سلسلۂ مطبوعات
۴

معاصر شخصیتوں، بزرگوں، استادوں اور دوستوں سے
متعلق تعارفی مضامین، تاثرات، مشاہدات و واقعات اور
معلومات کا دلچسپ مجموعہ

# کچھ کتاب کے متعلق

پیش نظر کتاب میرے ان مضامین کا مجموعہ ہے، جو چند معاصر شخصیتوں سے متعلق ان کی وفات کے بعد لکھے گئے، ان معاصرین میں مشاہیر علماء اور مصنفین بھی ہیں، اساتذہ اور شیوخ بھی، دوست اور رفیق کار بھی، نامور اور شہرۂ آفاق بھی اور ایسے گوشہ نشین اور مستورالحال باکمال اور مردان خدا بھی جن کو ایک محدود حلقۂ احباب کے سوا بہت کم لوگوں نے جانا اور پہچانا، ان میں زیادہ تر مضامین ان شخصیتوں کی وفات کے مابعد اس سے متاثر ہو کر لکھے گئے، اور اسی وقت اردو کے رسائل اور اخبارات میں شائع ہوئے، کچھ مضامین وہ ہیں جو وفات پر عرصہ گزر جانے کے بعد کسی خاص تحریک یا تقریب سے یا محض قلب حزیں کو تسکین دینے یا ان حضرات کے حقوق کی ادائگی کے جذبہ سے لکھے گئے، اور ابھی تک کہیں شائع نہیں ہوئے۔

یہ مضامین ان شخصیتوں کی سوانح حیات یا ان کے مکمل تذکرہ و تاریخ کے طور پر نہیں لکھے گئے، نہ ان کو ان کے حالات و کمالات کا مکمل مرقّع سمجھنا صحیح ہوگا، یہ درحقیقت نقوش و تاثرات

کا ایک مجموعہ ہے، جو اپنی یاد، ذاتی تجربات و واقعات اور خطوط اور ذاتی تحریروں کی مدد سے تیار کیا گیا، اس کی خوبی کہئے یا عیب کہ اس میں اپنی زندگی کے واقعات و تجربات اور اپنے دل کے احساسات و تأثرات اور ان شخصیتوں کی زندگی کے واقعات اور ان کے قلبی تأثرات و احساسات ایسے گھل مل گئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا اور ایک کی مدد کے بغیر دوسرے سے آشنا ہونا مشکل ہو گیا ہے، لیکن اس سے ان شخصیتوں کے بہت سے ایسے خط و خال نمایاں ہو گئے ہیں، جو روایتی سوانح عمریوں اور رسمی تاریخوں میں عام طور پر نمایاں نہیں ہوتے، اس لئے سوانح نگاروں اور تاریخ نویسوں کو بھی ان میں زندگی کی بہت سی گمشدہ کڑیاں، چہرہ کا اتار چڑھاؤ، زندگی کے نشیب و فراز، دل کی دھڑکنیں اور اقبال کے الفاظ میں "دلوں کی تپش اور شبوں کا گداز" ملے گا جو بڑے ضخیم تذکروں اور پر جلال تاریخوں میں نہیں ملتا اور یہی ان مضامین کی اصل قدر و قیمت ہے۔

اس کتاب میں تمام متعارف، محبوب یا محترم شخصیتوں کا احاطہ نہیں کیا گیا، یہ سمجھنا صحیح نہیں ہو گا کہ مصنف کا دائرہ محبت و عقیدت یا تعلق و تعارف انھیں شخصیتوں تک محدود ہے، جن کے متعلق اس مجموعہ میں مضامین ہیں، بہت سے واقف کار لوگوں کو اس مجموعہ میں ہندوستان کی بہت سی چیدہ و برگزیدہ شخصیتوں کا تذکرہ نہ پا کر بڑی مایوسی اور حیرت ہو گی جن سے مصنف کے نیازمندانہ یا دوستانہ تعلقات کا ان کو علم ہے، اس کے دو سبب ہیں، ایک یہ کہ بعض جلیل القدر شخصیتوں پر مصنف پوری پوری کتاب لکھنے کی سعادت حاصل کر چکا ہے، اس مجموعۂ مضامین میں اس دریا کو کوزے میں بند کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی، پھر سب جانتے ہیں کہ لکھی ہوئی چیز کا دوبارہ لکھنا بڑے سے بڑے مصنف اور ادیب کے لئے بہت بڑا امتحان ہے، اس فہرست میں مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ، مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی بھوپالیؒ، مشائخ میں سے،

والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحئیؒ، برادر معظم مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ خاندانی بزرگوں میں سے، ڈاکٹر سر محمد اقبال ادیبوں اور شاعروں میں سے شامل ہیں کہ ان میں سے ہر ایک پر مصنف کی ایک ایک مستقل کتاب طبع[1] ہو چکی ہے، بعض ایسی شخصیتیں ہیں، جن پر مستقل کتاب لکھنے کی نوبت تو نہیں آئی، لیکن ان کی سوانح عمریوں کے مقدمہ کی شکل میں ان کے متعلق پورے بسط و تفصیل سے اظہار خیال کیا جا چکا ہے مثلاً نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، اور مولانا محمد یوسف صاحب دہلوی پر خود مصنف کی نگرانی و رہنمائی سے ضخیم تذکرے، اور سوانح عمریاں شائع ہوئیں، اور ان پر مصنف کے بلسوط مقدمے ہیں۔

ایک بات اور بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اس مجموعہ میں صرف انھیں حضرات کو شامل کیا گیا ہے، جو اس دنیا سے رحلت کر گئے اور خدا کو پیارے ہوئے، زندہ شخصیتوں میں سے کسی کو بھی اس میں شامل نہیں کیا گیا، اس لئے نہیں کہ وہ اس بزم کمال یا مجلس احباب میں جگہ پانے کے قابل نہ تھے، بلکہ اس لئے کہ ابھی وہ اس دنیا میں موجود ہیں، اور ان کا درخت فضل و کمال نئے نئے برگ و بار لا رہا ہے، اور نئے نئے شگوفے کھلا رہا ہے، نیاز مند مصنف کی دعا ہے کہ خدا ان کو بہت دنوں تک سلامت رکھے اور وہ اپنے علمی و عملی کارناموں اور نیک نامیوں میں اضافہ کرتے رہیں، مصنف کو ان کی زندگی و تابندگی اس کتاب کے ان کے ذکر خیر سے منور و معطر ہونے سے زیادہ عزیز ہے۔

اسی طرح اس بزم میں ان حضرات کو بھی شرکت فرمانے کی زحمت نہیں دی گئی جنھیں مصنف کو بہت زیادہ قریب سے دیکھنے اور زیادہ برتنے کا موقع نہیں ملا اور اس کی

---

[1] "مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت"۔ "سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ"۔ "صحبتے با اہل دل" (حالات و ملفوظات شاہ محمد یعقوب صاحب مجددیؒ) "حیات عبدالحیؒ" "نقوش اقبال"۔

واقفیت ان سے "دید وشنید"، کبھی کبھی کی ملاقاتوں اور چند خطوط کی حد سے آگے نہیں ہے، ان میں سے متعدد شخصیتیں ایسی ہیں، جن کا اس کتاب میں آنا کتاب اور مصنف دونوں کے لئے اعزاز کا باعث تھا، ـــــــــــــــــــــــ ان ناموروں پر مستقل تصنیفات اور مضامین کی کمی نہیں اور اس کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہے گا مصنف ان میں اپنی معلومات کا بڑا وقیع اضافہ نہیں کر سکتا اور اس کو مصر کے بازار میں خریداری کے لئے سوت کی حقیر انٹی لے کر زردار و باوقار خریداروں کے زمرہ میں آنے سے شرم دامنگیر ہے، وہ اپنی حقیقت وبساط سے واقف ہے، اور انھیں شخصیتوں کے ذکر پر قانع ہے، جن سے اس کے گہرے روابط اور بے تکلف مراسم تھے۔

مضامین کی ترتیب اور شخصیتوں کی تقدیم وتاخیر میں ان کے زمانۂ وفات کا لحاظ رکھا گیا ہے، یعنی اپنے اپنے گروہ میں جن کی وفات پہلے ہوئی ان کو پہلے جگہ دی گئی، اور جن کی وفات بعد میں ہوئی، ان کا تذکرہ بعد میں کیا گیا، اس طرح مضامین کی ترتیب تاریخی اور زمانی ہے، شخصیتوں کے علم وفضل اور ان کے مرتبہ اور مقام کے درجات پر مبنی نہیں۔

یوں تو اس مجموعہ میں مختلف ذوق ورجحان رکھنے والے قارئین کو اپنے ذوق کی تسکین اور دلچسپی کا سامان ملے گا کہ اس میں عالم ومصنف بھی ہیں، شاعر وادیب بھی، فقیر و درویش بھی، سیاست وخدمت ملّی کے میدان کے شہسوار بھی، بزرگ بھی، دوست بھی نامور بھی، گمنام بھی، لیکن اشخاص کے انتخاب میں بھی اور ان کے حالات وکمالات پسند وناپسند کے تذکرے میں بھی مصنف کا ذوق ورجحان اس کی اپنی زندگی اور ماحول اور اس کی پسند وناپسند ضرور کارفرما نظر آئے گی، اور یہ زندگی کی ایک علامت بھی ہے،

اور صاف گوئی اور راست بیانی، سادگی اور بے تکلفی کی نشانی بھی کہ زندہ انسان جب کسی انسان کے متعلق کبھی کچھ لکھتا یا کہتا ہے، تو وہ اپنی ذات سے الگ نہیں ہوتا، اگر وہ ایسا کرے گا، تو تصنیف کسی قلم اور قلب کی سچی ترجمانی اور کارفرمائی نہیں، ایک بے جان کیمرے کا مصنوعی عمل ہے، مصنف کی زندگی کا بڑا حصہ مدرسہ کی فضا اور دینی ماحول میں گزرا ہے، اس نے اپنی شعوری و علمی زندگی کا سفر تدریس و تصنیف سے شروع کیا، اس لئے قدرتاً اس کے تاثرات و بیانات میں ان کا حصّہ غالب و نمایاں رہے گا، اور اس حصہ سے قدرتاً انھیں لوگوں کو زیادہ دلچسپی ہوگی، جو اس کا ذوق اور تجربہ رکھتے ہیں، اگر یہ کوئی عیب اور نقص ہے تو مصنف اس سے بری ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا، اور اگر یہ کوئی خوبی ہے، تو وہ خواہ مخواہ اس سے انکار اور تواضع سے کام لینے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

راقم سطور ہی کی زندگی نہیں اس کے اسلاف کی زندگی کا بہترین حصہ اہل کمال اور گذشتہ و موجودہ شخصیتوں کی تاریخ اور تذکرہ نویسی میں گزرا، اس دشت کی سیّاحی میں کم سے کم یہ تیسری پشت ہے، بزرگوں نے ہزاروں صفحات اہلِ کمال و اہلِ اخلاص کے حالات کے لکھنے میں سیاہ کر کے اپنا نامۂ اعمال روشن کیا، اور سرخ روئی حاصل کی، اب اس دفتر گرانمایہ میں ان چند ہلکے پھلکے مضامین اور کم سواد صفحات کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔

مصنف کو ابتدائے عمر سے تذکروں اور سوانح عمریوں کے مطالعہ کا ذوق رہا ہے، اور اس کے لئے سب سے زیادہ دلچسپ اور دلآویز موضوع اور مطالعہ کا سامان وہ مضامین رہے ہیں، جن میں اہل قلم نے اپنی معاصر شخصیتوں، اور اپنے زمانہ کے

ناموروں سے متعلق اپنے نقوش وتاثرات اور اپنے واردات وتجربات پیش کئے ہیں، اس نے بڑی دلچسپی اور ذوق کے ساتھ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی کتاب "چند ہم عصر" مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی کا مضمون "ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی" پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مجموعہ مضامین "گنج ہائے گرانمایہ" اور "ہم نفسان رفتہ" مولانا عبدالماجد دریابادی کی کتاب "محمد علی ذاتی ڈائری" اور "حکیم الامت نقوش وتاثرات" شورش کاشمیری کے سوانحی خاکے (مولانا ظفر علی خاں وغیرہ) پڑھے، ان میں سے متعدد مضامین اور کتابیں نہ صرف اردو ادب اور انشاء میں بلکہ معاصر ادب اور عالمی لٹریچر کے بہترین نمونوں میں جگہ پانے کی مستحق ہیں، ان میں سے بعض مقالات ورسائل نے اگر مصنف کے اندر اس موضوع پر لکھنے کی تحریک پیدا کی ہو، تو تعجب نہیں، پیش نظر کتاب کسی حیثیت سے بھی اس موقر فہرست میں اضافہ کرنے کا دعویٰ نہیں کرتی، لیکن اس کے ذریعہ انسانی زندگی، اسلامی سیرت واخلاق اور ظاہری وباطنی کمالات کے کچھ اور نمونے سامنے آجاتے ہیں، اور ان بعض تاریک گوشوں پر بھی روشنی پڑجاتی ہے، جو سابق الذکر مصنفین اور ادباء کی عقابی نگاہ، اور وسیع واقفیت کے دائرہ سے باہر رہے ہیں، یا جنھوں نے ان کتابوں کی تصنیف کے بعد شہرت اور امتیاز حاصل کیا، ظاہر ہے کہ ان مصنفین میں سے کسی نے بھی کوئی ہمہ گیر اور مکمل تذکرہ لکھنے کا ارادہ نہیں کیا، ہر ایک نے اپنے حلقۂ احباب، یا حلقۂ تعارف پر اکتفا کیا، اس طرح اس موضوع پر لکھنے کا سلسلہ برابر جاری رہے گا، اور اس سے زبان وادب، مطالعۂ زندگی اور سیرت کی تشکیل میں مدد ملتی رہے گی۔

الہ دین کا چراغ کے مشہور قصہ میں پڑھا تھا کہ افریقی جادوگر نے جب الہ دین کا

چراغ گم کر دیا اور اس کی بازیافت میں نکلا تو وہ اپنے ساتھ بہت سے نئے چراغ لے کر چین پہونچا، وہ دروازہ دروازہ صدا لگاتا تھا کہ "پرانے چراغ دو اور نئے چراغ لو" قصہ کا راوی کہتا ہے کہ جب اس گھر کے دروازہ پر پہونچا جہاں اس کا گوہر شب چراغ موجود تھا تو صاحبِ خانہ نے اپنی سادگی میں پرانا چراغ دے کر نیا چراغ لے لیا اور اس کی متاعِ گمشدہ ہاتھ آگئی، مصنف بھی اسی سوداگر کا بھیس بدل کر نئے چراغ بیچتا اور پرانے چراغ خریدتا ہے، اور اس بات پر یقین کرتا ہے کہ وہ اس سودے میں ہرگز نقصان میں نہیں رہے گا۔

اسی لئے اس کتاب کا نام "پرانے چراغ" رکھا گیا۔

ابوالحسن علی ندوی

دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی

۲۳ رجب ۱۳۹۲ھ (یکم ستمبر ۱۹۷۲ء)

مگو گذشتہ رفیقاں ز دل فراموشند
کدام نالہ کہ در پردہ اَش نمی جوشند
چراغ انجمن حیرتِ نظر بودند
کنوں بہ پردۂ دل داغہائے خاموشند
نرفتہ اند ازیں بزم تا سخن باقی ست
ز دیدہ رفتہ حریفاں ہنوز در گوشند

بیدل عظیم آبادی

بار اوّل

۱۳۹۵ھ - ۱۹۷۵ء

کتابت ـــــــــــ ظہیر احمد کاکوروی

طباعت ـــــــــــ نامی پریس لکھنؤ

صفحات ـــــــــــ ۴۶۴

قیمت ـــــــــــ ۱۶ سولہ روپے

باہتمام

محمد غیاث الدین ندوی

# فہرست عناوین

# چند بلند پایہ عالم و رہنما

# مولانا سید سلیمان ندویؒ

مولانا سید سلیمان ندویؒ سے ہمارے خاندان کے ایسے گوناگوں تعلقات اور ایسے عزیزانہ روابط تھے کہ وہ کسی دور میں بھی ہم لوگوں کے لئے اجنبی اور نامانوس نہیں تھے، وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نہ صرف تعلیم یافتہ اور فاضل بلکہ اس کے لئے سرمایۂ افتخار و نازش تھے، وہ میرے والد کے عزیز شاگرد اور بھائی صاحب کے ایسے دوست تھے جو عمر میں بڑے اور فضیلت و شہرت میں بڑھے ہوئے تھے، ہماری درسگاہ کے ایک طرح کے مربی و سرپرست بھی تھے، میرے استاذ مولانا خلیل عرب صاحب کے ساتھ بھی ان کا تعلق کچھ ایسا ہی تھا کہ عرب صاحب کی طرف سے احترام کا معاملہ بھی تھا اور بے تکلفی و مزاح و ظرافت کا معمول بھی، عرب صاحب نے اس دور میں ندوہ میں تعلیم پائی تھی، جب سید صاحب وہاں کے اساتذہ میں شامل تھے، اگر عرب صاحب کو ان سے پڑھنے کی نوبت آئی بھی ہوگی تو برائے نام، اس کے بعد جب دیکھا دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ معاملہ خوش طبعی و بے تکلفی کا دیکھا، سید صاحب اپنے بے تکلف احباب میں بڑے ظریف، نکتہ سنج، سبک روح اور

خوش مذاق تھے، لیکن ان کے مذاق میں بھی ایک علمی و ادبی شان ہوتی تھی، عرب صاحب بھی باوجود اس کے کہ ان کا زیادہ تر سابقہ عربی سے تھا، اردو کا اچھا مذاق رکھتے تھے، اور لکھنؤ میں طویل مدت گزارنے کی وجہ سے زبان کی باریکیوں اور مزاح و ظرافت کی نزاکتوں سے واقف تھے، کہ ذراسی بے احتیاطی سے مذاق کس طرح ابتذال اور خوش طبعی کس طرح اشتعال کے حدود میں داخل ہو جاتی ہے

سید صاحب کو اول اول قریب سے خواجہ سید رشید الدین مودودی مرحوم کی کوٹھی پر دیکھا، وہ جب لکھنؤ تشریف لاتے تھے، اکثر انھیں کی کوٹھی پر قیام کرتے تھے، خواجہ سید رشید الدین جو اچھے صاحب کے نام سے یاد کئے جاتے تھے، نواب سید نورالحسن خاں مرحوم کے داماد تھے، اور ان کے برادر خورد نواب سید علی حسن خاں مرحوم ناظم ندوۃ العلماء ان کے برادر نسبتی تھے، اچھے صاحب کا بنگلہ نواب نورالحسن خاں مرحوم کی کوٹھی (جو بھوپال ہاوس کے نام سے معروف تھی) کے بغل میں تھا، ۲۳، ۲۴، ۲۵ء میں بھائی صاحب کا قیام جو اس وقت میڈیکل کالج لکھنؤ میں زیر تعلیم تھے، اسی کوٹھی پر رہتا تھا، اور میں مہینوں ان کے ساتھ قیام کرتا تھا، میری عمر اس وقت ۱۱، ۱۲ سال کی تھی، سید صاحب جب اچھے صاحب کے یہاں تشریف لاتے تھے، تو ہم لوگ ان کو قریب سے دیکھتے تھے، لیکن اس وقت کی کوئی بات ذہن میں نہیں ہے، ۲۶، ۲۷ء سے ہم لوگ بازار جھاؤ لال منتقل ہوئے اور بھائی صاحب نے مطب شروع کیا، ہمارا اور عرب صاحب کا مکان آمنے سامنے تھا، اسی زمانہ میں میری عربی تعلیم عرب صاحب کے یہاں شروع ہوئی، اس دور میں سید صاحب اور مولانا مسعود علی صاحب بھائی صاحب یا عرب صاحب سے ملنے کبھی کبھی تشریف لاتے اور کچھ دیر صحبت رہتی، سید صاحب کا نقشہ اسی وقت سے آنکھوں میں ہے، سراپا وقار، مجسم متانت، قد میانہ مائل بہ پستی، چہرہ سے

معصومیت اور شرافت نمایاں، دیکھ کر دل شہادت دیتا تھا کہ ان میں دوسروں کو ایذا پہونچانے اور دل دکھانے کی صلاحیت ہی نہیں، لباس نہایت صاف ستھرا جس پر کہیں نکتہ چیں اور دور بیں کو بھی کوئی دھبہ یا شکن نظر نہ آئے، ہر چیز نفاست اور نستعلیقی پر دال، شیروانی کسی قدر لانبی، عمامہ سر پر نہایت سفید اور صاف اور اس کے پیچ نہایت خوبصورتی سے دیئے ہوئے، فرمایا کرتے تھے کہ میں نے عمامہ کی عادت تمہارے والد کو دیکھ کر اختیار کی، آواز پست جو قرب کے باوجود بغیر قدردانی اور شوق کے سنی نہ جا سکے، بالعموم کم گو اور بقدر ضرورت بولنے والے، آنکھوں سے حیا اور ذہانت کا اظہار کچھ نہاں کچھ آشکار، جب کہیں تشریف لاتے مخالف اور موافق فضل و کمال کے معترف اور ان کے منکر دونوں احترام پر مجبور ہو جاتے، ہمارے استاذ خلیل عرب صاحب ان کے فضل و کمال کے کچھ زیادہ معتقد نہ تھے، بلکہ کسی حد تک ناقد لیکن ان کو بھی ان کا ہمیشہ احترام ہی کرتے دیکھا۔

۲۹ء سے میرا دارالعلوم ندوۃ العلماء سے باقاعدہ استفادہ اور طالب علمی کا تعلق قائم ہوا، اس وقت سید صاحب دارالعلوم کے معتمد تعلیم تھے، ندوہ کے جلسۂ انتظامی کے علاوہ بھی تشریف لاتے اور کئی کئی دن قیام کرتے، کبھی کبھی درجوں اور طلباء کے جلسوں میں بھی تشریف لے آتے، ایک مرتبہ طلباء کا عربی جلسہ ہو رہا تھا، جب میری تقریر کی باری آئی تو میں نے اپنی عادت کے مطابق حاضرین کو مخاطب کر کے بلا کسی خطبۂ مسنون کے تقریر شروع کر دی، سید صاحب نے ٹوکا اور وہ حدیث یاد دلائی جس میں فرمایا گیا ہے، کہ جو تحریر و تقریر حمد و ثنا سے شروع نہ کی جائے وہ ناقص اور عیب دار ہے، میرے لئے بڑی دشواری پیش آئی کہ اسی وقت حمد و ثنا کے مناسب الفاظ اور موضوع کی رعایت سے خطبہ پڑھوں جس کے لئے میں نے تیاری نہیں کی تھی، میں کچھ دیر خاموش رہا، اور پھر

تقریر شروع کر دی، سید صاحب نے پھر ٹوکا، میں نے کہا کہ میں نے آہستہ سے پڑھ دیا ہے، سید صاحب مسکرائے اور فرمایا کذا قال الشارح، کذا قال الشارح۔"

ستمبر ۳۰ء میں علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی دار العلوم میں ادب عربی کے استاد اعلیٰ ہو کر آئے، اور نہ صرف دار العلوم میں بلکہ ایک طرح سے ہندوستان میں (جہاں تک عربی زبان کا تعلق ہے) ایک نئے دور کا آغاز ہوا، ہلالی صاحب نے غالباً ۳۱ء کے آخر میں ایک سفر مشرقی اضلاع بنارس، اعظم گڈھ، مؤ مبارک پور کا کیا، انھوں نے از راہ کرم و شفقت مجھے اپنی رفاقت اور معاونت کے لئے انتخاب فرمایا اور میں اس پورے سفر میں ایک خادم اور ترجمان کی حیثیت سے ان کے ساتھ رہا، رمضان کا زمانہ تھا، اور دسمبر یا جنوری کا مہینہ، اس سفر میں کئی روز دار المصنفین میں قیام رہا، یہ میری دار المصنفین کی پہلی حاضری تھی، افطار تو سب ساتھ ہی کرتے تھے، البتہ سحری کے لئے ہم دونوں کو سید صاحب کے دولت کدہ پر جانا ہوتا تھا دونوں یگانہ فاضلوں کو دیر دیر تک علمی و ادبی گفتگو کرتے سنا، اسی سفر میں دار العلوم سے ایک عربی رسالہ کے اجرا کا فیصلہ ہوا، جس کے نگراں و سرپرست سید صاحب اور ہلالی صاحب اور ایڈیٹر ہمارے دوست مولانا مسعود عالم صاحب ندوی منتخب ہوئے، یہ سید صاحب کے پرانے علمی و ادبی ذوق کی تجدید اور ایک عربی رسالہ نکالنے کے دیرینہ خواب کی تعبیر تھی، اس رسالہ کا پہلا شمارہ محرم ۱۳۵۱ھ مئی ۱۹۳۲ء کو نکلا، اس کا افتتاحیہ سید صاحب نے لکھا اور خوب لکھا، یہ ان کی عربی انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے، کہیں سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کی عربی لکھنے کی مشق چھوٹی ہوئی ہے، اور قلم کے مسافر کو ایک نئی وادی درپیش ہے، سید صاحب نے اس مضمون میں ہندوستان میں عربی صحافت کا مختصر جائزہ بھی لیا ہے، اور اس کی ضرورت بھی بیان کی ہے، اس مضمون میں کہیں کہیں عبارت کی بے ساختگی، بے تکلف

مسجّع اور استعارات وتشبیہات کی ندرت ان کے پرانے عہد کی یاد تازہ کرتی تھی۔

اس کے بعد سید صاحب کو عربی نثر میں لکھنے کا اتفاق تو بہت کم ہوا، زیادہ تر ان کی نظمیں اور قصائد شائع ہوئے اور ان کے اردو کے بعض تحقیقی مضامین کے ترجمے، جو زیادہ تر مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کے قلم سے ہوتے تھے، شائع ہوئے۔

سید صاحب سے قرب اور ان کی شفقتوں اور نوازشوں سے مستفید ہونے کا موقع دار العلوم میں تدریسی تعلق کے بعد ہوا، اس انتخاب اور تقرر میں بھی مولانا مسعود علی صاحب ندوی کی تحریک اور سید صاحب کی تائید کو دخل تھا، میرا تقرر یکم اگست ۱۹۳۴ء کو بحیثیت استاد تفسیر وادب ہوا، سید صاحب دار العلوم تشریف لاتے، تعلیمی مشورے دیتے، درجوں میں تشریف لے آتے، اکثر خود ہی درس شروع کر دیتے، بعض اوقات کئی کئی گھنٹے درس جاری رہتا، اور طلباء سے زیادہ ہم لوگوں کو استفادہ کا موقع ملتا، کئی کئی روز مہمان خانہ میں قیام رہتا، طلباء کم اور اساتذہ زیادہ حاضر باش اور مصروف استفادہ رہتے، سید صاحب کو طلباء کی اس بے توجہی اور ناقدری کا نہ صرف احساس بلکہ قلق بھی تھا، ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ مولوی علی صاحب (سید صاحب اکثر مجھ سے خطاب اسی طرح کرتے تھے) طلباء میرے پاس آنے سے کیوں گھبراتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ آپ امتحان بہت لیتے ہیں، سید صاحب کا تدریسی ذوق آخری وقت تک نہیں گیا تھا، انھوں نے صرف ونحو کی تعلیم قدیم طریقے پر پائی تھی[1]، اور اس کی اہمیت اور اس کا ذوق ان پر آخر تک غالب رہا، ان کو لغت واشتقاق

---

[1] یہاں ایک لطیفہ یاد آگیا، ہم چند اساتذہ نے جن میں مولانا مسعود عالم صاحب ندوی، شیخ محمد العربی المراکشی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، عربی زبان کی تعلیم کا دار العلوم میں ایک نیا تجربہ شروع کیا تھا، جس میں صرف ونحو کی صرف مشق کرائی جاتی تھی، قواعد واصطلاحات کا طلباء پر بار نہیں ڈالا جاتا تھا، ایک دن سید صاحب (باقی ص ۲۴ پر)

سے بھی بہت دلچسپی تھی، ہر درجہ کے طالب علم سے اس کی استعداد اور سطح کے مطابق صرف ونحو اور لغت کے سوالات کرتے، عربی کا کوئی شعر پڑھتے اور مطلب پوچھتے، طلبا فطرتاً امتحان سے گھبراتے ہیں پھر اچھے اچھے لوگ سید صاحب کی جرح کی تاب نہیں لاسکتے تھے، ان میں سے ایک بڑی تعداد سید صاحب کے مقام و مرتبہ سے ناآشنا بھی تھی، پھر سید صاحب کی مجلس کا وقت بالعموم اپنی ضروریات کے لئے بازار جانے یا کھیلنے کا ہوتا تھا، اس لئے طلبا ان کی مجلس میں بہت کم نظر آتے تھے، سید صاحب نے فرمایا کہ اچھا میں امتحان نہیں لیا کروں گا، تم طلبا کو سمجھا دو، میں نے طلبا کو ان زریں موقعوں سے فائدہ اٹھانے اور ان تاریخی مجلسوں کو غنیمت بلکہ نعمت سمجھنے کی ترغیب دی، کہنے سننے سے کچھ طلبا آئے بھی لیکن بعض اوقات سید صاحب پر وہ پرانا ذوق غالب آگیا اور انھوں نے پھر کوئی سوال کر دیا اور بعض اوقات طلبا کو ان مجلسوں میں اپنی دلچسپی کا کوئی سامان نظر نہ آیا، اور ان کی تعداد میں کوئی نمایاں اضافہ نہ ہوا اور سید صاحب کو اس کا قلق اور ہم لوگوں کو اس کی شرمندگی ہی رہی کہ طلبا نے گھر آئی ہوئی اس دولت اور اس ہمائے علم وادب کے سایہ سے فائدہ نہ اٹھایا۔

---

(باقی ص ۲۳ کا) درجہ اول میں تشریف لے آئے جہاں اس جماعت کا سبق ہو رہا تھا، اور مولانا مسعود عالم صاحب ندوی پڑھا رہے تھے، سید صاحب نے طلبا سے کسی لفظ کی تعلیل پوچھی طلبا نے غالباً یہ لفظ بھی نہیں سنا تھا، وہ جواب نہیں دے سکے، سید صاحب نے مولوی مسعود عالم صاحب کی طرف دیکھا انھوں نے کہا صرف کا گھنٹہ علی میاں کے پاس ہے میری طلبی ہوئی، سید صاحب نے فرمایا کیوں صاحب آپ نے ان طلبا کو تعلیل نہیں سکھائی، میں نے کہا کہ تعلیل تو آسانی سے ان کو سکھائی جاسکتی ہے، مگر یہ ایک سوال کرتے ہیں جس کا میرے پاس جواب نہیں، فرمایا کیا؟ میں نے عرض کیا کہ میں جب ان سے کہتا ہوں کہ قال اصل میں "قَوَلَ" تھا واؤ متحرک ماقبل اس کا مفتوح واؤ کو الف سے بدل دیا قال ہوگیا تو یہ پوچھتے ہیں کہ یہ کس زمانہ میں تھا اور عرب کب قال کے بجائے قَوَلَ بولتے تھے میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں، سید صاحب مسکرائے اور بات ختم ہوگئی۔

سید صاحب کو سال میں کئی مرتبہ علی گڑھ کا سفر پیش آتا، وہ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر بھی تھے، اساتذہ کے انتخاب کے لئے بھی بحیثیت ماہر خصوصی (EXPERT) ان کو بلایا جاتا، یونین بھی کبھی ان کو مدعو کرتی، دہلی اور مغربی، شمالی ہندوستان کے سفر بھی پیش آتے، ہر مرتبہ وہ آتے جاتے لکھنؤ ٹھہرتے اور کئی کئی روز ٹھہرتے، فرماتے کہیں جاؤ یا آؤ ندوہ پہنچ کر ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ اپنے گھر آگئے" بالاستقلال بھی کئی کئی ہفتے قیام کرتے، اسی دوران میں ہم چند اساتذہ کو انھوں نے فلسفۂ قدیم کی ایک کتاب پڑھانی شروع کی جس کا سلسلہ کچھ زیادہ دن قائم نہیں رہا لیکن فلسفۂ یونان کے متعلق بعض بنیادی حقائق معلوم ہوئے جو بعد میں بہت کام آئے۔

سید صاحب کے لئے علم کا معاملہ کسی پیشے یا ضرورت یا کسی مجبوری اور مصلحت کا معاملہ نہ تھا علم ان کا گوشت پوست بن گیا تھا، اور ان کے خون میں جاری وساری ہو گیا تھا، وہی ان کی غذا تھی، وہی ان کی تفریح اور وہی ان کا اوڑھنا بچھونا، اکثر دیکھا کہ ان کا تانگہ دار العلوم کے پھاٹک میں داخل ہوا اور جو پہلا شخص ملا اس سے کہا فلاں فلاں استادوں کو خبر کر دو یا کتب خانہ سے فلاں فلاں کتاب لے آؤ، مہمان خانہ پہونچ کر شیروانی اتاری ہاتھ منہ دھویا اور چائے کے انتظار میں بیٹھے، حدیث و فقہ کے استاذ آگئے اور کسی علمی مسئلہ پر مذاکرہ شروع ہو گیا، کتب خانہ سے کتاب پہونچ گئی اس کا مطالعہ شروع ہو گیا، اس میں کسی فن کی تخصیص نہ تھی، کبھی حدیث کا مسئلہ ہوتا کبھی فقہ کا، کبھی کوئی تاریخی بحث ہوتی، کبھی تذکرے اور تراجم کی کوئی بات جب تک قیام رہتا ان کی مجلسوں میں علمی مذاکرے اور بحث و تحقیق کے سوا کوئی موضوع نہ چھڑتا کسی سیاسی شخصیت یا عمائد شہر میں سے کسی کے آجانے سے کچھ موضوع بدل جاتا لیکن

اس کی جملہ معترضہ سے زیادہ حیثیت نہ ہوتی، البتہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی یا مولانا مسعود علی صاحب ندوی اور مولانا عبدالباری صاحب ندوی کے آنے سے کچھ تفریحی گفتگو، گذشتہ دور کی یاد اور مشترک دلچسپی اور تعلقات کی باتیں ہونے لگتیں، بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہوگا کہ سید صاحب ضلع جگت، لفظی رعایت اور نکتہ آفرینی میں بڑا کمال رکھتے تھے، ان کے اس ذوق نے ان کے بڑھے ہوئے وقار اور متانت اور سنجیدگی کو خشکی اور یبوست تک پہونچنے نہیں دیا تھا یہ ذوق اس وقت خاص طور پر نمایاں ہوتا تھا جب مولانا عبدالماجد صاحب جیسے خوش مذاق اور زبان کے اداشناس یا لکھنوی مذاق کے کوئی بزرگ تشریف لے آتے، بھائی صاحب مرحوم کے آنے سے یا مہتمم صاحب دارالعلوم کے تشریف رکھنے سے کچھ ندوہ اور دارالعلوم کے معاملات اور مسائل پر بھی گفتگو ہوتی، لیکن اصل ذوق اور موضوع وہی تھا، جو طبیعت ثانیہ بن گیا تھا اور اس سے مفارقت شدید بیماری میں بھی گوارہ نہ تھی۔

سید صاحب کی مجھ پر خصوصی شفقت اس وقت سے شروع ہوئی، جب اللہ تعالیٰ نے مجھے سیرت سید احمد شہیدؒ لکھنے کی توفیق عطا فرمائی، یہی وہ زمانہ تھا کہ سید صاحب کا ذوق و ذہن، مردہ نقوش سے اکتا کر، زندہ نقوش و صورت سے ہٹ کر، حقیقت اور خبر سے سیر ہو کر نظر کی تلاش میں سرگرداں تھے، غالباً ۳۷ء کا آخر ۳۸ء کا آغاز تھا، ایک مرتبہ وہ لکھنؤ تشریف لائے اور ہمارے ہی مکان پر ایک دو روز قیام رہا، میں نے ان کی خدمت میں سیرت سید احمد شہیدؒ کا مسودہ پیش کیا، انھوں نے پورے مسودہ پر نظر ڈالی، اس میں جابجا والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کے "سفرنامہ و روزنامچہ ارمغانِ احباب" کے حوالے تھے، سید صاحب نے [illegible]

جو اس وقت مصنف کے مسودہ کی شکل میں تھی، دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا، مسودہ پیش کر دیا گیا، سید صاحب نے اس کی نقل کی فرمائش کی جس کی تعمیل کی گئی، انھوں نے اس کو اپنے تعارفی کلمات کے ساتھ معارف میں بالالفاظ "دہلی اور اس کے اطراف" کے عنوان سے شائع فرمایا، خود ہی اس پر ذیلی عنوانات قائم کیے اور کتاب پر جا بجا اپنے قلم سے حواشی اور تشریحی نوٹ اضافہ فرمائے[1]۔

اسی موقع پر میں نے ان سے سیرت پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی فرمایا کہ جب کتاب چھپ جائے تو بھیج دینا میں اس پر کچھ لکھ دوں گا۔ ۱۹۳۸ء کے آخر یا ۱۹۳۹ء کے اوائل میں جب اس کی طباعت مکمل ہوئی تو میں نے اس کو کتابی شکل دے کر ان کی خدمت میں بھیج دیا، سید صاحب کو جب یہ کتاب ملی تو انھوں نے حسب ذیل مکتوب ارقام فرمایا جو غالباً میرے نام ان کا پہلا شفقت نامہ تھا، مکتوب بجنسہٖ درج ہے۔

"دارالمصنفین اعظم گڑھ

عزیزی رزقکم اللہ علماً نافعاً

کتاب ملی، جا بجا سے پڑھی، بعض حصے تو بہت موثر ہیں، جن کو پڑھ کر آنکھیں پر آب ہو گئیں، آپ کا انداز بیان اور انشا بھی دلپذیر ہے۔

اللہ کرے حسن رقم اور زیادہ

آپ نے لکھنے کے لئے کیا چھوڑا ہے جو میں لکھوں، چاہتا ہوں کہ

---

[1] یہ سلسلہ جنوری ۱۹۳۹ء سے شروع ہو کر جون ۱۹۳۹ء تک چلتا رہا، بعد میں کتابی شکل میں "دہلی اور اس کے اطراف انیسویں صدی میں" کے نام سے کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی اور مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی طرف سے شائع ہوا۔

کتاب کی روح چند لفظوں میں کھینچ لوں، چند صفحے ہوئے ہیں، کچھ اور ہو جائیں تو بھیج دوں، تراجم علمائے حدیث کا دیباچہ آپ نے دیکھا ہے؟ اسی پرداز پر ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں سلام کہئے۔ علی گڑھ کی کامیابی پر مبارکباد[۱]۔ والسلام

سید سلیمان

۱۳ فروری ۱۹۳۹ء"

سید صاحب نے مقدمہ لکھا اور دل کھول کر لکھا، ان کی اس تحریر میں بڑی دلآویزی آمد، اور ادبیت ہے اور غالباً یہ مقدمہ اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے ان کی تحریروں میں نمایاں مقام رکھتا ہے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس میں دماغ کے ساتھ دل، اور علم و زورِ انشاء کے ساتھ عشق و وجدان بھی شامل ہے، مقدمہ لکھنے کے بعد دوسرا شفقت نامہ باعثِ سرفرازی ہوا، اس کتاب کے پڑھنے اور اس سے جو تعلق پیدا ہوا تھا، غالباً اسی کا نتیجہ تھا کہ مجھے ایک قریبی سفر میں جو کرنال اور پانی پت کی طرف ہونے والا تھا، معیت اور ہمرکابی کا ایما ہوا، مکتوب درج ذیل ہے۔

---

[۱] یونیورسٹی کی طرف سے اعلان ہوا تھا کہ بی۔اے کے طلباء کے لئے دینیات کی ایک کتاب مطلوب ہے جس میں عقائد، اصول دین، سیرت طیبہ اور ضروری مسائل آجائیں راقم سطور نے بھی اس کے لئے پیش کش کی تھی جو منظور ہوئی، کتاب پسند کی گئی، اور اس پر معاوضہ عطا ہوا، سید صاحب کا اشارہ اسی کامیابی کی طرف ہے۔

اعظم گڑھ

برادرم سلمہ اللہ تعالےٰ

دیباچہ مرسل ہے پسند آئے تو شامل کتاب کیجئے گا، کتاب چھپنے کے بعد ایک نسخہ مکمل بھیج دیجئے گا آپ کو اپنی اس کتاب کے کچھ نسخے دارالمصنفین میں فروخت کے لئے کمیشن پر رکھوانا چاہیئے۔

مارچ کے شروع میں کرنال کے مدرسہ اسلامیہ کے معائنہ کے لئے جانا ہے، آپ بھی چلنے کو تیار رہیئے، علی گڑھ کی کامیابی پر مبارکباد، اس مضمون کی رسید سے مطلع کیجئے۔

سید سلیمان

"...... سنہ ۱۹۳۹ء

یہ میرا پہلا سفر تھا، جو سید صاحب کی معیت میں ہوا، یہ سفر کئی حیثیتوں سے یادگار اور میرے لئے سرمایۂ عزت و افتخار تھا، سید صاحب کے پایہ کے ایک عالم و محقق و ادیب کی ہمہ وقت صحبت، دینی و علمی مرکزوں کا سفر، تاریخی مقامات اور آثار قدیمہ کی سیر، بڑے بڑے اہل علم و فضل سے ملاقات، علمی و ادبی مجلسیں، ہر حیثیت سے یہ سفر میرے لئے وسیلۂ الظفر بن گیا، سید صاحب پہلے کرنال تشریف لے گئے، جہاں ان کو شمشیر جنگ نواب عظمت علی خاں رئیس کرنال کے وقف کے مدرسہ کا معائنہ کرنا تھا، اور وہاں کے بعض اساتذہ کے متعلق جن سے منتظمین مطمئن نہ تھے، رائے دینی تھی، اس وقت اس مدرسہ میں جو جامع مسجد کرنال میں قائم تھا، مولانا حمد اللہ صاحب پانی پتی صدر مدرس تھے، مولانا شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے تلمیذ رشید اور ان کی تحریک کے ایک کارپرداز اور معتمد رہ چکے تھے، اور ان کا ریشمی خطوط کے

قضیہ کے سلسلہ میں بار بار نام آیا تھا، میں نے بھی ان کی زیارت کی، منتظمین ان کی سن رسیدگی اور ضعف کی وجہ سے ان کو ہٹانا چاہتے تھے، لیکن اس کی جرأت نہیں کرتے تھے، سید صاحب کو دراصل انھوں نے اسی مقصد سے بلایا تھا کہ ان کے صاد کر دینے کے بعد پھر قیل و قال کی گنجائش نہیں تھی، لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے اور سید صاحب نے ان کو اپنے عہدہ پر برقرار رکھا، اس وقت ضلع کرنال کے ڈپٹی کمشنر حافظ عبدالمجید صاحب آئی سی ایس تھے، ان کا پڑاؤ اس وقت تھانیسر میں تھا، وہ سید صاحب کے علم و فضل سے غائبانہ واقف اور دارالمصنفین کی خدمات سے متاثر تھے، انھوں نے لنچ پر مدعو کیا، میں نے بھی اس سفر کی برکت سے تھانیسر، جو مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری مصنف "سوانح احمدی" اور "کالا پانی" کا وطن تھا، کی زیارت کی سب سے پہلے میں نے یہیں مغربی طرز پر کھانا کھایا، اور سید صاحب نے جو یورپ کا سفر کر چکے تھے، میری رہنمائی کی، اسی کھانے پر میں نے پہلی مرتبہ ایک ثقہ مجلس سے مولانا محمد الیاس صاحبؒ اور ان کی تبلیغی مساعی کا ذکر سنا۔

کرنال کے کام سے فارغ ہو کر ہم لوگ پانی پت آئے اور حسن اتفاق کہ ہم لوگ خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم کے فرزند ارجمند خواجہ سجاد حسین مرحوم کے مہمان ہوئے، انھوں نے بھی اس مکان میں ٹھہرایا جو مولانا حالی کی آخری رہائش گاہ تھی، اور وہیں سے انھوں نے سفر آخرت اختیار کیا، ان کی بعض مشہور نظمیں خصوصاً "چپ کی داد" وہیں لکھی گئیں، اس نظم کا نام آگیا تو یہ بھی سنتے چلئے کہ خواجہ سجاد حسین مرحوم نے سنایا کہ خواجہ غلام الثقلین یا ان کے بھائی (مجھے اس وقت نام میں شبہ ہو گیا ہے) خواجہ غلام الحسنین نے ایک دن مولانا حالی سے تعجب کے لہجہ میں کہا کہ اس سفر میں ایک صاحب یہ کہہ رہے تھے کہ مولانا حالی کی بہترین نظم اور ان کا شاہکار "چپ کی داد" ہے، مولانا نے ان سے کہا کہ تمہارا کیا خیال ہے؟ انھوں نے

اس میں کچھ تردد کا اظہار کیا، مولانا نے اس شخص کی تصویب فرمائی اور فرمایا کہ وہ ٹھیک کہتا تھا'
اسی زمانۂ قیام میں اردو کے مشہور مصنف منشی ذکاء اللہ صاحب دہلوی مرحوم کے صاحبزادہ
جو خود بڑے مصنف اور اردو کے کامیاب ترین مترجم سمجھے جاتے ہیں، مولوی عنایت اللہ صاحب
بی۔ اے مرحوم بھی پانی پت میں مقیم تھے، سید صاحب ان سے ملنے گئے، خواجہ سجاد حسین بھی
ہمراہ تھے، فرمایا کہ "اس وقت اردو کے تین انشا پردازوں اور اردو کے معماروں کے
فرزند و وارث موجود ہیں، مولانا حالی کے فرزند ارجمند خواجہ سجاد حسین، منشی ذکاء اللہ صاحب
کے چشم و چراغ مولوی عنایت اللہ اور مولانا شبلی کا فرزند معنوی ہیں"۔

اس سفر میں سید صاحب نے اولیائے پانی پت کے مزارات کی زیارت کی،
سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے دو نامور شیخ اور سر حلقہ، خواجہ شمس الدین ترک پانی پتیؒ اور
کبیر الاولیاء شیخ جلال الدین پانی پتیؒ یہیں آسودۂ خاک ہیں، حضرت خواجہ بو علی قلندرؒ کی
درگاہ بھی یہیں ہے، سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے ایک شیخ کامل و فاضل اجل حضرت
قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ بھی یہیں آرام فرما ہیں، اور مولانا غوث علی شاہ صاحبؒ بھی یہیں
مدفون ہیں، کچھ سادات کرام کے مزارات بھی ہیں، جو غالباً شہر کے باہر ہیں، سید صاحب
جہاں جاتے اپنے تاریخی معلومات سے ہم لوگوں کو مستفید کرتے، مولانا غوث علی شاہ صاحب
کے مزار پر فرمایا کہ یہ صوبۂ بہار کے تھے، یہ بھی غالباً فرمایا کہ سب سے زیادہ سادات کرام
کے مزارات پر جی لگا، سید صاحب غالباً مولانا قاری عبد الرحمن صاحب پانی پتی کے مکان
پر بھی حاضر ہوئے، ان کے پوتے جن کا نام غالباً مولانا عبد السلام صاحب تھا، خود بھی ملنے آئے
اور انھوں نے جمعہ کے بعد جامع مسجد میں تقریر کی فرمائش کی، سید صاحب نے تقریر فرمائی
جس میں پانی پت کی [illegible] اہمیت اور عظمت کا اظہار اور اس کے علماء و مشائخ اور [illegible]

خاک کے گنجھائے گرانمایہ کی طرف عالمانہ اور مورخانہ اشارات کئے، پانی پت کا تاریخی میدان بھی دیکھا، جہاں مرہٹوں نے شکست فاش پائی تھی، اور مسلمانوں کے اقتدار کو وقتی طور پر زندگی کی ایک قسط اور اس ملک میں کچھ عرصہ باعزت رہنے کی مہلت مل گئی تھی، پانی پت کا یہ میرا پہلا اور آخری سفر تھا، اور اب دس بار بھی جانا ہو تو ایک مورخ عظیم کی معیت کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔

پانی پت سے دہلی واپسی ہوئی راستہ میں ایک صاحب کا ساتھ ہو گیا، جو "طلوع اسلام" کے نائب ایڈیٹر تھے، طلوع اسلام اس وقت جناب غلام احمد صاحب پرویز کی ادارت میں دہلی سے نکلتا تھا، اور اس نے حدیث و سنت کو عرصہ سے نشانہ بنا رکھا تھا، وہ صاحب سید صاحب سے اس موضوع پر دیر تک بحث کرتے رہے، انھوں نے خیال کیا کہ یہ کوئی مولوی صاحب ہیں، جو اتفاق سے ہاتھ لگ گئے ہیں، ان کی بدولت سفر ذرا لطف سے طے ہو گا، سید صاحب نے بھی اپنا تعارف نہیں کرایا اور گفتگو میں حصہ لیتے رہے، دہلی کا اسٹیشن آیا اور سید صاحب اتر گئے، اور میں سامان کے انتظام کے لئے ٹھہر گیا، اسی اثنا میں انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ یہ کون مولوی صاحب ہیں؟ میں اس سے بے خبر تھا کہ سید صاحب نے مصلحتاً اپنا نام نہیں بتلایا، میں نے حیرت کا اظہار کیا اور کہا کہ آپ نے ابھی تک نہیں پہچانا؟ یہ مولانا سید سلیمان ندوی تھے، یہ سن کر وہ کچھ سناٹے میں آگئے، لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا، میں نیچے اترا۔ سید صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ تم نے ان صاحب کو میرا نام تو نہیں بتلایا؟ میں نے کہا کہ میں نے تو بتلا دیا، فرمایا کہ بڑی غلطی کی سفر میں نام نہیں بتلایا کرتے پھر یہ شعر پڑھا ع

صوفی نشود صافی تا در نہ کشد جامے

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

دہلی میں قیام جامعہ ملیہ کے مہمان خانہ میں ہوا، اس وقت جامعہ ملیہ قرول باغ میں
تھی، مجھے یاد ہے کہ مہمان خانہ پہونچتے ہی ایک ندوی فاضل سے جو اس وقت جامعہ میں
پڑھتے تھے، ملاقات ہوئی، ملتے ہی فرمایا کہ کیا تمہارے کتب خانہ سے قنوج کی تاریخ پر
فلاں انگریزی کتاب مل سکتی ہے؟ شام کا وقت تھا، اور سید صاحب کی آنکھوں میں تکلیف
بھی تھی، مجھے یاد نہیں کہ اس وقت کتاب دستیاب ہوگئی یا اگلے دن ملی بہرحال سید صاحب
نے اسی سفر میں کتاب سے استفادہ کیا، غالباً وہ اس زمانہ میں "حیات شبلی" لکھ رہے تھے،
اور یورپ کے تاریخی شہروں کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات جمع کرنے کے لئے ساعی
تھے، اگلے روز ڈاکٹر ذاکر حسین خاں شیخ الجامعہ کے یہاں دوپہر کا کھانا تھا، ڈاکٹر صاحب
کو قریب سے دیکھنے اور ان کی سادہ زندگی، ذہانت اور ظرافت کا نمونہ دیکھنے کا وہیں موقع
ملا، وہیں پہلی مرتبہ خان عبدالغفار خاں کو دیکھا، جن کو شیخ شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم تعلیم بالغان
کا مرکز اور اس کا کام دکھانے کے لئے لائے تھے، اور غالباً سید صاحب کو بھی زحمت دی تھی،

اکتوبر ۱۹۳۵ء میں سید صاحب سخت علیل ہوئے، ان کے احباب اور معتقدین
دور دور سے عیادت کے لئے گئے، بھائی صاحب نے بھی پہلی مرتبہ اعظم گڑھ کا سفر کیا اور
دو ایک دن دار المصنفین میں قیام کیا، مرض ذات الجنب کا شدید حملہ تھا، جس سے
قلب بھی متاثر تھا، ڈاکٹروں نے ہر طرح کی مشغولیت اور فکر سے علحدہ رہنے اور مکمل آرام
کا مشورہ دیا تھا، لیکن بھائی صاحب کا بیان ہے کہ ان کا دماغ برابر کام کرتا رہتا تھا، اس پر
ایک لطیفہ بھی سن لیجئے، بھائی صاحب نے کہا کہ ضرورت ہے کہ آپ کچھ عرصہ کے لئے اپنے
دماغ کو مکمل سکون اور آرام دیجئے، اور مضامین کی ترتیب اور ان کے لئے علمی مواد کی تلاش
اور ذہن میں بھی ان کا خاکہ بنانے سے مکمل احتراز کیجئے، سید صاحب نے کہا کہ ایسا کیسے ممکن ہے،

بھائی صاحب نے جواب دیا کہ اس کی دو، تین تدبیریں ہو سکتی ہیں، تاش اور شطرنج تو آپ کے شایان شان نہیں جس میں مکمل استغراق ہو جاتا ہے، ناول اور افسانے بھی آپ نہیں پڑھیں گے، ایک یہ کہ آپ الیکشن لڑیے جس میں دین و دنیا دونوں سے بے نیازی ہو جاتی ہے دوسرے شاعری شروع کر دیجیے کہ اس میں بھی کسی کی سدھ بدھ نہیں رہتی، ایک زیر لب تبسم پر یہ مکالمہ ختم ہو گیا، اور سید صاحب اس مشورہ پر عمل نہیں کر سکے۔

سید صاحب کو جب اس علالت سے افاقہ ہوا اور ملاقات کی اجازت ہوئی تو دار العلوم کے چند اساتذہ بھی عیادت اور مبارکباد کے لئے اعظم گڑھ گئے ان میں ہمارے استاذ اور دار العلوم کے شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں بھی تھے، مولانا مسعود عالم صاحب بھی اور راقم سطور بھی، سید صاحب ہم لوگوں سے بڑی محبت اور شفقت سے ملے، احتیاط واعتدال کے ساتھ علمی مذاکرات بھی شروع ہو گئے اور سید صاحب کا قدیم علمی اور تدریسی ذوق ابھر آیا، ایک روز مجلس میں سورہ جمعہ پر اور اس کی آیات کے باہمی ربط اور نظام پر ایسی فاضلانہ تقریر فرمائی اور ایسے علمی نکتے بیان کئے کہ ہم لوگ یہ سمجھے کہ سید صاحب کا اصل موضوع تفسیر اور تدبر قرآن ہی ہے، اس تقریر کو قلمبند نہ کرنے کا اب تک افسوس ہے۔

اس علالت سے صحت یاب ہو کر سید صاحب سب سے پہلے لکھنؤ تشریف لے آئے، ہم لوگوں نے ان کے استقبال اور اپنے جذبات ومسرت کے اظہار کے لئے بڑے بڑے منصوبے بنائے، ایک پروگرام یہ تھا کہ ان کو اساتذہ دار العلوم اور طلبائے دار العلوم کی طرف سے عربی میں سپاسنامے پیش کئے جائیں، جب سپاسناموں کی ترتیب کا مسئلہ سامنے آیا تو اساتذہ کی طرف سے سپاس نامہ لکھنے کا کام میرے سپرد ہوا اور

طلباء کی طرف سے سپاس نامہ لکھنے کا کام مولانا مسعود عالم صاحب ندوی نے اپنے ذمہ لیا، ہم دونوں نے پوری دلچسپی اور توجہ کے ساتھ سپاسنامے لکھے، میں نے اپنے سپاسنامہ میں اس کی رعایت کی کہ سید صاحب کی تمام اہم تصنیفات کے نام تلمیح اور اشارہ کے پیرایہ میں آجائیں، ہر مرتبہ ان کو خطاب کرنے میں بھی نیا اسلوب اختیار کیا، غرض یہ سپاسنامے علماء اور معززین شہر کی موجودگی میں ۱۵ ارمارچ ۱۹۳۶ء میں انجمن الاصلاح کے جالیہ ہال میں پیش کئے گئے، وہ بھی ایک عجیب منظر تھا، علمائے فرنگی محل عمائد شہر، نامور مسلم وکلاء، ہائی کورٹ کے بعض مسلمان جج موجود تھے، اور سب سید صاحب کے احترام اور اس فاضل یگانہ کی صحت سے مسرور، سید صاحب نے آخر میں اردو میں تقریر کی جس میں اپنے عزیزوں اور اپنے علمی خاندان کے افراد کی محبت کا شکریہ، اپنی زندگی کے بعض تجربے اور طلباء کو مفید نصائح تھے، میرے دور کی تاریخ میں یہ واقعہ بھی یادگار رہے گا، یہ ایک بزرگ خاندان کا جشنِ صحت نہ تھا، علم وادب، فکر و نظر اور بحث و تحقیق کی تازگی اور رعنائی اور نئے عزم سفر کی تہنیت تھی۔

سید صاحب کی دلچسپی دارالعلوم کے ساتھ برابر بڑھتی جارہی تھی، وہ اس عہد کہن کو تازہ کرنے کی فکر میں رہتے تھے، جب دارالعلوم ان کے استاذ مولانا شبلی کی رہنمائی اور سربراہی میں ہندوستان کے اہل علم و ذوق کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا، اور اس کا رسالہ "الندوہ" ہندوستان کے علمی مطلع پر ایک نئے سیارہ کی حیثیت سے طلوع ہوا تھا، سید صاحب نے الندوہ کے دوبارہ اجرا کا حکم دیا اور وہ راقم سطور اور رفیق محترم مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی استاذ دارالعلوم کی ادارت میں سنہ ۱۹۴۰ء سے نکلنا شروع ہوا، سید صاحب نے اس میں متعدد مضامین لکھے اور ان کی مختلف تقریریں بھی اس میں شائع ہوئیں، نومبر ۱۹۴۰ء

سے اس میں "میری محسن کتابیں" کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین شروع ہوا، اس میں سب سے پہلا مضمون، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا تھا، دوسرا سید صاحب کا، سید صاحب اس کی توسیع اشاعت، اور اس کے معیار کے بلند کرنے کی فکر میں رہتے تھے، لیکن کچھ تو ملک میں ایسے سنجیدہ رسالوں کا رواج نہ تھا، دوسرے ہم لوگ بھی اپنی تدریسی مصروفیتوں اور نوعمری کی وجہ سے اس کا معیار کچھ زیادہ بلند نہ کر سکے، بالآخر فروری ۱۹۴۱ء میں تقریباً دو سال جاری رہ کر اس کو بند کرنا پڑا۔

۱۹۴۰، ۴۱ء کا زمانہ تھا کہ سید صاحب علم و تحقیق کے چشموں سے سیراب ہو کر اور علوم دینیہ اور تاریخ و ادبیات کے سمندر میں بار بار غوطہ لگانے کے بعد اپنی روح کی پیاس اور "قلب کی کسی اور چیز کی تلاش" محسوس کرنے لگے تھے، اور اپنے محبوب دوست اور نامور معاصر علامہ اقبال" کے الفاظ میں خلوتوں میں (زبان حال سے) زیر لب اس طرح گویا ہوتے تھے کہ۔ ع

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گذشتہ روز و شب
مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علم نخیل بے رطب
تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفےٰ عقل تمام بولہب

شاید علمائے معاصرین کم سے کم ہندوستان کے فضلاء مدارس میں کسی کے ضمیر میں عقل و عشق، قدیم و جدید، مشرق و مغرب اور دین و ادب یا دین و فلسفہ کا یہ معرکہ اس طرح برپا اور تازہ نہ ہوا ہوگا جس طرح ندوہ کے اس فاضل، سیرت النبیؐ کے اس مصنف، میدان سیاست اور بزم ادب کے اس محرم راز، اور یورپ کے اس سیاح کے ضمیر میں ہوا تھا

انھوں نے اس نخیل علم کی آبیاری بھی کی تھی، اس کی گھنی چھاؤں میں برسوں آرام بھی کیا تھا، اس کی تاریخ بھی لکھی تھی، اس کی زندگی اور موت کا فلسفہ بھی بیان کیا تھا، لیکن ان کے قلب سلیم اور روح بے تاب کی شہادت تھی، (اگرچہ ان کے بہت سے معتقدین، تلامذہ اس کے ماننے کے لئے تیار نہ تھے کہ سید صاحب میں کوئی کمی اور تشنگی ہے) کہ وہ اس کے تازہ اور شاداب رطب سے فیضیاب نہیں ہوئے تھے، ان کی کتابوں نے بالخصوص "خطبات مدراس" "سیرت النبیؐ" کے مضامین اور "سیرت عائشہؓ" کے صفحات نے ہزاروں کو حلاوت ایمانی سے لذت آشنا کیا تھا، لیکن ان کی ہمت عالی اور ان کا طائر بلند پرواز خود اس دولت بیدار کا طالب تھا، جس کو حدیث میں احسان اور قرآن مجید میں تزکیہ کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے، اور جس طرح ان کو علم و ادب کی وادی کو کامیابی و فتح مندی کے ساتھ طے کرنے کے لئے علامہ شبلی جیسا خضر طریق ملا تھا، احسان اور تزکیہ کی وادی کے لئے بھی ایک خضر راہ اور ایک مرد حق آگاہ کی تلاش تھی، اس سلسلہ میں ان کی کہانی اور ان کے واردات قلبی، حجۃ الاسلام امام غزالی کی کہانی اور واردات قلبی سے بہت مشابہ نظر آتے ہیں کہ ان کو بھی علم و شہرت کے بام عروج پر پہونچنے کے بعد اپنی علمی زندگی اور ذہنی کدوکاوش، سراب نظر آنے لگی اور علم و یقین کے چشمۂ حیوان کی تلاش میں نکلے اور سیراب و کامیاب واپس آئے۔

یہ خضر راہ ان کو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی شکل میں مل گیا، اور چونکہ عراقی کی طرح ان کا باطن اس حرارت و حلاوت کو قبول کرنے کے لئے بالکل تیار تھا، اس لئے انھوں نے سالوں کی راہ مہینوں میں اور مہینوں کی راہ ہفتوں میں اور دنوں میں طے کی اور شیخ وقت کے اعتماد و استناد سے بہت جلد سرفراز اور ان کے خلیفہ مجاز ہوئے۔

سید صاحب کا تعلق اپنے شیخ سے اور شیخ کی شفقت ان کے حال پر برابر بڑھتی
جا رہی تھی کہ ۱۶ رجب ۱۳۶۲ھ (جولائی ۱۹۴۳ء) میں مولانا تھانویؒ نے سفر آخرت
اختیار کیا، سید صاحب کو یہ خبر سنتے ہی لکھنؤ کا سفر پیش آیا، اس وقت ان پر کچھ عجیب
ازخود رفتگی اور حزن وقلق کی کیفیت طاری تھی، حکمت الٰہی کہ انھیں دنوں مولانا محمد الیاس
صاحبؒ بھی لکھنؤ تشریف لے آئے، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب اور ایک تبلیغی
جماعت بھی اس وقت ندوہ میں ہی مقیم تھی، دونوں کا قیام ندوہ کے مہمان خانہ میں تھا،
مولانا الیاس صاحبؒ کی اس صحبت اور ان کے تبلیغی جلسوں کی شرکت نے ان کے
زخمی دل کے لئے مرہم کا کام دیا، سید صاحب مولانا کے ساتھ اسی احترام اور تواضع
سے جیسے کوئی مسترشد اپنے شیخ کے ساتھ پیش آتا ہے، مولانا بھی ان کا بڑا احترام
کرتے تھے، اور ان کے علم، ان کے مقام، ان کی طلب صادق اور اخلاص کے بڑے
معترف اور قدر داں تھے، اس زمانہ میں سید صاحب پر ذکر جہر کا بہت غلبہ تھا،
دونوں حضرات کا قیام مہمان خانہ ہی میں تھا، مولانا الیاسؒ سید صاحب کے اس ذوق
کو دیکھ کر بہت مسرور تھے، سید صاحب مولانا کے ساتھ کانپور بھی تشریف لے گئے،
اور حلیم مسلم کالج کے ایک جلسہ میں بڑی پر اثر تقریر بھی فرمائی، معارف کے شذرات
میں بڑے بلند الفاظ میں ان کا اور ان کی دعوت کا تعارف کرایا، پھر مولانا کے انتقال
کے بعد میری کتاب "مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت" پر بطور مقدمہ کے ایک
عالمانہ مضمون لکھا، جس کے لفظ لفظ سے عقیدت اور تاثر کا اظہار ہوتا ہے، بھوپال
جانے اور پاکستان منتقل ہونے کے بعد بھی ان کا تعلق تبلیغی جماعت سے قائم رہا،
وہ اس جماعت کے اخلاص وللّٰہیت اس کے بانی کی عظمت ومقبولیت، اور

اس کام کے خالص دینی مزاج اور نہج سلف پر ہونے کے، بڑے قائل تھے، بالعموم جماعت کے رفقا ان سے تبلیغی جلسوں میں شرکت اور رخصت ہونے والی جماعتوں کے لئے دعا کی درخواست کرتے اور وہ بے تکلف اس کو قبول فرماتے، اس کے لئے انھوں نے صحت کے تقاضوں سے بے پروا ہو کر بعض طویل سفر بھی کئے۔

رجحان اور ذوق کی تبدیلی اور عمر کی ترقی کے ساتھ ساتھ سید صاحب کا دارالعلوم کے بارے میں ذوق و رجحان بھی خاصہ بدل گیا تھا، اب وہ اس کو محض ایک علمی ادارہ اور پڑھنے پڑھانے اور علوم جدیدہ سے بقدر ضرورت واقفیت کا مرکز سمجھنے پر قانع نہ تھے دوسرے مختصر و بلیغ الفاظ میں وہ لسان العصر اکبر الہ آبادی کی اس تعریف کو پسند نہیں کرتے تھے، جو انھوں نے فضلائے ندوہ کا امتیاز بیان کرنے کے لئے خود سید صاحب کی نوجوانی میں کی تھی ؎

اور ندوہ ہے زبان ہوشمند

وہ ندوہ کو قلب درد مند، ذہن ارجمند اور زبان ہوشمند، تینوں کا مجموعہ دیکھنا چاہتے تھے، اور اسی ترتیب و تناسب کے ساتھ کہ پہلا مقام قلب درد مند کا ہو، دوسرا ذہن ارجمند کا اور اس کے بعد ان کی ترجمانی کے لئے زبان ہوشمند ہو، ندوہ میں دینی شخصیتوں اور دینی مرکزوں سے جو بیگانگی عرصہ سے چلی آرہی تھی، اس میں کچھ کمی تو خود سید صاحب کے اس جدید تعلق اور رجحان سے پیدا ہوئی جس کا اوپر تذکرہ ہوا، اور کچھ کمی، مولانا الیاس صاحبؒ کے اس ہفت روزہ قیام سے جو ندوہ ہی کے مہمان خانہ میں تھا، اور جس میں انھوں نے اس ماحول کو پورے طور پر اپنے سوز دروں اور اپنی روح اور اپنے جسم کی بے تابی سے بے چین اور متحرک رکھا، لیکن سید صاحب اس سے زیادہ چاہتے تھے،

ان کی خواہش تھی کہ اب ندوہ کے فرزند اور دار العلوم کے طلبار ادب اور تاریخ ہی کو اپنی کوششوں اور فتوحات کا نشانہ اور اپنے سفر کی آخری منزل نہ سمجھیں وہ دوبارہ اقبال کی زبان میں گویا تھے ؎

خودی کی یہ ہے منزل اولیں
مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

وہ چاہتے تھے کہ فرزندان ندوہ کے سامنے وہی شخصیتیں قابل تقلید اور منتہائے کمال نہ ہوں جو علم و ادب اور تاریخ کے لئے ایک رمز و علامت بن گئی ہیں، بلکہ وہ اپنی تحریک کے داعیوں اور اپنی درسگاہ کے بانیوں میں سے ان لوگوں کو بھی مثالی نمونہ کے طور پر سامنے رکھیں اور ان کی پیروی کی کوشش کریں جو اپنی دینداری اور صلاح اور اپنی دینی و دنیوی اور علمی و ادبی جامعیت میں بھی امتیاز خاص کے مالک تھے، مجھے خوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ دار العلوم کی عمارت کے عقبی حصہ سے نکلتے ہوئے فرمایا کہ مولوی علی صاحب ہر جماعت اور ہر دانش گاہ کے لئے ایک آئیڈیل ہوتا ہے، وہ اس کے تمام افراد کے دل و دماغ اور تخیل پر چھایا ہوا ہوتا ہے، اس سے ان کو اپنی زندگی کے لئے پیام اور اپنے کاموں کے لئے جوش و نشاط حاصل ہوتا ہے، میرے نزدیک دار العلوم کے لئے آئیڈیل چار شخصیتیں ہو سکتی ہیں، مولانا محمد علی مونگیریؒ مولانا شبلی نعمانی، آپ کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبد الحی اور نواب سید علی حسن خاں کہ یہ سب علم و دین کے مختلف شعبوں پر حاوی تھے، اور ان سے مل کر ایک جامعیت پیدا ہوتی ہے۔

سید صاحب کے ان نئے رجحانات نے طلباء میں وہ مقبولیت اور کامیابی حاصل نہیں کی جو ان کے مقام کے لحاظ سے متوقع تھی، بلکہ اس سے ایک ذہنی کشمکش

پیدا ہوئی، اس کا نقطۂ عروج وارتقاء طلبا کی وہ اسٹرائک تھی جو ۱۹۴۳ء میں پیش آئی آغاز اس کا اگرچہ کچھ انتظامی معاملات سے ہوا، لیکن اس کے اندر بے اطمینانی اور کشمکش کی یہی روح کام کر رہی تھی، اس اسٹرائک کی قیادت ہمارے بعض عزیز شاگرد کر رہے تھے جو دارالعلوم کے بہترین طلبار تھے، اور ان سے ہم نے اور دارالعلوم نے بڑی بڑی توقعات قائم کی تھیں، ان میں سب سے زیادہ نمایاں میرے عزیز ترین شاگرد علی احمد کیانی تھے۔ مجھے اپنے دس سال کے تدریسی دور میں اور اس کے بعد بھی جب میں نے بحیثیت نائب معتمد اور معتمد کے کام کیا اس نوجوان سے زیادہ ذہین، ذی استعداد، اور سلیم الطبع طالب علم نہیں دیکھا، دوسرے اور تیسرے ہی درجہ سے اس کا یہ حال تھا کہ صرف و نحو کی غلطی اس سے ہونی بہت مشکل تھی، میرے استاد خلیل عرب صاحب نے ایک مرتبہ ان کے امتحان کی کاپی دیکھ کر جب وہ درجۂ دوم یا سوم میں پڑھتے تھے، یہ کہا کہ یہ کاپیاں مجھے دیدو اور جتنا کہو میں ندوہ کے لئے چندہ لے آؤں، جو تھے، پانچویں درجہ میں پہونچ کر وہ برجستہ عربی میں تقریر کرنے لگے تھے، حافظہ اس بلا کا تھا کہ ہزاروں شعر اقبال واکبر اور ظفر علی خاں کے نوک زبان تھے، میرے بعض عربی مضامین کا ترجمہ بھی کیا تھا، وہ اسٹرائک کے بعد جب کراچی گئے تو اپنی نوعمری کے باوجود کراچی کی علمی مجلسوں میں علامہ کیانی کے نام سے مشہور ہوئے، جیسا کہ طلبار کے ہنگاموں میں ہوا کرتا ہے، وہ طوعاً و کرہاً طلبار کے نمایندہ اور اسٹرائک کے قائد بن گئے، ان کے سب استادوں کو اور بالخصوص مجھے ان کے اس ہنگامہ میں نہ صرف شریک ہونے بلکہ قائد بننے سے سخت قلق تھا، زیادہ تر اس وجہ سے کہ اس اسٹرائک کی زد سید صاحب کی شخصیت اور ان کی معتمدی پر پڑتی تھی، بلکہ وہ اس وقت ندوہ کے حقیقی مربی اور سرپرست اور اس کے لئے سینہ سپر تھے، سید صاحب کے دل کو بھی اس ہنگامہ سے بڑی چوٹ لگی،

ان کے دل میں ندوہ کی خدمت اور طلبار کی تربیت کی بڑی بڑی امنگیں تھیں، ان کو اس سے اپنی تمناؤں کا خون اور اپنی کوششوں کی ناکامی کا منظر نظر آیا اور بہت دل شکستہ اور افسردہ ہو گئے، انھیں دنوں میں علی احمد مرحوم پر جنون کا دورہ پڑا اور حالت یہاں تک پہونچی کہ ان کو گھر والوں نے رسیوں سے باندھ دیا ان کے بھائی میرے برادر معظم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب مرحوم کو ان کو دکھانے کے لئے گھر لے گئے، میں بھی خصوصی تعلق کی بنا پر ساتھ ہو گیا، مرحوم کو جب رسیوں سے بندھا ہوا دیکھا تو آنکھ میں آنسو آگئے کہ یہ نوجوان جو اپنی ذکاوت اور صحیح الدماغی میں اپنے ساتھیوں کے لئے بھی قابل رشک تھا، اس حالت میں ہے، بھائی صاحب نے نسخہ لکھا اور تشریف لے آئے، سید صاحب اس زمانہ میں اتنے دل برداشتہ تھے کہ دار العلوم میں قیام بھی نہیں فرمایا، ہمارے ہی گھر میں مقیم تھے، میں نے ایک مرتبہ تنہائی میں موقع پاکر عرض کیا کہ میرا خیال ہے کہ علی احمد کی زبان سے آپ کی شان میں کوئی لفظ نکل گیا، اس طوفان بے تمیزی میں کچھ بعید نہیں کہ ان پر جذباتیت غالب آئی ہو اور ناگفتنی کا ارتکاب کیا ہو، حدیث شریف میں آتا ہے "من اذیٰ لی ولیاً فقد اٰذنتہ بالحرب" اور آپ تو ان کے محسن اور مربی بھی تھے، سید صاحب نے اس کے جواب میں تواضع اور فروتنی کے الفاظ فرمائے اور کہا کہ میں کیا چیز ہوں، میں نے دوبارہ عرض کیا اور دعا کی درخواست کی، سید صاحب نے اس پر سکوت فرمایا، دوسرے یا تیسرے دن مجھ سے فرمایا کہ مولوی علی صاحب میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کر دی، اب اس واقعہ کو سید صاحب کی کرامت سمجھا جائے یا اس کو کسی اور بات پہ محمول کیا جائے کہ عزیز موصوف بالکل اچھے ہو گئے اور جہاں تک مجھے علم ہے، یہ دورہ پھر کبھی نہیں پڑا، افسوس ہے کہ یہ شعلۂ مستعجل بالکل نوعمری میں ۱۹۵۰ء میں گل ہو گیا۔

ع حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

سید صاحب بعض خاص اسباب کی بنا پر جولائی ۱۹۴۶ء میں قاضی ریاست امیر دار العلوم احمدیہ اور دینی امور تعلیم کے مشیر ہو کر ریاست بھوپال چلے گئے اور اکتوبر ۱۹۴۹ء تک وہیں رہے، انھوں نے بھوپال سے دار العلوم کے ساتھ تعلق قائم رکھا، دار العلوم کی حیثیت ایک فرزند کی سی تھی، اور وہ اس کی یاد کو کسی وقت بھی دل سے جدا نہ کر سکتے تھے، شفقت ناموں سے کارکنان ندوہ کا حوصلہ بڑھاتے اور تعلیمی رہنمائی فرماتے، یہاں پر بھوپال کا ایک مکتوب جو بعض حیثیتوں سے بڑی اہمیت رکھتا ہے، اور ان کے صحیح جذبات و خیالات کا آئینہ دار ہے، اور جس میں زندگی کی بعض تلخ حقیقتیں اور ناخوشگوار تجربے بھی اشارۃً آگئے ہیں درج کیا جاتا ہے، اس مکتوب پر ۱۸ اپریل ۱۹۴۸ء کی تاریخ درج ہے۔

"بھوپال

عزیز گرامی — وفقکم اللہ تعالےٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، آپ کی واپسی[1] کا حال جب معلوم ہوا آپ کو خط لکھنے کو دل چاہ رہا تھا، مگر یہاں کے لیل و نہار ایسے ہیں جن میں اصل سے زیادہ فروع پر وقت صرف ہوتا ہے، میں یہاں بڑے جذبات کے ساتھ آیا تھا، ہمیشہ سے حسرت تھی کہ ندوہ میں گداگری کر کر کے کہاں سے روپیہ لایا جائے کہ اصل کام کا موقع ملے کاش کوئی ریاست یا سلطنت ادھر متوجہ ہو اور سرمایہ سے بے فکر کر دے کہ اصل کام پر قوت صرف ہو مگر یہاں آکر ڈیڑھ برس میں تجربہ ہو گیا کہ کاروبار سلطنت کے زیر سایہ یہ مقصد کسی طرح پورا نہیں ہو سکتا، اس لئے میں خود چاہتا ہوں کہ جلد از جلد یہاں سے

---

[1] میری حجاز سے واپسی مراد ہے، میں جون ۱۹۴۷ء سے جنوری ۱۹۴۸ء تک حجاز ہی میں مقیم رہا۔

اپنا بستر اٹھالوں تذبذب ہے، تو اس قدر کہ ابھی اٹھالیا جائے یا موسم حج تک وسعت دی جائے۔

یہ تو اپنے یہاں کے قیام کا حال ہے، باقی اپنی قوت جسمانی اب اس قابل نہیں کہ پورے ولولہ اور جوش سے کام کیا جائے، اسی لئے میں نے ........... کو لگایا تھا کہ ان کی طاقت اور میرا دماغ کام کرے، مگر آپ کی غیر موجودگی میں اساتذہ کی باہمی کشاکش نے ان کے خلاف محاذ قائم کیا، میں نے کہا بہتر ہے اب آپ میں سے کوئی صاحب ہوں چنانچہ[1] ........ ہوئے اب معلوم ہوا کہ ان سے بھی نہیں بنتی۔ ع

چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما

دارالعلوم کی ضرورت اور اہمیت مسلم ہے، لیکن مدت سے میرے دل میں از روئے تجربہ یہ خیال بیٹھ گیا کہ مسلمانوں سے اجتماعی کام کرنے کی صلاحیت سلب کرلی گئی ہے، زمانہ کے حالات اور ملک کے انقلابات نے مذہبی تعلیم کی ضرورت کو روز بروز مسلمانوں کے لئے ضروری سے ضروری تر کر دیا ہے، مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں کی غفلت بھی ہر روز گراں سے گراں تر ہوتی چلی جاتی ہے، مجھے تو کبھی ایسا نظر آتا ہے، کہ ایسا نہ ہو کہ یہ سرزمین "اکّال الامم" بقول حالیؔ مسلمانوں کو بھی نگل لے، خیر یہ داستان تو دراز ہے۔

کبھی فرصت سے سن لینا بڑی ہے داستاں میری

ندوہ کے متعلق میرے جذبات وہی ہیں، جو آپ کے ہیں، میری تو ہمیشہ سے

---

[1] جہاں نقطے ہیں وہاں ان ندوی فاضلوں کے نام ہیں جو یکے بعد دیگرے منصب اہتمام پر فائز ہوئے۔

یہی رائے ہے کہ اب آپ اس بارگراں کو اپنے سر اٹھالیں۔

جواں ہو تم لب بام آچکا ہے آفتاب اپنا

میں ہر حال میں آپ کی مدد کروں گا، اور اگر کہیں تو کچھ قیام بھی کروں بشرطیکہ آپ کے خیالات کی تائید میں دوسرے اساتذہ بھی شریک ہوں۔

ڈاکٹر صاحب کا بھی خط آیا ہے، ان کی صحت کاملہ عاجلہ کے لئے دعا ہے، انھوں نے بھی ملایا ہے، مگر اس وقت اپریل تک حاضری مشکل ہے، کاش آیندہ امتحانات تک جس کو ایک دو ماہ ہوں گے، معاملات تھم سکتے۔

آپ نے میری نسبت حجاز کے اہل علم کے جس حسن ظن کا اظہار کیا ہے، وہ میرے لئے سرمایۂ سعادت ہے، کاشکہ میں ایسا ہی ہوتا۔

والسلام

سید سلیمان

۱۸ / اپریل ۱۹۴۸ء

سید صاحب نے یہ سمجھ کر کہ بھوپال میں رہ کر وہ دارالعلوم کی تعلیمی نگرانی پوری طرح نہیں کرسکیں گے مجھے نائب معتمد بنائے جانے کی تحریک کی جس کو مجلس دارالعلوم نے، جنوری ۱۹۴۹ء کو منظور کیا اور میں نے ان کی رہنمائی اور سرپرستی میں کام شروع کیا، اہم امور میں ان کی طرف رجوع کرتا تھا، اور وہ بھی از راہ شفقت بزرگانہ پورا اعتماد فرماتے تھے، یہاں پر ایک مکتوب درج کیا جاتا ہے، جس میں بعض اہم تاریخی اشارات آگئے ہیں، جن سے ان کی سوانح کی ترتیب میں بڑا کام لیا جاسکتا ہے، اور اس ذہنی کشمکش کا بھی کسی قدر اندازہ ہوسکتا ہے، جو سید صاحب کو اپنی علمی و دینی سرگرمیوں کے میدان کے انتخاب میں درپیش تھی،

یہ مکتوب ۱۵ر جون ۱۹۴۹ء کا ہے، اور وہ سید صاحب کے وطن دیسنہ سے لکھا گیا ہے، جہاں سید صاحب اس وقت مقیم تھے۔

"دیسنہ۔ پٹنہ ۵ر جون ۱۹۴۹ء

اخی العزیز رفع اللہ شانکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، آپ کا خط ملا تھا، خط میں دو باتیں تھیں، ایک میرے قیام کے متعلق دوسرے نصاب کے متعلق، میں منتظر رہا کہ آپ نصاب کا مسودہ مجھے بھیج رہے ہیں یا بھیجا ہے، مگر وہ اب تک مجھے نہیں ملا، اب انتظار کے بعد جواباً لکھتا ہوں میرا دور اور میرا عصر عمل گذر چکا "لکل عصر رجال" اب اس دور کے لئے آپ کا خاکہ موزوں ہوگا، مجھے چونکہ آپ پر اعتبار و اعتماد ہے اس لئے دیکھے بغیر میں اس کو پسند کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ نافع فرمائے۔

جائے قیام سے متعلق ہنوز فیصلہ نہ ہو سکا، میں نے اعظم گڑھ دماغی سکون ذہنی امن و امان اور باہمی تصادم سے بچنے کے لئے چھوڑا اور فوری طور سے حیدرآباد کی تعلیمی خدمات کے بجائے بھوپال کی مذہبی خدمت قبول کی، اگرچہ ریاست کے انقلاب کے دست و برد سے اب تک میری جگہ وہاں محفوظ ہے، گو اصل رائے تو وہاں پہنچ کر ہی معلوم ہوگی مگر چونکہ نفسیاتی طور سے اب اسلامی ریاست کا تصور نہیں رہا، اس لئے سمجھتا ہوں کہ وہاں اب دل نہیں لگے گا، اور بہتوں کا خیال ہے کہ مجھے اب وہاں سے ہٹنا پڑے گا یہی وجہ ہے کہ بعض گوشوں سے میری طلب جاری ہے ایک ہمسایہ[1] ملک کی طرف سے گفتہ آید در حدیث دیگراں، کے عنوان سے

---

[1] جمہوریہ پاکستان مراد ہے۔

بعض مذہبی امور آئین شرع کے سلسلہ میں مجھے یاد کیا جا رہا ہے، اور اس خدمت کے لئے کہ دینی و دنیاوی عام تعلیم میں کیوں کر انقلاب برپا کیا جائے اور کیا اصلاحی تجویزیں پیش کی جائیں، میرا نام لیا جا رہا ہے، لیکن ابھی تک میری طبیعت یکسو نہیں ہوئی ہے۔

وطن آیا تھا کہ گوشہ عزلت کی زندگی نبھ سکتی ہے یا نہیں مگر بعض بزرگوں کی تبرک جائدادوں اور اعزا کے عناد و خلش نے یہاں بھی مطمئن ہونے نہیں دیا۔

دارالعلوم ندوہ کی خدمت ہمیشہ سے زندگی کا مقصد رہا اور اب بھی اس کی خدمت سے انکار نہیں مگر ندوہ کیلئے جو اس وقت سب سے ضروری چیز مالی امداد ہے، یعنی چندوں کا جمع کرنا، میں اس کے لئے بیکار ہوں، پھر میری اقتصادی اور مع اہل و عیال کی قیامی شکل کا حل وہاں کوئی مجھے نظر نہیں آتا۔

غرض حالات نے قوت فیصلہ کو معطل کر رکھا ہے، اور راستہ صاف دکھائی نہیں دیتا، سردست حج کا سفر پیش نظر ہے، اس کے انجام کے بعد شاید کوئی راہ انشراح قلب کے ساتھ نظر آئے۔

آج ۱۵ رجون ہے، ۱۷ ر کو یہاں سے روانہ ہونا ہے، لکھنؤ اور اناؤ[1] کی راہ سے بھوپال قبل رمضان تک پہونچنے کا خیال ہے، امید ہے کہ بعض الجھنیں وہاں پہونچ کر دور ہوں گی، اگر آپ بھوپال کے پتہ سے مجھے اپنے مشوروں سے مستفید کر سکتے ہوں تو شکریہ۔

والسلام

سید سلیمان

---

[1] اناؤ میں اس وقت سید صاحب کے داماد سید حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر فائز تھے۔

جیسا کہ اس خط میں اشارہ کیا گیا ہے، سید صاحب بھوپال کچھ دن قیام کر کے حج کے لئے روانہ ہو گئے، ان کا یہ دوسرا یا تیسرا حج تھا جو ۱۳۶۹ھ ۱۹۴۹ء میں ہوا، حجاز کی تبلیغی جماعت نے سید صاحب کے قیام سے فائدہ اٹھایا اور ان کی ترجمانی اور تائید سے حجاز و سعودی عرب کے علمی و دینی حلقوں نیز باہر سے آئے ہوئے اہل علم حجاج میں اس دعوت کی وقعت اور وزن پیدا ہوا، سید صاحب نے حسب معمول اس خدمت سے دریغ نہیں فرمایا اور مجالس تبلیغ میں شرکت کر کے وہاں کے رفقائے جماعت اور کارکنوں کی ہمت افزائی فرمائی، واپسی پر میں نے شاید کوئی عریضہ لکھا جس میں ان کی اس سرپرستی اور ہمت افزائی کا مناسب الفاظ میں تذکرہ تھا، سید صاحب نے اس کے جواب میں جو مکتوب تحریر فرمایا وہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

بھوپال ۲۴ر جنوری ۱۹۵۰ء

عزیز محترم — وفقکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ عیادت نامہ ملا، شکر گزار ہوں، الحمد للہ بخیر و عافیت ہوں، ضعف بھی دور ہو رہا ہے۔

میری شرکت کو جو جماعت تبلیغ کے کاموں میں حجاز میں ہوئی ہے آپ صاحبوں نے بڑی اہمیت دی، مولانا یوسف صاحب اور مولانا زکریا صاحب تک نے اس کے لئے شکریے ادا کئے، اور دعائیں دیں، دعائیں تو ٹھیک ہیں کہ میں ان کا محتاج مگر شکریہ کس بات کا؟ کوئی نماز پڑھے تو اس کا شکریہ ادا کیا جائے گا؟ میں نے اس لئے لکھا کہ بعض صاحبوں نے ایسا کیا ہے۔

بے شبہ جو چیز آپ کے لئے آثار سعادت میں سے ہے وہ یہ ہے کہ

بحمد اللہ تعالیٰ کہ دو سال گزرنے کے بعد آپ کے نام اور کام کو میں نے زندہ پایا، بلکہ آپ کی نسبت سے مجھے بزرگی ملتی رہی۔

آپ کی ملاقات اور ندوہ کے حالات سننے کا مشتاق ہوں اب تو آپ بھوپال کے لئے پابرکاب ہوں گے۔

والسلام

سید سلیمان"

سید صاحب کو اس سفرِ حج ہی میں پاکستان آنے کی دعوت پاکستان کی بعض نہایت ذمہ دار شخصیتوں کی طرف سے بعض موقر شخصیتوں کے ذریعہ پہونچی اور ان کو وہاں خدمت اسلام کے نہایت وسیع امکانات اور اس نوخیز اسلامی مملکت کی اس رہنمائی کی توقعات دلائی گئیں جو سید صاحب سے بہتر کوئی اور عالم دین انجام نہیں دے سکتا تھا، پاکستان میں اسلامی آئین کی ترتیب کا مسئلہ بھی درپیش تھا، اور وہاں کی تعلیم کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا معاملہ بھی زیرِ غور تھا، اور ان دونوں بنیادی مسائل سے سید صاحب کو ذاتی لگاؤ اور طبعی ذوق تھا، لیکن وہ عرصہ تک اپنی طبیعت کی کمزوری اور مسئلہ کی نزاکت کی بنا پر پاکستان جانے کا فیصلہ نہ کر سکے، بالآخر اس بات کے لئے ایک مناسب تقریب پیدا ہو گئی کہ وہ وہاں کے حالات کو بچشمِ خود دیکھ لیں وہاں کے ذمہ داروں سے ملاقات اور ان کے خیالات سے واقف ہونے کا موقع ملے اور پھر وہ اطمینان سے کوئی رائے قائم کریں، جون ۱۹۵۰ء میں دہلی سے معزز ہندوستانی مسلمانوں کا ایک خیرسگالی کا وفد روانہ ہونے والا تھا جس میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لودھیانوی پیش پیش تھے، سید صاحب سے بھی اس وفد میں شرکت کی درخواست کی گئی اور انھوں نے غالباً انھیں مصالح کی بنا پر منظور کیا، وہ ۱۴ جون ۱۹۵۰ء کو

صبح کراچی پہونچے، سید صاحب کی واپسی طے شدہ تھی، اور اس بارے میں ان کے ذہن میں کوئی تردد نہ تھا، لیکن وہاں کے قریبی اعزا جن میں ان کی صاحبزادی، داماد اور اہل خاندان بھی شامل تھے، ان کی اس غیر متوقع آمد سے فائدہ اٹھایا اور ایسے حالات پیدا کر دئیے کہ سید صاحب کے لئے واپسی ناممکن ہو گئی، سید صاحب کو اپنے عزیزوں اور دوست واحباب کے اصرار کو رد کر دینے اور اپنے فیصلہ پر سختی سے قائم رہنے کی پہلے سے عادت نہ تھی، اور اب تو طبیعت اور زیادہ کمزور ہو گئی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے رخت سفر کھول دیا اور پاکستان کے قیام کا فیصلہ کر لیا اس سے ان کے ان تمام نیازمندوں، قدردانوں اور احباب کو ذہنی صدمہ پیش آیا جو ہندوستان میں ان کے قیام کی ضرورت سمجھتے تھے، اور ہندوستان کو اس علم وفضل کے خزانہ سے محروم ہونے کو ایک ملی حادثہ تصور کرتے تھے لیکن جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو گیا اور اب کف افسوس ملنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، اب تو سب کی یہ دعائیں تھیں کہ یہ نوخیز اسلامی مملکت جس سے دنیا کے بہت سے مسلمانوں کی بڑی بڑی امیدیں قائم تھیں، جو خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اسلامی تعلیمات اور آئین اسلامی کی زندگی اور معاشرہ کی رہنمائی کر سکنے کی صلاحیت ایک نازک امتحان اور سوالیہ نشان بن گیا تھا، سید صاحب کی ذات سے ان کے کمالات سے اور ان کے وسیع تجربات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے، لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہو سکا، وہ توقعات پوری نہیں ہوئیں اور ان کی ذات سے شایان شان فائدہ نہیں اٹھایا گیا، ان کو وہاں کے قیام میں بہت سے ناخوشگوار حالات اور بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، جن کی یاد ان کے تمام نیازمندوں کے لئے قلق کا موجب بن گئی، یہاں ان اسباب اور تفصیلات سے بحث نہیں، اس میں کیا کیا مجبوریاں اور کون کون سے اتفاقات پیش آئے، اس کی ذمہ داری کس طبقہ پر ہے،

اس میں کہاں تک سید صاحب کے طبعی ضعف اور اضمحلال کو دخل ہے، اس کا فیصلہ کرنا مشکل اور ان سطور کے لکھنے والے کے موضوع سے خارج ہے۔

مارچ ۱۹۵۳ء میں سید صاحب ایک بار (اور آخری بار) ہندوستان تشریف لائے سید صاحب ڈھاکہ کی ہسٹری کانگریس کی صدارت کے لئے تشریف لے گئے تھے، جو اسی مہینہ کی کسی تاریخ کو ہوئی تھی۔ وہاں انھوں نے اپنا وہ فلاضلانہ اور فکر انگیز خطبۂ صدارت پڑھا جس میں بنگالی مسلمانوں کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ بنگالی اسی طرح فارسی رسم الخط میں لکھیں جیسے وہ انگریزوں کے دور سے پہلے لکھی جاتی تھی، سید صاحب نے ثابت کیا کہ یہ تبدیلی ایک گہری سازش کے ماتحت ہوئی اور اس تبدیلی نے بنگالیوں کو اسلامی ثقافت اور اسلامی تہذیب سے بہت دور کر دیا اب بیگانگی کی اس خلیج کو دور کرنے کے لئے جو بنگالی مسلمانوں اور ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں میں پڑ گئی ہے، یہی صورت ہے کہ بنگالی فارسی رسم الخط اختیار کریں ظاہر ہے کہ یہ مشورہ بڑا مخلصانہ اور انقلاب انگیز تھا، اور اس میں وہ فراست اور دوربینی جھلک رہی تھی جس کو اقبال نے اس شعر میں ادا کیا ہے۔

ولے با من بگو آں دیدہ ور کیست
کہ خارے دید و احوال چمن گفت

اور جس کی تصدیق ان افسوسناک واقعات نے کی جو ۱۹۷۱ء کے اواخر ۷۲ء کے اوائل میں پیش آئے اور جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی کثیر آبادی کا یہ ملک پاکستان سے علیحدہ ہو گیا۔

بنگالیوں نے بالخصوص یونیورسٹی اور کالج کے طلبا نے اس مخلصانہ مشورہ کا جس طرح استقبال کیا وہ تاریخ میں ایک افسوسناک واقعہ کی طرح ہمیشہ یادگار رہے گا۔

وہ اس طوفان کی خبر دیتا تھا، جو خون برساتا ہوا اور پورے ملک کو زیر و زبر کرتا ہوا سروں پر سے گزر گیا، طلبار اور نوجوانوں نے اس فاضل یگانہ اور اس پیر کہن سال پر جو ملت اور اسلامی علم و ثقافت کی آبرو تھا، بے تحاشہ سنگ باری شروع کر دی، ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب اور ان کے چند رفقار نے سید صاحب کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور کسی نہ کسی طرح انھیں موٹر پر سوار کرایا اور کھڑکیاں بند کر دیں، اس طرح ان کا جسم محفوظ رہا لیکن ان کا دل چکنا چور ہو گیا، اس کے بعد ہی وہ ہندوستان آئے، ہم لوگوں نے دیکھا تو وہ بالکل بجھ کر رہ گئے تھے ان میں کوئی امنگ شوق اور امید پائی نہیں جاتی تھی، اور کسی مسئلہ سے دلچسپی باقی نہیں رہی تھی، میری فرمائش پر جو وہ بہت کم ٹالتے تھے، انھوں نے دار العلوم کے طلبار کے سامنے مسجد ہی میں بعد نماز مغرب کچھ دیر تقریر کی جس میں ان کو فقہ کی طرف توجہ کرنے کا مشورہ دیا، لیکن تقریر میں کسی قسم کا جوش اور نشاط نہیں تھا، ایک شب انھوں نے لکھنؤ کے تبلیغی مرکز واقع کچہری روڈ میں گزاری لیکن ان پر سکوت طاری تھا، صبح مولانا عبد الماجد دریابادی جن سے وہ بہت بے تکلف تھے، اور جب وہ سامنے آجاتے تھے، ان کی طبیعت کھل جاتی تھی، اور ادبی نوک جھونک، ضلع جگت اور تفریحی فقرے شروع ہو جاتے تھے، ملنے تشریف لے آئے، اور انھوں نے بہت چاہا کہ سید صاحب کھلیں لیکن طبیعت میں بالکل شگفتگی نہ تھی، مولانا محمد اویس صاحب نگرامی ندوی اور مولانا ابو العرفان صاحب ندوی جو سید صاحب کے ساتھ اناؤ تک گئے تھے، کا بیان ہے کہ سید صاحب پورے راستہ خاموش رہے صرف گنگا کا جب پل آیا تو فرمایا کہ کیا یہ گنگا ہے۔

پاکستان پہونچ کر سید صاحب زیادہ دن اس دنیا میں نہیں رہے، ان کو قلب کی شکایت پرانی تھی، مئی ۱۹۴۵ء میں ان پر استسقائے قلبی کا حملہ ہوا تھا، حوادث اور زندگی کے

ان تجربوں نے اور زیادہ دل شکستہ اور نیم مردہ کر دیا تھا، بالآخر ۱۴ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ (۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء) کو آخری ساعت آپہونچی اور ہم نے ہندوستان میں دفعۃً سنا کہ انھوں نے اس دنیا سے رحلت فرمائی اور رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا وہ ذاتی تعلقات، مشاہدات، تجربات اور خطوط کی روشنی میں تھا، اب سید صاحب کے ذات و کمالات کے بعض اہم پہلوؤں پر بہت اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی جاتی ہے، جو راقم سطور کی نگاہ میں ان کی سیرت اور گوناگوں کمالات کے چوکھٹے میں مرکزی مقام اور نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، اور جن سے ان سطور کا لکھنے والا خاص طور سے متاثر ہوا۔

سید صاحب کی زندگی کا سب سے نمایاں اور ممتاز پہلو طبقۂ علماء میں ان کی جامعیت اور ان کے علوم و مضامین کا تنوع ہے، ان کی ذات اور ان کی علمی زندگی میں قدیم و جدید واقفیت، علمی تبحر اور ادبی ذوق، نقاد و مورخ کی حقیقت پسندی اور سنجیدگی، ادباء و انشاپردازوں کی شگفتگی اور حلاوت اور فکر و نظر کا لوچ اور مطالعہ کی وسعت اس طرح جمع ہو گئی تھی، جو شاذونادر جمع ہوتی ہے، سید صاحب جس زمانہ کے طالب علم ہیں، اس زمانہ میں جدید و قدیم کے درمیان شدید رقابت تھی، ایک شخص بیک وقت دونوں قلمروؤں سے راہ و رسم نہیں رکھ سکتا تھا، قدیم و جدید نمایندوں کا بھی ایک جگہ مجتمع ہونا مشکل تھا (اور شاید ندوۃ العلماء کے جلسوں میں وہ پہلی مرتبہ جمع ہوئے تھے) دینی علوم اور ملک کی زبان و ادب کے درمیان بھی سرحدیں قائم ہو گئی تھیں، اور ان کو پار کرنا بڑی جرأت کا کام تھا، وہ دور جس نے نذیر احمد، حالی و شبلی جیسے عالم اور صاحب طرز انشاپرداز پیدا کیے تھے ختم ہو رہا تھا، اب یک فنی علماء کا دور تھا، جو ادب و شاعری کو ثقاہت کے خلاف

سمجھتے تھے، ایسے بھی بہت سے لوگ تھے، جو جیتی جاگتی زبان اور سلیس و شیریں اردو میں تصنیف کرنا اپنی عالمانہ شان کے خلاف سمجھتے تھے، جغرافیہ و تاریخ سے ناواقفیت علمار کا شعار سمجھا جانے لگا تھا، علوم قدیمہ میں بھی بالعموم مغایرت تھی، جو فقیہ و محدث ہوتے تھے، وہ ادیب نہیں ہوتے تھے، جو ادیب تھے، ان کو علوم دینیہ سے سروکار نہ تھا مدرس تصنیف و تحریر کے لائق اور مصنف و مقرر تدریس کا اہل نہیں سمجھا جاتا تھا، ندوۃ العلمار کی بنیاد "جامعیت" کے تخیل پر تھی، زندگی پر اثر انداز ہونے اور قوم کی دینی رہنمائی کے لئے بھی ضروری تھا کہ ملک کے علمی و ادبی رجحانات سے واقفیت اور علمی زندگی میں شرکت ہو، خود ندوۃ العلمار کے منتظمین میں شعر العجم و موازنۂ انیس و دبیر کے مصنف اور اردو کے صاحب طرز انشا پرداز (مولانا شبلی) تذکرۂ گل رعنا کے مصنف (مولانا حکیم سید عبد الحی) اور غالب کی سلاست و برجستگی کی یادگار (مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی) جیسے علمار و ادبار تھے، اس درسگاہ کے سب سے نمایاں اور کامیاب طالب علم مولانا سید سلیمان ندوی تھے، جنھوں نے نصف صدی سے زیادہ علمار کی اس قدیم جامعیت کو زندہ اور نمایاں رکھا اور دینی و علمی و ادبی حلقوں میں بیک وقت نہ صرف باریاب بلکہ اکثر صدر نشین رہے، ان کی زندگی اور وہ مختلف ذمہ داریاں جو انھوں نے مختلف وقتوں میں سنبھالیں خود ان کی جامعیت کا ثبوت ہیں، وہ ایک زمانہ میں دار العلوم ندوۃ العلمار کے استاد ادب اور "الندوہ" کے نائب ایڈیٹر نظر آتے ہیں، پھر "الہلال" جیسے عہد آفریں صحیفہ کے ادارت اور "مشہد اکبر" جیسے زندہ جاوید مقالہ کے مضمون نگار ہیں، جس نے سارے ملک میں جوش و حمیت کی ایک لہر پیدا کر دی تھی، اسی عرصہ میں جب مجلس خلافت مولانا محمد علی کی سرکردگی میں

اپنا وفد انگلستان بھیجنا طے کرتی ہے تو اس کی رکنیت اور مسلمانان ہند کی دینی نمایندگی کے لئے اس کی نظر انتخاب اسی نوجوان عالم پر پڑتی ہے، دفعتًہ وہ اپنے مربی واستاد (مولانا شبلی) کا معاون ورفیق نظر آتا ہے، اور ان کے انتقال کے بعد مجلس دار المصنفین کا ناظم وروح رواں اور معارف جیسے بلند پایہ رسالہ کا مدیر اور دار العلوم ندوۃ العلماء کا معتمد تعلیم دکھائی دیتا ہے، مجلس خلافت سلطان ابن سعود کی دعوت پر موتمر اسلامی میں شرکت اور مسلمانان ہند کے خیالات کی ترجمانی کے لئے ایک وفد مرتب کرتی ہے، تو اس کی قیادت کے لئے اس سے زیادہ موزوں شخص نظر نہیں آتا جو عالم اسلام کے اس نمایندہ ومنتخب مجمع میں عربی میں اظہار خیال کی قدرت رکھتا ہو اور مسلمانان ہند کی دینی علمی عظمت کا نقش قائم کرسکے، نادر خاں شاہ افغانستان اپنے ملک کی تعلیم کا ایسا خاکہ اور نظام مرتب کرانا چاہتے ہیں، جو بیک وقت قومی ودینی تقاضوں کو پورا کرسکے، اور دین کے اصول اور عصر حاضر کی ضروریات پر حاوی ہو، اس نازک اور دشوار کام کے لئے ان کی نظر ہندوستان کی تین ہی ہستیوں پر پڑتی ہے، ایک ڈاکٹر سر محمد اقبال دوسرے سر راس مسعود تیسرے مولانا سید سلیمان، پھر اس پورے عرصہ میں ہم ان کو کانگرس کے مخصوص جلسوں میں شرکت کرتے اور خلافت وجمیعۃ العلماء کے سالانہ جلسوں کی صدارت کرتے دیکھتے ہیں، ہر جگہ ان کی رائے کا وزن، ان کی شخصیت کا وقار اور ان کی واقفیت کا اعتراف پاتے ہیں، اسی کے ساتھ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جامعہ ملیہ، انجمن ترقی اردو، اور ہندوستانی اکاڈمی ان کے گراں قدر علمی خطبات ومقالات سے مالا مال ہے، پھر ان تمام مصروفیتوں اور سفروں میں ان کے علمی انہماک، اور تصنیفی تسلسل میں فرق نہیں آتا اور اسی عرصہ میں ان کی وہ محققانہ کتابیں شائع ہوتی ہیں، جن کو پڑھ کر بالکل اندازہ نہیں ہوتا کہ ان کا مصنف

ملک کی سیاسی زندگی میں شریک اور ملک کے انقلابی تقاضوں اور امنگوں کو سمجھنے والا اور ان کا ساتھ دینے والا ہے، پھر ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے علمی وادبی فتوحات پر قانع اور خالص تصنیفی زندگی اور علمی تحقیقات پر راضی نہیں بلکہ زبان ہوشمند، ذہن ارجمند اور فکر بلند کے ساتھ دل دردمند کی دولت سے فیض یاب ہے، اور اپنے زمانے کے ایک مسلم الثبوت شیخ (مولانا اشرف علی تھانویؒ) کی نسبت وصحبت سے اس شعبہ کی بھی تکمیل چاہتا ہے، اور بالآخر قلیل عرصہ میں ان کے اعتماد اور استناد سے مشرف ہوتا ہے، پھر ہم زندگی کے آخر دور میں اس ادیب اور مورخ کو بھوپال کی مسند قضا پر شرعی مقدمات کا فیصلہ کرتے اور فقہی رائے دیتے پھر دنیا کے ایک بڑے اسلامی جمہوریہ کے دستور مملکت کی ترتیب میں دینی رہنمائی کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، یہ گوناگوں مشاغل وخدمات سید صاحب کی ہمہ گیر طبیعت اور ان کے علم وثقافت (کلچر) کے تنوع اور وسعت کا بہترین ثبوت ہیں۔

ان کی تصنیفات پر اجمالی نظر ڈالنے سے بھی یہ حقیقت کھلتی ہے کہ ان کا ذوق و مطالعہ اور ان کی علمی مناسبت کس قدر متنوع واقع ہوئی تھی، ان کی تصنیفات میں ایک طرف سیرت النبی کے چار ضخیم دفتر نظر آتے ہیں (جن کی مثال کسی اسلامی زبان میں نہیں ہے) اور خطبات مدراس جیسا سیرت نبوی کا عطر (جس سے بہتر طریقہ پر ابھی تک سیرت کو نہیں پیش کیا گیا) دوسری طرف عرب وہند کے تعلقات اور عربوں کی جہاز رانی پر ان کے محققانہ مقالات اور عمر خیام پر ان کی ناقدانہ تصنیف ہے، جو ایک بڑے مصنف ومحقق کا پورا سرمایہ زندگی بن سکتا ہے۔

قرآن مجید میں جن ممالک اور شہروں کا ذکر آیا ہے، ان کے جغرافیہ اور تاریخی معلومات پر ان کی ابتدائی تصنیف "ارض القرآن" ہے ابھی تک اردو میں آخری چیز اور اس موضوع پر

سب سے بڑا ماخذ ہے، پھر ان کی جامعیت کا یہ پہلو تقریباً ان کی ہر تصنیف پر نمایاں ہے کہ وہ علم و ادب کا رشتہ کہیں ٹوٹنے نہیں دیتے کیسا خشک سے خشک مضمون اور خالص علمی موضوع ہو ان کا بہار آفریں قلم اور ان کا فطری ادبی ذوق (جو مولانا شبلی سے ان کو ورثے میں ملا تھا) مضمون کو شگفتہ اور تازہ بنا دے گا اور اس کا ادبی عنصر پڑھنے والے پر کتاب کو بار نہیں ہونے دے گا۔

سیرت النبیؐ میں معجزات کی بحث پڑھئے یا ارض القرآن میں جغرافیائی و تاریخی تحقیقات ہر جگہ آپ کا ادبی حاسہ اپنی غذا پائے گا، اور آپ سے پڑھنے کی سفارش کرے گا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سید صاحب کی تحریر میں مولانا شبلی کی برجستگی و بے ساختگی اور فارسی ترکیب کی چستی نہیں مگر شیرینی و سلاست اور ادبی محاسن پورے پورے موجود ہیں، اور ان کی علمی تصنیفات تک کے بعض ٹکڑے ادبی شہ پارے معلوم ہوتے ہیں، خطبات مدراس کے بعض پیراگراف، سیرت النبی کے بعض صفحات اور معارف کے بہت سے شذرات وہ تحریریں ہیں، جن پر ہمارے ادب عالی کو ملکیت کا دعویٰ ہے، نقوش سلیمانی کے بعض نقش ادبی حیثیت سے تعویذ بنا کر رکھے جانے کے قابل ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ میں نے ہندوستان و بیرون ہند کی سیاحت اور ممالک اسلامیہ سے قریبی واقفیت کے سلسلہ میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی جیسا جامع اوصاف اور مولانا سید سلیمان ندوی جیسا جامع فنون اور متنوع الذوق نہیں دیکھا۔

اردو کے علاوہ عربی ادب و انشا میں ان کا ایک خاص طرز تھا جس میں کلاسیکل ادب کی پختگی و صحت اور جدید طرز کی سہولت و سلاست دونوں شامل تھیں مولانا حمید الدین فراہی کی کتاب "امعان" کا مقدمہ اور عربی رسالہ "الضیاء" کا افتتاحی مقالہ بتلا رہے ہیں کہ

اگر وہ عربی تحریر و انشار کا مشغلہ جاری رکھتے تو اس میں بڑا امتیاز پیدا کر سکتے تھے۔

یہاں برسبیل تذکرہ اتنا اور عرض کروں کہ عام طور پر لوگ سید صاحب کو مورخ یا ادیب کی حیثیت سے جانتے ہیں خصوصًا علمار کے قدیم حلقہ میں ان کا تعارف اسی سلسلہ سے ہے، لیکن مجھے سید صاحب کی علمی صحبتوں اور ذاتی استفادہ سے معلوم ہوا کہ ان کا امتیازی مضمون قرآن مجید اور علم کلام ہے، میں نے معاصر علمار میں کسی شخص کا مطالعہ قرآن مجید اور علوم قرآن کا اتنا وسیع اور گہرا نہیں پایا، علم کلام اور عقائد پر سید صاحب کی نظر بہت عمیق و وسیع تھی، اور ان کو علم کلام کو سلف کے اصول اور کتاب و سنت کی روشنی میں عصر حاضر کے ذہن اور روح کے مطابق پیش کرنے کا خاص ملکہ حاصل تھا، اور یہ غالبًا مولانا حمید الدین فراہی کی طویل صحبت، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی کتابوں کے مطالعہ اور سیرت النبیؐ کی تالیف کے سلسلہ میں طویل غور و فکر کا نتیجہ تھا۔

یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ سید صاحب اپنے علم و تحقیق اور وسعت مطالعہ میں اپنے استاد و مربی مولانا شبلی مرحوم سے بہت آگے بڑھ گئے تھے نئی نئی کتابوں کی اشاعت، مسلسل غور و فکر اور محنت و مطالعہ کی بنا پر اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں۔

کسی فن میں کامل اور نامور ہونا اور بات ہے، اور اس کا تصنیفی ذوق اور اس میں شغف و انہماک، اور بات ہے، اپنی اس مختصر علمی زندگی میں اکثر یہ دیکھا کہ اکثر لوگ خاص ماحول اور خاص اوقات میں، صاحب علم اور صاحب ذوق نظر آتے ہیں، باقی اوقات میں ان میں کوئی علمی دلچسپی شوق و مطالعہ، جستجو اور کتابی ذوق نظر نہیں آتا، درحقیقت ان میں طالب علمانہ روح نہیں ہوتی۔ اس بارے میں میں نے دو شخصیتوں کو مستثنیٰ پایا ایک مولانا

انورشاہ کشمیریؒ، دوسرے مولانا سید سلیمان ندوی، اول الذکر کو کم دیکھا اور ان کی مجلسوں میں شرکت کا اتفاق ایک ہی دو بار ہوا مگر ان کی مجلسوں کو علمی تذکروں اور تحقیقات و افادات سے معمور پایا، لیکن سید صاحب کو خوب دیکھا، سفر و حضر میں رفاقت رہی اور کئی کئی دن مسلسل ساتھ رہنا ہوا، ان کا علمی ذوق ہر جگہ اور تقریباً ہر وقت قائم رہتا، مطالعہ، غور و فکر علماء و اہل فن سے تبادلۂ خیال اور بحث و نظر کا سلسلہ جاری رہتا وہ فطرتاً طالب علم تھے، اور ان کا اصلی ذوق اور افتادِ طبع یہی تھی، مطالعہ ان کی غذا اور ان کا لازمۂ زندگی تھا، بیماری میں بھی ان کا ذہن کام کرتا رہتا تھا، اور نقاہت و ضعف کی حالت میں بھی ان کا مطالعہ جاری رہتا، دیکھنے میں یہ معمولی بات ہے، لیکن قدیم و جدید حلقوں میں اب جو علمی بے تعلقی و بے ذوقی بڑھتی جا رہی ہے، اس کے پیش نظر کسی زمانہ میں یہ ایک یادگار بات ہوگی۔

سید صاحب میں علمی کام کرنے کا بڑا ولولہ اور اس کی قوت (ENERGY) تھی، وہ ہر تصنیف کو اس طرح مکمل کرنا چاہتے تھے، اور اسی طرح اس کی طرف متوجہ ہوتے تھے، گویا یہ زندگی کی اصلی اور آخری تصنیف ہے، وہ اس کے سلسلہ میں اپنے امکان بھر کوئی کمی نہیں کرتے تھے، اس کے لئے ہزاروں صفحات کا مطالعہ کرتے معلومات و اقتباسات جمع کرتے پھر مرتب کرتے، اس سے فارغ ہوتے ہی بجائے آرام کرنے کے کوئی دوسرا سلسلہ شروع کر دیتے، اور اسی انہماک و نشاط کے ساتھ اس میں مصروف ہو جاتے، اس چیز نے ان کی صحت پر برا اثر ڈالا تھا، ان پر عرصہ سے سن رسیدگی اور ضعف کے آثار شروع ہو چکے تھے، انھوں نے کئی بار مجھ سے فرمایا کہ تمہارے والد (مولانا حکیم سید عبدالحی ناظم ندوۃ العلماء) نے مجھ سے فرمایا تھا کہ۔ ع

من نکرد م شما حذر بکنید

مجھے تصنیف و مطالعہ نے قبل از وقت بوڑھا اور ضعیف کر دیا تم احتیاط کرنا،
فرماتے تھے کہ مجھ سے تو اس وصیت پر عمل نہ ہو سکا، اب یہ امانت تمہارے سپرد کرتا ہوں،
واقعہ یہ ہے کہ جو علمی مزاج اور طبیعت وہ لے کر آئے تھے، اس کے بعد ان کے لئے ممکن نہ تھا
کہ وہ اپنا علمی انہماک کم کر سکیں، وہ اپنے علمی و تصنیفی کاموں میں برابر مشغول رہے، اور
اتنا بڑا تصنیفی ذخیرہ چھوڑا جو ایک پوری جماعت کو مصنف بنانے کے لئے کافی ہے،
یورپ و ایشیا میں کئی کئی آدمی مل کر زندگی کی تمام راحتوں اور سہولتوں کے ساتھ
بعض اوقات اتنا علمی و تصنیفی کام نہیں کرتے جو سید صاحب نے تنہا انجام دیا، تنہا
سیرت النبی (جو صرف سیرت کی کتاب نہیں بلکہ اسلامی عقائد و اخلاق کا انسائیکلوپیڈیا
ہے) ان کی کارکردگی کی صلاحیت اور قوت عمل کا نمونہ ہے، حیات شبلی دیکھنے میں ایک
نامور عالم کی شخصی سوانح ہے، مگر حقیقتاً مسلمانوں کی ایک صدی کی دینی، علمی، تہذیبی اور
فکری ارتقاء کی تاریخ ہے، جس کے بغیر مسلمانوں کے قومی مزاج اور موجودہ دور کو سمجھنا مشکل
ہے، اس میں تقریباً تمام معاصر تحریکات اور اداروں کی سرگزشت بھی آگئی ہے، تنہا
اس کتاب میں سید صاحب نے ہزاروں صفحات کا نچوڑ اور بیسوں کتاب کا مواد جمع
کر دیا ہے۔

اس موقع پر اس کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ سید صاحب فطرتاً مطالعہ و تصنیف
اور ذہنی و تعمیری کاموں کے لئے پیدا کئے گئے تھے، اور اسی قسم کا مزاج اور طبیعت لے کر
آئے تھے، وہ میدانی اور ہنگامہ خیز زندگی اور سیاسی تحریکات کے لئے موزوں نہ تھے،
انھوں نے اپنی ذات اور ملت پر احسان کیا کہ اپنی اصلی طاقت اور زیادہ تر وقت تصنیفی و
تعمیری کاموں میں صرف کیا، جب انھوں نے حالات کے دباؤ یا طبیعت کی ہمہ گیری کی

وجہ سے اس دائرہ سے قدم نکالا، ان کو یہ محسوس ہوا کہ ان کا یہ میدان نہیں تھا، اسی طرح یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ فطرتاً عوامی مقرر اور اسٹیج کے خطیب نہیں تھے، ان کا اصل جوہر غور و فکر، تلاش تحقیق اور تصنیف و تالیف تھا، اور اس میں وہ پورے طور پر کامیاب تھے۔

سید صاحب نے جن اساتذہ اور علمی سرپرستوں کی رہنمائی اور جس ماحول میں ذہنی و علمی تربیت حاصل کی تھی، اس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ ان کی نظر میں وسعت اور ان کی طبیعت میں اعتدال تھا، نہ ان میں بہت سے قدیم علماء کا سا جمود اور گروہی عصبیت تھی، نہ جدید طبقہ کی عجلت و سطحیت اور یورپ کی مرعوبیت تھی، وہ اپنے تعلیمی خیالات سے لے کر فقہی مسلک تک وسیع النظر، وسیع القلب اور معتدل تھے، اگر یہ صفت ان میں نہ ہوتی تو ان کو مولانا محمد علی کی رفاقت، موتمر اسلامی کی شرکت، سفر افغانستان، علی گڑھ اور جامعہ ملیہ کے تعلقات ہر جگہ دشواری محسوس ہوتی، یہی نظر کی وسعت اور قلب کی فراخی تھی کہ انھوں نے ہندوستان کی ایک نامور علمی جماعت اور مشہور ادارہ کے سب سے بڑے آدمی ہوتے ہوئے اور اپنے مخصوص تعلیمی و اصلاحی خیالات رکھنے کے باوجود مولانا اشرف علی تھانویؒ سے رجوع و استفادہ کیا، اور اس میں ان کو کوئی رکاوٹ محسوس نہیں ہوئی وسعت نظر کی ایسی مثالیں طبقۂ علماء میں کم ملیں گی۔

آخری چیز جو ان کی پوری زندگی میں نمایاں رہی وہ ان کی طبیعت کی شرافت و مروت تھی، وہ بالکل بے آزار اور غیر منتقمانہ طبیعت کے آدمی تھے، ان کے لئے ظالم کے بجائے مظلوم بننا بہت آسان تھا، ان کی یہ صفت اس درجہ تک پہونچی ہوئی تھی جو کمزوری سے تعبیر کی جاتی تھی، ایک ایسی سوسائٹی میں جو اس طرح کی صفات کی قدر کرنے کی عادی نہیں ان کو اپنی اس افتاد طبع کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی اور اپنی رضامندی کے خلاف بہت سے

فیصلے کرنے پڑے، اس طویل زندگی اور وسیع تعلقات میں شاید کوئی ایسا شخص مل سکے جو بیان کرے کہ سید صاحب نے اس کو کبھی نقصان پہونچایا، یا اپنی ذات کا انتقام لیا، میرے سامنے ایک مرتبہ امین آباد میں ایک نوجوان نے سید صاحب سے بطور یادگار ایک منتخب شعر لکھنے کی فرمائش کی سید صاحب نے خواجہ حافظ کا مشہور شعر لکھا۔

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است

با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

میرے خیال میں ان کا یہ انتخاب محض اتفاقی اور سرسری نہ تھا، یہ ان کا اصول زندگی تھا، جس پر وہ ہمیشہ کاربند رہے۔

یہ چند نقوش و تاثرات ہیں جو اس وقت حوالۂ قلم ہوئے، سوانح و سیرت لکھنے کے لئے اور ان کی زندگی کی مختلف حیثیتوں کو نمایاں کرنے کے لئے مستقل ادارے اور بڑے بڑے صاحب قلم موجود ہیں اور خاص طور پر ان کے جانشین اور بزم شبلی کے موجودہ صدر نشین برادر محترم مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ناظم دار المصنفین مستقل سوانح حیات لکھ رہے ہیں جس میں ان کی زندگی اور کمالات کا پورا مرقع آجائے گا[1]، یہاں تو کچھ ذاتی مشاہدات اور تاثرات اور اپنے تعلق سے کچھ واقعات اور تجربات پیش کرتے ہیں، اس سے دوسروں کی ضیافت طبع کا سامان اور ان کی معلومات میں اضافہ ہو یا نہ ہو اپنے قلب حزیں کی تسکین اور اپنے منت شناس دل کے اطمینان کا ضرور ذریعہ ہے۔ ع

ہم نے اپنے آشیانے کے لئے

جو چبھے دل میں وہی تنکے لئے

---

[1] مقام مسرت ہے کہ یہ کتاب "حیات سلیمانی" کے نام سے شائع ہو گئی

# مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

اپنے زمانہ کی کسی مشہور و جلیل القدر ہستی کے متعلق یہ بتانا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے کہ اس کا نام سب سے پہلے کب کان میں پڑا تھا جب خیال کیجئے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام ہمیشہ سے مانوس اور یہ ہستی ہمیشہ سے معروف و محبوب ہے۔

میری طالب علمی کا زمانہ اور میرے لکھنے پڑھنے کی عمر کا بچپن تھا، اور مولانا کے علم و تصنیف کی عمرِ کا سن کہولت، میرے برادر معظم ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبد العلی صاحب ان کے دوست بھی تھے، اور معالج بھی، مولانا اکثر حیدر آباد سے اپنے وطن گیلانی جاتے ہوئے اپنے رفیق کار اور مخلص دوست مولانا عبد الباری صاحب ندوی کی معیت میں لکھنؤ اتر جاتے اور ایک دو روز قیام کر کے بہار کے سفر پر روانہ ہوتے، اس عرصہ میں کبھی ہمارے گھر کو بھی رونق بخشتے اور کبھی ہم مولانا عبد الباری صاحب کے دولت کدہ (شبستان سعادت) پر حاضر ہو کر ان کی زیارت و صحبت کی سعادت حاصل کرتے اس دو روزہ زمانۂ قیام کے صرف دو تاثرات باقی رہ گئے ہیں، ایک ان کی شیریں گفتاری،

شگفتہ بیانی، دوسرے ان کی نورانی صورت، خندہ پیشانی، ان دونوں صفتوں نے مل کر ان کی شخصیت میں عجب دلآویزی اور دل کشی پیدا کردی تھی، اور کسی طرح ان کی موجودگی یا گفتگو طبیعت پر بار نہیں ہوتی تھی، قدیم مشرقی سوانح نگار اور ادیب اسی کو "سبک روحی" سے تعبیر کرتے ہیں، اور اس کی مقابل صفت کو "گراں جانی" کہتے ہیں، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو اس لطافت سے خوب نوازا تھا، اور اسی وجہ سے وہ اپنے حلقۂ احباب میں بڑے محبوب اور اپنے حلقۂ تلامذہ و مستفیدین میں بڑے مقبول تھے، اور جو ان کی صحبت میں ایک مرتبہ بیٹھ جاتا وہ یہ کہتا ہوا اٹھتا ؎

بہت لگتا ہے جی صحبت میں ان کی

اسی اثنار میں اگر نماز کا وقت آجاتا تو مولانا حاضرین یا صاحب خانہ کے اصرار سے مصلّے پر تشریف لے جاتے، ان کی قرارت میں بڑا سوز اور حلاوت تھی قلب پر اس کا اثر پڑتا اور جی چاہتا کہ قرأت طویل ہو۔

اس دوران قیام میں جو علمی مذاکرے ہوتے ان کی تو اس وقت کچھ زیادہ سمجھ نہ تھی، اور نہ وہ محفوظ ہیں، بس اتنا یاد ہے کہ ان کی باتوں سے یہ احساس نہیں ہونے پاتا تھا کہ کوئی شخص علم کے فلک چہارم سے اہل زمین کو خطاب کر رہا ہے، یا کوئی عالم نشستگاہ کو درس گاہ تصور کر کے سامعین کو درس دے رہا ہے، ان سے مل کر ہم کو وہ دوری اور پستی نہ محسوس ہوتی جو مبتدی طالب علموں کو بڑے علمار و اساتذہ سے مل کر محسوس ہوا کرتی ہے، دیکھنے میں یہ بات معمولی ہے، مگر بڑی غیر معمولی ہے جس طرح بعض "نو دولت" حکام کو یہ مرض لاحق ہو جاتا ہے کہ وہ ہر جگہ یہاں تک کہ اپنے گھر میں اور اپنے بے تکلف احباب کے حلقہ میں بھی اپنے کو حاکم سمجھتے رہتے ہیں، اسی طرح بعض علمار اور ادبار اس کمزوری کا شکار ہو جاتے ہیں کہ وہ ہر وقت اپنے کو معلم و مصلح یا ادیب و نقاد

سمجھنے لگتے ہیں، اور درسگاہ اور مسند درس کا تصور ان سے کبھی جدا نہیں ہوتا، مولانا کی مجلس میں بڑا انبساط تھا، اور علمی و درسی اصطلاح میں "تنزل" بھی تھا، لطائف بھی تھے، واقعات بھی تھے، اور چیدہ و منتخب اشعار بھی اور وہ بھی ترنم کے ساتھ، دلنوازی اور شفقت بھی تھی، اور علمی و تحقیقی شان بھی، اور یہ سب اسی لطافت روح اور سبک جانی کا نتیجہ تھا، جو ان کو عطا ہوئی تھی، اور اس بات کا ثبوت کہ علم ان کا ایسا جزو بدن ہو گیا تھا کہ ان کو اس کا احساس باقی نہیں رہا تھا اس لئے اس کے موقع بے موقع اظہار کی ضرورت نہ تھی۔

اسی عرصہ میں مجھے تفسیر کے تفصیلی مطالعہ کا شوق ہوا، بھائی صاحب نے ارادہ فرمایا کہ مجھے کچھ عرصہ کے لئے مولانا کے پاس حیدرآباد بھیج دیں، مولانا نے بھی اس پر مسرت کا اظہار فرمایا، لیکن اب یاد نہیں کن اسباب و موانع کی بنا پر ایسا نہ ہو سکا، لیکن مولانا نے مشفقانہ و مربیانہ اور میں نے شاگردانہ و نیازمندانہ تعلق آخر تک قائم رکھا، اس سلسلہ میں سب سے پہلے میری خط و کتابت ۱۹۴۱ء میں ہوئی جب مجھے اپنی کسی علمی یا تصنیفی ضرورت سے مولانا کے اس مقالہ سے استفادہ کی ضرورت پیش آئی جو انھوں نے جمع و ترتیب قرآن پر تحریر فرمایا تھا، اس کی تاریخ یہ ہے کہ اجمل خاں صاحب نے قرآن مجید کی جمع و ترتیب کے متعلق ایسے متشککانہ خیالات کا اظہار کیا تھا جن سے قرآن مجید کی موجودہ جمع و ترتیب بلکہ اس کی محفوظیت مشتبہ ہو جاتی ہے، یہ چند عامیانہ و سطحی خیالات کا مجموعہ تھا جن کی کوئی علمی و تحقیقی اہمیت نہ تھی، لیکن ایک بڑے فتنہ کا آغاز تھا، مولانا کے علم و حمیت میں اس سے حرکت و جنبش پیدا ہوئی اور انھوں نے نفس مسئلہ جمع و ترتیب قرآن پر ایک محققانہ و عالمانہ مضمون تحریر فرمایا جو اسی زمانہ میں "مدینہ" بجنور میں شائع ہوا، مولانا کے علمی مقالات کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں یکجا اتنا منتشر مواد جمع فرما دیتے ہیں، جو آسانی کے ساتھ کسی ایک کتاب میں نہیں مل سکتا، دوسرے منقولات کے ساتھ

وہ بہت سی ایسی نئی باتیں لکھ دیتے ہیں، جن کی طرف عام طور پر ذہن نہیں جاتا، اللہ تعالےٰ نے ان کو بڑا نکتہ رس اور نکتہ آفریں ذہن عطا فرمایا تھا، قرآن مجید کی وہی آیات اور صحاح کی وہی احادیث اور تاریخ کے وہی بیانات جو ہم آپ بیسیوں بار پڑھ چکے ہیں، مولانا ان سے ایسے حقائق ثابت کر دیتے، اور ان سے ایسے عجیب لیکن صحیح نتائج نکالتے کہ حیرت ہوتی ہے[1]، اس مضمون میں بھی یہی شان ہے، قرآن مجید کے من جانب اللہ محفوظ و مرتب ہونے کو، اور عہدِ رسالت ہی میں اس کے مرتب و جمع ہو جانے کو انھوں نے قرآن مجید کے الفاظ و نصوص اور واقعات سے اس طرح ثابت کیا تھا، کہ اس خیال کی بالکل بنیاد ہی منہدم ہو جاتی تھی کہ قرآن مجید بہت تاخیر کے ساتھ جمع و مرتب ہوا اور اس کی ترتیب حضرت ابوبکرؓ یا حضرت زیدؓ بن ثابت کے اجتہاد کا نتیجہ ہے، اس مضمون کا محرک اور اس کی شان کیا تھی، اپنے مکتوب گرامی میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"آپ کو شاید میرے جنون کا حال معلوم نہیں، اجمل نامی پروفیسر کے نام سے "مدینہ" میں مضامین کا ایک سلسلہ شروع ہوا، غصہ آ رہا تھا، دبا نہ سکا، رات کو قلم لیا پراگندہ خیالات سمیٹے لکھ کر بھیج دیا، مسودہ تیار ہی کب تھا، وہی مسودہ، وہی بیضہ تھا، طبع ہونے کے بعد ایک کاپی آئی تھی، یاروں نے اسے بھی ختم کر دیا، سنہ تو یاد نہیں لیکن جس سنہ میں شائع ہوا مارچ کا مہینہ غالباً ۷، ار، ارچ تھا، ہو سکے تو جناب مجید حسن سے مانگئے شیر محمد صاحب[2] کے پاس ہوگا؟ اس کا کیسے یقین کروں، کیا آج کل اس سلسلہ میں کوئی کام

---

[1] اس کا بہترین نمونہ ان کی تصنیف "تدوین حدیث" ہے۔

[2] مولانا ابواللیث ندوی امیر جماعت اسلامی ہند۔

ہو رہا ہے کاش! قرآن کے ساتھ دوسری آسمانی کتابوں کی تاریخی حالت بھی
تحقیق کے ساتھ لکھ دی جاتی تو "لا ریب فیہ" کی تفسیر ہو جاتی ہے!

مولانا کی تصنیفات میں سے غالباً سب سے پہلے "النبی الخاتمؐ" پڑھی، کتاب عجیب البیلے انداز میں لکھی گئی ہے، صحف سماوی کا انداز بیان، خطیبوں کا جوش و برجستگی، عشاق کی مستی اور وارفتگی، عقل و جذب کی لطیف آمیزش، حسب معمول معمولی اور مشہور واقعات سے لطیف نکتے اور عظیم نتیجے نکالتے چلے جاتے ہیں، اور وہ اس سرعت و کثرت کے ساتھ کہ پڑھنے والا مصنف سے شکایت کرنے لگتا ہے کہ۔

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

میں نے اپنی ساری عمر میں سیرت نبوی میں رحمۃ للعالمین اور النبی الخاتم سے زیادہ مؤثر کتاب نہیں پڑھی، کتاب پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف علم و انشاء پردازی کی کرشمہ سازی نہیں ہے، اس کے اندر ان کا سوز دروں اور خون جگر بھی شامل ہے، اور واقعہ یہی ہے کہ۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود

ان سے جب زیادہ ملنا ہوا اور کچھ دن ساتھ رہنا ہوا تو اس حقیقت کی تصدیق ہوئی اور حیدر آباد کے قیام میں خود انھوں نے اپنے بعض واقعات سنائے جن سے بارگاہِ رسالت سے خصوصی تعلق و مناسبت اور اس کتاب کی مقبولیت و تاثیر کا راز معلوم ہوا۔

ان کا دوسرا نقش قلم جو نظر سے گزرا، اور نقش ہو گیا، وہ ان کا مضمون "الف ثانی کا

---

[1] خط پر تاریخ نہیں ہے، ڈاکخانہ کی مہر ۳۰ر اکتوبر ۱۹۴۱ء کی ہے۔

تجدیدی کارنامہ ہے، جو الفرقان کے مجدد نمبر میں شائع ہوا تھا، اور وہ ان کی بہترین و مؤثر ترین تحریروں میں ہے، حضرت مجدد الف ثانی پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، لیکن اس مضمون سے بڑھ کر ان کی تجدیدی عظمت کو آشکارا کرنے والا کوئی مقالہ یا تصنیف اس وقت تک نظر سے نہیں گزری، اس مضمون میں بھی انھوں نے یہی کیا ہے، کہ ملا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ سے لے کر ایسے اقتباسات جمع کر دیئے ہیں کہ عہد اکبری کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے، اور پڑھنے والے کو اس خطرہ کا اندازہ ہو جاتا ہے، جو اس ملک میں اسلام کو درپیش تھا، پھر ان تاریک و مایوس کن حالات میں الف ثانی کے مجدد کا تجدیدی کام شروع ہوتا ہے جو بالآخر اکبر کے تخت پر محی الدین اورنگ زیب بادشاہ غازی (نور اللہ مرقدہٗ و أعاد أیامہ) کو لے آتا ہے، اگر یہ مضمون اسی پرواز کے ساتھ جس سے وہ شروع ہوا تھا، مکمل ہو جاتا تو نہ صرف حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کی بہترین سیرت تیار ہو جاتی بلکہ ہندوستان کے اسلامی انقلاب، کی ولولہ انگیز تاریخ مرتب ہو جاتی۔

اس وقت تک میرے ان کے تعلقات کی نوعیت یہ تھی کہ میں ان کے علم و تحریر کے ہزاروں مداحوں میں سے ایک مداح تھا، ان کے مضامین و تصانیف کو شوق سے پڑھتا، اور کبھی کبھی استفادۃً خط و کتابت بھی کر لیتا، ان کو بھی میرے حالات اور علمی مشاغل سے بزرگانہ دلچسپی تھی، لیکن ایک ایسی تقریب پیش آئی جس نے مجھے ان سے زیادہ قریب ہونے کا موقع دیا، اور وہ یہ کہ انھوں نے اپنی اہم تصنیف "مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" کے زمانہ تصنیف میں والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحی کی تصنیف "نزہۃ الخواطر" کا دوسرا حصہ "تجدید ذکر کامنہ" کے ذیل کے طور پر دائرۃ المعارف نے شائع کیا تھا پڑھا، وہ اس کو پڑھ کر بڑے متاثر ہوئے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ واقعہ ہے کہ آپ کے والد مرحوم کی چیزوں سے یوں تو مجھے بچپن ہی سے
خاص دلچسپی رہی ہے، لیکن نزہۃ الخواطر کی قدر و قیمت مجھ پر اس کتاب کے
لکھتے وقت جتنی ظاہر ہوئی، اس سے پہلے نہیں ہوئی تھی، اللہ کے اس مخلص
بندے نے کمال کر دیا ہے، سمندروں کو کھنگال گئے، لیکن پتہ بھی چلنے نہ دیا،
خدا کرے ان کی محنت سے دنیا کو استفادہ کا موقع مل جائے، ایک انقلابی کام
ہے، جسے وہ کر کے چلے گئے ہیں، اب، ہم لوگوں کی توفیق کی بات ہے کہ اس سے
خود مستفید ہوں اور دوسروں کے مستفید ہونے کے مواقع پیدا کریں۔"

(یکم نومبر ۱۹۴۵ء)

انھوں نے دائرۃ المعارف سے اس کتاب کے مکمل طبع ہونے کی تحریک کی، ایک
محضر مرتب کیا جس پر ہندوستان کے اکثر اکابر علماء کے دستخط کرائے، یہ غالباً مہدی یار جنگ صاحب
کا زمانۂ وزارت تھا، اور وہ مولانا کی بڑی عزت کرتے تھے، بڑی کوششوں اور سلسلہ جنبانی
سے اس کتاب کی طباعت کی منظوری ہوئی، اور میں نے پہلا حصہ صاف کرا کے بھیج دیا ریاست
کے دوسرے کاموں کی طرح اس کتاب کی طباعت میں تاخیر پر تاخیر ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ مصلحت
یہ معلوم ہوئی کہ میں خود حیدر آباد جاؤں اور اس کے آخری مراحل طے کرانے کی کوشش کروں،
چنانچہ ۴۶ء میں غالباً جولائی کا مہینہ تھا، کہ میں حیدر آباد حاضر ہوا، مولانا کے سوا کہاں ٹھیرتا؟
یہ وہ زمانہ تھا کہ مولانا عبد الباری صاحب وظیفہ پر سبکدوش ہو کر لکھنؤ تشریف لے آئے تھے
جامعہ عثمانیہ کے قریب سیتا پھل منڈی میں مولانا کا قیام تھا، قریب ہی ایک مسجد تھی جس کی
تاریخ مولانا نے المسجد الاقصیٰ نکالی تھی (اور وہ مسجد کے دروازہ پر کندہ ہے، اور
اس لحاظ سے مناسب حال ہے کہ مسجد بلدہ کے بالکل ایک سرے (اقصی البلد) پر واقع ہے)

اس قیام میں مولانا کے شب و روز دیکھا اور گھنٹوں پاس بیٹھنا ہوا، وہاں ٹھیر کر مولانا کا تصنیفی انہماک اور علمی استغراق دیکھا، پہلے کا حال تو یہ تھا کہ بعض دن رات رات بھر لکھتے رہتے، دوسرے کا حال یہ تھا کہ بعض اوقات سلسلہ گفتگو شروع فرماتے اور میں کسی ضرورت سے اٹھ جاتا مگر مولانا سلسلہ جاری رکھتے پھر اچانک سر اٹھا کر دیکھتے اور اس وقت معلوم ہوتا کہ میں موجود نہیں ہوں طبیعت کی شگفتگی کا وہی عالم تھا، "مسجد اقصیٰ" کے مؤذن ایک دلچسپ بزرگ تھے، جن سے اکثر مولانا مطائبہ فرماتے اور ان کی سادگی سے لطف لیتے مولانا نے ان کا نام "امام مفرح القلوب" رکھا تھا، اکثر مولانا کے ساتھ ہی جامعۂ عثمانیہ اور دائرۃ المعارف جانا ہوتا اور بعض مرتبہ ان کے درجہ میں بھی (جو اپنی دینی عظمت کی وجہ سے جامعہ کی سب سے بالائی منزل میں تھا) بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوتی۔

مولانا سے ملنے میں دو باتوں کا ضرور احساس ہوتا، ایک ان سے عزیزانہ قربت کا جو ایک خاندان کے افراد ہونے سے محسوس ہوتی ہے، اس کی وجہ خواہ نسبی اشتراک ہو (اشتراک بعید ہی) خواہ ان کی طبیعت کی افتاد جس کے خمیر میں محبت و شفقت تھی، دوسرے ذوقی و علمی مناسبت، مولانا عالموں میں عالم تھے، ادیبوں میں ادیب، مورخوں میں مؤرخ، فقیہوں میں فقیہ، محدثوں میں محدث، مفسروں میں مفسر، فارسی، اردو کا ان کا یکساں مذاق تھا، شعر و شاعری کا ذوق اور سخن شناسی و سخن سنجی دونوں سے حصہ وافر ملا تھا، غرض وہ ہندوستان کی اس گزشتہ تہذیب و ثقافت کی یادگار تھے، جب فقیہ و محدث کے لئے خشک ہونے اور عالم کے لئے شعر کو غیر موزوں پڑھنے کی شرط نہ تھی، وہ علمار کی اس صف کے آدمی تھے جس کے اولین کرسی نشینوں میں مولانا فضل حق خیر آبادی، مولانا صدر الدین خاں آزردہ اور مولانا امام بخش صہبائی اور متوسطین میں مولانا حالی، مولانا شبلی اور حکیم سید عبد الحی (صاحب گل رعنا)

اور متاخرین میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوبکر جونپوریؒ تھے، اپنی کم سوادی اور بے استعدادی کے باوجود میرا نشو ونما اسی ماحول میں ہوا اس لئے مولانا سے ایسی مناسبت محسوس ہوئی جو ان کے بہت سے معاصروں سے محسوس نہیں ہوتی تھی، اور اس میں بہت کچھ دخل ان کی اس جامعیت ادبی ذوق اور لطف مجلس کو تھا جس کی بنا پر کہنا پڑتا تھا کہ۔

وہ اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں

۴۷ء میں مولانا کا تعلق حیدرآباد سے ختم ہوگیا اور وہ وظیفہ لے کر گیلانی آ گئے جس کو وہ اپنی "کہفی قیام گاہ" کہتے تھے، حیدرآباد کے واقعات نے ان کے حساس و دردمند دل کو بڑا صدمہ پہونچایا تھا، وہ لکھ پڑھ کر اپنا دل بہلاتے تھے، اسی زمانہ میں ان کی بعض اہم تصنیفات اور طویل سلسلہ مضامین شائع ہوئے۔

۴۷ء میں راقم الحروف اور رفیق مکرم مولانا عبدالسلام ندوی نے ادارۂ تعلیمات اسلام کی طرف سے ایک پندرہ روزہ اخبار "تعمیر" جاری کیا، جس کا اصل مقصد مسلمانان ہند کی اس افسردگی اور احساس کہتری اور مایوسی کو دور کرنا تھا، جو ۴۷ء کے انقلاب اور نئے حالات نے ان پر طاری کردی تھی، مولانا نے اس اخبار سے پورا تعاون فرمایا، اور اپنے بعض مضامین سے سرفراز کیا، مولانا کا ایک دیرینہ خیال یہ تھا کہ اسلامیہ کالجوں اور اسکولوں کے بجائے جن کا ایک زمانہ میں ہندوستان میں عام مذاق پیدا ہوگیا تھا، اور مسلمانوں کی بہترین تنظیمی و علمی و مالی صلاحیتیں ان پر صرف ہوئیں اس وقت اسلامی اقامت خوانوں کی ضرورت ہے، جن میں وہ مسلمان طلبا قیام کریں، جو مختلف سرکاری وغیر سرکاری، مسلم اور غیر مسلم درسگاہوں سے وابستہ ہوں، اور ان کے اندر اسلامی و دینی فضا اور غذا مہیا کرنے کی کوشش کی جائے، تاکہ وہ اپنی درسگاہوں کے

لادینی ماحول اور تعلیم کے اثرات سے امکانی حد تک محفوظ اور اسلامی افکار و اخلاق سے متاثر ہوں، اس میں کوئی شبہ نہیں، کہ یہ تجویز "کم خرچ بالانشین" کے مرادف اور اسلامیہ کالجوں اور اسکولوں سے (جن کی افادیت اب بہت مشتبہ ہو گئی ہے، اور جو انقلاب حکومت سے اپنی خصوصیات کھوتے چلے جا رہے ہیں) کہیں بہتر نتائج و ثمرات پیدا کر سکتی ہے، اور جدید تعلیم کے غیر اسلامی اثرات سے بچانے اور نئی اسلامی نسل کو (جس کا جدید تعلیم حاصل کرنا ایک طے شدہ حقیقت اور ایک ناگزیر ضرورت ہے) مسلمان باقی رکھنے کی واحد شکل ہے، اس وقت عالم اسلام کا سب سے بڑا فتنہ اسی نوخیز نسل کا غیر اسلامی بلکہ معاند اسلام ذہن اور نفاق ہے جس نے تمام اسلامی ممالک کو (جن کی زمام اختیار قدرتی طور پر اسی طبقہ کے ہاتھ میں ہے) الحاد و زندقہ کے دوراہہ پر کھڑا کر دیا ہے، اور ایک سخت ذہنی انتشار و کشمکش بلکہ اسلام کے خلاف بغاوت کا علمبردار بنا دیا ہے، مولانا کی یہ بڑی دینی بصیرت تھی، کہ انھوں نے اسلامی اقامت خانوں کی تجویز پیش کی جو کم از کم ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس مسئلہ کا ایک عملی اور معقول حل ہے، مولانا نے تعمیر کو اس دعوت کا ترجمان بنانا چاہا اور اس سلسلہ میں ان کے متعدد مکاتیب و مضامین شائع ہوئے، افسوس ہے ان کی اس تحریک کو کسی بڑے ادارہ یا انجمن نے نہیں اپنایا، اور اس کو تحریک و دعوت نہیں بنایا گیا ورنہ وہ نہ صرف کالجوں اور اسکولوں کے مقابلہ میں بلکہ ان یونیورسٹیوں کے مقابلہ میں بھی زیادہ مفید اور انقلاب انگیز ثابت ہوتی جن پر مسلمانوں کی بہترین طاقتیں اور عظیم قومی سرمائے صرف ہوئے، مولانا کے انتقال کے بعد ان کے شریک کار اور یار غار مخدومی مولانا عبدالباری صاحب ندوی نے "صدق" کے ذریعے اقامت خانوں کے قیام کی دعوت پیش کی اور اس کے لئے عملی قدم بھی اٹھایا، خدا کرے مستقبل قریب میں وہ تخیل عالم وجود میں آجائے اور ہندوستان و پاکستان میں اس کا تجربہ شروع کیا جائے۔

وہ اگرچہ اپنے نزدیک ایک "کہف" میں گوشہ نشیں وپناہ گزیں تھے، مگر باہر کی دنیا سے باخبر رہتے تھے، اور باخبر رہنا چاہتے تھے، مطالعہ وتصنیف وتحریر کا سلسلہ قوت کے ساتھ جاری تھا، راقم سطور کا معمول تھا کہ اس کی کوئی چیز شائع ہوتی تو خصوصی مناسبت وتعلق کی بنا پر مولانا کی خدمت میں ضرور بھیجتا، اور مولانا اس پر اپنے تاثرات وجذبات کا اظہار فرماتے ان تاثرات سے ان کے دردمند دل کا پورا اظہار ہوتا اور معلوم ہوتا کہ "امت" کے حالات سے ان کو کیسا تعلق ہے، ۱۹۵۱ء میں جب یہ ناچیز حجاز ومشرق وسطیٰ کی سیاحت سے واپس آیا تو بعض دوستوں نے ان ریڈیائی تقریروں کا جو دہلی کے ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوئی تھیں ترجمہ شائع کردیا، میں نے وہ کتابچہ مولانا کی خدمت میں بھیجا، مولانا نے ان الفاظ میں اس کی رسید عنایت فرمائی۔

"کتنے ذوق وشوق کے ساتھ آپ کی کتاب مشرق وسطیٰ والی اپنے ہاتھ میں لی، لینے کے ساتھ پڑھ گیا، لیکن آپ نے پیاس بھڑکا دی، امیدوار بنا کر چھوڑ دیا، کاش! آپ کا روزنامچہ شائع ہوجاتا، تاہم جو کچھ بھی اس میں آگیا غنیمت ہے، فلسطین کے اس پیرمرد کی بات دل کو بہت بھائی کہ سمندر کی مچھلیوں میں اگر جنگ ہو تو انگریز کی شرارت سمجھو، اپنا خیال بھی یہی ہے، اسی لئے اس دور کو "کہفی دور" سمجھے ہوئے ہوں تاآنکہ تلامیذ الشیطان کا دور ختم ہو، آپ نے اس سفر میں زیادہ تر ندوی الطبع حضرات سے ملاقات کی، دیوبندی الفطرت بمشکل دو ایک سے زیادہ نہ ملے، میری آرزو یہ تھی کہ حضرت شہید کے کچھ نمونوں کی تلاش کرنے میں بھی آپ کامیاب ہوئے ہوں گے، مگر شاید پیداوار کا سلسلہ اس راہ میں غالباً بند ہوچکا ہے"۔ (۲۰ر فروری ۱۹۵۳ء)

بالآخر وہ عربی روزنامچہ "مذکرات سائح فی الشرق العربی" بھی شائع ہوگیا، اور حسب معمول مولانا کی خدمت میں پیش کیا گیا، مولانا عربی ممالک کے دینی زوال اور جذبہ اسلامی کے ضعف کے واقعات سے بڑے متاثر و غمگین ہوئے اور کتاب پڑھتے ہی یہ مکتوب گرامی ارسال فرمایا جو درد و اثر میں ڈوبا ہوا ہے۔

"آپ کا ہدیہ سنیہ عربی سفرنامہ کئی دن ہوئے موجب سرفرازی ہوا چونکہ "الفرقان" میں اس سفرنامہ کی متعدد قسطیں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکی تھیں خیال گزرا کہ وہی مضامین عربی زبان میں ہوں گے، تاہم پڑھنا شروع کیا، اب خدا جانے میرے حافظہ کی کمزوری کا نتیجہ تھا، یا کیا تھا، کہ مجھے تو آپ کی اس کتاب کی ہر ہر سطر نئی معلوم ہوتی چلی جاتی تھی، پڑھتا جاتا تھا، اور استغراق و انہماک بڑھتا جاتا تھا، شاید دو دن میں ختم ہوا ختم کیا ہوا، ایسا معلوم ہوا کہ میں خود ختم ہوگیا، پرانے ناسور جو دل میں پڑے ہوئے تھے، تر و تازہ ہوتے چلے جاتے تھے، چند دن ایسے حال میں گزرے کہ گویا ایک قسم کا جنوں مسلط ہوگیا ہے، عرب، مصر، سوریہ، سوڈان کے مسلمانوں کا حال جب اس حد تک خراب ہو چکا ہے تو پھر اب غریب اسلام کہاں پناہ لے گا؟ مرحوم ڈاکٹر اقبال کا شعر بار بار زبان پر جاری تھا۔

اس راز کو اب فاش کر اے روح محمد
اس عہد میں اب تیرا مسلمان کدھر جائے

زیادہ سے زیادہ کچھ امید کی کرنوں کا سراغ آپ کے بیان کے مطابق الاخوان میں ملتا تھا، لیکن آپ ہی نے ان کے لئے جو ہدایتی راستہ

متعین فرمادیا تھا[1] اس راہ پر وہ بھی تو نہ چلے، حال کے واقعات[2] سے اس کی تصدیق ہی ہوگئی، گویا "مادہ برآمد" کے مصداق درحقیقت وہ بھی تھے، بس تڑپ رہا ہوں، کراہ رہا ہوں، کیا ہوگا، اور ورطہ سے دین کا سفینہ کیسے نکلے گا' بھلا جب اپنے ہاتھوں سے مسجدوں میں مسلمان تصویریں لٹکانے لگے[3]، اور دنیائے اسلام کے سب سے بڑے دینی مرکز[4] کے علماء نے إعفاء اللحی[5] کا ترجمہ "عفت الدیار محلها ومقامها" کی روشنی میں کر کے اسی پر اجماع منعقد فرمالیا ہے تو دین کو اب ہم کہاں ڈھونڈیں؟ کیا عرض کروں منہ لپیٹے آپ کی کتاب پڑھنے کے بعد پڑا ہوا ہوں "أم حسبتم أن أصحٰب الكهف والرقيم كانوا من آياتنا عجبا"، معلوم ہوتا ہے کہ دل کے اندر کوئی پڑھ رہا ہے' "فلعلك باخع نفسك على آثارهم إن لّم يؤمنوا بهٰذا الحديث أسفا" کا مطلب اب سمجھ میں آتا ہے، عقیدۂ ولدیت کے آثار[6] آخر بڑھتے ہوئے کہاں تک پہونچ چکے ہیں؟ بھروسہ اسی پر ہے کہ قرآن کے بعد نہ کوئی کتاب

---

[1] اشارہ ہے راقم سطور کے رسالہ "ارید أن اتحدث إلى الاخوان" کی طرف۔

[2] اخوان کی عملی سیاست میں شرکت۔

[3] سوڈان میں بعض مسجدوں میں وہاں کے مشہور شیخ طریقت السید علی میرغنی باشا کی تصویریں آویزاں ہیں۔

[4] جامعہ ازہر مصر۔

[5] إعفاء کے معنی چھوڑنے اور بڑھانے کے ہیں عفا یعفو کے معنی مٹنے کے ہیں یہ مصرع لبید کے معلقہ کا ہے۔

[6] مولانا کا مستقل خیال تھا کہ موجودہ مغربی تمدن مسیحیوں کے عقیدۂ ولدیت کا نتیجہ ہے، ملاحظہ ہو سلسلۂ مضامین دجالی فتنہ' (الفرقان)

نازل ہونے والی ہے، اور نہ محمد رسول اللہؐ کے بعد کوئی رسول آنے والا ہے،
مسلمانوں کا حشر جو کچھ بھی ہو لیکن "الاسلام" کو خدا کی پیدا کی ہوئی دنیا سے
کون نکال سکتا ہے؟" (۱۰ نومبر ۱۹۵۴ء)

نومبر ۵۳ء میں مولانا سید سلیمان ندوی کا حادثہ ارتحال پیش آیا، ہم لوگوں نے ارادہ
کیا کہ دار العلوم ندوۃ العلماء کی طرف سے ایک ایسا سنجیدہ و علمی اجتماع منعقد کیا جائے،
جس میں سید صاحب کے مختلف علمی کمالات اور دینی و تصنیفی خدمات پر علمی مقالات پڑھے جائیں،
ہم لوگوں کو سید صاحب مرحوم اور مولانا مناظر صاحب کا باہمی تعلق وارتباط معلوم تھا، عرصہ سے
مولانا لکھنؤ کبھی تشریف نہیں لائے تھے، اور ان کے احباب و علمی تلامذہ ان کی تشریف آوری اور
لطف صحبت کے آرزو مند تھے، میں نے آپ کی خدمت میں عریضہ لکھا، اور یہ عرض کیا کہ خواہ مجھے خود
حاضر ہونا پڑے لیکن یہ زحمت آپ کو نیاز مندوں کی خاطر برداشت کرنی پڑے گی، مولانا کی
صحت عرصہ سے کمزور تھی، وہ پہلے سے سفر کے بارے میں بڑے کمزور اور ضعیف الارادہ واقع
ہوئے تھے، قلبی شکایت نے ان کو اور بھی محتاط بنا دیا تھا، اور وہ سفروں کے سلسلے کو بالکل بند
کر چکے تھے، اندیشہ تھا، اور ان کے دوستوں نے پیش گوئی کی تھی کہ وہ سفر پر آمادہ نہ ہو سکیں گے،
مگر خلاف توقع انھوں نے یہ دعوت قبول فرمالی، اس کا سبب صرف ایک تھا، اور وہ یہ کہ اس جلسہ کی
نسبت ان کے ایک محبوب دوست اور فاضل معاصر سے تھی، جو اس وقت دنیا میں نہیں ہے،
زحمت اٹھا کر اور صحت کو خطرہ میں ڈال کر بھی اس میں شرکت کرنا ان کے نزدیک شرافت اور حق کے
اعتراف کی دلیل تھی، اور ان کی فطری سیادت اس کی متقاضی تھی، حقیقت میں شرافت علو نفس
اور مکارم اخلاق کے ظہور کے یہی مواقع ہوتے ہیں، بہت سے اکابر و مشاہیر تو ایسے دیکھے گئے ہیں
جو اپنے نامور معاصر اور دیرینہ رفیق کے انتقال کے بعد زبان پر ان کا ذکر لانا بھی اپنی عظمت و

خودداری کے خلاف سمجھتے ہیں، مولانا کا یہ مکتوب (جس میں انھوں نے سفر کی آمادگی ظاہر کی ہے) لفظ بلفظ پڑھنے کے قابل ہے، اور ان کی شرافت نفس علو فطرت اور لطیف جذبات و احساسات کی ایک تاریخی دستاویز ہے جس کو ان کا سوانح نگار کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔

"۸ر دسمبر ۱۹۵۳ء
گیلانی (بہار)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلیل الکرام البررہ برادر عزیز محترم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب وفقکم اللہ لما یحب و یرضی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، جی ہاں! نوازش نامہ کے جواب ہی کی فکر میں تھا کہ اچانک اس دینی و علمی حادثہ کی خبر نے دل و دماغ میں ہلچل ڈال دی۔ مرحوم نور اللہ ضریحہ، کے ساتھ دل کے تعلق کی صحیح کیفیت کا علم اب ہوا ہے، کافی مدت گزر چکی ہے، لیکن شاید ہی کوئی گھنٹہ بیداری تک کا ایسا گزرتا ہو جس میں ان کا خیال سامنے نہ آجاتا ہو، اور خیال کیا، کہنے کو کہہ سکتا ہوں کہ ان کا طیف نہیں بلکہ شاید وہی سامنے آجاتے ہیں، اس واقعہ کی توجیہ اب سمجھ میں آئی ہے، آخری حج سے واپس ہونے کے بعد اپنے ایک مکتوب میں سید صاحب مرحوم نے ارقام فرمایا تھا، کہ میں مطاف کے سامنے بیٹھا ہوا تھا، اچانک میری نظر پڑی کہ "تو طواف کر رہا ہے" خیال آیا کہ وہ آتا تو مجھ سے ضرور ملتا، آخر یہ ماجرا کیا ہے، میں خود ملنے کے لئے تیری طرف لپکا، لیکن دیکھا کہ تم غائب ہو گئے، پوچھا تھا کہ آخر صوفیوں میں جو مشہور ہے کہ کعبہ میں نماز پڑھتے ہیں، کیا اسی کے ظہور کی یہ شکل تھی؟ ان کا شاید یہی آخری گرامی نامہ تھا، جواب میں عرض کیا گیا تھا کہ محبت کے یہ سارے کرشمے ہیں، ورنہ کہاں یہ سیاہ رو، اور کہاں کعبہ کی نماز و طواف، پہلے تو

ان کے اس رقیمہ وداد کو محفوظ کر دیا، لیکن خیال گزرا کہ بعد کو کسی کی نظر اس پر نہ پڑ جائے اور خواہ مخواہ کے وہم میں مبتلا ہو، دل کا فیصلہ یہی ہوا کہ اس کو ضائع کر دیا جائے جب تک وہ زندہ رہے، اس راز کو دل ہی میں دبائے رہا آج پہلی دفعہ آپ کے سامنے صرف اس لئے اس واقعہ کا اظہار کر رہا ہوں کہ اپنے حال سے سید صاحب مرحوم کے حال کی توجیہ سمجھ میں آئی ہے، ان ہی کے قلب انور کا یہ عکس ہے کہ غائب ہونے کے بعد حضوری کا شرف حاصل ہو رہا ہے، جو کچھ مجھ پر گزری ہے، سمجھتا ہوں کہ کچھ اسی قسم کا حال ان پر بھی گزرا تھا لیکن "الفضل للمتقدم" اور اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی محبت غالب تھی کہ میرے مرنے سے پیشتر اس حال کا تجربہ ان کو ہوا، میرے اندر جو کچھ پوشیدہ تھا، اس کا بروز ان کی وفات کے بعد ہوا، غفر اللہ لہ ورحمہ۔

اب اس کے سوا دل کی تسلی کے لئے چارۂ کار ہی کیا ہے کہنے والے نے کہا تھا۔

جمال ذی الارض کانوا فی حیاتہم

بعد الممات جمال الکتب والسیر

وفات کی خبر بھی عجب طرح سے ملی، گوشہ خمول سے نکلنے کا سلسلہ قطعی طور پر منقطع ہے، لیکن جس رات کو ان کا وقت موعود ان کے سر پر پہونچا، اس کی صبح کو استھانواں جو دسنہ کے قریب ایک گاؤں ہے میلاد کی مجلس تھی، وہاں کے لوگوں کے شدید اصرار سے اسی مجلس مبارک کی شرکت کے لئے حاضر ہوا، راستہ ہی میں تھا کہ ایک صاحب دسنہ کے ملے اور ہوش و حواس پر بجلی اس خبر کو سنا کر گرائی، بولے کہ رات ریڈیو سے دسنہ میں یہ خبر کراچی سے سنی گئی ہے، وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا،

واقعہ یہ ہے کہ اگر استخوانواں جانا نہ ہوتا تو علی الصباح غالباً ان کے دفن ہونے سے پیشتر اس سانحہ فاجعہ سے آگاہ ہونے کی کوئی شکل میرے لئے نہ تھی، اسی وقت جنون میں ایک مرثیہ بھی ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں خود بخود دل میں تموّج پذیر ہوا، کچھ اشعار تو اس کے اسی وقت کی مجلس میں سنائے گئے بعد کو اخباروں میں بھیجدیا۔

بہر حال آپ نے ایک ایسی مجلس میں شرکت کی دعوت دی ہے کہ انکار کی گنجائش نہیں پاتا اور گنجائش آپ نے باقی ہی کب چھوڑی ہے، اس کے سوا اور کیا عرض کروں کہ صحت کے جس حال میں اس وقت ہوں اگر یہی حال باقی رہا کوئی خاص غیر معمولی بے ترتیبی اس میں پیدا نہ ہوئی تو حق سبحانہ وتعالےٰ کی توفیق کے بھروسہ پر یہ ارادہ کر چکا ہوں کہ جس طرح بھی ممکن ہو، اس بابرکت مجلس میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کروں آپ خود یا کسی صاحب کو بھیجنے کی ہرگز ہرگز تکلیف گوارا نہ فرمائیں، فقیر خود حاضر ہو جائے گا، اور ایک آدمی کو اپنے ساتھ رکھے گا، ہاں اگر ممکن ہو تو اس سے مطلع فرمائیں کہ آخر یہ جلسہ عام پبلک کی طرف سے ہو رہا ہے، یا ذاتی طور پر آپ نے اس بار کو اپنے سر پر اٹھایا ہے۔

آپ نے اپنے اس نوازش نامہ میں اس فقیر کے متعلق جن غیر استحقاقی الفاظ کا استعمال فرمایا ہے ان کو پڑھ کر بے ساختہ آنکھوں سے آنسو نکل پڑے، واقعہ یہ ہے کہ ان کی زندگی میں بھی اس کا اعتراف کرتا رہا اور اب، تو مجسم اعتراف ہوں کہ ان کے فضائل وکمالات سے دور کی بھی نسبت میرے ہفوانی مزورات کو نہ تھی، قلم کے دائرہ میں ان کی قلم کاریاں صدیوں تک انشاء اللہ کام آئیں گی، دنیا ان کی قدر وقیمت کا اب اندازہ کرے گی، بہر حال اب چلیئے سعید قلوب کے

حسن ظن کو اپنی مغفرت کا ذریعہ سمجھتا ہوں "بل الانسان علی نفسہ بصیرہ"۔

اس فقیر کے متعلق جو عنوان مقرر کیا گیا ہے، مناسب ہے، کہہ نہیں سکتا کہ اب کچھ لکھا بھی جائے گا یا نہیں، اپنے مرثیہ میں ایک شعر یہ بھی لکھا تھا کہ۔

اپنی تحریروں میں خود میری نظر تجھ پر رہی
رائے کا تیری رہا دل کو ہمیشہ انتظار

یہ عجیب بات ہے کہ اس "نفسیاتی کیفیت" کا انکشاف اب مجھ پر ہوا، قلم ہاتھ میں لیتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ سید صاحب مرحوم ہی کی نظر سے جب یہ بات نہ گزرے گی تو لکھنے کا فائدہ ہی کیا، وہ کہیں ہوں، کسی حال میں ہوں، گوشۂ خاطر عموماً ان ہی کی طرف رہتا تھا، ان کی پاک اور آزاد روح کو خطاب کرکے دعوت دی ہے کہ آپ آیئے اپنے دار المصنفین کی بہاروں کا تماشا کیجئے، اسی سلسلہ میں ایک شعر یہ بھی تھا۔

راہ میں آئے گا لکھنو اور دریاباد بھی
ہیں جہاں تھامے کلیجے تیرے کچھ یارانِ غار

آخری شعر یہ تھا:۔

اور ہو دستہ جو آنا تو رہے اس کا خیال
ایک گیلانی میں بھی ہے آرزوؤں کا مزار

اپنے برادر اکبر محسنی ومحترمی ڈاکٹر صاحب مدظلہ العالی کی خدمت میں فقیر کا سلام عرض کر دیجئے مولانا عبد الباری اور مولانا النعمانی صاحبان کی خدمت میں بھی سلام عرض ہے آخر اس "کھٹی" کو کھٹ سے گھسیٹنے کی ایک صورت نکل ہی آئی۔ فقط والسلام

مناظر احسن گیلانی

مولانا اپنے برادر عزیز مولوی مکارم احسن صاحب کی معیت میں تشریف لائے اور نہایت ذوق وشوق اور محبت وخلوص کے ساتھ دو روزہ اجتماع میں شرکت فرمائی، ایک روز کے اجتماع کی صدارت بھی فرمائی، اپنا مقالہ (جو حسب معمول طویل، دلچسپ اور پر مغز تھا) سنایا، مقالہ سیرۃ النبی کے حصہ ششم پر ایک مفصل تبصرہ تھا، اس میں دکھایا گیا تھا کہ سید صاحب نے اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور اخلاق نبوی پر جو کچھ لکھا ہے، وہ اس موضوع پر منفرد چیز ہے، اور سید صاحب کے علمی کارناموں میں اس کو خاص امتیاز حاصل ہے، اس مضمون میں انھوں نے جس فراخ دلی، فیاضی اور مسرت کے ساتھ اپنے نامور معاصر کے علمی وتصنیفی مقام اور اس کی عظمت کا اعتراف کیا تھا وہ خود مولانا کی عظمت کی دلیل اور ان کی بے نفسی وخلوص کا روشن ثبوت تھا، اور علمائے سلف کی یاد تازہ کرتا تھا، مولانا نے میری فرمائش پر اپنی وہ نظم بھی سنائی جو انھوں نے واقعہ کی اطلاع سن کر لکھی تھی، اور بعض اخبارات میں چھپ چکی تھی، جس وقت مولانا نے اپنی پر اثر آواز میں اپنے مخصوص ترنم کے ساتھ وہ نظم سنائی تو سماں بندھ گیا اور بہت سی آنکھیں نم تھیں۔

اجتماع کے علاوہ جو اوقات ملتے تھے، وہ مولانا کی پربہار مجلس کے لئے وقف تھے، اساتذہ وطلباء کا ایک مجمع ہر وقت ان کے گرد رہتا اور حالت یہ تھی کہ۔

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

اجتماع سے فارغ ہو کر اور مولانا عبد الباری صاحب کے یہاں کچھ وقت گزار کر وہ ہمارے مرکز میں تشریف لے آئے، میں نے ایک روز ان سے ان نعتوں کے سنانے کی فرمائش کی جو انھوں نے بہاری ہندی میں لکھی ہیں، اور جو سوامی دھرمی جی گیلانی والے کی طرف سے بعض اخبارات ورسائل میں چھپی ہیں، ان نعتوں میں ان کی محبت، سوز اور بارگاہ نبوی سے عاشقانہ تعلق بغیر کسی تکلف کے

ظاہر ہو گیا ہے، ہندی کے میٹھے بول، مولانا کا ترنم اور نعت کا موضوع اس سب نے مل کر اس میں عجب دلکشی اور دلآویزی پیدا کر دی ہے، مولانا خود بھی اپنی آنکھوں کو قابو میں نہ رکھ سکتے اور سننے والے بھی متاثر اور آبدیدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکتے، مجھے یہ نعتیں بے حد عزیز ہیں، مجھ پر ان کا ایک احسان بھی تھا، انھوں نے مجھے مدینہ طیبہ میں بھی کیف و ذوق بخشا ہے، کبھی جی چاہتا کہ صرف ان نعتوں کے سننے کے لئے گیلانی کا سفر کروں، ایک پاک قطرۂ اشک اس سفر کو وصول کرانے کے لئے کافی ہے بلکہ۔

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

اب یہ دولت گھر بیٹھے مل گئی تھی، اس لئے کیوں نہ اس کی قدر کی جاتی، بار بار فرمائش کی اور مولانا نے بلا کسی تکلف کے فرمائش پوری کی اور "اجلس بنا نؤمن ساعۃ" کا لطف بخشا، افسوس ہے کہ خرابی صحت کی بنا پر مولانا کا قیام طویل نہ ہو سکا، اور مولانا نے وطن کی طرف مراجعت فرمائی، اور ہم سب کہتے رہ گئے کہ۔

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

مولانا کا تعلق خاطر اس ناچیز و بے ہنر سے بڑھتا گیا، اور واقعہ یہ ہے کہ مجھے بھی ان سے جو فکری مناسبت اور قلبی تعلق محسوس ہوتا وہ بالکل ایسا ہی تھا، جیسے اپنے ایک شفیق استاذ اور عزیز بزرگ سے ہوتا ہے ۵۴ء میں مولانا پر پہلی بار قلبی دورہ پڑا اور وہ گیلانی سے پٹنہ لے جائے گئے، جہاں عرصہ تک علاج ہوتا رہا گیلانی واپسی اور طبیعت کے سنبھلنے پر اس ناچیز نے بھی مزاج پرسی کا عریضہ لکھا، اس میں شاید اس شبہ کا اظہار تھا کہ مولانا اپنے اس نیازمند سے کچھ ناراض یا کبیدہ خاطر تو نہیں ہیں، مولانا نے اس پر ایک نہایت پر محبت و پر شفقت مکتوب لکھا جس سے ان کے تعلق کا پورا اظہار ہوتا ہے، اور اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کیسا محبت سے لبریز دل

عطا فرمایا تھا۔

"ابھی ابھی آپ کا نوازش نامہ کیا آیا کہ دیر تک بکائی کیفیت میں الٹ پلٹ ہوتا رہا، اللہ اللہ آپ کے قلب مبارک میں خواہ بشکل وسوسہ ہی سہی یہ خیال کیسے اور کیوں آیا کہ۔

اس مخلص نیاز مند کے دل میں آپ کی طرف سے کسی قسم کا تغیر پیدا ہو گیا، واللہ جن ہستیوں کی محبت و اخلاص کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتا ہوں ان کی طرف سے تغیر پیدا ہونے کی شکل ہی کیا ہے۔ وانشدکم باللہ۔

حقہ مہر بداں مہر و نشان ست کہ بود

اپنی علالت کے ایام میں جب یہ محسوس ہوتا تھا کہ شاید اپنی یہ آخری علالت ہے تو منجملہ دوسرے خیالات کے ایک خیال آتا تھا، جسے شیخ شناوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف لوگوں نے منسوب کیا ہے یعنی وفات کے وقت زبان مبارک پر جاری تھا۔

اهيم بليلى ما حييت وان أمت

أوكل بليلى من يهيم بها بعدى

پہلے مصرعہ کا مصداق تو کسی حیثیت سے اپنے آپ کو قرار دینے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا لیکن دوسرے مصرعہ میں جس آرزو کا اظہار کیا گیا ہے، یہ آرزو اپنے ساتھ بھی آتی اور معاً اسی کے ساتھ آپ کا وجود متمثل ہو کر سامنے کھڑا ہو جاتا، بیماری کے ان طویل دنوں میں کچھ دن بے ہوشی نیم بے ہوشی میں بھی گزرے، لیکن بایں ہمہ آپ کی نقل و حرکت کی خبریں کسی نہ کسی ذریعہ سے ملتی رہتی تھیں، رشک ضرور آتا تھا، جب کوہ مری میں مولانا عبد القادر مدظلہ العالی کی مجلس ذکر میں شرکت کا موقع حق تعالیٰ

کی طرف سے آپ کے لئے مہیا کیا گیا، بڑے مبارک دن تھے جو آپ کے گزرے۔

۲۹ ستمبر ۵۴ء

مولانا کی علالت کا سلسلہ چلتا رہا اور ایسے وقفے بھی آتے رہے کہ مولانا بالکل صاحب فراش ہے، اور کبھی کبھی تو زندگی خطرہ میں نظر آتی، بایں ہمہ مولانا کا علمی ذوق اپنا کام کرتا رہتا، ذرا طبیعت سنبھلتی، تو لکھنے پڑھنے کا کام شروع کر دیتے، اپنے دوستوں اور نیازمندوں کی کسی تحریر یا تصنیف سے متاثر ہوتے تو اپنے تاثر کی اطلاع دیتے اگر کوئی اہم تصنیف شائع ہوتی اور مولانا کو نہ بھیجی جاتی تو شکایت فرماتے، اس خط سے ان کے علمی و ادبی ذوق و شغف کا اندازہ ہوگا جو گویا بستر علالت ہی سے لکھا ہے۔

"اگر یہ خیال فرمالیا گیا تھا کہ جو بیمار آخر بیم و امید کی کشمکش سے نجات پاکر وہاں پہونچ گیا یا پہونچا دیا گیا جہاں سے پہونچنے والوں نے یہ نعرہ بھی لگایا ہے کہ۔

تعالی اللہ ازیں بہتر چہ باشد
کہ از ننگ وجود خویش رستم

"سید احمد شہید" غلام رسول مہر کے تقریظی مضمون[1] کو پڑھ کر خصوصاً مہر صاحب کے حسن انتخاب کی داد فارسی اشعار کے متعلق جو دی گئی ہے، واقعہ یہ ہے کہ اکثر شعروں نے اس کو بھی زندوں کی طرح تڑپا دیا جسے مردہ تصور فرمالیا گیا ہے، بہرحال بیماری نے تو پیچھا نہیں چھوڑا ہے، لیکن کشمکش سے ابھی نجات بھی نہیں ملی ہے بلکہ ادھر کچھ مہینہ ڈیڑھ مہینہ سے کہہ سکتا ہوں کہ شکایات بے شمار کے بعض پہلوؤں میں گونہ تخفیف کی کیفیت محسوس کرتا ہوں۔

---

[1] سید احمد شہیدؒ مصنفہ مولانا غلام رسول مہر پر مفصل تبصرہ شائع شدہ "الفرقان"۔

البعث الاسلامی[1] کا دوسرا شمارہ بھی باصرہ نواز ہوا، بڑے حوصلہ اور بڑی ہمت کا کام ہے، خدا کرے کہ ہمارے مدارس کے خوابیدہ بزرگوں کو جھنجھوڑنے میں یہ آواز کامیاب ہو"

کچھ تو مولانا کی افتادِ طبع اور شاید خاندانی لینت و رفق اور کچھ جامعہ عثمانیہ کے طویل تعلق اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور نئی نسل کے مسلسل سابقہ نے مولانا کی تحریر و تعبیر میں جدید ذہن کی رعایت اور دینی حقائق کے بیان کرنے میں حکمت و تدریج کا پہلو غالب کر دیا تھا اور وہ گویا کلموا الناس علی قدر عقولھم کے مشورہ پر عمل فرماتے تھے اور اس کو "ادع الی سبیل ربك بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ" کی تعمیل خیال فرماتے تھے، وہ اپنے عقائد و خیالات اور علم میں پورے راسخ و متصلب تھے، لیکن اپنے طرز بحث اور طرز تحقیق و استدلال میں بالکل عصری اور بقول مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ وہ دیوبندی العلم مگر ندوی الفکر یا ندوی القلم تھے، اور شاید یہ بھی ہم لوگوں سے اور بالخصوص اس راقم سطور سے مناسبت کی وجہ تھی، ہمارے محترم و مخدوم مولانا عبد الباری صاحب ندوی العلم اور ندوی القلم ہونے کے باوجود اور برسوں یونیورسٹی میں فلسفہ کا درس دینے کے بعد بھی تحریر و تعبیر میں بھی کسی قسم کا لوچ اور جدید اسلوب بیان یا اسلوب استدلال پسند نہیں فرماتے، مولانا گیلانی کی کتاب "اسلامی معاشیات" پہلے طرز فکر اور طرز تحریر کا نمونہ ہے اور مولانا عبد الباری صاحب کی کتاب "تجدید معاشیات" دوسرے طرز فکر اور طرز تحریر کا، جب وہ شائع ہوئی تو شاید مولانا گیلانی کو محسوس ہوا کہ وہ ان کی کتاب کا جواب ہے، شاید اسی سلسلہ میں دونوں مخلص دوستوں اور دیرینہ رفیقوں میں کچھ مراسلت بھی ہوئی اور ہر ایک نے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا، مجھے اس کی اطلاع نہیں، لیکن مجھے ایک مکتوب میں

---

[1] عربی ماہوار رسالہ جو دار العلوم ندوۃ العلماء سے نکل رہا ہے۔

تحریر فرماتے ہیں۔

"(تھانوی المذاق ندوی القلم) بزرگ کا معتوب بنا ہوا ہوں کہ ان کی تازہ کتاب "تجدید معاشیات" کو اپنی کتاب "اسلامی معاشیات" کا تعریضی جواب خاکسار نے خیال کر لیا، خاکسار نے بھی اور ان کے دوست "صاحب صدق" نے بھی مقصد میں ہم دونوں متحد ہیں، لیکن پانی مانگنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ پن بھرن سے کہا جائے ماں! ذرا پانی پلا دے، لیکن ماں! کی جگہ کچھ دوسرے الفاظ دالّہ علی الاموست کا ذکر کیا جائے تو یقیناً اثر بدل جائے گا، حضرت تھانوی ہی سے یہ اظروفہ سنا کرتا تھا، بہرحال حکم "فاصدع بما تومر" کا بھی ہے اور "ادع الیٰ سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة" کا بھی، مکلفین کے اختیار تمیزی کی یہ بات ہے کہ وقت کس کا ہے؟ ۲۷ر دسمبر ۱۹۵۵ء"

لیکن مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ توسع اور ان کی تمام عصریت و حکمت، تحریر و تعبیر اور استدلال ہی میں تھی، عقائد و نصوص اور حدود دین کے بارے میں وہ اتنے ہی متصلب و متشدد اور ویسے ہی غیور و حساس واقع ہوئے تھے، جیسے ان کے اساتذہ و شیوخ کرام اور علمائے حق، جب کبھی وہ تحریف دین کی کوئی کوشش یا دین کی ترجمانی میں کوئی بے اعتدالی، یا آزادی یا غلط اجتہاد دیکھتے تو برداشت نہ کر سکتے، مولانا سندھی مرحوم جب ہندوستان واپس آئے تو ......... ان مرحوم نے بعض ایسے خیالات اور افکار کا اظہار کرنا شروع کیا جن میں توازن کی بڑی کمی تھی، اور جو بڑی غلط فہمیوں اور مغالطوں کا باعث ہو سکتے تھے، ان کے کسی مضمون میں قرآن و حدیث و فقہ سے متعلق بعض ایسے نظریات و "تحقیقات" تھے، جو جمہور اہل اسلام کے عقیدہ سے مختلف تھے، یا ان کی تعبیر میں کوتاہی تھی، مولانا نے مدرسی و جماعتی عصبیت سے

بالکل بے نیاز و بالاتر ہو کر اس مقالہ کی تردید میں ایک پرزور مقالہ لکھا، بعض اہل علم معاصرین مولانا عبید اللہ صاحب مرحوم سے ذاتی واقفیت کی بنا پر ان کو اس شدید مخالفت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے، انھوں نے مولانا کی طرف سے کچھ صفائی پیش کی اور اپنے ذاتی معلومات کی بنا پر ان کے ساتھ نرمی اور حسن ظن کی تلقین کی، مولانا نے اس موقع پر اپنے موقف کی حمایت کی اور مولانا سندھی مرحوم سے اظہار اختلاف اور ان کے افکار و آرار کی کھلی ہوئی تنقید و تردید کو دین کی حمایت کا تقاضا سمجھا، مندرجہ ذیل اقتباس سے ان کے دینی جذبہ اور تصلب فی الدین کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

"میرا تو مقصود ہی اس سے ع "حدی را تیز تر می خواں چو ذوق نغمہ کم یابی" تھا، یہی بتانا چاہتا تھا کہ خواہ وہ ہماری جماعت ہی کا آدمی کیوں نہ ہو، لوگوں میں اس کی بڑائی جس حد تک بھی مسلم ہو لیکن حق کا قدم جب درمیان میں آئے گا تو پھر کسی کا کچھ لحاظ نہیں کیا جائے گا خواہ وہ کوئی ہو" لو ان فاطمة بنت محمد اعاذها الله تعالیٰ سرقت لقطعت یدها" ہمارے دین کا امتیازی نشان ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا مرنے سے پہلے العیاذ باللہ میں بھی اس کا قائل ہو جاؤں گا کہ ابو حنیفہؒ کی فقہ عجمیوں کے قانون سے متاثر ہے، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سرزمین عرب کے ایک خاص تاریخی دور کی اصلاح کی حد تک محدود ہے، قرآنی قوانین کی حیثیت صرف مثالی باتوں کی ہے، بخاری و مسلم، انجیل و توراۃ جیسی محرف کتابوں کے ہموزن ہیں، العیاذ باللہ کیا میں اپنی خودی کے اعتماد کو خدا اعتمادی سمجھنے لگوں گا، قبل اس کے کہ میرے اندر خدا نخواستہ اس قسم کے خیالات کی صداقت واضح ہو، اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ

وہ مجھے اس دنیا سے اٹھالے۔" ۱ر نومبر ۱۹۴۵ء

اس اقتباس سے جو اپنی حمیت اور حفاظت دین کے جذبہ میں ڈوبا ہوا ہے، اندازہ ہو سکتا ہے، کہ عقائد و نصوص اور دین کی ہیئت و حقیقت کی حفاظت میں مولانا کا قدم اور قلم کسی بڑے سے بڑے عالم راسخ سے پیچھے نہیں، دراصل ان کا سارا تنوع طرز تحریر و طریقہ تفہیم میں تھا، ان کی کتابیں اور مضامین نئے اسلوب میں لکھے گئے ہیں، اور کہیں کہیں تو وہ اپنی کتابوں میں تاریخی مواد اس سلیقہ اور ترتیب سے پیش کرتے ہیں، اور اپنے دعوے کو ایسے علمی و تحقیقی انداز میں ثابت کرتے ہیں کہ وہ ایک قدیم مدرسہ کے فاضل اور ایک فقیہ و محدث ظاہر ہونے کے بجائے عصر حاضر کے مصنف اور اجتماعیات و علوم عمرانیہ کے فاضل معلوم ہوتے ہیں، نمونہ کے طور پر مولانا کا مضمون[1] حضرت شاہ ولی اللہ صاحب پر اور مولانا کی محققانہ کتاب "مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت" نیز "اسلامی معاشیات" اور "امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی" ملاحظہ ہوں، مولانا کی اسی جامعیت نے ان کو اپنے معاصر علماء میں ایک امتیاز بخشا تھا، اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو ان کی تصنیفات کا گرویدہ بنا دیا تھا۔

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق

جامعہ عثمانیہ اور حیدرآباد کے قیام نے مولانا کے اندر ایک تبدیلی اور پیدا کر دی تھی، یا یوں کہیے کہ ان کے اندر ایک دبی ہوئی صلاحیت کو ابھار دیا تھا وہ یہ کہ نئے تعلیم یافتہ طبقہ کے بہت سے افراد کے مشاہدہ و تجربہ نے ان کو اس نتیجہ پر پہونچا دیا تھا کہ صرف ظاہری شکل و صورت پر کسی شخص کے قبح باطن یا اس کے بے دین ہونے کا فیصلہ نہ کیا جائے نیز یہ کہ اس قلب و اندرون کی اسلامیت کی قدر کرتے ہوئے، اس کے ظاہر کی اصلاح کی کوشش کی جائے،

---

[1] شائع شدہ الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر۔

اس طرزِ فکر اور طرزِ عمل کے بغیر کوئی شخص جدید حلقہ میں کوئی اصلاحی و دینی خدمت انجام نہیں دے سکتا، یہ راقم حروف جب ۵۶ء میں دمشق گیا تو وہاں اس نے مسلمان نوجوانوں اور خاص طور پر جماعت اخوان سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں میں یہی دو متضاد پہلو پائے، ایک طرف ان کی ظاہری شکل و صورت ہم جیسے مدرسی اشخاص کے لئے انقباض و اعتراض کا موجب تھی، دوسری طرف ان کی ایمانی کیفیات، ان کا جذبۂ اسلامی، ان کی حمیت دینی، ذوق جہاد، نمازوں کی پابندی، عرب قوم پرستی سے بیزاری اور رشتۂ اسلامی پر کامل یقین، الحاد اور اہل الحاد سے عداوت موجب مسرت و انبساط تھی، اور بالآخر یہ دوسرا تاثر پہلے تاثر پر غالب آجاتا، میں نے مولانا کی خدمت میں دمشق سے جو پہلا خط لکھا اس میں اپنی اسی ذہنی کشمکش اور تاثر کا اظہار تھا، مولانا نے اس کا جو جواب دیا وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"بڑی مسرت اس بات سے بھی ہوئی کہ مسلمانوں کی نئی پود کے متعلق آپ پہلے آدمی ہیں جن کے قلم سے میری آنکھوں نے وہی لکھا ہوا پایا جس کا برسوں سے انتظار کرتا رہا، ممکن ہے کہ یہی نقطۂ نظر دوسرے اربابِ فکر و بصیرت کا بھی ہو لیکن جن جنچے تلے الفاظ میں اپنے احساسات کا اس سلسلہ میں آپ نے اظہار فرمایا ہے خاکسار تو نکتہ چینیوں سے اتنی جرأت بھی نہیں کر سکتا، قالب و قلب میں اختلاف کی یہ صورت جب پیش آجاتی ہے تو قلب ہی پر زیادہ نظر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، میرے خیال میں تو قالب و قلب یا ظاہر و باطن کے اختلاف کی یہ شکل اسلامی تاریخ میں نئی نہیں ہے، آغاز تو عہد صحابہ ہی میں معلوم ہوتا ہے کہ ہو چکا تھا، عمامہ پر "پر عقاب" لگا کر مدینہ میں داخل ہونے کا واقعہ کیا آج کا ہے؟ اور "پر عقاب" ہی کیا خز کے استعمال کی کثرت کے ساتھ ساتھ

خود مدینہ منورہ کے باشندوں میں تابعین و تبع تابعین ہی کے عہد سے جو تبدیلیاں
لباس میں، وضع میں، قطع میں، رہنے سہنے کے طریقوں میں مسلسل ہوتی رہیں تاریخ
ان کی شہادتوں سے معمور ہے، لیکن قلب اگر درست ہے تو قالب کی ان تبدیلیوں
کو اکابر برداشت ہی کرتے چلے آرہے ہیں، اخوان شام کے دینی جوش و خروش
اخلاص و صداقت النصح للّٰہ ولرسولہ وللمومنین کی جن قلبی
خصوصیتوں کا آپ نے ذکر فرمایا ہے، اس کو جانتے ہوئے صرف قالب کے
مطالبات میں ان کی کوتاہیاں اپنا خیال تو یہی ہے کہ درگذر کے قابل نہ بھی
ہوں، لیکن قول لیّن کا مستحق ان کو ضرور بنا دیتی ہیں، ہمارے علماء اگر فظاظت
و غلاظت ہی سے اس سلسلہ میں کام لینا ضروری قرار دیں گے تو کیسے کہا جا سکتا
ہے کہ قرآن کا نص محکم (لانفضوا من حولک) کی شکل میں ان کے
سامنے نہ آئے۔ ۲۸ رمئی ۱۹۵۶ء"

یہاں اس بات کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا کہ مولانا کو تاریخ اسلام سے فطری ذوق
اور اس سرزمین سے جہاں اس تاریخ کی بنیاد پڑی ہے، ایک فطری لگاؤ تھا، شاید اسی راستہ
سے ان کو عالم اسلام بالخصوص بلاد عربیہ کی سیاحت کا بڑا ارمان اور دیرینہ تمنا تھی،
رسالہ صبح صادق، لکھنؤ میں میرے خواہرزادہ عزیز مولوی محمد ثانی سلمہٗ کا سلسلہ مضامین "جہاں
مسلمان بستے ہیں" کے عنوان سے نکلتا رہتا تھا جس میں مختلف ممالک اسلامیہ کا تعارف ہوتا،
مولانا نے لکھنؤ آمد کے موقع پر بتلایا کہ وہ اس کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں، اس تقریب سے
انھوں نے اپنے شوق سیاحت کا تذکرہ اور اس کے بعض ابتدائی اقدامات کا ذکر فرمایا، راقم سطور
نے دمشق پہونچ کر جس ہوٹل میں قیام کیا تھا حسن اتفاق سے اس کا نام "الیرموک" تھا، میں نے

مولانا کی خدمت میں وہیں سے خط لکھا، دمشق پھر یرموک کے نام نے مولانا پر ایک وجد کی کیفیت طاری کردی اور باوجود آخری علالت اور نقاہت کے ان کے قلم میں جوانی کی توانائی اور رعنائی پیدا ہوگئی، اور میرے خط کے جواب میں انھوں نے یہ وجد انگیز خط لکھا، جو ان کی ممتاز ادبی تحریروں میں شامل کئے جانے کا مستحق ہے۔

"کس نے کہاں کن حالات میں اس زار و نزار، بیمار و دور افتادہ دہقانی کو یاد فرمایا سوچتا ہوں، اور گو کھڑا ہونا بھی میرے لئے آسان نہیں ہے، مگر بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ سجدۂ شکر یاد دلانے والے کے قدموں پر ادا کر کے رقص کروں، خدا ہی جانتا ہے کہ الیرموک کی موجوں نے کن دبے دبائے تاریخی محفوظات اور ان سے پیدا ہونے والے جذبات میں طوفانی ہل چل برپا کردی ہوگی، جب اپنے آپ کو اس حال میں پا رہا ہوں کہ مکتوبہ شکل میں صرف الیرموک کے لفظ پر نظر پڑتے ہی تخیل کو آپ کے مشاہدے سے جو تھوڑا بہت سہارا ملا تو گھنٹوں یرموک اور جو کچھ اس کے ساحل پر گزرا اسی میں غرق ہوگیا، الواقوصہ کی وادی میں پہاڑوں کے کھڈ میں ٹپک ٹپک کر کافر گر رہے ہیں، اور ان کی بڑی تعداد یرموک برد ہو رہی ہے، ہم آگے بڑھ رہے تھے، دنیا پیچھے ہٹتی جاتی تھی، پھر بازی پلٹی ہوا جو کچھ ہوا، یہی کیا غنیمت نہیں ہے کہ الیرموک کے کنارے مسلمانوں کا پھریرا لہرا رہا ہے فندق الیرموک شہر سے چاہئے تو یہی تھا کہ کافی فاصلہ پر ہو گو اس عہد میں مسافت و فاصلہ کا سوال باقی نہیں رہا ہے، یا آبادی دمشق کی پھیل کر الیرموک تک پہونچ گئی ہے۔[۱]

[۱] دراصل ہوٹل کا نام صرف تبرکاً الیرموک رکھا گیا ہے، ورنہ الیرموک کے نام کا دریا اور اس کے ساحل کا میدان جنگ، دمشق سے بہت فاصلہ پر شرق اردن کے حدود میں واقع ہے، علی

بہر حال آپ نے بڑا احسان کیا جس سرزمین برکتوں سے بھری ہوئی کا تصور سالہا سال تک پاتا رہا ہوں، اس کی چشم دید جھلک آپ کے موئے خامہ کے ذریعہ اس کوردہ گاؤں میں پہونچ گئی فجزاکم اللہ عنا خیر الجزاء۔"

دمشق کے نام سے مولانا کے تاریخی اور علمی ذوق میں حرکت پیدا ہوئی اوران کے تصور نے ان کو ایک گاؤں کے گوشۂ عزلت اور بستر علالت سے اٹھا کر شام کے قدرتی مناظر، تاریخی آثار اور علمی مراکز میں پہونچا دیا اور وہ یہ بالکل بھول گئے کہ وہ قلب کے مریض اور بقول خود ایک کہف کے گوشہ نشین ہیں، فرماتے ہیں۔

"واقعی آپ کا وجود مسعود اس وقت کم از کم میرے لئے سراسر رشک و غبطہ بنا ہوا ہے، خیال شام کے ان مناظر کا ایک طرف ستاتا ہے، جن کی تفصیل کرد علی صاحب کے "خطط الشام" میں پڑھ چکا ہوں، اور دھیان ان اسلامی تعمیرات کی طرف منتقل ہوتا ہے جنھیں عمر بن عبد العزیز جیسے بزرگوں نے اس لئے باقی رکھا کہ وہ غیظاً للقلوب الکفار نظر آتے ہیں، سب سے زیادہ تڑپ دل میں ان کتابوں کی پیدا ہو رہی ہے جن سے شام کے کتب خانے پٹے پڑے ہوں گے، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ و ابن قیم، علامہ ذہبی السبکی وآلہ کے وطن میں جو کچھ مل رہا ہو اسے ملنا ہی چاہئے یوم المحاضرہ کے بعد تو ہفتہ بھر آپ کا ان ہی چیزوں کی سیر و تماشہ میں بسر ہونا ہوگا معلوم نہیں کہ دول الاسلام ذہبی کا مکمل نسخہ اور مرآۃ الزمان ابن الجوزی السبط کی طباعت کا انتظام کیا گیا ہے، جی چاہتا تھا، کہ مرنے سے پہلے کم از کم دونوں کتابوں کے مطالعہ کا موقع مل جاتا، ابن عساکر کی تاریخ دمشق خدا جانے مکمل ہوکر بازار میں آگئی یا نہیں، میرے پاس تو صرف ابن بدران کی تلخیص کی ساتویں جلد تک ہے، کیسی

عجیب بات ہے کہ دو مختلف وادیوں کے شیخ یعنی شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور الشیخ الاکبر ابن عربی دونوں کے لئے دمشق کے آغوش میں جگہ نکل آئی۔ اس زمانہ میں شیخ الاسلام کے عقیدتمندوں کی تو کافی جماعت ہوگی، کیا بے چارے الشیخ الاکبر کی اکبریت کو باقی رکھنے کے لئے بھی کوئی کھڑا کر دیا گیا ہے، ابن تیمیہ اور ان کے تلامذہ راشدین کی کوئی غیر مطبوعہ نادر کتاب آپ کی پسند کی کیا ملی؟ ان بزرگوں کے لئے تو یورپ کے عصری مذاق کی رو سے چاہیئے تھا کہ الگ الگ سوسائیٹیاں شام میں بن جاتیں، جو ان کی اصل کتابوں کو بھی شائع کرتیں اور ان کے علمی و نظری اختراعات و تحقیقات پر کام کرتیں یہ وہ اسی قسم کے وساوس و اوہام میں اپنے بستر علالت پر ڈھائی سال سے کروٹیں بدل رہا ہوں؟ (۲۸ رمئی ۱۹۵۶ء)

اس مکتوب گرامی کا جواب دینے کی نوبت نہ آئی تھی کہ ترکی کا سفر پیش آگیا، قسطنطنیہ سے تو کسی خط کے لکھنے کی نوبت نہ آئی کہ سارا دن وہاں کے تاریخی آثار کے دیکھنے میں گزرجاتا، مگر قونیہ پہونچ کر اور مولانا روم کے مزار کی زیارت کر کے بے اختیار مولانا یاد آئے اور ان کو اور مخدومی مولانا عبدالماجد دریابادی کو اپنے تاثرات لکھنے کو جی چاہا وہیں قونیہ کے یک روزہ قیام میں خط لکھا اور ڈاک کے سپرد کیا، دمشق پہونچ کر اس کے جواب کی توقع تھی، معلوم نہیں دمشق و یرموک کی طرح مولانا اور ان کے محبوب شہر کا نام سن کر مولانا کے قلب پر کیا اثر ہوتا اور ان کے قلم سے کیا تاثرات ظاہر ہوتے، دمشق واپس ہوا تو برادر معظم ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کا گرامی نامہ ملا، جس نے یہ خبر سنائی کہ مولانا سفر آخرت پر روانہ ہوگئے اور اپنے خالق سے جا ملے، یہ ایک دینی، علمی، ادبی حادثہ نہ تھا، اور میرے لئے ایک ذاتی حادثہ بھی، میرا تعلق مولانا سے صرف ذہنی و علمی ہی نہ تھا، شخصی اور قلبی بھی تھا، مسافرت میں ایسا معلوم ہوا کہ ایک بزرگ خاندان کا

سایہ سر سے اٹھ گیا، جہاں تک علم و دین اور فضیلت و تحقیق کا تعلق ہے، مولانا ہماری گزشتہ دینی تعلیم کے بہترین نمونوں میں تھے، اور مدارس کے دور انحطاط کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ۔

ترکش مارا خدنگ آخریں

بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے، وسعت نظر، وسعت مطالعہ، رسوخ فی العلم اور ذکاوت میں ان کی نظیر اس وقت ممالک اسلامیہ میں ملنی مشکل ہے، والغیب عنداللہ تصنیف و تالیف کے لحاظ سے وہ عصر حاضر کے عظیم مصنفین میں شمار کیئے جانے کے مستحق ہیں، انھوں نے اپنی کتابوں میں جو مواد جمع کر دیا ہے، وہ بیسیوں آدمیوں کو مصنف اور محقق بنا سکتا ہے، اس ایک آدمی نے تن تنہا وہ کام کیا ہے، جو یورپ میں پورے پورے ادارے اور منظم جماعتیں کرتی ہیں، ان جیسا آدمی برسوں میں پیدا ہوا تھا، اور اب ان جیسا آدمی شاید برسوں میں بھی پیدا نہ ہو۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اللہ تعالےٰ جانے والے پر اپنی بے شمار رحمتیں نازل فرمائے اور اپنے انعامات سے مالامال کرے کہ وہ بڑا دردمند، بڑا پر محبت دل رکھتا تھا، اور اس کے قلب و دماغ کی ساری صلاحیتیں کسی نہ کسی طرح اسی "الاسلام" کی خدمت میں (جس کے سوا کوئی دین اس کے یہاں قبول نہیں) اور اسی "النبی الخاتم" کی ابدی نبوت و سیادت کے ثبوت میں اور اسی کے علوم کی نشر و اشاعت میں جس کے بعد کوئی رسول آنے والا نہیں صرف ہوئیں، وہ جب تک زندہ رہا اسی کے گن گاتا رہا اور اپنے دیس کی بے تکلف بولی میں اس کو خطاب کر کے سناتا رہا۔

تجھ سے توڑوں تو کس سے جوڑوں
تیری گلی کی دھول بٹوروں

یقین کامل ہے کہ خدا کی رحمت کاملہ نے اس کو اسی محبوب کے عشاق اور اس کے دین کے مخصوص خدام میں شامل فرمایا ہوگا، جس کا کام کرتا ہوا وہ زندہ رہا اور جس کا نام لیتا ہوا وہ دنیا سے رخصت ہوا۔

مرگ مجنوں پہ عقل گم ہے میرؔ
کیا دِوانے نے موت پائی ہے
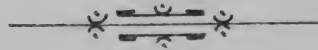
# مولانا سید حسین احمد مدنیؒ[1]

۱۹۲۸ء کی بات ہے لکھنؤ کی مشہور سفید بارہ دری میں آل پارٹیز کانفرنس ہورہی تھی اور نہرو رپوٹ پیش تھی شب کی نشست میں مرحوم تصدق احمد خاں شروانی نے کسی تجویز پر تقریر کی اور اس میں کچھ اعداد و شمار پیش کیے، ان کی تقریر کے بعد ایک بزرگ کھڑے ہوئے جبہ و دستار میں ملبوس عربی قبا اور ہندوستانی عمامہ، لیکن عجیب بات یہ کہ شروانی مرحوم (جو ایک کہنہ مشق سیاسی لیڈر تھے) کے پیش کردہ بعض اعداد و شمار کی تصحیح فرمائی، متجسس نگاہوں کا جواب تھا "مولانا حسین احمد مدنی"۔

اس کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک جلسہ میں جو طلبہ کے درس قرآن کی تقریب مسرت میں منعقد ہوا تھا مولانا کو خالص دینی و علمی تقریر کرتے سنا جس میں آپ نے قرآن کے فضائل و آداب بیان کیے اور اس کی توجیہ فرمائی کہ بعض فرقوں کو قرآن مجید کیوں نہیں یاد ہوتا نیز قدیم نصاب درس میں معقولات کی زیادتی اور قرآن مجید کے درس و مطالعہ کی کمی اور اس کی حق تلفی پر تنقید فرمائی، ایک دوبار لاہور کی طالب علمی کے زمانہ میں مولانا کی حج سے واپسی کے

---

[1] یہ مضمون مکاتب شیخ الاسلام جلد دوم کے مقدمہ اور ایک دوسرے مضمون کے اقتباسات پر مشتمل ہے مقدمہ مولانا کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔

موقع پر زیارت کی، حافظہ پر زور ڈالا، تو یہی ابتدائی نقوش ابھرے، ایک سبزۂ آغاز طالب علم جس نے عقیدت و ارادت کے حلقہ سے دور نشو و نما پایا ہو، اور سیاسی میدان سے نہ فطری مناسبت رکھتا ہو، نہ طبعی عمر، ایک نامور عالم اور ایک مصروف خادم قوم کی زیارت و دید سے اتنا ہی مشرف اور سعادت اندوز ہو سکتا ہے۔

۱۹۳۰ء ۳۱ء میں ہمارا مکان لکھنؤ میں مستقل قیام گاہ قرار پایا، راقم سطور کے برادر معظم حکیم ڈاکٹر مولوی سید عبد العلی صاحب دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ رشید تھے، حضرت سید احمد شہیدؒ سے نسبت خاندانی کی بدولت بزرگانِ دیوبند اس خاندان کے افراد سے ہمیشہ سے محبت و شفقت و یگانگت کا معاملہ کرتے رہے، بھائی صاحب جب تک دیوبند میں رہے، شیخ الہندؒ کے الطاف و عنایات سے سرفراز رہے، بیعت و ارادت کا اگر کبھی خیال آتا تو نظر حضرت ہی کی طرف جاتی، ابھی اس ارادہ کی تکمیل نہیں ہونے پائی تھی کہ حجاز کا سفر اور مالٹا کی منزل پیش آگئی، واپسی میں بھی اس کا موقع نہیں مل سکا، اب اس ارادہ کی تکمیل اس سے ہوئی جس کو حضرت کے بہت سے ارادوں کی تکمیل کرنی تھی، لکھنؤ بہت سے اسباب و خصوصیات کی بنا پر قومی و سیاسی تحریکوں کا ایک بڑا (غالباً سب سے بڑا) مرکز تھا، کانگریس سے لے کر معمولی کمیٹیوں اور سیاسی انجمنوں کے اجلاس لکھنؤ میں ہوتے تھے، اور مولانا کو اکثر ان میں شرکت کرنی ہوتی تھی، سیاسی انہماک، کانگریس کے جلسوں اور کانفرنسوں کی ہمہ وقت شرکت بھی، کبھی مولانا کے مزاج، افتاد طبع اور معمولات میں فرق نہیں پیدا کر سکی، سیاسی رہنماؤں اور مندوبین کی قیام گاہ لکھنؤ میں عموماً بڑے ہوٹل، قیصر باغ کے پرانے محلات یا امراء کی کوٹھیاں ہوتی تھیں، مولانا کو اس ماحول سے کبھی مناسبت نہیں رہی، ان کو ایک سادہ بے تکلف مخلصانہ قیام گاہ جہاں سے مسجد قریب ہو اور جہاں معمولات آسانی سے پورے ہو سکتے ہوں، اور جہاں رہنے اور

کھانے میں تکلفات نہ ہوں، ہزار درجہ پسند ہے، ہمارا محلہ (بازار جھاؤلال) ہمیشہ سے اس بارے میں ممتاز رہا ہے کہ وہاں صحیح العقیدہ مسلمان رہتے ہیں، والد صاحب (مولانا سید عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ) کی وجہ سے اور ندوہ کے تعلق سے یہ محلہ اور اس کی مسجد ہمیشہ علماء اور فضلاء کا مرکز رہی ہے، مولانا نے اس محلہ اور ہمارے مکان کو لکھنؤ کے قیام کے لئے منتخب فرمالیا، اور آج بیس برس ہوتے ہیں کہ ایک مرتبہ بھی اس وضعداری اور معمول میں فرق نہیں آیا، ایسا بھی ہوا ہے کہ سلیم پور ہاؤس یا شاہی بارہ دری کے شاندار ایوان کے جلسہ اور مباحثوں میں ایک گھنٹہ شریک رہے اور کھانا ہمارے "شیرازی" دسترخوان پر کھایا، خواہ کتنی دیر لگ جائے، مسلم پارلی منٹری بورڈ کے زمانہ میں کسی حلقۂ انتخاب میں تشریف لے گئے، دیر رات گئے تشریف لائے، معلوم ہوا ابھی کھانا نہیں کھایا، ماحضر تناول فرمایا اور استراحت کی، اس گھر کی یہی ادا (سادگی) آپ کو پسند تھی، اگر کبھی کچھ تکلف کیا گیا تو شکایت فرمائی۔

مسلم پارلی منٹری بورڈ، تحریک مدح صحابہؓ وغیرہ کے موقع پر آپ کا قیام کئی کئی دن مسلسل رہا، محدود و مختصر قیام گاہ اور سادہ طرز رہائش میں گھر والوں کو معزز مہمانوں کو قریب سے دیکھنے اور مطالعہ کرنے کا زیادہ موقع ملتا ہے، جو چیز خاص طور پر محسوس کی وہ دن میں ان کی شگفتگی، مستعدی و بیداری، ہر ایک کی طرف توجہ و التفات، اور شب کو معمولات کی پابندی و مشغولی، ان آنکھوں نے متضاد مناظر بھی دیکھے، بعض مقامی تحریکوں میں عقیدت و ارادت کا جوش بھی دیکھا، ان کی نیازمندی اور اظہار جاں نثاری بھی دیکھا، پھر انھیں آنکھوں نے زود رنج و طوطا چشم عوام کو سخت برہم اور مغلوب الغضب بھی دیکھا اور ان کے ذمہ داروں کو تند و تلخ الفاظ رو در رو کہتے بھی سنا، لیکن مولانا کی حالت یکساں پائی، بعض سیاسی تحریکوں کے زمانہ میں بھی مشاہیر کو نیازمندانہ حاضر ہوتے اور تعارفی و سفارشی خطوط لکھواتے بھی

دیکھا، پھر ان کی تلخ نوائیاں اور احسان فراموشیاں بھی دیکھیں، اس کو تنقیدی ذہن کہئے یا حقیقت بینی کہ طبیعت نے محسوس کیا کہ آنے والوں اور بیٹھنے والوں میں مولانا کے اصل ذوق اور اصل فن سے استفادہ کرنے والے بہت کم نظر آئے، زیادہ وقت اشخاص یا جماعتوں کے تذکرے یا سطحی تبصرے یا تعویذ و دعا کی فرمائش میں گزرتا، مولانا اپنی فطری عالی ظرفی سے کسی کو گرانی یا ناگواری کا احساس نہ ہونے دیتے، مگر جہاں کوئی تصوف و سلوک کا مسئلہ پوچھ لیتا یا کوئی علمی بحث چھیڑ دیتا، یا اہل اللہ کا تذکرہ کرنے لگتا تو فوراً چہرہ پر بشاشت ظاہر ہوتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ دل کا ساز کسی نے چھیڑ دیا۔

صرف باہر ہی نہیں اس ناچیز نے مولانا کو اپنے مستقر پر بھی دیکھا، چار مہینے دیوبند میں قیام رہا، تقریباً مہینہ بھر خاص مولانا کے دولتکدہ پر، پھر اپنے اصرار سے دار الشفاء کے ایک حجرہ میں (جو مولانا کے دروازہ سے متصل اور گذرگاہ پر واقع ہے) منتقل ہوگیا، یہ قیام گاہ بھی زیر سایہ ہی تھی، آتے جاتے ملاقات، چمن میں صبح و شام نشست و برخاست اخبار رہتی، صبح کی چائے میں پابندی سے حاضری (جس کی مولانا نے شرط فرمادی تھی) اس زمانۂ قیام میں مہمانوں کی کثرت اور اس پر مولانا کی مسرت و بشاشت بچشم خود دیکھی، مہمانوں کی کوئی تعداد مقرر نہیں تھی، مستقل مہمان خاصی تعداد میں الگ تھے، بعض اوقات خود اندر سے کھانا لاتے، مہمانوں میں ہر طبقہ کے لوگ تھے، ارکان جمعیت، مشاہیر علماء، سیاسی کارکن نوجوان ورکر، جیل سے آنے والے، خفیہ پولیس کے خفیہ اشخاص، بیعت کے خواہش مند، تعویذ کے طالب وغیرہ وغیرہ، یہیں مولانا ابو المحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ کی پہلی زیارت ہوئی کئی ہفتے ان کی ہمسائگی رہی اور ان کے محاسن کا علم ہوا، بخاری و ترمذی کے درس میں شرکت کرتا تھا، مولانا کا استحضار اور مسئلہ کی مبسوط تقریر ان لوگوں کے لئے نئی بات ہے،

جو مولانا کی سیاسی مصروفیتوں اور سفروں کی کثرت سے واقف ہیں، ایک مسئلہ پر بعض اوقات تین تین چار چار دن مسلسل (۶۰ منٹ کے تعلیمی گھنٹہ میں) تقریر جاری رہتی اور مسئلہ کا "ما لہ وما علیہ" ائمہ کے اختلاف ومذاہب اوران کے دلائل وماخذ، متن واسنادو رجال کی بحثیں برجستہ اس سب پر مولانا کی قرأت حدیث، مولانا کا مخصوص دلکش لہجہ اوردارالحدیث کی روحانی وپرسکینت فضا ابھی تک آنکھوں میں ہے، اور گویا اس وقت بھی بالسند المتصل الی امیرالمومنین فی الحدیث ........ کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے، درمیان میں طلبہ کے سوالات کا (جن میں غیر متعلق بھی ہوتے) تحمل کے ساتھ جواب دیتے، آخر سال میں درس کی مصروفیت اتنی بڑھ جاتی کہ عصر کے بعد بھی درس، عشاء کے بعد دیر رات تک درس، صبح کی نماز کے بعد درس، اچھے اچھے مستعد طالب علموں کی ہمت جواب دے جاتی، لیکن مولانا کی مستعدی، نشاط اور قوت میں فرق نہ آتا۔

یہ ۳۲ئہ کا زمانہ تھا، مولانا کے سفر کے پروگرام پہلے سے مرتب ہوتے، اکثر جمعہ باہر ہی گزرتا، اللہ تعالیٰ نے جس طرح داؤد علیہ السلام کے لئے لوہے کو موم کردیا تھا "وَأَلَنَّا لَهُ الْحَدِيدَ"، مولانا کے لئے سفر سہل فرمادیا تھا، ع

ما آب من سفر الا الی سفر

مجھے قرآن مجید کی تفسیر کے مطالعہ کا شوق تھا اس میں اشکالات پیش آتے تھے، جو بعض مرتبہ کسی کتاب سے حل نہ ہوتے، مولانا نے جمعہ کی نماز کے بعد کا وقت مرحمت فرمایا تھا کہ اپنے اشکالات کو پیش کروں، مگر تھوڑے ہی جمعے میرے حصہ میں آئے، مطالعہ کے لئے بعض سیاسی کتابیں حکومت خود اختیاری وغیرہ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے رسائل عنایت فرمائے، دیوبند کے قیام کی برکت تھی کہ انگریزوں سے نفرت میں (جن کے

جراثیم میرے اندر موروثی طور پر تھے) شدت پیدا ہوئی، بعد میں اتنا اضافہ ہوا کہ ایک انگریز ہی نہیں، سارا یورپ ہی اس وقت کفر و مادیت کا علمبردار ہے، اور اس کے زوال کے بغیر دین و اخلاق کا عروج اور اسلام کی دعوت کا پھلنا پھولنا مشکل ہے، یہ صرف کسی ایک حکومت اور کسی ایک ملک کی غلامی کا سوال نہیں، سوال ایک پوری تہذیب ایک مستقل نظام فکر اور ایک عالمگیر دعوت کا ہے، جو پیغمبروں کی لائی ہوئی تعلیمات اور ان کے نتائج و اثرات کے بالکل ضد واقع ہوئی ہے، وہ کیا وقت اور ماحول تھا جس میں حضرت موسیٰؑ نے بڑے اضطرار سے یہ دعا کی تھی "ربنا انک اٰتیت فرعون وملأہ زینۃ واموالاً فی الحیٰوۃ الدنیا لیضلوا عن سبیلک ربنا اطمس علیٰ اموالھم" الآیۃ یہ بات پورے یورپ کے عالمگیر اقتدار اور اس کی سحر انگیز ترقی ہی کو دیکھ کر سمجھ میں آئی، انگریز مشرق میں.... لادینی و مادہ پرست یورپ کا ایک کامیاب ایجنٹ تھا، اور ہم اہلِ مشرق کو سب سے پہلا اور سب سے بڑا واسطہ اسی سے پڑا، اس لئے اس سے ہماری نفرت بالکل قدرتی امر ہے لیکن الکفر ملۃ واحدۃ - ع

این خانہ تمام آفتاب است

اس تہذیب اور اس دعوت کے علمبردار امریکہ، روس اور خود ایشیا کے وہ لادینی ممالک اور ریاستیں ہیں جنھوں نے یورپ کے نظام فکر اور نظام حیات کو پورے طور پر اپنا لیا ہے، نیز یورپ سے عالم اسلامی کو جو دینی، ایمانی، اخلاقی نقصان پہونچا ہے، وہ ان مادی نقصانات سے کہیں بڑھ کر ہے، جو غیر ملکی حکومت سے ان ممالک کو پہنچا ہے، بہر حال انگریز سے یہ مخصوص نفرت بھی قابل قدر چیز تھی، اور اس میں شبہ نہیں کہ اس میں اس ماحول، مولانا کی صحبت اور مطالعہ کو خاص دخل تھا۔

دیوبند کے قیام میں میرے لئے دل بستگی کا واحد ذریعہ مولانا کی ذات گرامی تھی، میری ذہنی و تعلیمی پرداخت، اس انداز سے ہوئی تھی کہ میرے لئے وہاں کی درسی و مدرسی ماحول میں دلچسپی کا کم سامان تھا، لیکن مولانا کی ایک نگاہِ التفات، ایک تبسم، کسی وقت شفقت سے کچھ پوچھ لینا سارا بوجھ ہلکا کر دیتا اور دل دیر تک اس کا مزہ لیتا رہتا۔

رجب کے آخر یا شعبان کی ابتدا میں مکان واپس آگیا، مولانا کی آمد و رفت اور قیام کا سلسلہ برابر جاری رہا اور ہم لوگوں کو خدمت کا شرف حاصل ہوتا رہا، مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے زمانہ میں ایک حلقۂ انتخاب میں معیت و ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا، مولانا ہمارے ضلع (رائے بریلی) میں دورہ کرنے والے تھے، مسلسل سفروں سے خستہ ہو رہے تھے، لوگوں کو اپنے کام سے کام ہوتا ہے، کسی کی صحت و راحت کی پرواہ نہیں کرتے، بھائی صاحب نے خستگی و تکان محسوس کر کے مجھے ساتھ کر دیا کہ رائے بریلی پہنچ کر ایک دو روز کے لئے اپنے یہاں (دائرہ شاہ علم اللہ) میں مولانا کے آرام کا اہتمام کرنا اور اس کی کوشش کرنا کہ مولانا کچھ وقت سکون و راحت کے ساتھ گذار دیں، جائس (نصیر آباد) کے حلقہ میں دورہ تھا، کار کا سفر تھا امیدوار صاحب بھی جو یوپی کے ایک مشہور مسلمان بیرسٹر ہیں، ہمراہ تھے، اس سفر سے اندازہ ہوا کہ مولانا اس کام کو اپنا ایک دینی فرض سمجھ کر اور ایک عقیدہ و ارادہ کے ماتحت کر رہے ہیں وہی بے غرضی، وہی مستعدی وہی جفاکشی جو ایک سپاہی میں میدان جنگ کے اندر ہوتی ہے، جمعہ کی نماز ایک قصبہ کی جامع مسجد میں پڑھی، خطیب صاحب حضرات دیوبند کی تکفیر کرنے والوں میں تھے، انھوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر بعض بزرگوں کے متعلق بہت کچھ کہا، مولانا سنتوں سے فارغ ہو کر خاموش بیٹھے تھے، نماز ہوئی خاموش تشریف لے آئے، سفر کے آخر تک کبھی بھول کر بھی خطیب صاحب کا تذکرہ نہیں کیا، امیدوار صاحب نے کھانے کا پر تکلف اہتمام کیا تھا، (جیسا کہ امیدوار صاحبان کرتے ہیں، اور

حلقۂ انتخاب کے مقربین توقع رکھتے ہیں) مولانا نے اپنے ساتھ ایک ہی پلیٹ میں شریک کیا اور اس قدر جلد ہاتھ اٹھالیا کہ میں سمجھ گیا کہ وہ قوت لایموت کے طور پر اس کھانے کا استعمال جائز سمجھتے ہیں، رائے بریلی میں ایک شب قیام فرمایا، حضرت شاہ علم اللہ (جد امجد حضرت سید احمد شہیدؒ) کی مسجد میں دیر تک تنہا مراقب رہے، نکلنے کے بعد گھر میں کچھ دیر بیان فرمایا جو محض عالم آخرت، عالم ارواح اور برزخ کی زندگی سے متعلق تھا، چلتے وقت اس مقام کے متعلق اپنے باطنی تاثرات کا اظہار کیا اور طویل قیام کی خواہش ظاہر کی، جس کی مولانا کی مصروف و متحرک زندگی میں بہت کم گنجائش تھی۔

پھر وہ ہنگامہ خیز دور آیا جب مولانا کی رائے اور سیاسی بصیرت، عام مسلمانوں کی خواہش اور جذبات اور اس وقت کی مقبول قیادت کے سیاسی فکر سے بالکل مختلف تھی، مولانا نے پوری قوت اور بے باکی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا، تقسیم کے خطرات و نقصانات بیان کیے، اور اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اپنے خیالات کی دعوت و تبلیغ کے لیے سارے ملک کا دورہ کیا، جا بجا تقریریں کیں، متعدد رسائل و مقالات شائع کیے، اس وقت مسلمانوں پر ایک اعصابی کیفیت طاری تھی جس کے دو بڑے محرک تھے، ایک برادران وطن کی تنگ نظری اور کم حوصلگی کا طویل و مسلسل تجربہ جو انگریزی حکومت میں سالہا سال سے ہو رہا تھا، چنانچہ اس تحریک میں وہی حلقہ پیش پیش تھا جس کو دفتروں، تعلیم گاہوں اور شہری زندگی میں اس سے سابقہ پڑتا تھا، دوسرا محرک مسلمانوں کی قومی قیادت کا مزاج تھا، اس لیڈر شپ نے مسلمانوں کے جذبات کو اتنا متحرک و مشتعل کر دیا تھا کہ ان میں کسی مخالف رائے کے سننے اور برداشت کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی تھی، اور کسی مسئلہ پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنے اور اس کے نشیب و فراز کے سوچنے کے حال اور کیفیت ہی میں نہیں تھے، مولانا نے

خلوص، عزم اور احساس فرض نے اس کیفیت کو جو ایک واقعہ تھا، تسلیم کرنے اور اس کے سامنے سپر ڈالنے سے انکار کر دیا اور انھوں نے اپنے عقیدہ اور ضمیر کے مطابق رائے عامہ کی اس طاقت کے سامنے کلمۂ حق کو اپنا فرض اور افضل الجہاد سمجھا، نتیجہ یہ ہوا کہ سفروں اور جلسوں میں وہ سب کچھ پیش آیا، جو مولانا کی شخصیت ان کی سابقہ خدمات ان کے علمی و دینی مقام کے بالکل شایان شان نہ تھا، اس وقت ایک طبقہ تھا، جو سطح کی چیزوں کے علاوہ باطنی کیفیات کا بھی ادراک رکھتا تھا، وہ ان واقعات سے جو مختلف مقامات پر پیش آرہے تھے، سخت تکلیف محسوس کرتا تھا، اور مولانا کے علو مقام، للّٰہیت و بے نفسی کی کھل کر شہادت دیتا تھا، اور ان واقعات کو مسلمانوں کے حق میں مضر و نامبارک سمجھتا تھا، مجھے یاد ہے کہ ایک ایسی ہی مجلس میں جب سید پور کے اسٹیشن کا واقعہ کسی اخبار سے پڑھ کر سنایا جا رہا تھا، اس مجلس میں حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب فرط تاثر سے رو پڑے، مشکل سے کوئی ایسا تھا جس کی آنکھیں نم نہ ہوں، اس وقت مولانا کی عقیدت و محبت اور ان کے خلوص و للّٰہیت پر اعتماد ایک جزیرہ سا بن کر رہ گیا تھا، جس کے چاروں طرف ناراضگی، برہمی اور بدنامی کا سمندر پھیلا ہوا تھا، اس کی موجیں اس جزیرہ کے کنارے سے آکر ٹکراتیں اور واپس جاتیں، اس جزیرہ پر وہ ہزاروں لاکھوں مسلمان آباد تھے۔ جن کو اب بھی مولانا کے خلوص و للّٰہیت پر اعتماد تھا، اور جو اس پر ایمان رکھتے تھے کہ مولانا سے، تمام اصحاب اجتہاد کی طرح خطائے اجتہادی تو ممکن ہے، لیکن خود غرضی، موقع پرستی، سربلندی اور قیادت کی خواہش، حب جاہ وہ چیزیں ہیں، جن سے اللہ تعالٰے نے مولانا کو بہت بلند کر دیا ہے، لکھنؤ میں ہمارا مکان بھی اس جزیرہ پر واقع تھا، اور چونکہ لکھنؤ اس قومی تحریک کا بہت بڑا مرکز تھا، اس لئے ہمیں بھی ناراضگی کی ان لہروں کا تجربہ کرنے کا موقع ملا۔

آخر وہ دور آیا کہ جن لوگوں نے مسلمانوں کے جذبات میں یہ تحریک پیدا کی تھی، وہ ان کو بے یار و مددگار چھوڑ کر اپنی بنائی ہوئی دنیا میں چلے گئے، مسلمانوں میں سخت مایوسی، مستقبل سے ناامیدی اور اپنے بارہ میں بے اعتمادی اور احساس کمتری رونما تھا، ان کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا، ہر شخص ایک یتیمی اور کس مپرسی کی سی کیفیت محسوس کرتا تھا، اب مولانا اور ان کے رفقاء کی جماعت تھی کہ انھوں نے مسلمانوں میں خود اعتمادی، مستقبل کی طرف سے اطمینان، اپنے وطن میں رہنے اور ناسازگار حالات کا مقابلہ کرنے کا عزم پیدا کرنے کی تبلیغ کی، شمالی ہندوستان اور بالخصوص یو پی (جو ہندوستان کے مسلمانوں کا ذہنی، علمی اور سیاسی مرکز ہے) کے مسلمانوں کی قسمت اور ان کے قیام کا انحصار یو پی کے مغربی سرحدی اضلاع (سہارنپور، مظفر نگر، میرٹھ) کے برقرار رہنے اور مسلمانوں کے اپنی جگہ قائم رہنے پر تھا، سہارنپور جو یو۔ پی اور مشرقی پنجاب کا درمیانی ضلع ہے، اکھڑ جاتا تو مسلمانوں کا کسی ضلع میں باقی رہنا مشکل تھا، سہارنپور اور اس کے متصل اضلاع میں مقامی حالات اور مشرقی پنجاب کے قرب کی وجہ سے ترکِ وطن اور انخلاء کی طاقتور تحریک و ترغیب اور رجحان پایا جاتا تھا، علمائے دیوبند اور سہارنپور کا یہ بڑا احسان ہے کہ ان حضرات نے ترکِ وطن کی تحریک و ترغیب کا سختی سے مقابلہ کیا اور اس کو دینی و سیاسی حیثیت سے مسلمانوں کے اقدام قتل کا مرادف بتلایا اور مسلمانوں کے روکنے اور ان کے قدم جمانے کی سخت جد و جہد کی، اس میں بھی مولانا کا بہت بڑا حصہ تھا، خود ان کے قیام نے پھر ان کی ایمان آفریں تقریروں نے، ان اضلاع کے مسلمانوں میں دینی روح اور نیا حوصلہ پیدا کر دیا، ترک وطن کا سلسلہ رک گیا، بہت سے لوگوں کو میری طرح یہ احساس ہوگا کہ مولانا کی صحت زیادہ جد و جہد کے لائق ہوتی، ماحول اور رفقاء کچھ بھی مساعد ہوتے اور خلاف توقع حالات و واقعات نے طبیعت کو افسردہ اور پژمردہ

نہ کر دیا ہوتا تو مولانا اب بھی اسی عزم اور طاقت کے ساتھ اس بدلے ہوئے دور کی رہنمائی کرتے اور وقت کے غلط رجحانات کا مقابلہ کرتے ؎

ولو ان قومی انطقتنی رماحهم
نطقت ولکن الرماح اجرّت

جوانی کی بہترین طاقتیں، اور قلب و دماغ کی پوری توجہات اور ہمت قلبی، انگریزی حکومت کے مقابلہ اور انگریزوں کے اخراج پر صرف ہوئی جس کے لئے شیخ الہندؒ کی صحبت اور تجربہ و مطالعہ نے آپ کو تیار کیا تھا، جب نیا انقلاب ۴۷ء اپنے نئے تقاضوں اور ضرورتوں کے ساتھ آیا تو وہ عمر کے انحطاط، قویٰ کے اضمحلال اور مصروفیتوں کی زیادتی کا زمانہ تھا، اور عام طور پر یہ خیال غالب تھا کہ مسلمانوں کا اس ملک میں کسی نہ کسی طرح رہ جانا ہی ایک بڑی کامیابی اور فتح مندی ہے، اب یہ ان لوگوں کی خدمت کا زمانہ ہے، جو اس انقلاب کے دوررس اثرات سے واقف ہیں، اور علمی و فکری طور پر اس کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔

ایک جامع فضائل ہستی کے بارہ میں یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہوتا ہے کہ اس کے فضائل و کمالات میں مرکزی اور نمایاں صفت کون سی ہے، جس کو اس شخصیت کی کلید قرار دیا جائے اور جس سے اس کی زندگی اور خصوصیات کو سمجھنا آسان ہو جائے، مولانا کو بہت سے لوگ ایک عالم اور محدث کی حیثیت سے جانتے ہیں، بہت سے لوگ ایک شیخ طریقت اور سالک کی حیثیت سے جانتے ہیں، بہت سے لوگ ایک سیاسی رہنما اور مجاہد کی حیثیت سے جانتے ہیں، اور اس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات کو ان سب فضائل سے آراستہ کیا ہے، لیکن میری کوتاہ نظر میں دو صفتیں آپ کی زندگی میں کلیدی حیثیت رکھتی ہیں، جنھوں نے آپ کو اپنے معاصرین میں ممتاز بنایا ہے، ایک عزیمت

دوسرے حمیت، عزیمت کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ آپ نے علماء اور اہل درس کے حلقہ سے باہر قدم نکالا اور اس مسئلہ کی طرف توجہ کی، جو وقت کا اہم مسئلہ تھا، اور عین انگریزی حکومت کے عروج کے زمانہ میں اعلان حق کر کے "کلمۃ حق عند سلطان جائر" کے افضل جہاد کا شرف حاصل کیا، مالٹا میں اسیری کے دن گزارے اور ہندوستان کی جیلوں میں مہینوں رہ کر سنت یوسفی ادا کی اور دنیا کی عظیم ترین سلطنت کے مقابلہ میں برسوں سینہ سپر رہے، یہاں تک کہ آپ کا مقصد پورا ہوا، پھر یہ عزیمت آپ کی پوری زندگی میں نمایاں ہے، فرائض کی ادائگی، نوافل و مستحبات کی محافظت، مخالف ماحول میں معمولات کی پابندی اس زمانہ میں بڑی استقامت ہے، وعدوں کے ایفاء دور دراز کے جلسوں اور اجتماعات میں شرکت اور اس کے لئے ہر طرح صعوبتیں برداشت کرنا مستقل عزیمت ہے، پھر اس کے ساتھ دار الحدیث کے اسباق کی پابندی اور کتابوں کی تکمیل ایک مستقل مجاہدہ، مہمانوں کی میزبانی اور مختلف الطبائع اشخاص کے ساتھ معاملہ اور ان کی مزاجی خصوصیات کا تحمل مستقل جہاد، پھر مریدوں کی تربیت اور نگرانی، کثیر التعداد خطوط کا جواب دینا اور سب اس ضعف و پیری اور مصروفیت میں، یہ سب آپ کی غیر معمولی عزیمت و علو ہمت کی دلیل ہے، حقیقت یہ ہے کہ آپ نے اپنی زندگی میں ان اللہ یحب معالی الامور و یکرہ سفسافہا پر عمل کر کے دکھا دیا۔

حمیت آپ کی کتاب زندگی کا نہایت روشن عنوان ہے، اسی حمیت نے انگریزوں کی مخالفت کا جذبہ پیدا کیا، جس کی آسودگی اس وقت تک نہیں ہوئی جب تک انگریز اس ملک سے چلے نہیں گئے، تحریک خلافت اور جمعیۃ علماء کی جد و جہد میں یہی روح کام کرتی رہی تھی،

اور یہی آپ کو سدا جوان، مستعد و سرگرم رکھے ہوئے تھی، اور اسی نے سیکڑوں ہزاروں آدمیوں کو متحرک بنا رکھا تھا، یہی حمیت تھی جس نے آپ سے مہینوں دشمن اسلام طاقتوں کے خلاف قنوت نازلہ اس جوش و ولولہ کے ساتھ پڑھوائی کہ معلوم ہوتا تھا کہ محراب میں شگاف پڑجائیں گے، اور الفاظ نہیں ہیں بلکہ شرارے ہیں، جو آپ کے دل سے نکل رہے ہیں، یہی حمیت ہے، جو کسی منکر شرعی اور خلاف سنت فعل کو اب دیکھنے کے روادار نہ تھی، اور جس کی حرارت اور آنچ آس پاس بیٹھنے والوں کو اکثر محسوس ہوتی، جن لوگوں نے آپ کے اس جذبہ کو پہچان لیا اور سمجھ گئے کہ حمیت آپ میں کس قدر کوٹ کوٹ کر بھری تھی، وہ بعض اوقات اس سے غلط فائدہ اٹھا لیتے اسی طرح مولانا کی شرافت و مروت سے جو آبائی ورثہ اور سادات کرام کا شیوہ ہے، بہت سے لوگ غلط فائدہ اٹھا کر آپ کے مخلص محبین اور نیازمندوں کے لئے شرمندگی کا باعث بنتے اور اپنی اغراض براری کر کے اپنی ہوشیاری اور موقع پرستی کا ثبوت دیتے اور مولانا کی ذات کو نقصان پہونچاتے۔

مولانا حسین احمد مدنی (رحمۃ اللہ علیہ) علمی و سیاسی حیثیت سے جس قدر بلند ہوں مجھے اس سے انکار نہیں، لکھنے والے ان گوشوں پر لکھیں گے لیکن میرے خیال ناقص میں ان کی جو حیثیت سب سے زیادہ روشن، ممتاز اور مسلم تھی، وہ ان کی انسانی بلندی ہے۔

علمی دنیا ممتاز شخصیتوں، وسیع النظر اور متبحر عالموں سے خالی نہیں، ان کے سیاسی خیالات سے اختلاف کی گنجائش ہے، انھوں نے اپنی بلند نظری سے ملک کی آزادی سے جو توقعات قائم کی تھیں، اور اپنی فطری شرافت، اور نفس کی پاکیزگی سے اس ملک کی اکثریت کے متعلق جو اندازے لگائے تھے، وہ کہاں تک صحیح ثابت ہوئے اور ان کو زبان، کلچر، مذہبی تعلیم اور پرسنل لا کے تحفظ کے بارے میں (جس کی کانگریس کے منشور اور ہندوستان کے دستور نے ضمانت کی تھی) آخری عمر میں جو مایوسی ہوئی اور ان کو اپنی سیاسی جد و جہد کے رفیقوں اور جیل کے ساتھیوں کے

متعلق (صاحب اختیار و اقتدار ہو جانے کے بعد) جو تلخ اور دل شکن تجربے ہوئے آج ان کو خواہ زبان پر نہ لایا جاسکے، مگر آنے والے مورخ کے قلم کو ان کے اظہار سے روکا نہیں جاسکتا، مگر جو چیز ہر شک و شبہ اور ہر بحث و نزاع اور ہر اختلاف سے بالاتر ہے، وہ ان کی بلند سیرت، پاکیزہ شخصیت، بے غرض جد و جہد، بے داغ زندگی اور مکارم اخلاق ہیں جنھوں نے ان کی ذات کو کھرا سونا اور سچا موتی بنا دیا تھا، اور ان کو اخلاقی وطبعی بلندی کے اس مقام پر پہونچا دیا تھا جس کے متعلق دور اول کے عرب شاعر نے کہا ہے۔

هجان الحی کالذهب المصفّٰی

صبیحة دیمة یجنیه جان

قبیلہ کے شریف سردار ایسے کھرے سونے کی طرح ہیں، جو کسی بارش کی صبح کو زمین سے اٹھا لیا جائے اور صاف کر لیا جائے۔

اس راقم سطور کو مولانا کو بہت قریب سے دیکھنے اور مختلف حالات (سفر حضر، رضا و غضب، مشغولیت و فراغت، جلوت و خلوت) میں دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی، تقریباً سنہ ۳۰ء سے برادر معظم ڈاکٹر مولوی سید عبد العلی رحمۃ اللہ علیہ کی بدولت ہمارے لکھنؤ کے مکان کو مولانا کی فرودگاہ بننے کا شرف حاصل ہے، دیوبند کے ابتدائی طویل قیام اور بعد کے منتشر قیام میں مولانا کی زندگی، معمولات اور مزاجی خصوصیات نظر میں رہے۔

سیر و تراجم کے ذوق و مطالعہ پھر خصوصیت کے ساتھ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مولانا حکیم سید عبد الحی سابق ناظم ندوۃ العلماء کی جلیل القدر تصنیف یا کتب خانہ "نزهۃ الخواطر"[1]

---

[1] یہ کتاب عربی میں ہے اور اس کا موضوع ہندوستان کی ممتاز شخصیتوں کے حالات و سوانح ہے، اس میں پہلی صدی ہجری سے چودھویں صدی ہجری تک کے علماء، ادباء، شعراء اور سلاطین و وزراء و اہل کمال (باقی ص۱۱۰پر)

کی آٹھ ضخیم جلدوں کے بار بار مطالعہ وخدمت نے شخصیتوں کو غور سے دیکھنے اور ان کی خصوصیات واخلاق کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے اور ان کو اسلاف کے معیار پر جانچنے کی عادت پیدا کردی، اس نقطۂ نظر اور اس افتاد طبع کے ساتھ جب مولانا کو دیکھا، انسانیت وآدمیت، شرافت و سیادت اور اخلاق وکردار کی بڑی بلندی پر پایا اور اسی چیز نے مولانا کی بلندی کا نقش دل و دماغ پر ایسا قائم کیا کہ جب کبھی ذہن وذوق نے ان کے کسی سیاسی خیال یا کسی علمی تحقیق و رجحان کا پورا پورا ساتھ دینے سے معذرت کی اور دماغ اس کو قبول نہ کرسکا، ان کی انسانی واخلاقی بلندی اور ان کی شخصیت کی دلآویزی آڑے آئی اور دیکھا تو عقیدت ومحبت میں کوئی کمی نہ تھی۔

مولانا کو انسانی بلندی کے اعلیٰ معیاروں پر پورا پایا، اخلاص وبے غرضی ان کی زندگی کا جوہر اور ان کے تمام اعمال ومساعی وسرگرمیوں کا محرک تھا جس طرح بعض غیر مخلصین کے لئے کسی حالت اور کسی کام میں بھی مخلص بننا مشکل ہے، عدم اخلاص اور غرض پرستی طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے، اسی طرح ان مخلصین کے لئے جن کی سرشت میں اللہ نے اخلاص رکھا ہے، غیر مخلص بننا ناممکن ہوتا ہے، ان کی فطرت غیر اختیاری طریقہ پر اخلاص کی طرف چلتی ہے، وہ عمل جس کے اغراض کے ماتحت کرنے کا رواج عام ہوتا ہے، وہ بھی اغراض سے بالاتر پوری ذہنی یکسوئی کے ساتھ انجام دیتے ہیں، ہندوستان کی جنگ آزادی میں مولانا نے جو سرفروشانہ اور قائدانہ حصہ لیا اور اس راستہ میں انھوں نے جو مصائب اور

---

(باقی ص ۱۰۹ کا) کے تذکرے ہیں، پوری کتاب میں پانچ ہزار کے قریب اعیان واہل فضل کے حالات آگئے ہیں، مولانا مدنی اس کتاب کے بڑے قدرداں اور مشتاق تھے، اور اسی کے متعلق آخری ملاقات میں فرمایا کہ نفس کتاب بڑی نعمت ہے، آٹھوں جلدیں حیدرآباد سے شائع ہو چکی ہیں۔

تکلیفیں برداشت کیں، انھیں صرف انگریزوں کا (جن کو وہ اسلام اور مسلمانوں کا عدوئے اکبر سمجھتے تھے) بغض، ہندوستان کو آزاد کرانے اور اس کی آزادی سے ممالک اسلامیہ کے آزاد ہونے کی سبیل پیدا کرنے اور اس سب کے علاوہ اور شاید اس سب کے برابر اپنے اسلاف اور بزرگوں بالخصوص اپنے مربی و محبوب حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے اتباع و اطاعت کا جذبہ کام کر رہا تھا، اس کے علاوہ کسی مادی منفعت اور ذاتی مصلحت کا تصور اور خطرہ بھی شاید ان کے دل میں نہ آتا ہو، چنانچہ جب ہندوستان آزاد ہو گیا اور ملک میں حکومت خود اختیاری قائم ہوئی تو وہ اپنے اصلی کام (درس و تدریس اور تزکیہ و ارشاد) میں ایسے مصروف اور سیاسی جد و جہد کے میدان سے ایسے کنارہ کش ہو گئے جیسے ان کا کام ختم ہو چکا ہو، صف اول کے قائدین میں میرے خیال میں تنہا وہ ایک شخص تھے، جنھوں نے اپنی پچھلی سیاسی زندگی اور قربانیوں کی کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ قیمت وصول نہیں کی اور وقت سے فائدہ نہیں اٹھایا یہاں تک کہ جب ان کو جمہوریہ ہند کی طرف سے سب سے بڑا اعزازی خطاب عطا کیا گیا، تو انھوں نے اس کے قبول کرنے سے صاف معذرت کر دی، اگرچہ ان کی طبعی تواضع و انکسار نے اس کی وجہ یہ بیان کی کہ یہ ان کے اسلاف کرام کے شیوہ و مسلک کے خلاف ہے مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ اپنے دامن اخلاص پر خفیف سے خفیف داغ بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کے اس فیصلہ نے ایک بار پھر اس حقیقت کا اظہار کر دیا۔

کہ عنقا را بلند است آشیانہ

نہ صرف سیاسی جد و جہد بلکہ انھوں نے اپنے کسی جوہر، کسی کمال، کسی متاع اور کسی ہنر کی کوئی قیمت نہیں لی، جو لوگ حقیقت سے آشنا اور حالات سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ

دیوبند کی تنخواہ (جس کا مولانا اپنے "دنیا دار" ہونے کا ثبوت دینے کے لئے بار بار اظہار و اعلان فرماتے تھے) وہ ان کے وسیع مہمان خانہ کے ایک ہفتہ بلکہ شاید نصف ہفتہ کا بھی خرچ نہیں تھی، اور اس کا بڑا حصہ سفروں کی غیر حاضری کی بنا پر کٹ جاتا تھا اور برائے نام وہ ان کے حصہ میں آتی تھی، انھوں نے دراصل اپنی پوری زندگی احتساب و اخلاص میں گزاری اور اخفائے حال کے لئے مدرسہ کی تنخواہ (جس سے بدرجہا زائد ان کے شاگردوں کو مل سکتی تھی) کا ایک پردہ ڈال رکھا تھا۔

انسانی بلندی کے ایک دوسرے معیار یعنی "خذ العفو وامر بالعرف واعرض عن الجاھلین" اور "ادفع بالتی ھی احسن" پر عمل کرنے اور دشمنوں سے نہ صرف درگزر کرنے بلکہ ان کو نفع پہونچانے اور ان کے حق میں دعائے خیر کو وظیفہ بنانے میں مولانا فرد فرید تھے، سید پور، بریلی، جالندھر، اسٹیشن کے ان واقعات کے بعد جو انسانیت و شرافت کے ابتدائی حدود سے بھی متجاوز اور وحشت و رذالت کا نمونہ تھے، مولانا کی زبان پر کبھی بھول کر بھی کلمۂ شکایت یا اظہار حال نہیں آیا بلکہ یہاں تک مجھے معلوم ہے تہجد و سحور کے وقت مولانا کو ان ناشناسوں کے حق میں گریہ و زاری کے ساتھ دعا کرتے سنا گیا ہے، ان دشنام طرازوں، بدنام کرنے والوں اور خاک اڑانے والوں کو جب ضرورت پیش آئی ہے، اور انھوں نے یا ان کے عزیزوں نے مولانا سے کسی سفارشی خط کی فرمائش کی ہے، مولانا نے بڑی بشاشت اور انشراح خاطر کے ساتھ پرزور الفاظ میں ان کی فرمائش پوری کی ہے، اس موقع پر اگر کسی خادم یا رفیق نے ان کا تعارف کرانے اور ان کے پچھلے کارناموں کو یاد دلانے کی کوشش کی ہے تو اس کو سختی کے ساتھ جھڑک دیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ان کا عمل اس اسوۂ نبوی پر تھا، "ان اعفو عمن ظلمنی واصل من قطعنی واعطی

من حرمنی" (حدیث نبوی) مجھے میرے رب نے وصیت کی ہے کہ جو مجھ پر ظلم کرے اس کو میں معاف کردوں جو میرا مقاطعہ کرے میں اس کے ساتھ سلوک اور صلہ رحمی کروں جو مجھے محروم رکھے میں اس کو عطا کروں۔

مولانا خاندانی یا ذاتی حیثیت سے کوئی رئیس و متمول شخص نہ تھے، مگر اللہ نے ان کو بادشاہوں کا سا حوصلہ، اور ظرف (خدا مجھے معاف کرے) میں نے غلط کہا اہل اللہ اور نائبین انبیاء کا سا حوصلہ اور ظرف عطا فرمایا تھا، "الید العلیا خیر من الید السفلیٰ" پر ساری زندگی عمل رہا وہ بہت کم دوسروں کے ممنون ہوئے اور انھوں نے ایک عالم کو ممنون کیا، ان کا مہمان خانہ ہندوستان کے وسیع ترین مہمان خانوں اور ان کا دسترخوان ہندوستان کے وسیع ترین دسترخوانوں میں تھا، اور حقیقت یہ ہے کہ ان کا قلب اس سے بھی زیادہ وسیع تھا، بعض واقفین کا اندازہ ہے کہ پچاس مہمانوں کا روزانہ اوسط تھا، پھر اس میں ہر طبقہ اور ہر حیثیت کے لوگ ہوتے تھے، مولانا کی بشاشت، انتظام، مستعدی اور اہتمام بتلاتا تھا کہ ان کو کس قدر قلبی مسرت اور روحانی لذت حاصل ہو رہی ہے۔

ضیافت و مہمان نوازی اور اطعام طعام ان کی روحانی غذا اور طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، پھر مہمانوں کے ساتھ وہ جس تواضع اور انکسار اور جس اعزاز و احترام کے ساتھ پیش آتے تھے، اس کو دیکھ کر قدیم عرب شاعر کا یہ شعر بے اختیار یاد آتا تھا۔

وانی لعبد الضیف مادام نازلاً

وما شیمۃ لی غیرھا تشبہ العبدا

(میں مہمان کا غلام ہوں جب تک وہ میرے گھر مہمان رہے، اور زندگی کا یہی ایک موقع ہے

جس میں میں غلام معلوم ہوتا ہوں ) صرف میزبانی اور مہمانی نہیں ہر موقع پر وہ کوشش کرتے تھے کہ ان کا ہاتھ اونچا رہے، اور استفادہ کے بجائے ان کو نفع وافادہ کا موقع ملے، اگر کسی نے ذرا سا بھی ان کے ساتھ سلوک کر دیا اور کسی موقع پر کوئی خدمت انجام دی ہے، تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس فکر میں رہتے تھے کہ اس کے ساتھ کوئی سلوک کریں اور اس کے حق کو ادا کر دیں، ہم نے اہل بیت کرام کی سخاوت و شہامت و حوصلہ مندی کے جو واقعات پڑھے ہیں، ان کا پر تو مولانا کی زندگی اور ان کے بعض معاصرین کبار کے اخلاق میں پایا۔

کمال و شہامت خلق کے ساتھ اپنے نفس سے بدگمانی، اپنے نقص کا استحضار و اعلان، انسانیت کی بلندی کی دلیل اور اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان نفس امارہ کی گرفت اور خود فریبی اور خود پرستی سے بلند ہو گیا ہے، یہ صفت مولانا کی زندگی میں بہت نمایاں تھی، اور یہ ان کا حال تھا، قال نہ تھا۔

مولانا اپنے نام نامی کے ساتھ ہمیشہ ننگ اسلاف لکھا کرتے تھے، بعض ناخدا ترس اخبار نویسوں نے اس کا مذاق بھی اڑایا مگر ان کے جاننے والے اور ان سے قریب رہنے والے جانتے ہیں کہ کسی کے لئے اس طرح کے القاب و اوصاف ایک رسم اور تکلف ہوں گے، لیکن مولانا کا اپنے متعلق یہ عقیدہ تھا، اور اس میں کوئی تصنع کا شائبہ نہ تھا، وہ دل سے اپنے کو ننگ اسلاف سمجھتے تھے، حالانکہ اللہ نے ان کو ہر طرح سے اپنے اسلاف کرام کا جانشین اور نعم الخلف لنعم السلف کا مصداق بنایا تھا۔

اس لقب کے علاوہ وہ اکثر ایسے اشعار بڑے درد سے پڑھتے تھے، جن سے معلوم ہوتا تھا کہ مولانا اپنے وجود سے بڑے شرمندہ ہیں، اور اپنے کو کسی قابل نہیں سمجھتے،

مجھے یاد ہے، ایک مرتبہ (جب میری عمر بھی کم تھی) میں مولانا کے ہاتھ دھلا رہا تھا یا مولانا وضو فرما رہے تھے، یہ شعر بڑے درد و حسرت سے پڑھ رہے تھے۔

ذهب الذين يعاش في اكنافهم
بقي الذين حياتهم لا تنفع

(وہ لوگ تو چلے گئے جن کے سایہ میں زندگی گزاری جاتی تھی، وہ لوگ رہ گئے جن کی زندگی کچھ کار آمد نہیں) اکثر وہ یہ شعر (خصوصاً جب کوئی بیعت کی درخواست کرے) پڑھتے تھے۔

نہ گلم نہ برگ سبزم نہ درخت سایہ دارم
در حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا

مولانا کے خطوط و مکاتیب سے بہت سے ایسے اقتباسات و منقولات پیش کئے جا سکتے ہیں، جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اپنے کو کیا سمجھتے تھے، اور اللہ تعالےٰ نے ان کو تواضع، انکسار نفس اور بے نفسی کے کس مقام رفیع پر پہونچایا تھا، مگر میں نے اس مضمون میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا التزام کیا ہے کہ وہ صرف میرے مشاہدات اور ذاتی معلومات پر مشتمل ہو۔

مولانا کی وفات سے علم و سیاست کی بزم میں جو جگہ خالی ہوئی ہے اس کا افسوس کرنے والے اور اس خلا کو محسوس کرنے والے بہت ہیں، لیکن اخلاق و انسانیت کی صف اولین اور رشد نشین میں جو جگہ خالی ہوئی ہے، اس کا احساس کرنے والے شاید کم ہیں، شاید اس لئے کہ انسانیت کو کوئی ایسا مرتبہ نہیں سمجھا جاتا کہ کسی بزرگ یا عالم کو اس معیار سے جانچا جائے اور کسی "مرد کامل" کے اٹھ جانے سے کوئی خلا محسوس کیا جائے، مگر میرے نزدیک

آدمیت کے اس قحط اور انسانیت وانحطاط عام کے اس دور میں مولانا مدنی کا حادثۂ وفات ایک بڑا اخلاقی خسارہ اور انسانی حادثہ ہے۔

اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے
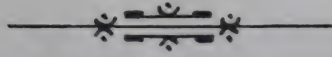
# چند مشائخ کبار و مصلحین

# حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی

رحمۃ اللہ علیہ

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا اسم گرامی، احترام و عقیدت کے ساتھ بچپن ہی سے کان میں پڑا ان کی کتاب "بہشتی زیور" کا گھر گھر چلن تھا، اور ان خاندانوں میں جو بدعات و رسوم سے دور تھے، وہ ایک مفتی اور دینی اتالیق کا کام کرتی تھی، غالباً سب سے پہلے ان کی تصنیفات میں سے اسی کتاب سے تعارف ہوا، خاندان کے ان بزرگوں اور اہل علم سے جن کے قول کو سند اور جن کی رائے کو فتویٰ سمجھتا تھا، ان کا ذکر ایک حاذق طبیب روحانی اور ایک ماہر معالج امراض نفسانی کی حیثیت سے سنا، مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی خاندان کے اکثر بزرگوں کے شیخ و مرشد تھے، اور خود بھائی صاحب انھیں سے بیعت اور ان کی محبت و عقیدت سے سرشار تھے، سیاسی خیالات میں بھی خاندان و ماحول کا رجحان مولانا ہی کے مسلک کی طرف تھا، لیکن اس سے مولانا تھانوی کی عظمت و عقیدت میں کچھ فرق نہیں آیا، مولانا تھانوی کے متعدد خلفاء ہم لوگوں پر خصوصی شفقت فرماتے تھے، اور ان سے مراسم و تعلقات تھے، ان میں مولانا وصی اللہ صاحب فتحپوری اور

مولانا عبد الغنی صاحب پھولپوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں، والد ماجد کے ایک عزیز شاگرد مولوی افضل علی صاحب نھلواروی جن کو ہم سب لوگ صوفی صاحب کے نام سے جانتے اور پکارتے تھے مولانا کے مرید اور مجاز بیعت تھے، انھوں نے مولانا سے اس وقت بیعت کی تھی جب شاید چند ہی حضرات کو یہ شرف حاصل ہوا ہو گا وہ مولانا کا تذکرہ برابر کرتے رہتے تھے، مولانا عبد الباری ندوی اور مولانا عبد الماجد دریابادی سے بھی برابر مولانا کا اور تھانہ بھون کا ذکر خیر سننے میں آتا رہتا تھا، اور اس عقیدت و احترام میں ان دونوں حضرات کی تحریروں اور مجلسوں کو بھی بہت دخل ہے۔

میرا علمی و ذہنی نشوونما اس زمانہ میں ہوا کہ مولانا تھانوی نے سفر کا سلسلہ بالکل موقوف فرما دیا تھا، اس لئے اگست ۱۹۳۸ء سے پیشتر جب وہ عرصہ دراز کے بعد بغرض علاج لکھنؤ تشریف لائے، اور پورا چلہ یہاں قیام فرمایا، زیارت و ملاقات کی سعادت حاصل نہیں ہوئی تھی، البتہ مکاتبت کا شرف اس سے کئی سال پیشتر حاصل ہو چکا تھا، ۱۹۳۴ء کی گرمیوں میں میں مولانا احمد علی صاحب کی خدمت میں لاہور میں تھا، کہ بھائی صاحب نے جو میری دینی و اخلاقی تربیت کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے، مجھے ہدایت کی کہ واپسی میں تھانہ بھون حاضری دیتا ہوا اور مولانا کی خدمت میں کچھ دن قیام کر کے واپس ہوں، ان کو تھانہ بھون کے آداب اور حاضری کے قواعد و ضوابط کا بھی علم تھا، اس لئے انھوں نے میری رہنمائی فرمائی اور ہدایت کی کہ میں خط میں اپنا تعارف بھی کرا دوں اور سفر کا مقصد اور مدت قیام بھی لکھ دوں، نیز جن حضرات سے مجھے تلمذ یا استرشاد کا تعلق ہے، ان کے ناموں کی وضاحت بھی کر دوں، اس لئے کہ مولانا اس صفائی اور اظہار کو بہت پسند فرماتے تھے، اور اخفاء و توریہ اور تکلفات سے ان کو اذیت ہوتی تھی، میں نے ان ہدایات پر پورا عمل کیا اور لاہور سے ایک عریضہ ارسال خدمت کیا جس میں اپنا تعارف بھی کرایا، مجھے معلوم تھا کہ حضرت میرے والد ماجد سے

اچھی طرح واقف ہیں، اپنے اساتذہ اور جن حضرات سے بیعت و تربیت کا تعلق تھا، ان کا بھی
تذکرہ کیا، ندوہ اور مولانا مدنی سے انتساب و تعلق کا بھی اظہار کیا، یہ بھی لکھا کہ ایک ہفتہ قیام کی نیت
ہے، اور مقصد بھی زیارت و شرف ملاقات ہے، مولانا نے بڑی شفقت کے ساتھ ... اس خط کا
جواب عنایت فرمایا، حسب معمول خط کے حاشیہ پر مختلف فقروں اور مندرجات کا مختصر جواب
تحریر فرمایا، حاضری کی اجازت طلبی پر تحریر فرمایا کہ "سر آنکھو پر تشریف لائیں، لیکن صرف ملاقات
کی نیت سے، نہ اعتقاداً نہ انتقاداً نہ اظہاراً" میں نے جن بزرگوں سے اپنے تعلق کا اظہار کیا تھا،
اس پر تحریر فرمایا کہ "صفائی سے دل خوش ہوا" پھر بعض بزرگوں کے طرز سے خود بھی اپنے اختلاف
کا ذکر کیا، حاضری کی اجازت طلب کرنے پر دوبارہ ارشاد ہوا کہ "میرے لئے فخر ہے، اگر میرے
حالات اس فخر میں مانع نہ ہوں، ورنہ مشتاق تہ کر ملولی" (کما قال السعدی) اس وقت تک
بھائی صاحب کی بھی ملاقات مولانا سے نہیں ہوئی تھی، مولانا ان کا تذکرہ غائبانہ سنتے رہتے
تھے، لیکن میرے نام سے بھی غالباً واقف نہ تھے، اور کوئی وجہ بھی اس واقفیت کی نہ تھی، اس لئے
آخر میں مستقل یہ دلچسپ عبارت تحریر فرمائی کہ "مکرمی دام لطفکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،
اتنی تکلیف اور دیتا ہوں کہ کیا آپ ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے بھائی ہیں، یا آپ ہی کے دو نام ہیں"
اس سرفراز نامہ کا جواب میں نے لاہور ہی سے طالب علمانہ انداز میں دیا اور بلا ضرورت یہ تحریر
کیا کہ میرے نزدیک یہ اختلاف باپ چچا کے اختلاف کی طرح ہے کہ ایک سعادت مند کے لئے
صلۂ رحم تعلق سے مانع نہیں، گویا اپنے موقف کو صحیح ثابت کرنے کے لئے اور اس اختلاف کی
اہمیت کو کم کرنے کے لئے استدلال اور حجت سے کام لیا، مولانا کی طبیعت کی نزاکت اور
ذکاوت کے جو قصے مشہور تھے، اور جو واقعات تھانہ بھون کے منتسبین اور آنے جانے والوں کی
زبانی سنے تھے، ان کے پیش نظر یہ بات یقینی تھی کہ ایک نوعمر اور کم علم طالب علم کی جسارت اور

دخل در معقولات، طبیعت پر بہت گراں گزرے گا، اور اس عریضہ کا جواب یہ آئے گا کہ آپ
یہاں آنے کی زحمت نہ فرمائیں آپ کو کوئی نفع نہ ہوگا، غالباً اس خط کے لکھنے کے بعد میرا قیام
لاہور زیادہ نہیں رہا، اور میں جلد لکھنؤ واپس ہوگیا، شاید اس اندیشہ سے کہ اس خط کا جواب
نہیں آئے گا یا اپنی بے خیالی اور ضوابط کی ناواقفیت سے میں نے اس میں جوابی کارڈ نہ رکھا
لیکن میری حیرت و مسرت کی کوئی انتہا نہیں رہی جب مولانا نے اس عریضہ کے جواب
کے لئے خلاف معمول اہتمام فرمایا اور تمام ضوابط کو بالائے طاق رکھ کر خود لفافہ بنایا،
اس پر اپنے دست مبارک سے لکھنؤ کا پتہ لکھا اور مستقل ایک مکتوب لکھکر اس کے اندر
رکھا اور مولوی محمد حسن صاحب کاکوروی مالک انوار المطابع کو جو لکھنؤ آرہے تھے، حوالہ فرمایا کہ
مجھے پہنچا دیں، پہلے پتہ کی عبارت پڑھئے پھر مکتوب ملاحظہ کیجئے۔

"مشفق مکرم مولوی علی ابو الحسن صاحب سلمہٗ
بتوسط جناب ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب سلمہٗ
۳۷ امین آباد لکھنؤ

مرسلہ

اشرف علی از تھانہ بھون

از اشرف علی عفی عنہٗ بخدمت مجمع الکمالات زید لطفکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ
فرحت نامہ پہونچا، ہر ہر حرف حیات بخش تھا جزاکم اللہ تعالیٰ علیٰ ہذہ الحجۃ
آپ کے صدق وخلوص وسلامت فہم کے اثر سے میری طبیعت بھی دفعۃً آپ سے
بے تکلف ہوگئی، اس لئے آپ سے کسی امر کا اخفا نہیں چاہتا، اس کے تحت میرا اتنا

اور عرض کرنے کی ہمت کرتا ہوں کہ ........ کا اختلاف اس وقت تک آپ کو علمی اور اجمالی ہی معلوم ہے، کیونکہ ان کو دیکھا ہے، مجھ کو نہیں دیکھا مجھکو دیکھنے کے بعد اس اختلاف کا علم تفصیلی ہوگا اور علم سے متجاوز ہو کر جذبات واخلاق کے متعلق بھی، اس وقت مجھ کو قوی توقع ہے کہ میرے ساتھ جو حسن ظن ہے، اس بار سے قلب ہلکا ہو جاوے گا جس سے راحت ہوگی، والغیب عنداللہ۔

حضرت خلیفہ صاحب[1] کے پیام وسلام سے ان کی یاد تازہ ہوگئی، اللہ تعالےٰ ان کے برکات میں تضاعف فرماوے، باقی آپ کے لئے دعا کرتا ہوں[2] اور دعا چاہتا ہوں جس کا صیغہ مدت دراز سے یہ تجویز کر رکھا ہے۔

"اللھم کن لنا واجعلنا لک" والسلام"

اس گرامی نامہ پر ۱۶ ربیع الاول ۱۳۵۳ھ کی تاریخ ہے، جو ۱۴ جون ۱۹۳۴ء کے مطابق ہے، اس شفقت نامہ پر اس کے سوا کیا عرض کیا جائے کہ۔

---

[1] حضرت خلیفہ غلام محمد صاحب دینپوری مراد ہیں، جو اس عہد کے مشائخ کبار میں سے تھے، سلسلہ قادری تھا، اور قیام دین پور میں رہتا تھا، جو خان پور ریاست بھاول پور کے مضافات میں سے تھا، تمام بزرگان وعلمائے دیوبند ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔

[2] خاکسار نے اپنے عریضہ میں مولانا سے دعا کی درخواست کی تھی، اور کسی خاص مقصد کا تعین نہیں کیا تھا، بلکہ لکھا تھا کہ "اہل مکہ ادری بشعابہا" (مکہ کے باشندے اس کی گلیوں سے خوب واقف ہیں۔)

## "کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید"

لیکن اس کے بعد بھی تھانہ بھون حاضری کی نوبت نہیں آئی، یہاں تک کہ تھانہ بھون خود لکھنؤ آگیا اگست ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ میں مژدۂ جانفزا سننے میں آیا کہ حضرت بغرض علاج لکھنؤ تشریف لا رہے ہیں، کوئی نہیں جانتا تھا کہ اپنے اس علاج کے پردہ میں کتنے بیمار دلوں کا علاج ہونے والا ہے اور شہر کے ایک مرکزی مقام (مولوی گنج) میں ایک مولوی (مدرسہ کا اصطلاحی مولوی نہیں بلکہ جس معنی میں مولانا جامی نے مولانا روم کے متعلق کہا تھا "مثنوی مولوی معنوی" اور کسی عارف نے کہا تھا "مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم") روحانی مطب کھولنے والا ہے جس کے حاضر باشوں میں بڑے بڑے علماء و مشائخ اور عمائد شہر ہوں گے، غرض اگست ۱۹۳۸ء میں مولانا لکھنؤ تشریف لائے، اپنے قدیم مسترشد اور مجاز صحبت مولوی محمد حسن کاکوروی مالک انوار المطابع اور نبیرہ مولانا محسن کاکوروی کے مکان پر قیام فرمایا، علاج شفاء الملک حکیم عبدالحمید (جھوائی ٹولہ) لکھنؤ کا تھا، قیام پورے چالیس دن رہا، وہ مدت جس کو یوں بھی سلوک و تربیت اور خانقاہوں کے نظام سے خاص مناسبت ہے، ظہر اور عصر کے درمیان مخصوص لوگوں کو حاضری کی اجازت تھی، ضابطہ یہ تھا کہ یا تو مولانا ذاتی طور پر آنے والوں سے واقف ہوں، یا حاضرین مجلس میں سے کوئی معتبر آدمی اس سے واقف ہو، تاکہ کوئی نامناسب اور اذیت پہنچانے والی بات پیش نہ آئے، مولانا کی اس غیر متوقع آمد کی خبر تمام احتیاطوں کے باوجود بجلی کی طرح تمام اطراف و اکناف بالخصوص شرقی اضلاع میں پہنچ گئی، جو مدت دراز سے آپ کی آمد سے محروم و مایوس تھے، خاص ضوابط و شرائط کے ساتھ اہل تعلق کو آنے کی اجازت دی گئی اور خلفاء و مسترشدین کلکتہ سے، امرتسر و لاہور تک کے مختلف وقتوں میں حاضر ہوتے رہے، عمائد شہر کی بھی ایک تعداد زیارت سے مشرف اور مجالس سے مستفید ہوئی ان میں علماء فرنگی محل، اساتذہ دارالعلوم ندوۃ العلماء

اور شہر کے دینی ذوق رکھنے والے رؤساء و عمائد بھی تھے، مولانا عصر کی نماز مسجد خواص میں جو آپ کی تشریف آوری اور روزانہ کی مجالس کی وجہ سے حقیقی معنی میں مسجد خواص بن گئی تھی، ادا فرماتے تھے، نماز کے بعد مسجد کے شمالی مغربی گوشہ میں مجلس ہوتی، مولانا خطوط کے جوابات بھی دیتے رہتے اور لوگوں سے مخاطب بھی ہوتے، اس مجلس میں سلوک و تصوف کے نکات، اصلاحی و علمی تحقیقات اور بزرگوں کے حالات و واقعات ارشاد فرماتے، بزرگوں کے واقعات بیان کرتے وقت خاص کیف و اثر محسوس ہوتا، اس وقت چیدہ چیدہ لوگ ہوتے، اور مولانا کو بھی بڑا انبساط و انشراح ہوتا، بھائی صاحب مرحوم اس مجلس میں نیز عصر سے پیشتر کی مجلس میں جو قیام گاہ پر ہوتی بڑی پابندی سے شرکت کرتے، ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی طالب علم مدرسہ میں حاضری کی پابندی کر رہا ہے، مولانا بھی خصوصی شفقت و التفات فرماتے، علاج کے بارے میں بھی کبھی کبھی مشورہ میں شریک کرتے، یہ ناچیز بھی تقریباً روزانہ ہی بھائی صاحب کے ساتھ حاضری دیتا، اس عاجز کی طرف مولانا کی خصوصی توجہ کا ایک محرک یہ پیدا ہوا کہ اسی زمانہ میں "القول المنشور" کی طباعت ہو رہی تھی، جو اصلاً مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کی تصنیف ہے، لیکن اس میں مولانا کی تحقیقات و اضافے بھی ہیں، مولانا کو اس کی طباعت و اشاعت کا بڑا اہتمام تھا، اس میں بکثرت طویل عربی کی عبارتیں بھی آئی ہیں، خدا وصل صاحب بلگرامی کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے اس کی تصحیح کا کام میرے سپرد کر دیا، مجھے اس میں جہاں اشکال و مراجعت کی ضرورت پیش آتی عصر کے پیشتر کی مجلس میں مولانا کے سامنے پیش کرتا اور مولانا اس کو حل فرما دیتے، اسی دوران قیام میں ۱۵ ستمبر ۱۹۳۸ء کو اچانک بھائی صاحب سے ان کے مکان پر آنے کی خواہش کا اظہار فرمایا، اس سے زیادہ عزت و مسرت کی بات کیا ہو سکتی تھی، مولانا رفقاء و خدام کی ایک مختصر جماعت کے ساتھ مکان پر تشریف لائے، دیر تک سرفراز فرمایا،

حضرت حاجی صاحب اور بزرگوں کے حالات کا سلسلہ وہاں بھی شروع ہو گیا۔

تین برس کے بعد دوبارہ اگست ۱۹۴۱ء میں پھر لکھنؤ تشریف آوری ہوئی اس مرتبہ بھی ایک مہینہ سے کچھ زیادہ قیام رہا، تقریباً وہی معمولات و نظام الاوقات رہا، اس طرح پھر ان روح پرور اور پرکیف مجالس میں شرکت اور استفادہ کا موقع ملا۔

۱۹۳۹ء میں میری کتاب "سیرت سید احمد شہیدؒ" شائع ہوئی، میں نے تو اس کے بھیجنے کی جرأت نہیں کی لیکن میری بے خبری میں رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے اس کو ایک دوسری کتاب کے ساتھ جوان کو بہت پسند تھی ایک صاحب تعلق کے ذریعہ مولانا کی خدمت میں اس تصریح کے ساتھ بھیجی کہ اگر حضرت کو کچھ گرانی ہو تو اس کو بلا تکلف واپس فرما سکتے ہیں، مولانا نے یہ ہدیہ قبول کیا، دوسری کتاب اسی وقت کسی صاحب کو دیدی اور "سیرت" خود اپنے مطالعہ کے لئے رکھ لی، اس کے جواب اور شکریہ میں مولانا منظور صاحب کو ایک خط لکھا جس میں ان کی اس رعایت پر مسرت و انبساط کا اظہار بھی فرمایا، اور سیرت کے متعلق اپنے تاثرات بھی تحریر فرمائے، یہ مکتوب یہاں بجنسہٖ نقل کیا جاتا ہے کہ اس سے مولانا کے مزاج و مذاق اور اصلی جذبات کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے۔

"از ناکارہ آوارہ اشرف علی عفی عنہٗ

بخدمت مکرم بندہ دام فضلہم السلام علیکم۔ کل کے روز صحیفۂ عنایت مع دو رسالہ ہدیہ کے پہونچکر منت بخش و مسرت افزا ہوئے، بسر و چشم قبول کئے، اور آپ کی اس ادا نے زیادہ فریفتہ کر دیا کہ آپ نے میرے اصول کو اپنے جذبات پر ترجیح دے کر قبول عذر کر دینے کی بھی اجازت دے دی، چونکہ میرے اصول میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حضرات مخلصین کی اطاعت کو

فخر و سعادت سمجھتا ہوں، لہذا ان کے قبول میں بھی میرے اصول محفوظ ہیں، ایک میرے اصول میں سے یہ بھی ہے کہ اپنے احباب کے عطایا سے قلب پر جو اثر ہوتا ہے، اس کا اخفا نہیں کرتا، چنانچہ اس ہدیہ سے خصوص سیرت شہید سے قلب پر دو اثر ہوئے ایک مسرت کا دوسرا خجلت کا، وہ خجلت یہ کہ کتاب دیکھ کر اپنی ناکارگی سامنے آجاتی ہے کہ ہم میں نہ ہمت نہ غیرت، بہائم کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں کہ بجز خواب و خور کے کوئی شغل نہیں، لہذا ایسی چیزیں اگر ایسوں کو دی جائیں جو ان سے کام لیں تو ہدیہ ضائع نہ ہو اب دعا کی درخواست پر ختم کرتا ہوں اللہ تعالے بزرگوں کا اتباع نصیب فرما دے۔

والسلام"

بالآخر وہ دن بھی آگیا کہ تھانہ بھون حاضری کی سعادت حاصل ہوئی اور جس جگہ کے قصے آنے جانے والوں سے برسوں سے سننے میں آرہے تھے، اس کو بچشم خود دیکھنے کا اتفاق ہوا کہتے ہیں کہ پھول شاخ گل پر اور چمن کے اندر ہی اپنی صحیح شکل و صورت میں نظر آتا ہے، غالباً ۱۹۴۲ء اور مئی یا جون کا مہینہ تھا، اتنا یاد ہے کہ خوب گرمی تھی، اور لو چل رہی تھی، میں مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہمرکابی میں چھوٹی لائن پر سفر کر رہا تھا، جو شاہدرہ سے سہارنپور تک جاتی تھی، اور جس میں وہ سب مقامات و قصبات پڑتے تھے، جن سے بزرگان دیوبند کی تاریخ وابستہ ہے، یعنی کاندھلہ، تھانہ بھون، نانوتہ، اور رام پور منیہاران اچھی طرح یاد نہیں کہ پہلے سے قصد تھا یا اثنائے سفر میں یہ خیال ہوا کہ تھانہ بھون بھی حاضری دی جائے، نظام کچھ ایسا تھا کہ کاندھلہ مولانا کے ساتھ قیام کر کے جو ان کا وطن تھا، رام پور منیہاران جانا تھا، تھانہ بھون، کاندھلہ اور رام پور کے درمیان واقع ہے، میں نے

مولانا سے اجازت لی کہ میں ایک روز پیشتر کاندھلہ سے روانہ ہو جاؤں اور چوبیس گھنٹے تھانہ بھون قیام کرکے اسی گاڑی پر سوار ہو جاؤں جس سے مولانا رام پور تشریف لے جائیں گے، مولانا خود تھانہ بھون کے عقیدت مندوں میں تھے، اور مولانا تھانوی کو اپنے مشائخ کی صف ہی میں سمجھتے تھے، یہ سن کر بہت خوش ہوئے، اور بڑی بشاشت و مسرت کے ساتھ اجازت دی تھانہ بھون کے ایک صاحب تعلق تھانہ بھون جا رہے تھے، میں نے اپنی آمد کی اطلاع کا خط لکھ کر ان کے حوالہ کرنا چاہا کہ وہ خود پیش کر دیں، انھوں نے کہا کہ یہ ضابطہ کے خلاف ہے، میں نے عرض کیا کہ آپ اس کو پوسٹ بکس میں ڈال دیں، انھوں نے اس کو منظور کیا، میں ایک روز کاندھلہ ٹھہر کر تھانہ بھون روانہ ہوا، ٹھیک دوپہر کو گاڑی تھانہ بھون پہونچتی تھی، خانقاہ امدادیہ کا اسٹیشن سے کچھ زیادہ فاصلہ نہیں، میں ایک حمال کو ساتھ لے کر پیدل خانقاہ پہنچ گیا، تھانہ بھون کے قواعد و ضوابط اور آداب کے متعلق اتنا سن رکھا تھا، اور دار و گیر اور احتساب کے واقعات بھی اتنے کان میں پڑ چکے تھے کہ ڈرتے ڈرتے خانقاہ میں قدم رکھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک طالب علم مدرسہ میں داخل ہو رہا ہے، گرمی اور دوپہر کی وجہ سے وہاں سناٹا تھا، مقیمین خانقاہ اپنے اپنے حجروں میں آرام کر رہے تھے، میں ایک طرف سامان رکھ کر بیٹھ گیا، کچھ دیر کے بعد ظہر کی اذان ہوئی، مولانا تشریف لائے، وضو فرمایا، میں نے اس وقت اپنا تعارف مناسب نہیں سمجھا، ظہر کی نماز کے بعد مسجد کی اس سہ دری میں جو جانب جنوب واقع ہے، اور مولانا کی نشستگاہ رہتی تھی، مجلس شروع ہوئی، چیدہ چیدہ حضرات اور خواص تھے، جن میں خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب کو میں پہچانتا تھا، میں بھی حاضر ہوا اور کنارے بیٹھ گیا، سہ دری میں قدم رکھتے ہی میری نظر اس ڈیسک پر پڑی جو مولانا کے سامنے تھی، اور جس پر خطوط اور لکھنے پڑھنے کا سامان رکھا ہوا تھا، انہی کاغذات اور سامان میں "سیرت سید احمد شہیدؒ" جس کو

چھپے ہوئے تین سال سے زائد ہو چکے تھے، سامنے رکھی تھی، معلوم نہیں مولانا نے میری دل جوئی اور مجھے مانوس کرنے کے لئے اس کو اسی دن نکلا لا تھا، یا وہ عام طور پر اسی جگہ رکھی رہتی تھی، اس کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا گویا ایک نہایت عزیز دوست میرے تعارف اور تقریب کے لئے موجود ہے، اس کی موجودگی سے اجنبیت کے احساس میں بڑی کمی ہوئی، مولانا خطوط کے جواب دینے میں مصروف تھے، چند منٹ کے بعد خواجہ صاحب کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا خواجہ صاحب! ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے بھائی آنے والے تھے آئے نہیں؟ اب میں نے خاموش رہنا نامناسب سمجھا، آگے بڑھا اور عرض کیا کہ میں حاضر ہوں، فرمایا کہ آپ نے بتایا نہیں، آیئے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا، میں نے عرض کیا حضرت کے حرج کے خیال سے عرض نہیں کیا، فرمایا کہ اس سے بڑھ کر کیا حرج ہوتا کہ مجھے آپ کی آمد کا علم نہ ہوتا، خجلت ہوتی، ندامت ہوتی، افسوس ہوتا، مکرر کئی لفظ فرمائے، سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ فرمائی کہ میں نے تو آج آپ کی وجہ سے خطوط کا بہت سا کام پہلے کر لیا تھا، تاکہ آپ سے اطمینان سے باتیں کرنے کا موقع ملے، یہ گویا حضرت کی طرف سے انتہائی رعایت اور اعزاز تھا، جو اس نوعمر و گمنام آنے والے کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا، پھر مزاج پرسی کے بعد بڑی شفقت سے فرمایا کہ کوئی اور رفیق تو ساتھ نہیں؟ کھانے میں کیا معمول ہے، کوئی پرہیز تو نہیں؟ اس سے اندازہ ہوا کہ حضرت اپنا ہی مہمان رکھیں گے، یہ بھی عام روایات اور تجربات کے خلاف تھا، اور مہمان کے ساتھ بڑی خصوصیت و شفقت۔ میرے عرض کرنے پر کہ کوئی پرہیز نہیں ہے، معذرت فرمائی کہ میں آج کل طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے ساتھ نہیں کھا سکوں گا، اس کا کچھ خیال نہ فرمائیں، پھر فرمایا کہ قیام کتنا رہے گا، میں نے عرض کیا کہ اگلے روز دوپہر کو جانا ہے، فرمایا بس اتنا مختصر قیام، پھر فرمایا کہ میں اپنے دوستوں سے زیادہ قیام کے لئے اصرار نہیں کرتا کہ گرانی کا باعث نہ ہو، اور شاید جو حضرات اتنا وقت بھی دیتے ہیں، ان کو آنے میں پس و پیش ہو اس کے بعد

مجلسی گفتگو شروع ہوگئی، زیادہ تر واقعات خاندان ولی اللّٰہی اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ اسمٰعیل صاحب کے تھے۔

رات کھانا حضرت کے دولت خانہ سے آیا، کھانے میں اہتمام اور تنوع تھا، صبح نماز فجر کے بعد خواجہ صاحب حضرت کا پیغام لائے کہ فلاں وقت میری خصوصی مجلس کا ہے جس میں مخصوص احباب کو شرکت کی اجازت ہے، لیکن اگر ضرورت ہو تو میں اس سے بھی الگ وقت دے سکتا ہوں، میں نے عرض کیا کہ مجھے کوئی خصوصی بات عرض کرنی نہیں ہے، زیارت و استفادہ کے لئے حاضر ہوا ہوں، اسی خصوصی مجلس میں حاضر ہو جاؤں گا، تقریباً چاشت کے وقت حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، دو ہی چار حضرات تھے، ان میں خواجہ عزیز الحسن صاحب مجھے یاد ہیں، حضرت نے خواجہ صاحب سے فرمایا کہ حضرت خواجہ صاحب میرا جال لے آئیے، خواجہ صاحب تعمیل ارشاد میں اٹھ گئے، مگر سمجھے نہیں، آپ نے فرمایا خواجہ صاحب سمجھے کہ میرا جال کیا ہے، خواجہ صاحب نے عرض کیا کہ حضرت نہیں، فرمایا کہ تسبیح، یہی ہم لوگوں کا جال ہے جس سے ہم لوگوں کو پھانستے ہیں، مجلس میں اول سے آخر تک بڑا انبساط رہا، خشونت تو الگ رہی کسی درجہ کی خشکی اور یبوست بھی کہیں آس پاس نہ تھی، خندہ جبینی، شگفتہ بیانی، زندہ دلی، اور نکتہ سنجی مجلس کو باغ و بہار بنا دیتی تھی، تھانہ بھون کے متعلق جو تصور قائم ہوا تھا معلوم ہوا کہ اس میں جہاں تک مولانا کی ذات کا تعلق ہے، مبالغہ اور غلط فہمی کو دخل ہے، ضوابط ضرور تھے، مگر استثناءات بھی بکثرت طالبین اور زیر تربیت اشخاص کے لئے احتساب اور مواخذہ تھا، مگر زائرین اور کبھی کبھی کے آنے والوں کے لئے نیز ان لوگوں کے لئے جن کا تعلق مستقل اصلاح و تربیت کا نہیں تھا شفقت و رعایت، یہ بھی اندازہ ہوا کہ خانقاہ کا سارا ماحول حضرت کے مزاج و مذاق اور حضرت کی جامعیت اور حکمت کے سو فی صدی مطابق نہیں تھا، اور وہ مولانا کی پوری نمائندگی اور اپنے زبان حال سے

ترجمانی نہیں کرتا تھا، اور شاید اس شہرت عام میں جو تھانہ بھون کی دارو گیر اور رعب و جلال کے متعلق ملک میں پھیلی ہوئی تھی، ان ضابطہ پرستوں کی بے لچک پابندیوں کو بہت دخل تھا، اپنا ہی تجربہ لکھتا ہوں کہ مولانا کی مجلس سے فارغ ہونے کے بعد گاڑی کے جانے میں بہت دیر تھی، خالی اور بیکار بیٹھنے کی عادت نہیں، طالب علمی کا پرانا مرض، خانقاہ میں شمالی حصہ میں ایک مدرسہ بھی تھا، ایک عالم کوئی کتاب پڑھا رہے تھے، میں بھی جاکر ایک طرف بیٹھ گیا، مدرس صاحب نے ایک طالب علم کو اشارہ کیا، دیوار پر ایک تختی آویزاں تھی جس پر لکھا تھا کہ جس وقت کوئی استاد سبق پڑھا رہا ہو تو باہر کے آئے ہوئے کوئی صاحب وہاں نہ بیٹھیں، وہ تختی لائے اور مجھے دکھایا میں شرمندہ ہوکر اٹھ گیا، اسی طرح میں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ کتب خانہ کس وقت کھلے گا، انھوں نے بجائے خود جواب دینے کے کہا کہ تختی پر اوقات لکھے ہوئے ہیں پڑھ لیجئے، غالباً یہی لفظی پابندی اور ضابطہ پرستی بہت سے اجنبی لوگوں کے لئے وحشت کا سبب بنتی تھی، لیکن اس کے برعکس مولانا ان ضوابط پر حاکم تھے، محکوم نہ تھے، واضع تھے مقلد نہ تھے، وہ جہاں چاہتے اور جس کے لئے چاہتے ضابطہ کو بالکل بالائے طاق رکھدیتے اور اسی کو اس وقت کا ضابطہ سمجھتے۔

اس کے بعد نہ پھر تھانہ بھون حاضری کا اتفاق ہوا نہ لکھنؤ مولانا کے قدوم سے مشرف، البتہ مکاتبت، معنوی اور علمی استفادہ اور محبت و عقیدت کا تعلق ہمیشہ رہا، بھائی صاحب سے بھی کبھی کبھی مراسلت ہوتی، ایک مرتبہ حضرت نے ندوہ کے کتب خانہ سے بعض کتابیں مطالعہ کے لئے طلب فرمائیں اور ان کے بحفاظت واپس ہونے کے لئے اور بھیجنے والے پر کسی قسم کا بار نہ پڑنے کا اہتمام فرمایا، جو مولانا کا مزاج بن گیا تھا، اور جس کی رعایت و نگہداشت میں وہ اپنے اقران و اماثل میں بھی بہت ممتاز تھے، یہاں پر مولانا کا وہ مکتوب درج کیا جاتا ہے جو مولانا نے اس موقع پر بھائی صاحب کے نام تحریر فرمایا تھا، اور جس سے مولانا کی وسعت نظر

اور وسعت قلب کا بھی اندازہ ہوگا اور اس کا بھی کہ مولانا شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم کو کس نظر سے دیکھتے تھے، اور کس ادب واحترام سے ان کا نام لیتے ہیں، مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

"مکرمی ومحترمی دام فضلہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کتاب اعلام الموقعین مع حادی الارواح وشفاء العلیل سے میرا مستفید ہونا ندوہ کا فیض ہے جس کا میں ممنون ہوں اور دل سے دعا کرتا ہوں، جس مضمون کو دیکھنے کو میں نے کتاب منگوائی تھی، اس مقصود میں تو میں حضرت مؤلف کا موافق نہیں ہوں، مگر خود اس مقصود میں جن مقدمات سے انھوں نے کام لیا ہے، وہ بجائے خود علوم عالیہ ہیں، جن سے مجھ کو عجیب وغریب نفع ہوا، اس مضمون کو میں نے نقل بھی کرالیا جس کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ جس وقت مجھ کو یا کسی دوسرے دوست کو فرصت ہو تو اس کا جواب ادب کے ساتھ لکھا جاوے، اس نقل کے سبب واپسی میں دیر ہوئی، الحمد للہ آج اس کو واپس کر کے سرخ رو ہوتا ہوں، ایک خط میں آمد کا محصول ومصارف عہ لکھا تھا، اس لئے عہ بصورت ٹکٹ روانہ خدمت ہے اگر گرانی نہ ہو تو ایک کارڈ پر پہونچنے کی اطلاع فرما کر مطمئن کر دیا جاوے، باقی بجز دعاگوئی ودعاجوئی کیا عرض کروں، والسلام اشرف علی از تھانہ بھون۔

بلٹی محصول اداشدہ حاضر ہے۔"

رجب ۱۳۶۲ھ (جولائی ۱۹۴۳ء) میں مولانا محمد الیاس صاحب لکھنؤ تشریف لائے اور اس کی وجہ سے شہر میں ایک خاص برکت ورونق اور دینی وایمانی فضا پیدا ہوگئی، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب بھی دوسرے روز تشریف لے آئے ایک بڑی تبلیغی جماعت بھی آئی ہوئی تھی، ہم سب لوگ اسی دینی دعوت اور تبلیغی نقل وحرکت میں مصروف اور مسرور تھے کہ اچانک

یہ جانگداز اور روح فرسا خبر سنی کہ ۱۷ ر رجب ۱۳۶۲ھ (۱۹ ر جولائی ۱۹۴۳ء) کو تھانہ بھون کا یہ آفتاب علم وارشاد غروب ہوگیا، حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی بھی ٹھیک انہی دنوں میں لکھنؤ تشریف لائے، معلوم نہیں انھوں نے یہ خبر راستہ میں سنی یا لکھنؤ آکر لیکن ان کی بے قراری اور رنج وقلق دیکھنے کا تھا، اس وقت ہم لوگوں کو اندازہ ہوا کہ ان کو اپنے شیخ سے کیسا گہرا تعلق ہے، کسے معلوم تھا کہ اس کے ٹھیک ایک سال کے بعد مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس جہانِ فانی سے رحلت فرمائیں گے، اور ہندوستان ان دو جلیل القدر ہستیوں سے محروم ہو جائے گا۔

"کل من علیها فان ویبقی وجه ربك ذو الجلال والاکرام"
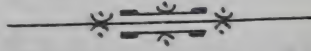
# مولانا احمد علی صاحب لاہوری

## رحمۃ اللہ علیہ

میری زندگی میں وہ بڑا مبارک دن اور بڑی سعید گھڑی تھی، جب مولانا احمد علی صاحب لاہوری امیر انجمن خدام الدین شیرانوالہ دروازہ، لاہور سے نیاز حاصل ہوا، میری زندگی کے دو بڑے موڑ ہیں، جہاں سے زندگی نے نیا راستہ (جہاں تک خیال ہے بہتر اور مبارک راستہ) اختیار کیا، پہلا موڑ جب مولانا احمد علی صاحب سے تعلق پیدا ہوا، دوسرا موڑ اس وقت پیش آیا جب خدا نے مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچایا، اگر مولانا احمد علی صاحب سے ملاقات نہ ہوتی تو میری زندگی اچھی یا بری بہر حال موجودہ زندگی سے بہت مختلف ہوتی، اور شاید اس میں ادب و تاریخ اور تصنیف و تالیف کے سوا کوئی ذوق اور رجحان نہ پایا جاتا، خدا شناسی اور خدا رسی، راہ یابی اور راس روی تو بڑی چیزیں ہیں، مولانا کی صحبت میں کم سے کم خدا طلبی کا ذوق، خدا کے نام کی حلاوت اور مردان خدا کی محبت، اپنی کمی اور اصلاح و تکمیل کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا، اور ہم عامیوں کے لئے یہی بڑی دولت و نعمت ہے، بلکہ بعض حقیقت شناسوں کے نزدیک یہی اصل دولت ہے،

وحشت کلکتوی نے انہی لوگوں کی ترجمانی اپنے اس شعر میں کی ہے۔

نشان منزل جاناں ملے ملے نہ ملے
مزے کی چیز ہے یہ ذوق جستجو میرا

کہتے ہیں کہ جس کا رزق جہاں مقدر ہوتا ہے وہیں ملتا ہے، اس کے لئے وطن، پردیس اور یگانہ و بیگانہ کی قید نہیں، میرے نزدیک یہ کلیہ مادی و غذائی اور معنوی و روحانی دونوں قسم کے رزق کے لئے عام ہے، اور قرآن مجید میں معنوی حقیقتوں کے لئے رزق کا استعمال آیا ہے، "أَتَجعلون رزقکم انکم تکذبون"۔ مصنفین، مفکرین اور ہر اچھے مقصد کے لئے کوشش کرنے والوں کو جن پر وہ مقصد طاری ہو جائے رہنمائی کے حصول، نئے نئے انکشافات خلاف توقع اور خلاف قیاس معلومات و مواد کی فراہمی اور غیبی امداد کے ایسے ایسے تجربے ہوتے ہیں کہ ان کے سامنے آیت قرآنی "ویرزقه من حیث لا یحتسب" کی تفسیر کے نئے نئے نمونے اور مثالیں سامنے آتی ہیں، اور ان کے نزدیک اس آیت کا وہی محدود مفہوم باقی نہیں رہتا جو تفسیر و ترجمہ کی عام کتابوں میں لکھا گیا ہے، اور عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔

میرے شعور کا زمانہ تھا، اور عربی تعلیم شروع ہو چکی تھی کہ خود خاندان میں، اپنے ہی ضلع میں وطن کے قریب مولانا سید محمد امین صاحب نصیر آبادی موجود تھے[1]، جن سے ضلع رائے بریلی،

---

[1] آپ خاندان حسنی قطبی کے چشم و چراغ اور حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ کے ایک شیخ طریقت اور مصلح اور داعی تھے، بیعت غالباً مولانا خواجہ سید احمد صاحب نصیر آبادی سے تھی، اور تربیت و اجازت میرے جد مادری حضرت سید شاہ ضیاء النبی رحمۃ اللہ علیہ سے، اللہ تعالیٰ نے بڑی دینی وجاہت اور دبدبہ عطا فرمایا تھا، ۱۲ جمادی الآخرۃ ۱۳۴۹ھ مطابق ۵ نومبر ۱۹۳۰ء میں اپنے وطن نصیر آباد ضلع رائے بریلی میں انتقال کیا۔

پرتاب گڑھ، سلطانپور اور اعظم گڑھ کے ہزاروں مسلمان بیعت وارادت کا تعلق رکھتے تھے، اور ان کی اصلاح وتربیت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا غلغلہ دور دور بلند تھا، لیکن باوجود قریبی قرابت اور مکانی قربت کے میں ان کی زیارت سے بھی محروم رہا، ہندوستان کے شمالی مغربی اضلاع، مشائخ وعلماء کا مرکز ہیں اور قریب وبعید متعدد حقانی ربانی مشائخ وبزرگ موجود تھے، تمام ظاہری قرائن اور قیاسات اس بات کے موجود تھے کہ علمی اور روحانی پیاس بجھانے کے لئے اور اپنی اصلاح وتربیت کے لئے انھیں میں سے کسی مشہور ومقبول ہستی کا انتخاب کیا جائے گا، خود اپنے شہر ہی نہیں اپنے محلہ اور مکان پر قدیم تعلقات اور روابط کی بنا پر ایسے بزرگوں کی آمد ورفت تھی، اور ان سے متعدد افراد خاندان منسلک ووابستہ تھے، لیکن ہوا وہی جو برسوں کا تجربہ ہے کہ رزق خود کھینچ کرلے جاتا اور اپنی طرف بلاتا ہے۔

مولانا احمد علی صاحب لاہوری کا نام شاید سب سے پہلے خواجہ عبد الحی صاحب فاروقی سے سنا، خواجہ صاحب میرے بھائی صاحب مرحوم کے دیوبند کے ہم سبق تھے، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب اور مولانا انور شاہ صاحب کے حدیث کے درس کے دونوں ساتھی تھے، اور دونوں میں غالباً زمانۂ حال کے تقاضوں سے واقفیت اور جدید مطالعہ کی بنا پر بہت کچھ ہم مذاقی اور اتحاد تھا، خواجہ صاحب مولانا عبید اللہ صاحب سندھی سے پڑھ کر آئے تھے، انگریزی داں تھے، سیاست کا ذوق تھا، اور بھائی صاحب ندوہ سے پڑھ کر گئے تھے، غرض دونوں میں بڑی دوستی اور محبت تھی، خواجہ صاحب، بھائی صاحب کی دعوت پر غالباً ۱۹۲۷ء میں ایک مرتبہ گرمی کی تعطیلات گزارنے کے لئے لکھنؤ آئے اور ہمارے مکان پر ٹھہرے بھائی صاحب نے ان سے فرمائش کی کہ وہ اس زمانۂ قیام میں مجھے قرآن مجید کا

کچھ حصہ پڑھادیں، میری عمر اس وقت ۱۳-۱۴ سال کی تھی، خواجہ صاحب نے اخیر پارے کی اخیر سورتیں پڑھائیں۔

مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کے ہندوستان میں دو مایۂ ناز شاگرد تھے اور ان کے طرز تعلیم اور مسلک تفسیر کے حامل و امین اور اس میں ان کے صحیح جانشین، مولانا احمد علی صاحب لاہوری اور خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی، وہ زمانہ ساری دنیا میں سیاسی بے چینی اور ہندوستان میں انگریز دشمنی کے بحران کا تھا، سیاست ہر چیز پر حاوی اور غالب تھی، ہر مسئلہ کو خواہ وہ علمی ہو یا دینی، ادبی ہو یا تاریخی، اخلاقی ہو یا اقتصادی، سیاست کی عینک سے دیکھنے اور سیاست کی کسوٹی پر پرکھنے کی عادت ہو گئی تھی، جیسے ہر زمانہ میں ایک خاص طرز فکر اور نقطۂ نظر کا استیلاء ہو جاتا ہے، اور ہر چیز اسی کی مدد سے اور اسی سے متاثر ہو کر دیکھی جاتی ہے، اس زمانہ میں سیاست و حکومت، آزادی و غلامی، حاکمیت و محکومیت اور استعمار و استقلال کا استیلاء تھا، اور اس نے ایک نئے "وحدۃ الوجود" کے فلسفہ کی شکل اختیار کر لی تھی، اس دور کے فلسفہ اور اس کے اثر و تسلط کو دیکھ کر وحدۃ الوجود کے عقیدہ کی عمومیت و عالمگیری، ادب، شاعری، علم و فلسفہ، الٰہیات اور علم کلام یہاں تک کہ عام زندگی و معاشرت، اور روزمرہ کی گفتگو اور بول چال پر اس کی مضبوط گرفت اور گہری چھاپ کا سمجھنا آسان ہو جاتا ہے، اس وقت ساری دنیا بالخصوص ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے سب سے اہم مسئلہ مغربی طاقتوں سے خصوصاً ان کے سب سے بڑے نمائندہ انگریزوں کی غلامی اور حکومت سے نجات اور آزادی حاصل کرنا تھا، مولانا عبید اللہ صاحب غیر معمولی طور پر ذہین و ذکی واقع ہوئے تھے، اسی کے ساتھ نہایت درجہ حساس اور غیور طبیعت رکھتے تھے، شیخ الہندؒ کی صحبت نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا، ان کے ابتدائی مرشد و مربی حافظ محمد صدیق صاحب اور ان کے خلیفہ مولانا سید تاج محمود امروٹی اعلیٰ مجاہدانہ جذبات

رکھتے تھے، اور پورے درجہ کے انگریز دشمن تھے، ان سب اثرات نے مولانا عبیداللہ صاحب کو ایک شعلۂ جوالہ میں تبدیل کر دیا اور ان کے ذہن کو جہاد و حریت، احیائے خلافت و حکومت الٰہی حصول آزادی اور انگریز دشمنی کی طرف ایسا موڑ دیا کہ ان کو سارا قرآن مجید جو شروع سے ان کی دلچسپی اور مطالعہ کا مرکز تھا اسی کی تفسیر اور اسی کی دعوت و تبلیغ نظر آنے لگا، ان کی ذہانت اور نکتہ آفرینی نے اس کی آیات و اشارات سے وہ کام لیا کہ ان کو اپنے ہر دعویٰ کی تائید قرآن مجید ہی میں نظر آنے لگی، اور انھوں نے اس سے اجتماعی و سیاسی زندگی کے ایسے ایسے اصول و کلیات اخذ کئے جن کا نہ کسی قدیم تفسیر میں نشان ملتا ہے، نہ کسی جدید تفسیر میں، یہ طرز استنباط اور یہ طریقہ، تفسیر صوفیائے کرام کے تفسیری لطائف اور متصوفانہ نکات سے بہت ملتا جلتا تھا جن کو وہ الاعتبار والتاویل کے نام سے یاد کرتے ہیں، اور جن کے نمونے شیخ اکبر کی فتوحات مکیہ، علامہ مہائمی کی تفسیر تبصیر الرحمٰن و تیسیر المنّان اور علامہ حقی کی تفسیر روح البیان میں دیکھے جا سکتے ہیں، اگر اس کو تفسیر کا نام نہ دیا جائے اور "الاعتبار والتاویل" ہی کے نام سے یاد کیا جائے، نیز وہ حد اعتدال سے متجاوز نہ ہو تو ہر دور کے علماء نے اس میں حرج نہیں سمجھا ہے۔

غرض مولانا عبیداللہ صاحب ایک خاص طرز تفسیر کے اس دور میں بانی تھے جس کو ان کے شاگرد رشید مولانا احمد علی صاحب تفسیر کے بجائے الاعتبار والتاویل ہی کے نام سے یاد کرنا پسند فرماتے تھے، اس میں ان کے سب سے زیادہ کامیاب وفادار اور جاں نثار شاگرد بھی دو مولانا احمد علی صاحب لاہوری اور خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی تھے، اول الذکر نے لاہور میں بیٹھکر تقریباً نصف صدی اس کی اشاعت کی، مدارس عربیہ کے فضلا کی بدولت جن کے لئے انھوں نے صرف ڈھائی تین مہینہ کا نصاب بنایا تھا، اور جو ان مدارس کی

تعطیل کے زمانہ میں ان سے استفادہ کے لئے آتے تھے، یہ درس قرآن ہندوستان کے دور دراز گوشوں تک پہنچ گیا، جہاں تک مجھے علم ہے، اس سے نقصان کم پہنچا، ...تصحیح عقائد، اصلاح رسوم ربط بالقرآن کا فائدہ زیادہ ہوا، یہ درحقیقت مولانا احمد علی صاحب کے تقوی اور روحانیت اور اخلاص و ایثار کی برکت تھی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں درس قرآن کے عمومی رواج اور لوگوں میں اس کی مقبولیت کا سہرا انہی کے سر ہے، دوسرے شاگرد رشید خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کو جو پہلے علی گڑھ میں تھا پھر دہلی منتقل ہوا، اپنی کوششوں کا مرکز بنایا، ان کے درس سے کم لیکن ان کی تفسیری تصنیفات سے اس کا علمی حلقہ میں زیادہ تعارف ہوا، خواجہ صاحب مولانا احمد علی صاحب کا نام بڑے احترام سے لیتے، ان کے درس اور مجالس میں ان کا تذکرہ آنا غیر متوقع بات نہ تھی، اس لئے جہاں تک قیاس کام کرتا ہے، مولانا کا سب سے پہلے نام اہمیت کے ساتھ انہی سے سنا۔

مولانا کے تعارف اور دل میں ان کی عقیدت پیدا ہونے کا دوسرا سبب یہ تھا کہ میرے بھائی مولانا سید طلحہ صاحب ایم۔ اے اورینٹل کالج لاہور میں پڑھاتے تھے، اتحاد مسلک کی وجہ سے مولانا سے ان کے گہرے روابط تھے، حضرت سید احمد شہیدؒ کے خاندان سے تعلق کی بنا پر مولانا ان کا ایک درجہ میں احترام فرماتے تھے، اور وہ خود بھی لاہور میں سب سے زیادہ مولانا ہی کے اخلاص وللّٰہیت اور پاکیزہ نفسی کے قائل تھے، وہ جب چھٹیوں میں وطن آتے تو مولانا کا ذکر خیر کرتے ۱۹۲۹ء کی گرمیاں تھیں اور مئی کا مہینہ، میں امتحان عربی میں نمایاں طریقہ پر کامیاب ہوا تھا، اس وقت تک لکھنؤ سے باہر کہیں نہیں گیا تھا، صرف ہسوہ فتحپور قرابتوں اور تقریبات کی وجہ سے اس سے مستثنیٰ تھا کہ وہاں سال میں ایک دو مرتبہ جانا ہوتا تھا، میری پھوپھی صاحبہ کا خط والدہ مرحومہ کے نام آیا جس میں مجھے لاہور بلایا گیا تھا،

یہ میرا پہلا طویل سفر تھا، اور بہت سی حیثیتوں سے تاریخی اور یادگار، اسی سفر میں میں نے پہلی مرتبہ علامہ اقبالؔ کی زیارت کی جس کا تذکرہ "نقوش اقبال" کے مقدمہ میں تفصیل سے آچکا ہے، مشہور علمی اور ادبی شخصیتوں کو دیکھا، بڑے بڑے فضلاء اور پروفیسروں سے ملاقات کی علمی و ادبی محفلوں میں شریک ہوا، رستم زماں گاما پہلوان اور بعض ہندوستان گیر اور بعض عالمگیر شہرت رکھنے والے اہل کمال کی زیارت کی، یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ مولانا احمد علی صاحب کے دیدار سے آنکھیں روشن نہ کرنا جن کا ذکر خیر عرصہ سے سنتا تھا، اس پر اضافہ یہ ہوا کہ بھائی صاحب نے میرے لاہور پہنچنے پر جو خط پھوپھا صاحب کو لکھا اس میں تاکید کی کہ مجھے مولانا احمد علی صاحب سے ضرور ملایا جائے۔

مئی کی غالباً کوئی آخری تاریخ تھی کہ مولانا سید طلحہ صاحب مجھے مولانا احمد علی صاحب کے پاس لے گئے، میری عمر اس وقت ۱۵-۱۶ کے درمیان رہی ہوگی، میرے تعارف میں دو ہی باتیں کہی جاتی تھیں، والد صاحب کا نام اور ان سے نسبت فرزندی اور عربی زبان سے مناسبت اور اس میں بے تکلف لکھنے پڑھنے کی صلاحیت جو اس عمر اور زمانہ میں کچھ نئی ہی بات سمجھی جاتی تھی، مولانا نے جس شفقت و عنایت کا اظہار فرمایا، اس کا مجھے اس وقت تک کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا اور وہ میری توقع اور حیثیت سے زیادہ تھی، یہ پہلا موقع تھا کہ ان کی محبت و عقیدت کا بیج دل کی نرم زمین میں پڑا اور زمین نے اس کو قبول کر لیا، اسی کا نتیجہ تھا کہ دوسرے یا تیسرے سال گرمیوں کی تعطیل میں لاہور پھر اس شوق میں گیا کہ مولانا کے درس قرآن میں شرکت کروں لیکن معلوم ہوا کہ عربی مدارس کے طلباء اور فضلاء کا باقاعدہ درس جس کو مولانا کے رفقاء و خدام "علماء کلاس" کے نام سے یاد کرتے ہیں، رمضان، شوال اور ذیقعدہ میں ہوا کرتا ہے، اس وقت تو صرف فجر کے بعد عمومی درس میں اہل شہر شریک ہوتے ہیں، اور مغرب کے بعد انگریزی تعلیم یافتہ حضرات

کا کلاس ہوتا ہے، لیکن مولانا نے ازراہ شفقت مجھے مستقل وقت دیا اور شروع سے قرآن شریف پڑھانا شروع کیا، اس درس میں صرف میں اور برادر عزیز سید احمد الحسنی جو پہلے سے لاہور میں تھے شریک تھے، اس درس کا سلسلہ زیادہ دن نہیں رہا، شاید سورۂ بقر نصف ہوئی ہوگی کہ لکھنؤ میری واپسی ہوگئی، اس درس میں نیز صبح کے عمومی درس میں شرکت سے اور کوئی فائدہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو دینی ذوق ضرور پیدا ہوا، مولانا کے درس کے تین اہم بڑے مرکزی مضمون تھے، عقیدۂ توحید کی وضاحت، جو ہر قسم کے مشرکانہ اثرات و رسوم سے پاک تھی، اور جس میں ان کا طرز مولانا اسماعیل شہیدؒ (صاحب تقویۃ الایمان) سے بہت ملتا جلتا تھا، نیز انھیں کے ایک دوسرے نامور معاصر اور بزرگ مولانا حسین علی شاہ صاحب (واں بھچراں ضلع میانوالی) کے طرز تفسیر اور انداز تبلیغ سے بہت ملتا ہوا تھا، یہ چونکہ خود اپنے خاندانی مسلک کی ترجمانی اور تائید تھی، اس لئے دل نے اس کا خوب ذائقہ لیا اور دماغ نے اس کو پورے طور پر قبول کیا، دوسرا مرکزی مضمون اہل اللہ کے موثر اور دلآویز واقعات، بالخصوص اپنے سلسلہ کے مشائخ کا دل نشین و دلپذیر بکثرت تذکرہ، مولانا اپنے سلسلہ کے مشائخ کی محبت میں بالکل سرشار تھے، اور جیسا کہ محبت کا قاعدہ ہے، وہ ان کے تذکرہ کے لئے کوئی نہ کوئی تقریب پیدا کر لیتے تھے، وہ جس وقت ان کا تذکرہ کرتے تھے، تو معلوم ہوتا تھا کہ ان کے منہ میں پانی بھر آیا ہے، اور وہ کسی نہایت شیریں اور محبوب چیز کا مزہ لے کر ذکر کر رہے ہیں، ان کے دو روحانی مربی و شیخ تھے، مولانا سید تاج محمود صاحب امروٹی اور خلیفہ غلام محمد صاحب دین پوری، وہ جس وقت ان دونوں بزرگوں کا تذکرہ کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ان کے ہر بن مو سے تشکر و امتنان اور محبت و عقیدت کا چشمہ ابل رہا ہے، اور کسی نے ان کے دل کا ساز چھیڑ دیا ہے، سامعین کے دل ان تذکروں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے، چنانچہ

قدرۃً یہ عقیدت و محبت ان کے دل سے سننے والوں کے دلوں کو منتقل ہوتی تھی، اور بجلی کی کرنٹ کی طرح دوسروں کے جسم و جان میں بھی دوڑ جاتی تھی، تیسرا مرکزی مضمون جذبۂ جہاد، بغض فی اللہ اور انگریزوں سے شدید دشمنی اور نفرت کا مضمون تھا، جو بار بار درس میں آتا تھا، اور خود قرآن مجید کی آیات ان کی رہبری کرتی تھیں، میرا نشو و نما اس وقت تک علمی و ادبی فضا اور ندوہ کے ماحول میں ہوا تھا، خاندان میں بھی انقلاب زمانہ اور انگریزی تعلیم کے اثر سے یہ تذکرے بہت کم رہ گئے تھے، حقیقتاً مولانا ہی کے درس سے اس نئی دنیا سے آشنائی پیدا ہوئی اور معلوم ہوا کہ علم و مطالعہ فکر و نظر اور ادب و شعر کے علاوہ بھی کچھ مقاصد و حقائق اور کچھ لذتیں اور ذائقے ہیں، اور انسانوں کی کوئی قسم ایسی بھی ہے، جس کے لئے دین صرف خبر نہیں بلکہ نظر، یا دریافت نہیں بلکہ یافت کا معاملہ ہے۔

سرّ دیں مارا خبر او را نظر

او درونِ خانہ ما بیرون در

اس کے اگلے سال غالباً ۱۹۳۲ء میں میں حجۃ اللہ البالغہ کے درس میں شرکت کے لئے لاہور آیا، مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کی دوسری پسندیدہ کتاب شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ تھی، جس کو وہ بڑے شوق و ذوق سے پڑھاتے تھے، ان کی ذہانت و نکتہ آفرینی نے اس میں بھی ایک نیا عالم پیدا کر دیا تھا، اس میں ان کو تمام جدید، سیاسی معاشی انقلابات کی پیشین گوئیاں اور ایک نئے صالح اور مکمل نظام کا نقشہ نظر آتا تھا، جو اخلاقیات و معاشیات اور سیاسیات و الہیات کے چار ستونوں پر قائم ہو سکتا ہے، پہلے گزر چکا ہے کہ ذہانت بڑی خلاق اور جدت پسند واقع ہوئی ہے، وہ بے جان تصویروں میں جان، اختصار میں تطویل اور اجمال میں تفصیل پیدا کر دیتی ہے، اور چند لفظوں اور لکیروں سے جو بعض اوقات

خوردبین کے بغیر دیکھی نہیں جا سکتیں، ایک پورا شہر تعمیر کر لیتی ہے، لیکن حجۃ اللہ البالغہ میں مولانا سندھی کی ذہانت کو زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی، کتاب کا موضوع، اس کے مطالب، شاہ ولی اللہ صاحب کے وسیع و آفاقی ذہن، ان کی نکتہ رس طبیعت اور ان کی دوربین نگاہ نے مولانا عبید اللہ صاحب کی خود مدد اور رہنمائی کی، اور انھوں نے اس کتاب کا رشتہ موجودہ زندگی اور مسائل سے جوڑ دیا، مولانا احمد علی صاحب اس کتاب کو بڑے اہتمام اور ذوق و شوق سے پڑھاتے تھے، اور اس کا ایک الگ درس ہوتا تھا جس میں مستند مدارس عربیہ کے فضلاء کو شرکت کی اجازت تھی، میرے علم میں اس وقت حجۃ اللہ البالغہ کا بالاستقلال درس کہیں نہیں ہوتا تھا، شاہ صاحب سے عقیدت گویا گھٹی میں پڑی تھی، اور خاندان و مدرسہ دونوں نے اس کو استحکام اور دوام عطا کیا، میں نے بھی اس درس میں شرکت کی، کئی روز تک میرا نام باقاعدہ نہیں لکھا گیا، مولانا کو اس بارہ میں بہت شبہ تھا کہ میرے اندر اس کتاب کی استعداد و صلاحیت ہے، ان کو معلوم تھا کہ میں نے فلسفہ اور علم کلام کی باقاعدہ تعلیم نہیں پائی اور اس کتاب کا اس کے بغیر سمجھ میں آنا مشکل ہے، خدا علامہ حسین میر کاشمیری[1] مرحوم کو جزائے خیر دے انھوں نے اس کی تقریب پیدا کی، ایک روز مولانا سے عرض کیا کہ آج عبارت ان سے پڑھوائیے، میں عرب اساتذہ سے پڑھنے اور ندوہ کی تعلیم کے اثر سے عبارت اچھی پڑھتا تھا، اور اس میں کچھ دوسروں سے فائق نکلا، مولانا کا خیال بدل گیا، اور انھوں نے مجھے باضابطہ اس جماعت میں شامل کر لیا، یہ دس بارہ طالب علموں کی جماعت رہی ہوگی، سب فارغ التحصیل تھے، ان میں بنگالی اور آسامی طلبہ بھی تھے، پنجاب اور

---

[1] یہ لاہور کے ایک مشہور مزاح نگار صحافی و شاعر اور شہر کے مشہور مجلسی شخصیت تھے، جن کے روابط تمام علماء اور قائدین بالخصوص مجلس احرار کے رہنماؤں سے تھے، شہر میں علامہ صاحب کے نام سے مشہور تھے۔

یوپی، بہار کے بھی، درس کا طور یہ تھا کہ اس میں نہ وقت کی قید تھی، نہ مقدار کی مسلسل ۳-۴ گھنٹے بھی درس ہو جاتا تھا، مجھے یاد ہے کہ ایک نشست بیٹھنے سے ٹانگیں درد کرنے لگتیں، چونکہ میں کچھ تاخیر سے حاضر ہوا تھا، اور میں نے کئی وہ علوم نہیں پڑھے تھے، جو مقدمات کا کام دیتے ہیں، اس لئے مجھے اس کتاب کے سمجھنے اور اس کے مطالب پر حاوی ہونے میں کہیں کہیں بڑی دشواری محسوس ہوئی، اور مجھے اس کے لئے بڑی تیاری کرنی پڑی، کئی کئی گھنٹے مطالعہ کرنا اور درس سے پہلے کتاب کو پورے طور پر حل کر لینے کی کوشش کرنا نیز طلبار کے ساتھ مذاکرہ کر کے پچھلا حصہ جو چھوٹ گیا تھا، اس کو پڑھا، مولانا کے یہاں کتاب کا صرف پہلا حصہ زیر درس رہتا تھا، نصاب پورا ہوا تو ہم لوگ مولانا نجم الدین صاحب پروفیسر اورینٹل کالج لاہور کے پاس گئے، مولانا کے معقولات و منقولات میں تبحر کی شہرت تھی، اس وقت اورینٹل کالج کے سینیر مولوی ہونے کی وجہ سے استاذ الاساتذہ سمجھے جاتے تھے، مولانا نے بھی امتحان بڑی تفصیل و تدقیق سے لیا، امتحان زبانی تھا، اس لئے جرح کا پورا موقع تھا، اور وہ کمزوریاں جو تحریری امتحان میں چھپ جاتی ہیں، ان کے اظہار کا بھی پورا موقع تھا، میری حیرت و مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے مجھے سب سے زیادہ نمبر دیئے، اور میں اول آیا۔

اہل اللہ کے تذکرے اور روحانیت کا شوق پیدا کرنے والے واقعات کا سلسلہ مولانا کے درس قرآن، حجۃ اللہ البالغہ کے سبق، جمعہ کے خطبات اور عام مجالس میں برابر جاری رہتا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہی مولانا کا اصلی ذوق اور اصلی دعوت ہے، اسی کے ساتھ زیادہ قیام اور قرب کی وجہ سے مولانا کی زاہدانہ اور مجاہدانہ زندگی ہمارے سامنے آئی، جس کی نظیر کم سے کم میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی، صرف بزرگوں کے قصے سنے اور کتابوں میں پڑھے تھے، ہم لوگ

مدرسہ قاسم العلوم میں رہتے تھے، ٹھیک اس کی پشت پر چند گز کے فاصلہ سے مولانا کا مکان واقع تھا، راستہ میں پتلی گلی تھی، مولانا کے بڑے صاحبزادہ مولوی حبیب اللہ صاحب[1] میرے دوست ہو گئے تھے

[1] افسوس ہے کہ ۲۹ جمادی الآخرہ ۱۳۹۲ھ (۲۶ جولائی ۱۹۷۲ء) پنجشنبہ کے دن مولانا نے اس دار فانی سے رحلت کی اور اپنی تمنا کے مطابق جنت المعلیٰ میں بعد نماز عشا مولانا عبدالحق شیخ الدلائل کی جگہ پر مدفون ہوئے غفر اللہ لہٗ ورفع درجاتہٗ۔

مولانا حبیب اللہ صاحب تقریباً ۲۵ سال سے حرمین شریفین میں مقیم تھے اس عرصہ میں وہ کبھی وہاں سے باہر نہیں گئے ابتدا کے دس بارہ سال انھوں نے مدینہ طیبہ میں گزارے اور بہت پابندی سے مسجد نبوی میں اپنے والد ماجد کے طرز پر درس قرآن دیا، پھر بعض مجبوریوں کی بنا پر مکہ معظمہ میں سکونت اختیار کر لی، وہیں جان جانِ آفریں کے سپرد کی، اس پورے قیام میں، ریاضت شاقہ طویل مدت تک مسلسل روزے اور تقلیل طعام و منام کا معمول رہا، پوری زندگی تجرد و انقطاع میں گزاری آخر میں یکسوئی اور خلوت پسندی کا اتنا غلبہ ہو گیا تھا کہ چند گنے چنے احباب و خدام کے سوا جن سے خاص مناسبت اور اتحاد ذوق تھا کسی سے ملنا پسند نہیں فرماتے تھے، ذکر کا بڑا غلبہ تھا اور زندگی بالکل زہد و قناعت بلکہ مجاہدہ کی تھی، آخر میں کسی سے خدمت لینا اور علاج معالجہ بھی گوارہ نہیں تھا، علالت کے آخری دنوں میں ایک دوست نے بہت اصرار کیا تو فرمایا کہ بھائی میں نے باری تعالےٰ سے رجوع کیا علاج بے سود ہے بس دعا کرو، محبی حکیم معراج الحسن صاحب مقیم مکہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ "تین دن پہلے بے چینی بہت بڑھی ہوئی تھی، فرمایا جمعہ تک انتظار کرو انشاء اللہ جمعہ تک بالکل تندرست ہو جاؤنگا بس دعا کرتے رہو، انتقال سے چند منٹ پہلے دیوار سے سہارا لے کر بیٹھ گئے اور فرمایا الحمدللہ اللہ نے میرا کام بنا دیا کلمہ شریف پڑھا اور رخصت ہو گئے"

مولانا عالم و حافظ اور فاضل دیوبند تھے انکو اپنے والد مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت و خلافت بھی تھی احوالات نہایت رفیع تھے، ریاضات شاقہ اور علوئے استعداد کی بنا پر والد ماجد کی طرح کشف اور اشراق بہت بڑھا ہوا تھا۔

مولانا کے گھریلو حالات اور ان کے زہد و تقشف، ورع و احتیاط اور قناعت و استغنا کے واقعات ان کے معتمد خاص، رفیق زندگی اور انجمن خدام الدین کے سکریٹری خلیفہ شہاب الدین صاحب سے سننے میں آتے تھے، جو مجھ پر خصوصی کرم فرمانے لگے تھے، خلیفہ صاحب نے غالباً مولانا ہی کے ساتھ ہجرت کی تھی، اور کابل و بخارا پھر وہاں سے ترکی گئے تھے، وہ مولانا کے محرم راز اور خلوت و جلوت کے آشنا تھے، ان ذرائع سے مولانا کی زندگی کے جو حالات، ان کے زہد و ورع، روشن ضمیری، قوتِ ادراک اور باطنی کمالات کا جو اندازہ ہوا اس سے مولانا سے اصلاح و تربیت کے مستقل تعلق کا داعیہ پیدا ہوا، اور میں نے ایک دن مولانا سے اس کی درخواست کردی، مولانا نے فرمایا کہ ابھی میرے شیخ و مرشد حضرت خلیفہ صاحب حیات ہیں میں آپ کو ایک تعارفی خط دے دیتا ہوں آپ دین پور چلے جائیں اور ان سے بیعت ہو جائیں، میرے لئے تعمیل ارشاد کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، سخت گرمی کا زمانہ تھا اور غالباً جون کا مہینہ، دین پور، ریاست بہاولپور میں خان پور سے چند میل کے فاصلہ پر واقع ہے جو لاہور کراچی لائن کا ایک مشہور اسٹیشن ہے اور تقریباً سندھ کی سرحد پر واقع ہے، میں نے وہاں جانے کا عزم کرلیا۔

قبل اس کے کہ دین پور کے سفر کی مختصر روداد سنائی جائے مولانا احمد علی صاحب کے سلسلۂ روحانی کا مختصر تعارف کرا دینا مناسب ہے، بارہویں صدی کے تقریباً وسط میں سندھ و بلوچستان میں ایک مشہور شیخ طریقت سید محمد راشد گزرے ہیں، جن کا سلسلہ قادریہ تھا، میں نے مولانا عبیداللہ صاحب سندھی سے خود سنا ہے کہ وہ ان دیار میں علمی اور روحانی طور پر تقریباً وہی مرتبہ اور شہرت رکھتے تھے، جو ان کے معاصر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کا شمالی مغربی ہندوستان میں تھا، سید محمد راشد اپنے والد سید محمد بقا کے مرید و مجاز تھے، وہ سید عبدالقادر جیلانی خامس کے خلیفہ تھے، جو پیر کوٹ سدھانہ (ضلع جھنگ سیال پنجاب) میں مدفون ہیں، یہ سلسلہ بغداد و حلب سے اُچ (ریاست بہاول پور)

پہونچا جہاں اس سلسلہ کے نو مشائخ مدفون ہیں۔

سید محمد راشد کے تین[۳] نامور اور ممتاز ترین خلفار تھے، دو خود ان کے صاحبزادے سید صبغۃ اللہ اور سید محمد یٰسین، سید صبغۃ اللہ اور سید محمد یٰسین کے درمیان والد نامدار کے تبرکات اور مناصب کی تقسیم اس طرح ہوئی کہ سید صبغۃ اللہ کے سر پر دستارِ خلافت و مشیخت باندھی گئی اسی وجہ سے وہ سندھیوں میں پیر پگاڑو کے شہرۂ آفاق لقب سے مشہور ہوئے اور ان کا ہر جانشین پیر پگاڑو کہلاتا انھوں نے ایک مجاہد جماعت کی "حر" کے نام سے تنظیم شروع کی جس کا مقصد یہ تھا کہ وقت آنے پر ان رضا کاروں کو مجاہدین کے جیش میں تبدیل کر دیا جائے اور ان سے اسلام کی عزت و سربلندی کا کام لیا جائے۔ پیر صبغۃ اللہ شاہ ثانی پیر پگاڑو ۶ کے زمانہ میں حروں نے بدامنی شروع کی اور اس کی وجہ سے انگریزوں نے ان کو پھانسی دی، ان کے بعد سکندر شاہ شاہِ مردان ثانی اپنے اسلاف کے جانشین ہوئے، یہی پیر صبغۃ اللہ اول ہیں جنھوں نے حضرت سید احمد شہید اور ان کے قافلے کی ۱۲۴۱ھ ۱۸۲۶ء کے سفر ہجرت میں بڑی اولوالعزمی کے ساتھ ضیافت و میزبانی کی اور انہی کی وجہ سے ان کے مستقر پیر کوٹ میں آپ کا تیرہ روز قیام رہا سید صاحب کے اہل و عیال عمر کوٹ سے آکر ۶۔۷ سال وہیں مقیم رہے، اور پھر آپ کی شہادت کے بعد وہیں سے مستقل طور پر ٹونک منتقل ہو گئے۔

سید محمد یٰسین کے حصہ میں عَلَم (جھنڈا) آیا اور وہ پیر جھنڈا کے لقب سے مشہور ہوئے، پیر جھنڈا کا کتب خانہ ہندوستان کے علمی حلقوں میں مشہور و معروف ہے ۱۹۴۴ء کے اوائل میں راقم سطور نے مولانا عبید اللہ صاحب کی ملاقات کے لئے جو اس وقت کوٹھ پیر جھنڈا میں مقیم تھے، وہاں حاضری دی، اس وقت اس سلسلہ کے شیخ پیر ضیاء الدین زندہ تھے، اور انھیں نے میزبانی فرمائی۔

سید محمد راشد کے تیسرے خلیفہ حضرت شاہ حسن تھے، جن سے سندھ، ریاست بھاول پور اور پنجاب میں سلسلہ کی بڑی اشاعت اور عقائد و اعمال کی بڑی اصلاح ہوئی، انہی کے سلسلہ میں حافظ محمد صدیق صاحب بھرچونڈی والے ہوئے، جن کے دو ممتاز ترین خلفار مولانا سید تاج محمود امروٹی اور حضرت خلیفہ غلام محمد دین پوری تھے، مولانا سید تاج محمود امروٹی پر جلال اور جذبۂ جہاد غالب تھا، کرامات جلیہ کا ان سے ظہور ہوا، کئی بار انگریزوں کو چیلنج کیا اور ان کے مقابلہ میں آگئے حکومت نے شورش عام کے خطرہ سے طرح دی، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بڑا اخلاص و اختصاص تھا، ایک مرتبہ ان کی خدمت میں بڑے اہتمام سے ایک ٹوپی بھیجی اس پر لکھا "تاج محمود" حضرت خلیفہ غلام محمد صاحب پر جمال کا غلبہ تھا، بڑے صاحب سکینت اور تمکین تھے، چہرۂ مبارک گلاب کی طرح سرخ اور آفتاب کی طرح پر انوار معلوم ہوتا تھا، نہایت صاحب وجاہت اور صاحب جمال تھے، عرصہ تک دستور رہا کہ بھاول پور کا جب کوئی نواب گدی پر بیٹھتا تو خود ہی اس کی دستار بندی گویا تاج پوشی فرماتے، تقریباً ناخواندہ تھے، میں نے جب ۱۹۳۱ء میں زیارت کی تو اس وقت کسی استاذ کے سامنے قرآن شریف کی تصحیح فرماتے تھے، پنجاب و سندھ کے تمام مشائخ ان کے علوئے مرتبہ، قوت نسبت اور ان کی بزرگی کے قائل تھے، مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نے خود مجھ سے فرمایا کہ ان کو بھی حضرت خلیفہ صاحب سے اجازت حاصل ہے، ہمارے شیخ و مرشد مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری بہت احترام و عقیدت کے ساتھ ان کا نام لیتے تھے اور ان کو اس نواح کے مشائخ کبار میں شمار فرماتے تھے، صاحبزادگان اور خلفار بھی حضرت سے بہت ربط و تعلق رکھتے تھے۔

غرض ۱۹۳۱ء یا ۱۹۳۲ء کے جون کی کوئی تاریخ تھی کہ میں کراچی میل سے خانپور کیلئے روانہ ہوا، ایک رفیق درس اور دوست مولوی محمد موسیٰ سندھی رفیق سفر تھے، جو خود بڑے

صاحبِ صلاح اور قوی الاستعداد نوجوان تھے، مغرب کو ہم لوگ خان پور پہنچے، وہاں سے دین پور کی طرف روانہ ہوئے، غالباً رات ہی کو حضرت کی زیارت ہوگئی، ایسا منور چہرہ غالباً اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا، نہایت کم گو اور کم سخن بزرگ تھے، گفتگو بھی فرماتے تو ٹھیٹھ ریاستی زبان میں جو ملتانی و سندھی کا مجموعہ ہے، اور جس سے میں بالکل ناآشنا تھا، دین پور کی دنیا ہی نرالی تھی، وہ صحیح معنی میں دین پور تھا، قادری طریقہ پر ذکر جہر سے مسجد و خانقاہ اور بستی ہر وقت گونجتی رہتی تھی، اگر کوئی کسی کو آواز بھی دیتا تو پکارنے والا بھی اِلَّا اللہ کہتا اور جواب دینے والا بھی اِلَّا اللہ ہی سے اس کا جواب دیتا، اس طرح اذان، ذکر جہر اور صدائے اِلَّا اللہ کے سوا کوئی اور بلند آواز سننے میں نہ آتی، یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں صرف حضرت اور حضرت کے متعلقین آباد تھے، نیم خام نیم پختہ چند مکانات جن کی تعداد شاید ۵-۷ سے زیادہ نہ ہو، ایک سادہ سی مسجد، چند خام حجرے ذاکرین کے لئے، کچھ کھجوروں کے درخت جن کو دیکھ کر عرب کے بادیہ کی بستیاں یاد آتی ہیں، آب و ہوا بھی بادیہ عرب سے ملتی جلتی تھی، مقیمین خانقاہ کے لئے ایک لنگر تھا جس میں خالص سندھی اور بہاولپوری مذاق کا ایسا کھانا تیار ہوتا جو قوت لایموت کا صحیح مصداق تھا، اور ہم اودھ کے نازک مزاج مہمانوں کے لئے اس کا کھانا بڑا مجاہدہ اور امتحان تھا، گرمی شدت کی تھی، دن بھر لو چلتی، رات کسی قدر ٹھنڈی ہوتی۔

یہ تھا دین پور کا نقشہ جہاں عمر میں صرف دو مرتبہ جانا ہوا ایک اسی ۱۹۳۱ئ یا ۱۹۳۲ئ میں دوسرے ۱۹۵۰ئ یا اس کے بعد خلیفہ صاحب کی وفات کے عرصہ کے بعد ایک شب کے لئے جانا ہوا، حضرت خلیفہ صاحب کی عمر اس وقت بھی نوے سال سے متجاوز تھی، مولانا احمد علی صاحب کا خط آپ کو سنایا گیا جس میں غالباً حضرت سید صاحب کی نسبت سے میرا تعارف تھا،

حضرت نے سلسلہ میں داخل فرمایا اور ذکر قلبی کی تلقین کی، جب وقت رخصت ہونے لگا تو فرمایا کہ "ان کو سلام کہہ دینا" میں نہیں سمجھا کہ اشارہ کس کی طرف ہے، صاحبزادہ میاں عبدالہادی صاحب پاس سے گزر رہے تھے، انھوں نے تشریح فرمائی کہ مولانا اشرف علی تھانوی کو، مولانا کا نام سنتے ہی خلیفہ صاحب پر رقت طاری ہو گئی، اس سے اس تعلق کا اندازہ ہوتا ہے، جو ان دونوں بزرگوں کے درمیان تھا مجھے معلوم ہوا کہ مولانا تھانوی ایک مرتبہ کراچی سے آتے ہوئے خلیفہ صاحب کی زیارت اور ملاقات کے لئے دین پور ٹھہرے تھے۔

میں دین پور ۳-۴ دن ٹھہر کر لکھنؤ واپس آگیا، اس کے بعد پھر خلیفہ صاحب کی زیارت نصیب نہیں ہوئی، میں نے مولانا کے حکم کی تعمیل تو کر دی تھی، لیکن میں انہی کو اپنا شیخ و مربی سمجھتا تھا، اور ان کا بھی معاملہ میرے ساتھ یہی تھا، یہ تعلق یوماً فیوماً بڑھتا رہا، لاہور آنا جانا تو آسان نہ تھا، مگر خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری رہا ۱۹۳۲ء کے آخر میں (رمضان ۱۳۵۱ھ) میں لاہور اس درس کی تکمیل کے ارادہ سے گیا، جو فضلائے مدارس کے ساتھ مخصوص تھا، اور جس کا سلسلہ آخر شعبان سے شروع ہو کر وسط ذیقعدہ تک جاری رہتا تھا، سردیوں کا رمضان تھا، مدرسہ قاسم العلوم میں قیام تھا، پچاس اور ساٹھ کے درمیان طلبا رہتے تھے، جو سب مدارس عربیہ کے فارغ التحصیل تھے یا بالکل آخری درجات (حدیث و تفسیر) کے طالب علم تھے، فجر کے بعد ذرا دن چڑھے سبق شروع ہو جاتا اور کئی کئی گھنٹے جاری رہتا، مولانا عبید اللہ صاحب سندھی نے ہر رکوع کا خلاصہ اردو کے چند جملوں میں کر رکھا تھا، طلبہ کو وہ اور اس کا ماخذ ازبر کرنا پڑتا تھا، اسی طرح ہر سورہ کا عمود یعنی مرکزی مضمون مقرر تھا، میں خاندانی طور پر ضعیف الحافظہ ہوں، اس لئے سیکڑوں رکوع کے خلاصے یاد کرنے اور مستحضر رکھنے میں بڑی محنت کرنی پڑتی تھی، لیکن اس کے بغیر چارہ نہ تھا، مولانا پہلے آموختہ کے طور پر پچھلے اسباق سنتے تھے، پھر سبق پڑھاتے تھے، اس سبق میں مولانا کی

طبیعت بہت شگفتہ اور خوش رہتی، توحید کا مضمون، ردِ شرک و بدعت، اہل اللہ کے واقعات اور دشمنانِ اسلام سے بیزاری کا اظہار اور ان کے خلاف جد و جہد کے جذبہ کی تحریک ان اسباق کا ایک مشترک اور عمومی مضمون تھا، اس پر ان اشارات و ہدایات کا اضافہ تھا جن کا تعلق طلبہ کی اصلاح و تربیت اور تزکیہ نفس سے تھا۔

اس درس کا اصل مقصد و موضوع تو قرآن مجید کے علم و فہم میں بصیرت پیدا کرنا تھا، اور مولانا اس سلسلہ میں اپنے محبوب استاذ مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کے متبع اور پیرو تھے، جہاں تک اس طرز کا تعلق ہے، مجھے اس سے کچھ زیادہ مناسبت نہیں تھی، اسی لئے میں اپنے درس قرآن میں جس کا سلسلہ میں نے لکھنؤ واپس آکر شروع کر دیا' اور جس نے بعد میں ادارۂ تعلیماتِ اسلام میں شہر کے ایک بڑے مرکزی درس کی شکل اختیار کر لی جس میں شہر کے جدید تعلیم یافتہ اور اعلیٰ عہدیدار بڑی تعداد میں شریک ہونے لگے، اس طرز کی پیروی نہیں کی، لیکن اس درس سے مجھے فائدہ بہت ہوا، اور اس کی برکت میں نے اپنی بعد کی علمی اور تبلیغی زندگی میں محسوس کی۔

سب سے زیادہ مفید و موثر مولانا کی صحبت' ان کی زاہدانہ اور مجاہدانہ زندگی' ان کا اخلاص' ان کا قرآن مجید سے والہانہ تعلق اور اس کی نشر و اشاعت اور تبلیغ کا بے قرارانہ جذبہ تھا' ان کو قرآنِ مجید کے درس و اشاعت کے بغیر چین نہیں آتا تھا، اور وہ ان کی روح کی غذا اور درد کی دوا بن گیا تھا، ان کے نزدیک اس درس میں ناغہ کرنا گویا گناہ کبیرہ اور سخت کوتاہی تھی، میں نے سنا ہے کہ ایک مرتبہ ان کے ایک بچہ کا انتقال ہوا اس کی لاش گھر میں تھی، لیکن اس دن بھی انھوں نے درس کا ناغہ نہیں کیا، درس کے بعد حاضرین کو اس واقعہ کی اطلاع کی اور تجہیز و تکفین میں مشغول ہوئے۔

اوائل ذیقعدہ ۱۳۵۱ھ شروع مارچ ۱۹۳۳ء میں ہم لوگوں کا قرآن مجید ختم ہوا مولانا نے

ہم لوگوں کے امتحان کے لئے اپنے قدیم رفیق خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی کو دہلی سے لاہور آنے کی زحمت دی، اس طرح جس طرز تفسیر اور درس قرآن کا آغاز پانچ سال پہلے خواجہ صاحب ہی کے ہاتھ پر لکھنؤ میں ہوا تھا، اس کا اختتام بھی (امتحان کی شکل میں) انھیں کے ہاتھ پر ہوا، ۱۵؍ذیقعدہ ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۲؍مارچ ۱۹۳۳ء کو ایک مختصر جلسہ میں جس میں شہر کے بعض علماء اور اہل تعلق شریک تھے، مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نے سند تقسیم کی، اس سند کا عربی مضمون مولانا سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا لکھا ہوا ہے، سند پر شاہ صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی اور مولانا مدنی اور مولانا احمد علی صاحب کے دستخطوں کے فوٹو ہیں۔

مولانا سے پنجاب اور سندھ میں اللہ تعالٰی نے تصحیح عقائد، اشاعت توحید اور اصلاح اعمال و رسوم اور انابت الی اللہ کا جو عظیم و وسیع کام لیا۔ درس قرآن کے علاوہ اس کے دو اور مؤثر ذریعے تھے، ایک جمعہ کا خطبہ، دوسرے عام فہم اصلاحی رسائل کی اشاعت، جمعہ کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ان کی زندگی میں پنجاب میں اتنا بڑا جمعہ اور اتنی موثر و مقبول جمعہ کی تقریر کہیں نہیں ہوتی تھی، لوگ دور دور سے آتے تھے، اور بہت پہلے سے منتظر رہتے تھے، مولانا جمعہ کے خطبہ سے پہلے جس کی عربی میں دینے کی پابندی فرماتے تھے، پورے ایک گھنٹہ اردو میں تقریر فرماتے تھے، یہ تقریر خالص اصلاحی اور تبلیغی رنگ کی ہوتی تھی، اس کی سب سے بڑی خصوصیت اور طاقت مولانا کی صاف گوئی، بے خوفی اور ہر قسم کی مصلحت اندیشی سے بے پروائی تھی، یہ تقریر بالکل مطابق حال ہوتی تھی، اس سے غلط عقائد، فاسد اخلاق، غیر دینی اور غیر شرعی رسوم و اعمال، غیر اسلامی معاشرت و تمدن پر ضرب کاری لگتی تھی، اور ہر وہ شخص جو اس میں مبتلا ہوتا تھا، اس ضرب اور اس کی چوٹ کو محسوس کرتا تھا، اور اثر لئے بغیر نہیں رہتا تھا، مولانا اس میں کسی رعایت و مداہنت اور اشارے کنایے سے قطعاً کام نہیں لیتے تھے، اہل حکومت، اہل وجاہت، اہل ثروت اور

دنیا دار علماء و مشائخ اور دین کو پیشہ بنانے والوں اور غلط پیروں پر سخت تنقید کرتے تھے، بعض مرتبہ ان کی تنقید اتنی سخت ہو جاتی تھی کہ سننے والوں کو حیرت ہوتی تھی کہ لوگ کیسے برداشت کر لیتے ہیں، مجھے تو کئی مرتبہ ڈر معلوم ہوا کہ کہیں یہ سامعین کی برداشت سے باہر نہ ہو جائے اور ان کی زخم خوردہ انانیت اپنے کرب کو چھپا نہ سکے اور انتقام لینے اور بے ادبی پر آمادہ نہ ہو جائے، لیکن ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا، صاف معلوم ہوتا تھا کہ ان کا اخلاص اور ان کی بے غرضی اور بے نفسی، پھر ان کی عنداللہ و عندالناس مقبولیت کسی فتنہ کو اٹھنے نہیں دیتی، سننے والوں کے کانوں میں اب بھی یہ الفاظ گونج رہے ہوں گے کہ "اے لاہوریو! احمد علی چھیالیس[۴۶] برس سے تمہارے درمیان رہتا ہے، لیکن وہ اس اٹھارہ لاکھ کی آبادی میں انسان کی صورت دیکھنے کو ترستا ہے، تم سب کچھ ہو مگر انسان نہیں ہو" بعض مرتبہ اہل حکومت پر تنقید کرتے، بعض مرتبہ پاکستان کے بانیوں پر اور یہ فرماتے کہ "سی آئی ڈی والو! یہ لکھ لو، میں صاف کہتا ہوں" لیکن جس قدر مولانا کی یہ صاف گوئی اور ان کا اندرونی درد و جوش بڑھتا جاتا، سامعین کی تعداد بھی بڑھتی جاتی، اور گرویدگی بھی، لوگوں نے جمعہ اور ان عام مواعظ میں اچھے اچھے معزز شہریوں، ارکان حکومت اور وزراء کو بھی دیکھا، بارہا سر فیروز خاں نون کو لوگوں نے ایک عام شہری کی طرح سر جھکائے ہوئے بیٹھے ہوئے دیکھا، جب جوش آتا تو تقریر کی روانی اور طاقت لسانی بہت بڑھ جاتی، یہ معلوم ہوتا کہ سینہ میں ایک دریا امنڈ رہا ہے، اکثر ایسے موقعوں پر کئی کئی منٹ مسلسل پنجابی میں تقریر فرماتے، جو ان کی زبان سے بہت بھلی لگتی، خاص طور پر جب عورتوں کو خطاب ہوتا جو بڑی تعداد میں موجود ہوتیں ان کے لئے الگ پردہ کا انتظام تھا، شادی بیاہ کی رسموں، جھوٹی غیرت اور اسراف بیجا اور مغربی تمدن کی نقالی پر تنقید ہوتی، جمعۃ الوداع میں تو اتنی بڑی تعداد ہوتی کہ شیرانوالہ دروازہ کی وسیع مسجد کا صحن اس کے لئے کافی نہ ہوتا اور پاس کے پارک میں جو شہر کے

چاروں طرف سے جمعہ کا انتظام کیا جاتا۔

اشاعت و تبلیغ کا دوسرا ذریعہ مولانا کے وہ کثیر التعداد تبلیغی رسائل تھے جو وقتاً فوقتاً انجمن خدام الدین کی طرف سے بڑی تعداد میں شائع ہوتے رہتے تھے، اور بڑے پیمانہ پر ان کی اشاعت ہوتی تھی، ان کا موضوع بھی عام طور پر اصلاح عقائد و اعمال اور رد بدعت ہوتا تھا، وہ عوام اور کم پڑھے لکھے لوگوں کی سطح کے مطابق ہوتے اور بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے، ان رسائل کی اشاعت مجموعی طور پر لاکھوں کی تعداد تک پہنچ گئی ہو گی، مولانا نے سندھی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ اور حواشی بھی شائع کئے، یہ لکھنا رہ گیا کہ مولانا کو سندھی زبان پر پورا عبور تھا، اور اس میں بے تکلف تقریر کرتے تھے، اردو میں بھی بڑے اہتمام سے ۱۹۴۷ء میں مترجم قرآن شریف شائع کیا اس میں ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کا ہے، اور حواشی اپنے قلم سے اسی طرز تفسیر پر لکھے ہیں، جس کے مطابق درس دیتے تھے، یہ قرآن مجید بڑی تعداد میں شائع ہوا۔

مولانا تبلیغی دورے بھی فرماتے تھے، لیکن اس میں ان کے شرائط اتنے سخت تھے کہ بعض اوقات مہینوں ان کی نوبت نہ آتی تھی، اس میں ایک شرط یہ تھی کہ اپنے ہی کرایہ سے تشریف لے جائیں گے، اس کے لئے بعض اوقات مہینوں انتظار کرنا پڑتا تھا، دوسری شرط یہ تھی کہ جب تک وہاں قیام رہے گا اپنا ہی کھانا کھائیں گے، فرماتے تھے کہ جہاں تبلیغ کرنی ہو وہاں کا کھانا کھا لینے بلکہ بعض اوقات شربت پی لینے سے بھی اثر پڑ جاتا ہے، اور آدمی اتنی صفائی اور جرأت سے امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور احقاق حق کا فریضہ انجام نہیں دے سکتا، ایک مرتبہ بعض اہل تعلق کی دعوت پر پونہ تشریف لے گئے، گھر سے کوئی ایسی چیز پکوا کر لے گئے تھے جو کئی دن تک خراب نہ ہو، جب تک وہاں قیام رہا اسی پر گزارہ کیا، ظاہر ہے کہ اس کی کوئی فقہی حیثیت نہیں اور یہ قانون ہر ایک کے لئے نہیں ہو سکتا، اور اس کے التزام سے تبلیغ میں بہت سی

مشکلات بھی پیدا ہو سکتی ہیں، لیکن مولانا اس بارے میں صاحب حال تھے، کھانے پینے کے بارے میں ان کی یوں بھی احتیاط و تورع بہت بڑھا ہوا تھا، غیر مسلموں کے یہاں کے کھانے اور بازار کی چیز کو وہ شرعاً جائز سمجھتے تھے، لیکن اس سے بھی احتراز کرتے تھے۔

وہ عمر بھر انجمن خدام الدین[1] اور مدرسہ قاسم العلوم سے جس کے وہ بانی اور روح رواں تھے، ایک پیسہ لینے کے بھی روادار نہیں ہوئے، ساری عمر انھوں نے اعزازی اور رضاکارانہ طور پر خدمت انجام دی اور اپنی اور اپنی اولاد کے لئے کوئی منفعت حاصل نہیں کی، مجھے ان کے ایک قدیم معتمد خاص نے بتایا کہ ایک مرتبہ مولانا سخت علیل ہوئے، معالجین نے آپ کے لئے دوا اور غذا کا ایک نظام بنایا جس کی آپ کی زاہدانہ زندگی میں گنجائش نہ تھی، انجمن کے ارکان نے یہ سمجھ کر کہ انجمن اور اس کا سارا کام مولانا کے دم سے ہے، ان کی زندگی ہی سے انجمن کی زندگی اور بقا ہے، مولانا کے علاج پر کچھ انجمن کے فنڈ سے خرچ کر دیا، مولانا کو بیماری سے افاقہ کے بعد جب اس کا علم ہوا تو نہایت ناراض ہوئے، اور فرمایا کہ تم نے مجھے ناجائز کھلایا اور اس سب کو اپنے پاس سے ادا کیا، جب ہم لوگ مدرسہ قاسم العلوم میں پڑھتے تھے، تو بعض اوقات ملازمین اور واقفین حال سے معلوم ہوتا کہ مولانا کے یہاں کسی کسی وقت فاقہ ہو جاتا ہے، بعض وقت ہم طلباء کے لئے بڑی فراوانی کے ساتھ کھانے پکتے اور ہم سب آسودہ ہو کر کھاتے، لیکن یہ مجال نہ تھی کہ مولانا کے یہاں اس میں سے ایک دانہ بھی پہنچ جاتا اور ان کے گھر کا ایک بچہ بھی اس کھانے سے مستفید ہوتا۔

ہم لوگوں کو خوب اندازہ تھا کہ مولانا کے یہاں عسرت اور نہایت سادگی کے ساتھ گزران ہوتی ہے، اسی کا نتیجہ تھا کہ اخفاء حال اور تکلیف سے بچانے کے لئے مولانا اپنے

---

[1] انجمن خدام الدین کا قیام ۱۹۲۲ء اور مدرسہ قاسم العلوم کا قیام ۱۹۲۴ء میں عمل میں آیا۔

عزیز مہمانوں کے کھانے کا انتظام باہر کرتے اور انجمن کے کسی خادم یا مسجد کے کسی منتظم کو کچھ نقد عنایت فرما دیتے جس سے ان مہمانوں کی میزبانی ہوتی رہتی، مجھے ایک مرتبہ اچانک اس کا اندازہ اور علم ہوا کہ مولانا کے گھر میں عام طور پر کیسی گزران اور کیا معیار زندگی ہے، رمضان مبارک میں غریب مسلمانوں کے یہاں بھی کچھ نہ کچھ اہتمام اور تکلف ہوتا ہے، لیکن مولانا کے یہاں میں نے اتنا بھی اہتمام نہیں پایا، واقعہ یہ پیش آیا کہ ایک رمضان مبارک میں میں مولانا کی خدمت میں مقیم تھا، مولانا نے ایک روز فرمایا کہ آج کھانا میرے ساتھ کھایئے گا، افطار ہم لوگوں نے پنجاب کے رواج کے مطابق مسجد میں پانی اور چھوہارے سے کیا، نماز مغرب کے بعد مولانا نوافل میں مشغول ہو گئے، فارغ ہوئے تو میری طرف دیکھ کر فرمایا کہ مولوی صاحب! میں گھر میں اطلاع دینا بھول گیا کہ آج آپ ساتھ کھانا کھائیں گے، یہ کہہ کر مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ فرمایا، کھانا آیا تو صرف روٹی اور دال کا پیالہ تھا، غالباً ماش کی تھی، اسی وقت دہی کا میری خاطر اضافہ کیا گیا مولانا نے کھاتے ہوئے فرمایا کہ مولوی ابوالحسن صاحب! (مولانا مجھے اکثر اسی طرح یاد فرماتے تھے) ہم سے تو یہ دال اچھی ہے کہ یہ جس مقصد کے لئے پیدا کی گئی تھی، اس کو اس نے پورا کیا، مگر ہم نے اپنی زندگی کا مقصد پورا نہیں کیا، اس کے بعد بغیر کسی معذرت کے کھانے میں شریک ہو گئے، اور ایسا معلوم ہوا کہ آج کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔

طمع دنیا اور مشتبہ مال سے احتیاط سے زیادہ مشکل غیبت سے اجتناب اور پرہیز ہے خصوصاً ان لوگوں کے لئے جو عزلت اور گوشہ گیری کی زندگی نہ گزارتے ہوں، اور ان کا مختلف طبقوں، کثیر التعداد اور مختلف المزاج لوگوں سے واسطہ پڑتا ہو، یہ بات اس وقت اور بھی زیادہ مشکل ہو جاتی ہے جب کسی طبقہ یا فرد سے اعتقادی اور اصولی اختلاف بھی ہو اور اس کے ساتھ صریح ظلم کیا گیا ہو، مولانا کو ان نازک موقعوں پر بھی ہمیشہ غیبت وشکایت سے مجتنب اور

محتاط پایا، درس میں ہر طرح کا تذکرہ آتا، تردید و تنقید بھی ہوتی، لیکن کسی موقع پر بھی مولانا کو اپنے کسی شدید سے شدید مخالف کی غیبت کرتے ہوئے نہیں سنا گیا۔

مولانا کی قوت روحانی اور اشراقی بہت بڑھی ہوئی تھی، کشف قبور میں بڑا دخل تھا، ان کے صحیح کشف کے بہت سے حیرت انگیز واقعات ہیں، جو ان کے مخصوص اہل تعلق کے علم میں ہیں، اس قوت کشفیہ سے انھوں نے بعض بزرگوں کے مشہور و مسلم مزارات کے غیر معتبر اور جعلی ہونے کی حقیقت دریافت کی، جو اپنے شہر اور دیار میں مرجع خلائق بنے ہوئے تھے، اور ان کے صحیح مدفن کی اطلاع دی، یہ باتیں وہ اپنے بہت ہی معتمد اور مخصوص دوستوں اور خدام سے کرتے تھے، فطری اور خداداد مناسبت کے علاوہ اس کمال میں جس میں وہ اپنے معاصرین میں ممتاز تھے، اور جو کتابوں کے واقعات اور شیوخ متقدمین کی یاد تازہ کرتا تھا، ان کے مجاہدہ و ریاضت، دوام ذکر اور مشتبہ و مشکوک غذا سے احتیاط کو بہت دخل تھا۔

مولانا جہاں اہل دنیا اور اہل دول کے سامنے بڑے خوددار اور غیور واقع ہوئے تھے، اہل دین اور خصوصیت کے ساتھ ان حضرات کے سامنے جن کو اپنے مشائخ اور اکابر کی صف میں شمار کرتے تھے، غایت درجہ متواضع اور منکسر المزاج تھے، علمائے حق سے بہت جھک کر اور فروتنی سے ملتے تھے، اور ان کی نہایت تعظیم کرتے تھے، دیکھنے والے کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا اپنے کو ان کے سامنے ایک معمولی طالب علم سے زیادہ نہیں سمجھتے، معاصر علماء اور مشائخ میں سے ان کو دو شخصیتوں سے بے حد عقیدت تھی، اور وہ ان کے ساتھ اپنے مشائخ کا سا معاملہ کرتے تھے، ایک مولانا حسین احمد صاحب مدنی دوسرے مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری، ان آنکھوں نے بار بار دیکھا ہے کہ مولانا حضرت رائے پوری کی خدمت میں حاضر ہوئے،

اور نہایت ادب کے ساتھ دو زانو اس طرح مراقب ہو کر بیٹھ گئے، جیسے کوئی مرید رشید اپنے شیخ کے سامنے حاضر ہوتا ہے، اگر حضرت نے کوئی بات پوچھی تو نہایت ادب کے ساتھ مختصر اور بقدر ضرورت جواب دیا ورنہ خاموش رہے، مولانا سید انور شاہ صاحبؒ کے بھی بڑے معتقد اور مرتبہ شناس تھے، ان کی زندگی میں برابر حاضری دیتے رہے، اور خردی و بزرگی کا معاملہ رکھا۔

مولانا اگرچہ اپنے استاذ مولانا عبید اللہ سندھی کو اپنا سب سے بڑا محسن و مربی سمجھتے تھے، اور اپنے کو ان کا ساختہ و پرداختہ جانتے تھے ان سے اخذ کئے ہوئے طرز تفسیر کو انھوں نے پورے طور پر اپنا لیا تھا، اور اسکی اشاعت و تعلیم کو وہ اپنے فرائض زندگی میں سمجھتے تھے[۱]، لیکن ان کا یہ سارا تعلق دین کے تابع تھا، اور وہ اپنی اس نیاز مندی و وفاداری میں عقیدۂ اہل سنت اور مسلک سلف سے بال برابر ہٹنا بھی گوارہ نہیں فرماتے تھے، چنانچہ جب مولانا سندھی طویل مدت کے بعد ہندوستان تشریف لائے، اور انھوں نے بعض اپنے خیالات و افکار کا اظہار فرمایا، جو مولانا کے نزدیک صحیح الخیال علمار اور راسخ العقیدہ جماعت کے عقائد و افکار و مسلک سے مطابقت نہیں رکھتے تھے، اور ان میں مولانا کی حد سے بڑھی ہوئی ذہانت، انفعالیت اور جذباتیت، طویل مسافرت اور زندگی کی ناکامیوں، اور ہمت شکن تجربوں کا اصل دخل تھا اور ان سے مسلمانوں میں ذہنی انتشار پیدا ہونے کا اندیشہ تھا، تو مولانا نے ان کے خیالات میں متابعت نہیں فرمائی، بلکہ صاف اپنے اختلاف کا اظہار کر دیا جس سے مولانا سندھی کو رنج بھی ہوا، اور شکایت بھی پیدا ہوئی، اس لئے کہ وہ مولانا سے اس کی بالکل توقع نہیں رکھتے تھے، لیکن مولانا احمد علی صاحب نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی، اور پوری نیاز مندی اور

---

[۱] مولانا نے اس درس قرآن کی ابتدا ۱۹۱۷ء سے کر دی تھی، اور وہ آخر دم تک قائم رہا۔

سعادت مندی کے ساتھ اپنے مسلک پر قائم رہے۔

مولانا بڑے وسیع النظر وسیع القلب بزرگ تھے، عبادات واحکام میں فقہ حنفی اور مسلک دیوبندی کے پابند ہونے کے باوجود جماعت اہل حدیث اور اس جماعت کے علماء اور صلحاء سے ان کے بڑے اچھے تعلقات تھے، اور وہ ان کا احترام کرتے تھے، وہ عید کی نماز التزاماً مولانا سید محمد داؤد صاحب غزنوی کے پیچھے جو جماعت اہل حدیث کے امام اور امیر تھے بادامی باغ کے کھلے میدان میں پڑھتے تھے، اس لئے کہ یہ زیادہ مطابق سنت ہے، انھوں نے اپنی الگ عیدین کی نماز قائم کرنے کی کبھی اجازت نہیں دی، حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو شاید وہ لاہور کی سب سے بڑی جماعت ہوتی۔ ان کی ایک صاحبزادی بھی ایک اہل حدیث عالم کے نکاح میں تھیں، پنجاب اور لاہور کے اہل حدیث حضرات مولانا سے عقیدت و محبت رکھتے تھے اور برابر آتے جاتے رہتے تھے۔

مولانا حسین علی شاہ صاحب واں بھچراں (ضلع میانوالی) سے جو عقیدۂ توحید کی تبلیغ و تصریح میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کے نقش قدم پر تھے، اور ان کی تفسیر قرآن کا یہی مرکز و محور تھا، سے خاص عقیدت رکھتے تھے، اور ان کو بھی مولانا سے بڑی محبت و خصوصیت تھی، ان کی دعوت پر کئی بار خدام الدین کے جلسوں میں تشریف لائے، مجلس احرار کے علماء و زعماء بالخصوص مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری، اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کے برادرانہ تعلقات تھے، اور وہ حضرات مولانا کو اپنے سچے خیر خواہوں اور بزرگوں میں سمجھتے تھے، شاہ صاحب کے ہاتھ پر علماء و صلحاء کی ایک بڑی جماعت (جن میں مولانا سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے) نے مجلس خدام الدین ہی کے جلسہ میں بیعت امارت کی تھی، اور وہ اسی وقت سے امیر شریعت پنجاب کہے جانے لگے تھے، مولانا احمد علی صاحب آخر آخر وقت تک مولانا ابوالکلام آزادؔ

کا بڑے احترام سے نام لیتے تھے، اور ان کی سیاسی بصیرت، اصول پر ثبات واستقامت، اور علمی و ذہنی صلاحیتوں کے بڑے قائل تھے، مولانا حمید الدین صاحب فراہی، اور علمائے ندوہ کے نام بھی ہمیشہ احترام سے لیتے تھے، مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے خاص طور پر مانوس اور ان کے علم وفضل کے معترف تھے، اپنے ترجمہ وحواشی قرآن پر سید صاحب سے تقریظ بھی لکھوائی۔

مولانا شروع سے مجاہدانہ جذبات وعزائم کے حامل تھے، اور یہ بات ان کو اپنے مربی مولانا عبید اللہ سندھی اپنے شیخ طریقت مولانا سید تاج محمود امروٹی اور اپنے استاد حدیث شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی سے وراثت میں ملی تھی، مولانا کا آخر آخر تک اسی جماعت وگروہ سے تعلق رہا، جو انگریزوں کا دشمن، ہندوستان کی آزادی کے لئے کوشاں، اور ممالک اسلامیہ کی آزادی واستقلال کا خواہشمند تھا، وہ تحریک خلافت کے ایک سرگرم کارکن اور جمعیۃ العلماء کے ایک وفادار رکن تھے، انھوں نے ۱۹۲۰ء کی تحریک ہجرت میں بھی شرکت کی تھی، اور کابل گئے تھے، لیکن یہ دیکھ کر کے کہ افغانستان اور دوسرے اسلامی ممالک میں قرآن مجید کی اشاعت وتفہیم اور اسلامی تعلیمات واحکام کی تبلیغ کی اتنی آزادی وگنجائش بھی نہیں جتنی ہندوستان میں ہے، ہندوستان واپس آگئے تھے، کھدر کا استعمال انھوں نے آخر آخر تک نہیں چھوڑا تھا، اسی حق گوئی اور حکومت برطانیہ کی مخالفت کی پاداش میں وہ انگریزوں کے عہد میں کئی بار جیل گئے اور اسی جرم میں وہ دہلی سے جہاں وہ مولانا عبید اللہ سندھی کی نیابت میں تعلیمات قرآن کی اشاعت کر رہے تھے، جلاوطن کر کے لاہور لائے گئے، پاکستان بننے کے بعد بھی ان کی حق گوئی وبیباکی، ذمہ داران حکومت پر تنقید اور ان کے غیر دینی اور غیر جمہوری رجحانات کی مخالفت وتردید میں کوئی فرق نہیں آیا، وہ ۱۹۵۳ء میں تحریک ختم نبوت کے سلسلہ میں جیل گئے، اپنے خطبات ومواعظ میں برملا اہل حکومت پر تنقید کرتے، اور اس میں کسی مصلحت اندیشی اور مداہنت سے کام نہیں لیتے تھے، جو مولانا کی تقریریں سنتا وہ اقبالؒ کے

اس شعر کی تصویر اور عملی تصویر پاتا ؎

آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

مولانا اپنے مسترشدین و خدام کے ساتھ نہایت شفقت اور نوازش کا معاملہ فرماتے اور اس بارہ میں "واخفض جناحک لمن اتبعک من المومنین" پر عمل کرتے، ہر شخص کو اپنا حال معلوم ہے، میں مولانا کے مکتوبات پڑھتا ہوں تو ان کی پدرانہ شفقت اور مربیانہ عنایت کو دیکھ کر دل پر چوٹ لگتی ہے، اور اپنی نااہلی و ناکامی کو یاد کرکے سر ندامت سے جھک جاتا ہے، یہ خطوط قلب حزیں کی تسکین اور یاس و دل شکستگی کے شدید حملوں کے وقت سکون و تقویت کا بڑا ذریعہ ہیں

بہر تسکیں دل نے رکھ لی ہے غنیمت جان کر

جو بوقتِ ناز کچھ جنبش ترے ابرو میں تھی

یہاں پر صرف دو اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

۲۷ر فروری ۱۹۴۸ء کے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں۔

"چونکہ آپ میرے ہیں، اس لئے اللہ تعالےٰ کا جو فضل بھی آپ پر ہو وہ میرے لئے باعث صد فخر ہے، مجھے جس طرح مولوی حبیب اللہ سلمہٗ[1] کی ترقی سے فرحت ہو سکتی ہے، اسی طرح بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بعض وجوہ کی بنا پر اس سے زیادہ خوشی اور سرور آپ کے درجات کی ترقی سے ہوتا ہے، اب یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ آپ کو استقامت عطا فرمائے اور موجودہ دور فتن میں تمام مصائب و آلام سے مامون رکھے، آمین یا الٰہ العالمین آمین"

---

[1] فرزند اکبر۔

ایک دوسرے مکتوب میں جو ۱۹ مئی ۱۹۵۶ء کا ہے تحریر فرماتے ہیں۔

آپ کی ہر کامیابی سے جتنا میرے دل میں سرور اور فرحت حاصل ہوتی ہے غالباً دنیا میں اور کوئی نہیں جسے اس درجہ کی راحت حاصل ہو، میرا دل آپ کی ترقی دارین کے لئے بارگاہ الٰہی میں ملتجی ہے، اللہ تعالےٰ آپ کو عمر دراز عطا فرمائے اور اپنی مرضی کے مطابق عمر بھر اشاعت دین کی توفیق عطا فرمائے۔"

(آمین یا الہ العالمین آمین)

شاید یہ بہت سے لوگوں کو نہ معلوم ہو گا کہ مولانا ایک نو مسلم خاندان کے فرد تھے، مولانا کے والد شیخ حبیب اللہ صاحب خود اسلام لائے تھے، وہ گجرانوالہ[1] پنجاب کے ایک شریف ہندو خاندان کے فرد تھے، مولانا عبید اللہ صاحب جو اصلاً پنجابی تھے طویل قیام کی وجہ سے سندھی مشہور ہو گئے، ان کے رشتہ دار ہوتے تھے[2]، مولانا کی تعلیم و تربیت انھیں کے زیر سایہ اور نگرانی میں ہوئی، اور انھوں نے اس تعلق کا حق ادا کر دیا، مولانا کی ہجرت کے بعد انہی نے ان کے کام کو سنبھالا اور دہلی میں ان کے درس کا سلسلہ جاری رکھا، جب انگریزی حکومت نے ان کو دہلی سے جلاوطن کر کے لاہور پہونچایا تو آپ نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر درس قرآن کا آغاز کیا، رفتہ رفتہ آپ شیرانوالہ دروازہ میں اس مسجد میں منتقل ہوئے جو لائن والی مسجد یا سبحان خاں کی مسجد کے نام سے مشہور ہے، اس مسجد کا مسقف حصہ نہایت مختصر تھا، جو اب بھی موجود ہے، اس کے بغل میں جانب شمال ایک وسیع چبوترہ تھا جس پر گرمیوں میں ٹھنڈے اوقات میں نماز ہوتی تھی، جب آپ کا درس مرجع خاص و عام بن گیا اور قدیم مسجد بالکل ناکافی ثابت ہوئی اس چبوترہ پر چھت پڑ گئی،

---

[1] مولانا کا وطن قدیم قصبہ جلال ضلع گجرانوالہ تھا، وطن ثانی باہو چک، تاریخ ولادت جمعہ ۲ رمضان المبارک ۱۳۰۴ھ

[2] مولانا عبید اللہ صاحب سے مولانا احمد علی صاحب کی والدہ کا نکاح ثانی بھی ہوا تھا۔

اور روز بروز مجمع زیادہ ہونے لگا، آپ کی قبولیت و مرجعیت برابر بڑھتی گئی اور آخری زندگی میں تو یہ حال ہو گیا کہ لوگ دور دور سے پروانہ وار آتے اور ایک ہجوم رہتا، اسی کے ساتھ آپ کی مشغولیت اور انہماک بھی بڑھتا گیا، بعض اوقات ملاقات اور زیارت کے لئے آنے والوں کو گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا اور بہت دیر میں باری آتی، بعض دن ناشتہ کی نوبت ہی نہ آتی، دوپہر کے کھانے میں بھی بہت دیر ہو جاتی آخر میں سربرآوردہ اور صاحب وجاہت اشخاص کو بھی کئی کئی دن کے انتظار کے بعد ملاقات کا موقع ملتا، اس بارہ میں آپ کا معاملہ مقبولین خدا، اور اولیاء اللہ کے مشابہ تھا کہ جتنا سفر کا وقت قریب آتا جاتا تھا، لوگوں کی عقیدت و محبت بڑھتی جاتی تھی، اور نفع و افادہ کی مقدار بھی اسی کے بقدر، بالآخر وہ وقت آگیا کہ نصف صدی کا پر مشقت اور طویل مجاہدہ کا سفر طے کرنے والا اپنی آخری آرام گاہ پر پہنچے اور اپنی محنت و وفاداری کا انعام پائے، ۱۳۸۱ھ کے رمضان المبارک کی ۱۸ تاریخ مطابق ۲۳ فروری ۱۹۶۲ء کو حاضری کا پیام آگیا اور نماز عشاء میں بحالت سجدہ انتقال ہوا، اور خادم قرآن، قرآن کے نازل کرنے والے کے جوار رحمت میں پہنچ گیا، جنازہ میں لوگوں کے پروانہ وار ہجوم اور اجتماع عظیم کا وہ منظر تھا، جو لاہور کے عظیم شہر نے مدت دراز سے نہیں دیکھا تھا، اور شاید مدت دراز تک نہ دیکھے، غروب آفتاب کے ساتھ تبلیغ و اشاعت دین کا یہ آفتاب بھی لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل اور خاک کے پردہ میں نہاں ہو گیا اور سیکڑوں ہزاروں آدمیوں نے وہیں افطار کیا اور با دیدۂ نم واپس آئے۔

مولانا جب لاہور آئے یا لائے گئے تو تنِ تنہا تھے، اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر درس قرآن کا آغاز کیا تھا، لیکن جب اس شہر کو داغ مفارقت دیا تو خدا کے ہزاروں بندے سوگوار اور ان کے فراق میں اشکبار تھے۔

"تلک الدار الآخرۃ نجعلها للذین لا یریدون علواً فی الارض ولا فساداً والعاقبة للمتقین"

# مولانا وصی اللہ صاحب فتحپوریؒ

فروری ۱۹۵۴ء کی کوئی تاریخ تھی کہ میں مئو ضلع اعظم گڑھ میں جہاں ایک تبلیغی دورہ میں ایک بڑی جماعت کے ساتھ پہنچا ہوا تھا، میں نے مولانا وصی اللہ صاحب فتحپوری کی زیارت کے لئے مولانا کے وطن و مستقر فتحپور تال نرجا حاضر ہونے کا ارادہ کرلیا خوش قسمتی سے مولوی حکیم حبیب اللہ صاحب نے جن پر مولانا کی اس زمانہ میں خصوصی نظر عنایت تھی، میری رفاقت و رہبری منظور فرمائی، اس وقت تک مولانا کی زیارت ہی زیارت ہوئی تھی، شاید پہلی بار اپنے محلہ کی مسجد میں اور ایک دوبار مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی لکھنؤ کی مجالس میں مولانا کو دیکھا تھا، مگر وہ دیکھنا نہ دیکھنا برابر تھا، نہ گفتگو کی نوبت آئی نہ پاس بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی، مولانا ہمارے بزرگوں سے اچھی طرح واقف تھے، اعظم گڑھ کے تمام قصبات و دیہات جہاں مسلمانوں کی آبادی ہے حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ پھر ان کے معنوی جانشین مولانا سید خواجہ احمد نصیر آبادی اور آخر میں مولانا سید محمد امین نصیر آبادی کی دعوت و اصلاح کی کوششوں سے واقف اور ان کے معتقد و حلقہ بگوش ہیں بالعموم حضرت سید احمد صاحب کو

بڑے سید صاحب کے نام سے اور مولانا سید محمد امین صاحب کو چھوٹے سید صاحب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، مولانا وصی اللہ صاحب کو بھی ہمیشہ اسی طرح ذکر کرتے سنا، مولانا کے ایک عزیز قریب نے والد صاحب مرحوم سے طب پڑھی تھی، اور ان کے مطب میں بیٹھتے تھے، وہ مزید واقفیت و تعلق کا ذریعہ بنے ہوں گے، بھائی صاحب مرحوم سے بھی مولانا کو اچھا خاصا تعلق اور موانست تھی، اور غالباً انھیں سے ملنے کے لئے ایک بار ہماری مسجد میں تشریف لائے تھے، بحیثیت طبیب کے بھی ان کی طرف رجوع فرمایا ہوگا، وہ میری نوعمری اور طالب علمی کا زمانہ تھا، نہ میں مولانا کے مقام و مرتبہ سے واقف تھا نہ ان کو میری طرف خصوصی توجہ کرنے کا اس وقت کوئی سبب تھا، اس لئے اصل زیارت و ملاقات کہنا چاہئے کہ اسی سفر میں ہوئی۔

نکلتے جاڑے تھے، ہم لوگ ایک یکہ پر مئو سے کوپا گنج گئے اور وہاں سے فتحپور کا رخ کیا، میرے ساتھ ایک رفیق سفر مولوی اشرف علی لکھنوی تھے، دوپہر کا کھانا ہو چکا تھا، اور لوگ قیلولہ کے لئے لیٹ چکے تھے کہ ہم لوگ فتحپور پہنچے، مولانا کو اسی وقت خبر ہوگئی، میرے نام سے غائبانہ طریقہ پر واقف تھے، اسی وقت بالاخانہ سے نیچے تشریف لے آئے اور نہایت شفقت کے ساتھ مجھے اوپر لے گئے، دیر تک از راہ شفقت میرا ہاتھ پکڑ کر دباتے رہے، اور یہ مولانا کی خاص ادا تھی، پھر اسی وقت کھانا گرم کروایا، دسترخوان بچھوایا، مجھے اس طرح کھلایا جیسے مائیں پاس بیٹھ کر بچوں کو کھلاتی ہیں، کبھی کبھی لقمہ بنا کر میرے منہ میں دیتے، مجھے حیرت تھی کہ میری بے کمالی اور اپنی بلند مقامی کے باوجود پہلی ہی ملاقات میں ایسی غیر معمولی شفقت کیوں؟

کھانے سے فارغ ہو کر میں..... نیچے آگیا، اور اس خانقاہ میں ٹھہر گیا، جو مولانا کے دولتخانہ کے مقابل تھی، یہ ایک پختہ عمارت تھی، جو کسی بڑے مدرسہ کا دار الاقامہ معلوم ہوتا تھا، غالباً دو منزلہ عمارت تھی اور نئی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی، اس وقت محترم حاجی نثار اللہ صاحب رئیس گورکھپور،

سابق ایم، ایل، سی، جو مولانا کے مسترشدین اور محبین خاص میں سے تھے، خانقاہ میں مقیم تھے، ان سے اچھا لطف صحبت رہا، وہ بڑے دیندار اور باذوق انسان تھے، اور ان سے پہلے سے نیاز حاصل تھا، ایک شب خانقاہ میں قیام رہا، اگلے دن وہاں سے واپسی ہو گئی، لیکن اس غیر معمولی برتاؤ اور شفقت بزرگانہ کا اثر مہینوں باقی رہا۔

یہ پہلا تخم محبت و عقیدت تھا، جو مولانا ہی کے وطن میں دل کی سرزمین میں ڈالا گیا، اور بارآور ہوا۔ " والبلد الطیب یخرج نباتہ باذن ربہ " یہ بھی یاد ہے کہ ایک مجلس میں مولانا نے حاجی نثار اللہ صاحب یا کسی حاضر باش سے دریافت فرمایا کہ جانتے ہو کہ مشہور مصرعہ۔

مے خانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے

کا پہلا مصرعہ کیا ہے؟ لوگوں نے سکوت کیا تو فرمایا کہ۔

مستی کے لئے بوئے مئے تند ہے کافی

مے خانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے

میں اس کو اپنے حق میں فال نیک سمجھتا ہوں کہ کیا عجب ہے کہ یہ اس عابرانہ بلکہ طائرانہ حاضری کی طرف اشارہ ہو، واپسی پر مولوی حکیم حبیب اللہ صاحب کو ۹ رجمادی الثانی ۱۳۷۳ھ (۱۱ رفروری ۱۹۵۴ء) کو جو خط لکھا اس میں یہ الفاظ آئے ہیں:۔

" فتحپور کا مبارک اور پر لطف سفر برسوں نہ بھولے گا، آتے جاتے آپ کی مخلصانہ و محبانہ ادائیں اور فتحپور میں حضرت والا دامت برکاتہم کی بزرگانہ شفقتیں اور نوازشیں اب بھی یاد آتی رہتی ہیں، اور دل میں چٹکیاں لیتی ہیں، اللہ تعالے پھر وہ پر مسرت لمحات نصیب فرمائے، اور آپ کی معیت میں فتحپور کا سفر نصیب ہو۔"

اس درمیان میں دو گھنٹے کے لئے دوبارہ اپنے مخدوم و محترم دوست صوفی عبدالرب صاحب

کی معیت میں فتحپور حاضری نصیب ہوئی، صوفی صاحب کے فرزند اکبر میاں خالد عمر ایم ایس سی سلمہ، حال انجینئر جدہ کی مختصر سی بارات ساتھ تھی، مولانا نے ان کا نکاح اپنے دوسرے خادم و محب مولانا امجد اللہ صاحب رئیس گورکھپور[1] کی صاحبزادی سے پڑھایا اور ہم لوگ رخصت ہوئے، اسی سفر میں مولانا نے خصوصی شفقت فرمائی، اور مجھے اپنے پاس ہی چارپائی پر بٹھایا، اس کے بعد عرصہ تک نہ ملاقات کی نوبت آئی نہ مکاتبت کا شرف حاصل ہوا، سب سے پہلا عریضہ ۱۲ رمضان ۷۴ھ کو لکھا جس میں اس ماہ مبارک میں دعا کی خصوصی درخواست تھی، مولانا نے اس کا بڑی شفقت سے جواب دیا اور تحریر فرمایا کہ "امتثالاً للامر دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ اپنی طلب صادق عطا فرمائے اور آپ کو اپنے مخلصین میں شامل فرمائے، آپ سے بھی اسی دعا کی درخواست ہے"، اس کے بعد حضرت خواجہ محمد معصوم کے مکتوبات میں سے مکتوب بست و دوم کا ایک نہایت موثر مضمون نقل فرمایا کہ جس میں ماسوی اللہ سے انقطاع کلی اور عشق مولا میں اپنے نفس کو بلکہ سارے جہاں کو خیرباد کہہ دینے کی تلقین تھی۔

اس کے بعد سے مکاتبت کا سلسلہ جاری ہوگیا، جس میں طویل طویل وقفے بھی ہوتے رہے، اپنے خطوط میں دعا کی درخواست اور محبت و مناسبت کا ذکر اور حضرت کے گرامی نامہ میں شفقت و خصوصیت کا اظہار ہوتا رہا، اس کے بعد ایک مرتبہ گورکھپور میں حاضری ہوئی یہ وہ زمانہ تھا کہ فتحپور سے دل برداشتہ بلکہ آزردہ ہو کر گورکھپور تشریف لے آئے تھے[2] اور حاجی نثار اللہ صاحب کی کوٹھی میں مقیم تھے، وہیں حاضری ہوئی، علالت کا سلسلہ کچھ عرصہ سے جاری تھا، اس لئے ملنے ملانے میں

---

[1] مولانا امجد اللہ صاحب کا گزشتہ سال رمضان المبارک (۱۳۹۱ھ) میں مدینہ طیبہ میں انتقال ہوا اور بقیع شریف میں دفن ہوئے۔ [2] مولانا، رمضان المبارک ۷۵ھ کو فتحپور سے گورکھپور تشریف لے گئے وہاں ڈیڑھ سال قیام رہا ۲ ربیع الثانی ۷۷ھ کو الہ آباد تشریف لائے اور آخر تک وہیں قیام رہا۔

کچھ پابندیاں تھیں، لیکن مجھے طلب فرمالیا گیا، اور نہایت شفقت فرمائی، جمعہ کی نماز کیلئے بھی میرے ساتھ ایک ہی رکشہ پر بیٹھ کر تشریف لے گئے، گورکھپور سے واپس آکر میں نے ایک عریضہ لکھا جس میں ان شفقتوں اور خورد نوازی کا ذکر کرتے ہوئے شیخ سعدی کا مشہور مصرعہ بھی لکھدیا کہ۔

کلاہِ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید

اس خط کے ساتھ میں نے اپنی نو تصنیف کتاب "تاریخ دعوت وعزیمت" کا پہلا حصہ بھی اس تمہید و تقریب کے ساتھ بھیجا کہ جناب والا نے ایک مجلس میں فرمایا تھا کہ "بیماری میں ہر چیز سے یہاں تک کہ گفتگو کرنے سے بھی طبیعت برداشتہ ہو جاتی ہے، ایسی حالت میں جی چاہتا ہے کہ کوئی اور گفتگو کرے اور ہم سنیں ........ میں نے اس کا ایک بدل تجویز کیا ہے کہ اپنی ایک حقیر تصنیف "تاریخ دعوت وعزیمت" پیش خدمت کروں اور وہ کبھی کبھی حضرت کی مجلس میں پڑھ کر سنا دی جائے، اس کی جرأت اس لئے بھی ہوئی کہ اس کتاب کے بعض مضامین سے "جو اکابر کے کلام و تالیفات سے ماخوذ ہیں" حضرت کے اذواق وارشادات کی تائید ہوتی ہے، مولانا نے سعدی کے مصرعہ کا ایسا جواب دیا جس نے الٹا شرمندہ کیا تحریر فرمایا کہ "اس کا صحیح مصداق تو یہ تھا، کہ میں پڑھتا کیونکہ ایک بادشاہ نے کسی دہقان کے یہاں نزول فرمایا تھا، اس پر اس نے یہ کہا تھا، تو آپ کی مثال شاہوں کی سی ہے کہ کبھی یہاں اور کبھی وہاں نزول فرماتے رہتے ہیں، چنانچہ ایک دہقان کے یہاں بھی نزول فرما کر اس کو شرف بخشا، اسی لئے اگر میں کہوں تو حق بجانب ہوں۔ ع

کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید

بلکہ پورے قطعہ ہی کو دہراتا ہوں کہ ؎

زقدر وشوکت سلطاں نگشت چیزے کم | زالتفات بمہماں سرائے دہقانے

کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید　　　　که سایہ برسرش انداخت چوں تو سلطانے

پھر کتاب کی پیش کش کے متعلق ایسی بات تحریر فرمائی جس سے اپنی غلطی پر تنبہ اور ندامت ہوئی اور مولانا کے مصلحانہ شان اور دیدہ وری کا اظہار ہوا، تحریر فرمایا گیا کہ۔

"اور آپ نے اپنی بعض تصانیف کے متعلق جو یہ تحریر فرمایا ہے کہ مرض کی وجہ سے گفتگو کرنے کو جی نہیں چاہتا تو مجلس میں اس کو پڑھ کر سنایا جائے تاکہ تفریح طبع کا ذریعہ ہو سکے، اس کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ چوں کہ اس کے مضامین ارشادی ہیں، جیسا کہ آپ نے بیان فرمایا تو میں ارشادی مضامین کو تفریح کا سبب نہیں بناؤں گا کیونکہ یہ اس کی ناقدری ہوگی، بلکہ میں یہ کروں گا کہ اس کا از خود مطالعہ کروں گا اور جس طرح سے بزرگوں کے اقوال سے اثنائے گفتگو میں استدلال کرتا ہوں اسی طرح اس کے مضامین کو بھی لوگوں کے سامنے پیش کروں گا، لیکن یہ سب کچھ ابھی نہیں بلکہ معتدبہ قوت کے بعد کروں گا۔"[1]

اس کے کچھ عرصہ بعد مولانا گورکھپور سے الہ آباد تشریف لے آئے اور الہ آباد کیا تشریف لائے، الہ آباد اور الہ آباد والوں کی قسمت جاگی، اور وہ شہر جو عرصۂ دراز تک تصوف و معرفت کا مرکز رہ چکا تھا، اور یہاں کے بارہ دائرے مشہور تھے، اب ذکر اللہ اور دعوت الی اللہ کی برکت سے اسم بامسمیٰ اور صحیح معنی میں الہ آباد ہو گیا، مولانا گورکھپور سے ربیع الثانی ۷۷ھ میں الہ آباد تشریف لائے کچھ عرصہ حسن منزل میں قیام رہا، پھر روشن باغ کا محلہ آپ کے قیام سے منور و روشن ہوا اور وہاں ایک خانقاہ اور دار التربیت قائم ہو گیا۔

اسی زمانہ میں محب محترم مولوی شاکر حسین خاں صاحب مرحوم نے انجمن اصلاح المسلمین کے

---

[1] مکتوب ۲۴ ربیع الاول ۷۶ھ از گورکھپور۔

جلسہ میں تقریر کے لئے مدعو کیا جو بڑے دھوم دھام سے ہر سال الٰہ آباد میں ہوا کرتا تھا، خاں صاحب کئی سال سے مدعو فرما رہے تھے، لیکن چونکہ میرا معمول جلسوں میں بہت کم جانے کا تھا، برابر معذرت کرتا رہا، اس مرتبہ اس میں ایک دوسری کشش شامل ہوگئی، یہ مولانا کی موجودگی تھی، جلسہ کا تو ایک بہانہ تھا، میں نے الٰہ آباد کا قصد کرلیا کہ مولانا کی خدمت میں حاضری اور کچھ وقت گزارنے کا موقع مل جائے گا، مولانا نے حسب معمول نہایت شفقت فرمائی، مجالس میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی، جو اس سفر کی اصل قیمت تھی، اس وقت ذرا قریب سے اور کچھ زیادہ غور سے مولانا کو دیکھنے کا موقع ملا، ایک اضطرابی و سیمابی کیفیت تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی کل چین نہیں، مسلمانوں کے حالات، اخلاق و معاملات کے بگاڑ، صدق و اخلاص کی کمی اور "نفاق" کے کھلی آنکھوں مشاہدے نے بے قرار و مضطرب بنا رکھا ہے، اصلاح حال اور دعوتِ فرار الی اللہ کا جذبہ قلب و دماغ و اعصاب پر مستولی ہوگیا ہے، اور وہ حال ہے، جو اس شعر میں بیان کیا گیا ہے۔

شعلہا آخر ز ہر مویم دمید
از رگ اندیشہ ام آتش چکید

مولانا کی اس بے قراری و سیماب وشی کو دیکھ کر بے اختیار مولانا محمد الیاس صاحب یاد آگئے، وہی نحیف جثہ، وہی گفتگو میں تکلفات، انداز خطابت سے بے نیازی، وہی موسوی رنگ کہ زبان سینہ کے جوش اور دل کا ساتھ نہ دے سکے، وہی دعوت کا غلبہ، وہی فکر میں ڈوبا ہوا سکوت، وہی اضطراب سے لبریز تکلم، دعوت کے موضوع کا ضرور فرق تھا، لیکن اپنے موضوع سے عشق اور اپنے کام کی فکر کا وہی حال تھا، صبح اور شام کی مجلسوں میں شرکت کا اتفاق ہوا، ایسے جذب کی کیفیت تھی، جس پر عقل و سلوک کے پہرے بیٹھے ہوئے تھے،

کبھی کبھی بعض مخلص خادموں کے سر پکڑ کر ہلاتے، اور ان کو کسی نکتہ یا ضرورت کی طرف متوجہ فرماتے۔

الہ آباد کی مجالس میں خاص طور پر تذکیر باآخرت اور نعمائے جنت و عذاب جہنم کی ترغیب و ترہیب پر خاص طور پر زور تھا، اور یہ کہ قرآن مجید کا اسلوب اور طریقۂ موعظت سب سے زیادہ مفید اور مؤثر ہے، نیز یہ کہ علماء اور واعظین نے آخرت کے مضمون اور جنت و دوزخ کے تذکرہ کو بالکل فراموش و نظر انداز کر دیا ہے، اور ان کو اس سے شرم آنے لگی ہے، گویا وہ ایک خلاف فیشن بات ہے، الہ آباد سے واپسی پر ۲۵ شوال ۱۳۷۷ھ کو لکھنؤ پہنچ کر جو عریضہ لکھا اس میں انھیں تاثرات کا اظہار تھا، خاص طور پر اس غیر معمولی شفقت پر اپنے گہرے تاثرات و تشکر کا اظہار کیا گیا تھا، جو اس دو روزہ قیام میں دیکھنے میں آئی، مولانا نے اس کا جو جواب دیا وہ میرے لئے سرمایۂ سعادت ہے، وہ یہاں بجنسہٖ نقل کیا جاتا ہے۔

حُبیبی و محبی سلمہ اللہ تعالےٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مکرمت نامہ نے شرف صدور بخشا، باعث ازدیاد محبت و خلوص ہوا جو حضرات اہل علم میرے پاس آمد و رفت فرماتے ہیں، ان میں غالباً سب سے زیادہ قلب کا رجحان جناب کی طرف ہوتا ہے، ارقام فرمایا ہے کہ جس اہم و مبارک موضوع کی طرف توجہ دلائی ہے، وہ میری اصلاح و تعلیم کے لئے بہت مفید تھی، ہم لوگوں نے اس موضوع و مضمون کو بالکل فراموش و نظر انداز کر دیا ہے، اس کو سن کر بے ساختہ یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے ؎

لگ چلا تھا دل قفس میں پھر پریشاں کر دیا
ہمصفیرو تم نے پھر ذکر گلستاں کر دیا

اب میں جناب سے اجازت چاہتا ہوں، کچھ عرض کرنے کی، بعد آنے اجازت نامہ کے قدرے تفصیل سے عرض کروں گا۔ والسّلام

وصی اللہ عفی عنہٗ"

اس حاضری اور تاثر و تحریک کا نتیجہ مولانا کا وہ بیش قیمت مضمون "التذکیر بالقرآن" تھا، جو میری واپسی کے بعد سپردِ قلم فرمایا گیا اور "الفرقان" اور دوسرے رسالہ میں شائع ہوا، اور علیحدہ کتابی شکل میں چھپ گیا، یہ مضمون باوجود عبارت آرائی اور تکلفات سے دور ہونے کے نہایت موثر اور مفید ہے، اس کے بعد غالباً ایک بار اور اصلاح المسلمین کے جلسہ میں اور حقیقتاً مولانا کی مجالس میں شرکت اور استفادہ کے لئے الہ آباد جانا ہوا، قیام تمامتر مولانا کے دولتخانہ پر رہا، مجالس اور حلقۂ افادہ و استفادہ کا وہی معمول تھا، جو پہلے دیکھنے میں آیا تھا، یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ شہر کے ذی علم و فہیم حضرات حاضری دیتے ہیں، اور اس کو اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔

اس کے بعد پھر ایک بار جون ۱۹۶۴ء میں الہ آباد حاضری ہوئی، تقریب حاضری یہ تھی کہ ۲۰ ر ۲۱ ر جون کو دینی تعلیمی کونسل جس کی صدارت کا شرف شروع سے حاصل رہا کی الہ آباد میں صوبائی کانفرنس تھی، اس کا پہلے سے قصد تھا کہ قیام مولانا ہی کے یہاں رہے گا، غلطی سے مولانا کو اپنی آمد اور پہنچنے کے وقت کی اطلاع دیدی، غلطی اس لئے کہ جب ۲۰ ر جون کو صبح الہ آباد کے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو معلوم ہوا کہ مولانا خود اسٹیشن تشریف لائے ہیں، گاڑی ذرا تاخیر سے پہنچی تھی، مولانا نے ملتے ہی فرمایا کہ اس خیال سے کہ وہ وقت چائے اور ناشتہ کا ہوگا میں چائے اور ناشتہ اسٹیشن پر

لایا ہوں کہ تاخیر نہ ہو، لیکن اب تو وقت زیادہ ہو چکا ہے، اس لئے اب گھر ہی پر ناشتہ ہو جائے گا
میں اس لطف و کرم اور اہتمام کو دیکھ کر پانی پانی ہو گیا، اور اپنی اس غلطی کا شدت سے احساس
ہوا کہ پہنچنے کے وقت کی اطلاع کیوں دی، اس سفر میں محبی ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، برادرم مولوی
سید ابوبکر صاحب حسنی ایم۔اے (حال استاذ نہرو یونیورسٹی دہلی) جو مولانا کی زیارت و ملاقات کے
بڑے مشتاق تھے اور عزیزی سید محمد مسلم حسنی بھی ساتھ تھے، ہم سب مولانا ہی کے مہمان رہے کیونکہ
شدید گرمی کا زمانہ تھا، اس لئے شب کا قیام ایک نو خرید مکان کے صحن میں رہا، مولانا نے ہماری
راحت کا بڑا اہتمام فرمایا تھا، اس زمانۂ قیام میں مولانا نے مسلمانوں کے حالات و مسائل سے
اپنی گہری دلچسپی و فکر مندی کا بار بار اظہار فرمایا، بعض مرتبہ مولانا جامی صاحب یا مولانا سراج الحق صاحب
کو خصوصی پیغام دے کر میرے پاس اس وقت بھیجا جب میں کانفرنس کے سلسلہ میں کسی کمیٹی یا مجلس
کے مذاکرات میں شریک تھا۔

مولانا کے قیام سے الہ آباد میں دینی رونق پیدا ہو گئی تھی، جس محلہ میں قیام تھا، اس مسجد
کی توسیع کی ضرورت جلد پیش آگئی، مدرسہ بھی قائم ہو گیا، اور مولانا کی برکت سے لوگوں میں اپنی
اصلاح و تربیت کی طرف توجہ پیدا ہو گئی، مولانا کو مساجد کی تعمیر کا بڑا ذوق تھا، جہاں کچھ عرصہ قیام
فرماتے وہاں ضرور کچھ نئی مساجد تعمیر ہو جاتیں، گورکھپور میں بھی ایسا ہی ہوا، اور الہ آباد کے اسٹیشن
کے قریب کی مسجد جس کی بنیاد شاید پہلے پڑ چکی تھی، مولانا کے حسن توجہ سے تکمیل کو پہونچی اور اس کا شمار
خوبصورت مسجدوں میں ہونے لگا۔

مولانا کے اس تعلق قلبی اور شفقت بزرگانہ کا پورا اظہار اس وقت ہوا، جب میں اپنی
آنکھ کی تکلیف کے سلسلہ میں ۱۹۶۷ء میں سیتاپور میں مقیم تھا، اور یکے بعد دیگرے آپریشن ہو رہے تھے،
کوئی فائدہ نہ ہوتا تھا، اس وقت مولانا کے نامۂ و پیام برابر آتے تھے، الہ آباد سے مولانا کے اہل تعلق

میں جو بھی آتا وہ بیان کرتا کہ مولانا بہت فکر مند اور بے چین ہیں، بعض اوقات لیٹے سے اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ میں ان کی اس تکلیف میں کس طرح کمی کر سکتا ہوں، یہاں تک کہ قیام کے آخر زمانہ میں مولانا کا گرامی نامہ آیا کہ "میرے دل میں بار بار یہ خیال آتا ہے کہ آپ کو وہاں کے علاج سے فائدہ نہ ہو گا، آپ لکھنؤ جائیں، اور ہومیوپیتھک علاج کریں"، میں اور میرے تیماردار بھی اس قیام سے عاجز آ گئے تھے، یہ ایک اشارۂ غیبی معلوم ہوا اور میں لکھنؤ آ گیا، اور مجبور ہو کر ایک ہومیوپیتھ ڈاکٹر سے جو بہت زیادہ نامور بھی نہ تھا رجوع کیا، خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ جو تکلیف بار بار کے آپریشنوں سے بھی نہیں گئی تھی، وہ باذن اللہ ایک خوراک سے جاتی رہی، اور الحمد للہ پھر کبھی نہیں ہوئی، نام تو اس ڈاکٹر کا ہو گیا، اور اس معرکۃ الآرا علاج سے خود اس کو بہت فائدہ ہوا، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اس میں دوا سے زیادہ دعا اور ایک مردِ خدا کی اور بہت سے مخلصین کی سوزِ قلبی اور دردمندی کا ہاتھ تھا۔

کارِ زلفِ تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

اس تکلیف سے نجات پانے کے بعد میں نے الہ آباد کا مستقل سفر کیا جس کا محرک محض جذبۂ تشکر اور مولانا کی مسرتِ قلبی کی توقع تھی، گرمی کا زمانہ تھا، مولانا نے دولتخانہ کی نیچے کی منزل میں قیام کا انتظام فرمایا، اور تاکید کی کہ گرمی میں اوپر آنے کی زحمت بالکل نہ کی جائے، اس کا بھی اہتمام کیا گیا کہ کسی ضرورت کے لئے باہر نہ نکلنا ہو، کئی بار انار شیریں کے دانے اس پیغام کے ساتھ بھیجے کہ یہ آنکھوں کے لئے مفید ہیں، پھر شام کو بڑی شفقت کے ساتھ ملاقات فرمائی، کھانے کا اہتمام فرمایا، ان نوازشوں میں محض بزرگانہ نہیں بلکہ مادرانہ شفقت کی جھلک بھی نظر آتی تھی، جو نائبین رسول کا امتیاز ہے "عزیزٌ علیہ ما عنتم حریصٌ علیکم"۔

ایک بار مجلس مشاورت کے جلسہ کے سلسلہ میں بھی جو الہ آباد میں ہونا طے پایا تھا، الہ آباد جانا ہوا، مولانا ہی کے دولتخانہ پر قیام تھا، صدر مجلس ڈاکٹر سید محمود صاحب بھی تشریف لائے تھے، ڈاکٹر صاحب کو مولانا سے بڑی عقیدت پیدا ہو گئی تھی، اور کچھ ایسا بھی سنا جاتا تھا کہ وہ داخل سلسلہ بھی ہو گئے ہیں، مجلس کے بعض دوسرے قائدین بھی الہ آباد آئے ہوئے وہ بھی مولانا کی خدمت میں حاضری دیتے رہتے تھے، مولانا ابو اللیث صاحب ندوی (امیر جماعت اسلامی) خاص طور سے حاضری کا اہتمام کرتے تھے، اور مولانا بھی ان پر خصوصی شفقت فرماتے تھے۔

اب وہ وقت آگیا کہ مولانا کے لئے اپنے امراض و تکالیف بالخصوص مرض رعاف کی وجہ سے الہ آباد کی گرمیوں میں رہنا مشکل ہو گیا، اور معالجین نے معتدل آب و ہوا کے کسی مقام پر گرمیاں و سردیاں گزارنے کا مشورہ دیا اس علاج و مشورہ میں ہمارے شہر لکھنؤ کے نامور طبیب یونانی شفاء الملک مولانا حکیم خواجہ شمس الدین صاحب پیش پیش تھے، جن کو اپنی حذاقت نیز مناسبت و عقیدت کی وجہ سے مولانا کے خاص معتمد و مقرب بننے کا شرف حاصل ہو گیا تھا، اب بمبئی[1] کی قسمت نے زور کیا، ظاہر بیں سمجھے کہ مولانا اپنے علاج کے لئے تشریف لے جاتے ہیں، لیکن حقیقت میں اہل بمبئی کا علاج مقصود تھا، اور وہاں ایک روحانی مطب کھلنے کا قضا و قدر میں فیصلہ ہو گیا تھا' مولانا کی دل بستگی (جس کے ساتھ اہل بمبئی کی دل کشائی وابستہ تھی) بمبئی اور اہل بمبئی سے بڑھتی گئی، اور اہل بمبئی کو بھی مولانا کی ذات سے گرویدگی اور عقیدت آناً فاناً ترقی کرتی گئی، سارے قرائن و اسباب اس بات کے موید تھے کہ مولانا کی آمد اور قیام سے ہندوستان کے اس عظیم ترین شہر (جس کا مزاج ہمیشہ سے تجارتی اور کاروباری رہا ہے، اور جو کسی زمانہ میں مسلک دیوبند کے داعیوں اور علم برداروں کے لئے ارض ممنوعہ کی حیثیت رکھتا تھا) کے ساکن سمندر کی سطح میں ادنیٰ سا تموج و

---

[1] ۱۹۶۵ء سے بمبئی کے سفر کا سلسلہ شروع ہوا۔

حرکت بھی پیدا نہ ہوگی، مولانا کے پاس ان اسلحہ اور وسائل میں سے کوئی ایک چیز بھی نہ تھی، جو بمبئی کے لوگوں کو متاثر اور گرویدہ کرسکتی، یعنی خطابت، ظاہری وجاہت، پروپیگنڈا اور ظاہری شان و شوکت وغیرہ، لیکن قضا و قدر کے فیصلے ان میں سے کسی چیز کے بھی تابع اور پابند نہیں، لوگوں نے جو کچھ دیکھا، تمام ترقیاسات کے برخلاف تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غیبی قوت کام کر رہی ہے اور لوگوں کے دلوں اور روحوں کو ان کی طرف متوجہ کر رہی ہے، میں نے ان تاجروں اور بمبئی کے چوٹی کے کاروباری لوگوں کی عقیدت و رجوع دیکھا جو اس سے پہلے کسی دینی دعوت و تحریک سے متاثر نہیں ہوئے تھے، اور جو علمائے حق کی طرف شدید غلط فہمیوں اور بدگمانیوں میں مبتلا تھے، ان کا رجوع برابر بڑھتا گیا اور تیزی سے ان میں اصلاح و تغیر آنے لگا، دیکھتے دیکھتے ان کی صورت و سیرت میں نمایاں تبدیلیاں ہونے لگیں، مجھے ۵۰ء سے بمبئی جانے کا برابر اتفاق ہوتا رہا ہے، اور اس میں مشکل سے کسی سال وقفہ ہوتا تھا، لیکن اب مولانا کے قیام کے بعد جو بمبئی جانا ہوا تو وہاں کی حالت ہی دوسری دیکھی، جن لوگوں کو مولانا کی مجلس میں دیکھنے کی بالکل امید نہ تھی، ان کو وہاں سر بہ زانو پایا حالانکہ یہاں کشش کے وہ سب اسباب مفقود تھے، جو بمبئی کے لئے ضروری تھے، ۱۹۶۷ء میں حجاز جاتے ہوئے چند روز بمبئی ٹھہرا، میں ایک دن صبح کرلا جہاں مولانا کا قیام رہتا تھا، ٹھیک صبح کے درس کے وقت پہونچا، مجھے مولانا کی کرسی کے پایہ کے پاس جگہ دی گئی، مولانا تشریف لائے میکروفون سامنے تھا کچھ بیان فرمانا شروع کیا، درمیان میں تفسیر و حدیث کی کتابیں منگوا کر ان کی عبارتیں سناتے اور تقریر فرماتے، میں پایہ سے لگا بیٹھا ہوا تھا، مولانا کے لہجہ اور طرز کلام سے بھی مانوس تھا لیکن میں خود بھی گفتگو کا خاصہ حصہ نہیں سمجھ سکا لیکن دیکھتا تھا کہ لوگوں کے چہرے اور آنکھوں میں گہرا اثر ہے، کئی بار کی طرح اس موقع پر بھی اندازہ ہوا کہ تاثیر کے لئے خطابت و الفاظ کی کوئی شرط نہیں۔

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

ورنہ اس کے برخلاف بڑے بڑے شیوا بیان مقرر تقریر کا سماں باندھ دیتے ہیں لیکن نہ قلوب پر کوئی اثر ہوتا ہے اور نہ زندگی میں کوئی انقلاب اس لیے کہ بقول جگر۔

آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں چہرہ پہ یقیں کا نور نہیں

اگر خدا کو منظور ہوتا اور مولانا کے سفر و قیام کا سلسلہ چند سال اور قائم رہتا تو شاید بمبئی میں خاصے وسیع پیمانہ پر دینی بیداری، اصلاح حال، اتباع سنت کا ذوق اور بیسیوں نہیں، بلکہ سیکڑوں زندگیوں میں انقلاب پیدا ہو جاتا، لیکن خدا کی حکمت اور اسرار الٰہی کو کوئی نہیں جانتا، نومبر ۱۹۶۷ء کو یہ سلسلۂ خیر و برکت اچانک ختم ہو گیا، اور صرف بمبئی ہی نہیں، بلکہ سارا ہندوستان اور عالم اسلام اس مبارک وجود سے محروم ہو گیا جس نے مشائخ پیشیں اور مصلحین اولین کی یاد تازہ کر دی تھی، اور ثابت کر دیا تھا کہ اخلاص و درد اپنے کام کی دھن اور لگن اور روحانی قوت بڑے سے بڑے ناسازگار حالات اور سخت سے سخت مادہ زدہ اور ظاہر پرست دور اور ماحول میں بھی اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتی ؎

جہانے را دگرگوں کرد یک مرد ... خود آگاہے

یہ واقعہ اس طرح پیش آیا کہ مولانا کے قلب میں زیارت بیت اللہ اور کچھ عرصہ اس کے سایہ میں قیام کرنے کا جذبہ اور شوق اس طرح موجزن ہوا کہ کوئی طبی مصلحت اور اصلاحی ضرورت اس پر غالب نہ آسکی، مولانا نے حج کا عزم فرمالیا، اور اپنے خصوصی مخلصین کو بھی اس پر آمادہ فرمانا شروع کیا، یہ جذبہ اس قوت و شدت سے پیدا ہوا تھا کہ کوئی مشکل اس کی راہ میں حائل نہ ہو سکی، ادھر خدا کی کچھ ایسی مدد ہوئی کہ موانع مرتفع ہوتے چلے گئے اور ہمرکابی کے لئے ایک اچھا خاصا قافلہ تیار ہو گیا، میں اسی زمانہ میں رابطہ کے جلسہ میں شرکت کے لئے سفر حجاز پر روانہ ہو رہا تھا، بمبئی میں جب بغرض ملاقات حاضر ہوا تو اپنے ارادہ کا جس کا عام طور پر اعلان نہیں ہوا تھا، ذکر فرمایا، رخصت ہو کر جب موٹر پر آکر بیٹھ گیا تو مولانا جامی صاحب کو یہ خصوصی پیغام دے کر بھیجا کہ واپسی میں عجلت نہ کیجئے گا، میرا انتظار کیجئے گا"

لیکن میں بعض اسباب کی بنا پر زیادہ نہ ٹھہر سکا، اور جلسہ سے فارغ ہو کر بمبئی واپس ہوا، وسط نومبر ۱۹۶۷ء کی غالباً ۱۹/۲۰ر تاریخ تھی، مولانا سے ملا اور عرض کیا کہ میں آ تو گیا ہوں، لیکن مجھے بعض اسباب کی بنا پر توقع ہے کہ میں رمضان المبارک میں حاضر ہوں گا، اور اس طرح کچھ عرصہ آپ کی خدمت میں وہاں رہنے کا موقع ملے گا، مولانا بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ ضرور ضرور کوشش کرنا۔

واپسی کے سفر میں رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی بھی ساتھ تھے، مولانا کی روانگی سے ایک دو روز پیشتر ہم لوگ لکھنؤ روانہ ہونے والے تھے، ایک شام کو ایک صاحب کے یہاں جو ایک بڑے تاجر تھے، مولانا کی چائے کی دعوت تھی، ہم دونوں اور مولانا ابرار الحق صاحب بھی مدعو تھے، مولانا نے اپنے گدے پر دائیں اور بائیں اپنے قریب ہم دونوں کو بٹھایا پھر بڑی رازداری کے ساتھ لب مبارک کو میرے کان کے پاس لاکر فرمایا "دعا کرو کہ حاضری ہو جائے" میں اس جملہ کا مطلب بالکل نہیں سمجھا کہ اب حاضری میں کیا تردد رہا چند دن کا معاملہ ہے، لیکن بعد کے واقعہ نے ثابت کر دیا کہ یہ جملہ بڑا معنی خیز تھا، اور تقدیر الٰہی کو وہاں ...... حاضری کے بجائے کچھ اور منظور تھا،

"وکان امر اللہ قدرا مقدورا"

روانگی چہار شنبہ کے روز ۲۲ر نومبر ۱۹۶۷ء کو ہوئی ابھی جہاز کو روانہ ہوئے .. دو ہی روز ہوئے تھے کہ ۲۴ر نومبر بعد نماز مغرب غشی کا دورہ پڑا، اسی شب میں چند گھنٹے کے بعد گیارہ بجے شب میں بیت کے بجائے رب البیت سے جا ملے، اور مکان کے بجائے مکیں سے واصل ہوئے "ان الی ربک الرجعیٰ"۔

یہ خبر جب وائرلیس سے حجاز پہنچی تو وہاں کے مخلصین نے اور محمد مدحت کامل صاحب سفیر ہند متعین سعودی عرب نے جنت المعلیٰ میں تدفین کے لئے حکومت سعودیہ کی منظوری حاصل کرنے کی کوشش کی جو کامیاب ہوئی اور بالکل استثنائی طریقہ پر جسد مبارک کو البلد الامین لانے

کی سرکاری طریقہ پر اجازت ملی، جنت المعلیٰ میں شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہؒ صاحب مہاجر مکی کی لحد کی جگہ پر قبر تیار بھی کر لی گئی، اور مدرسہ صولتیہ میں غسل کی تیاری بھی شروع کردی گئی، لیکن یہاں بھی اللہ تعالےٰ کا خصوصی معاملہ رہا، اس غلط فہمی کی بنا پر کہ اجازت نہیں ہوئی ہے غسل و تکفین اور نماز جنازہ میں عجلت سے کام لیا گیا، اور جسد مبارک جہاز کے قوانین کے مطابق سمندر میں اتار دیا گیا؛ سنا ہے کہ مولانا بمبئی سے رخصت ہونے سے پہلے بار بار یہ شعر پڑھتے تھے۔ ع

پھول تربت پر میری ڈالو گے کیا   خاک بھی تم سے نہ ڈالی جائے گی

یہ واقعہ جس طرح پیش آیا، اس میں تدبیر کی بے بسی اور تقدیر کی قہاری صاف نمایاں تھی، تفصیل کا یہ موقع نہیں" واللہ غالب علی امرہ ولکن اکثر الناس لا یعلمون" اس طرح ان برگزیدہ افراد کی نورانی فہرست میں جن کے مدفن ہونے کا شرف بجائے آغوش خاک سمندر کے سینہ کو عطا کیا گیا، اور جن میں حضرت مولانا مفتی عنایت احمد صاحب کاکوروی مصنف "علم الصیغہ" اور تاریخ "حبیب الٰہ" اور قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری مصنف "رحمۃ للعالمین" جیسے صلحا و مقبولین شامل ہیں، ایک اور مرد کامل کا اضافہ ہوا اور سمندر کو شکایت نہ رہی کہ وہ اس دولت سے یکسر محروم ہے، جو زمین کے نصیب میں آئی ہے:-

# چند اساتذۂ کرام

# شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی
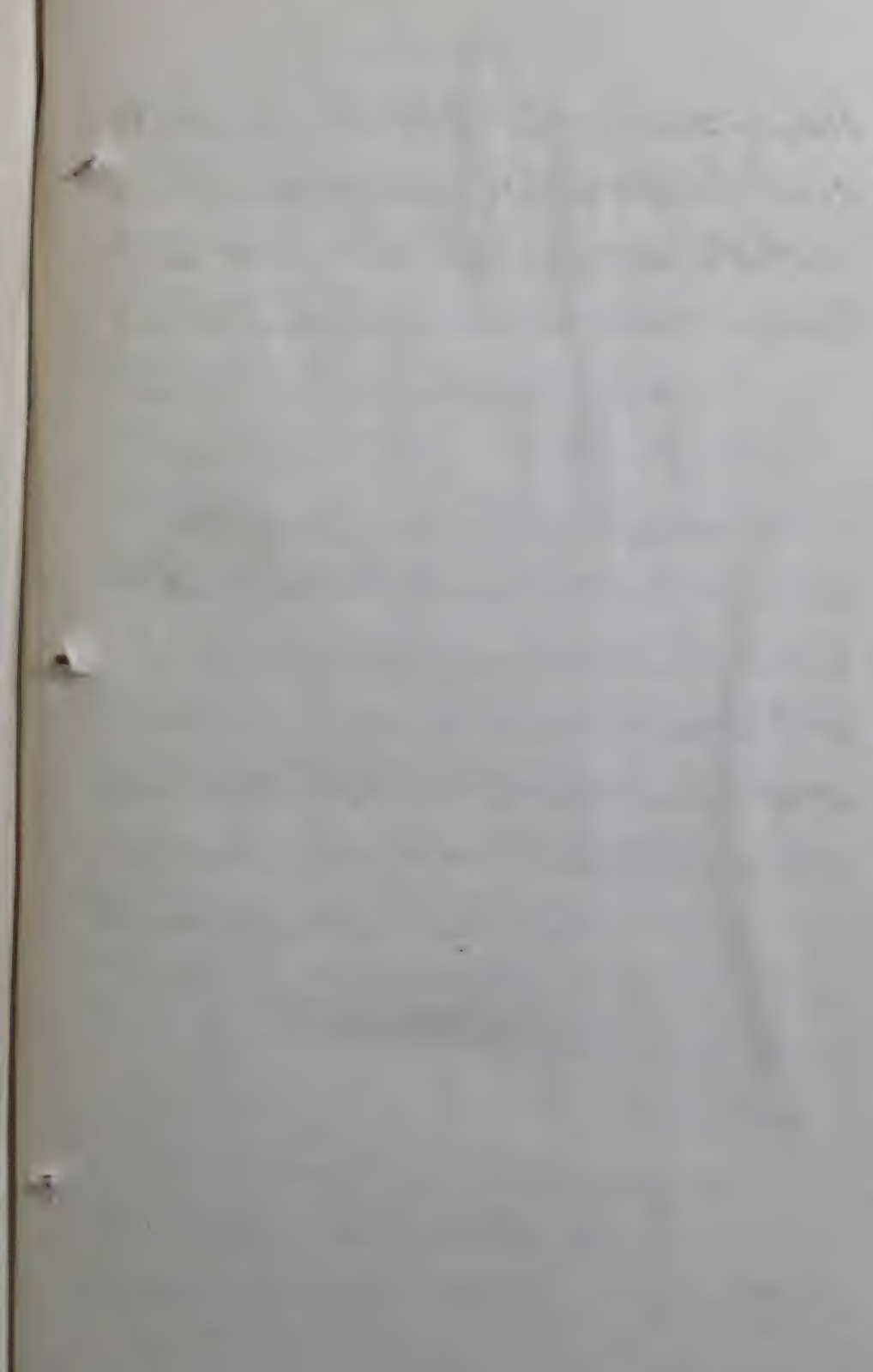
سنہ ۱۹۲۳ء سے سنہ ۱۹۴۰ء تک تقریباً ۱۷ برس لکھنؤ کے خوش قسمت شہری (جن کو ہر دور میں جلیل القدر علمار کی زیارت کا موقع حاصل رہا ہے) ایک ایسا نورانی چہرہ دیکھنے کے عادی ہو گئے تھے، جس کو دیکھ کر علمائے سلف کی یاد تازہ ہوتی تھی، اور بے اختیار اس کی طرف طبیعت کھنچتی اور اس کی محبت و عقیدت دل میں پیدا ہوتی تھی، میانہ قد، متناسب الاعضار جسم، چہرہ انار کی طرح سرخ اور گلاب کی طرح شاداب، آنکھوں میں سرخ ڈورے اور شب بیداری کے آثار، نگاہیں جھکی ہوئیں، چال باوقار لیکن اس سے عزم و اعتماد کا اظہار، سر پر افغانی طرز کا عمامہ، کبھی سرخ رومال کا، اکثر سفید، پیشانی کی طرف جھکا ہوا، پاؤں میں نری کا سادہ جوتا، پائجامہ شرعی ٹخنوں سے خاصا اونچا، گرمیوں میں صرف کرتا، سردیوں میں اس پر روئی کی بنڈی جس کے اوپر کے بٹن کھلے ہوئے، ہاتھ میں ایسی چھڑی جو ہندوستانی ریاست کے لوگ اکثر رکھتے ہیں، سادہ لیکن مضبوط جس سے اپنے دفاع اور خودداری کی حفاظت کا کام لیا جا سکے، گومتی کے پل سے قیصر باغ و نظیر آباد ہوتے ہوئے، امین آباد کی طرف سے بازار جھاؤلال کی طرف جاتے ہوئے (جس کو اب گوئن روڈ کہتے ہیں)

لکھنؤ کے دوکانداروں اور ان راستوں سے روزانہ کے گزرنے والوں نے ایک معصوم صورت، بزرگ سیرت ہستی کو پیدل گزرتے ہوئے باربار دیکھا خصوصاً جمعہ کی شام کو جو عربی مدارس میں چھٹی کا دن ہوا کرتا ہے، یہ مولانا حیدر حسن خاں صاحب ٹونکی تھے، جو ندوہ سے بالعموم عصر کی نماز کے بعد پیدل چل کر ناظم ندوۃ العلماء کے پاس آتے تھے، جن کا مکان اس جگہ واقع تھا جہاں سے اب محمد علی لین شروع ہوتی ہے، جب تک سابق ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید عبدالحی صاحب[1] زندہ تھے، ان کا ہر جمعہ کو ان کے پاس آنے کا معمول تھا، کچھ دیر بیٹھتے، مدرسہ کے حالات سناتے، مشورہ کرتے اور چلے جاتے پھر جب ان کے فرزند اکبر ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی صاحب ناظم ہوئے تو مولانا نے اپنی وضع نہیں چھوڑی اور تقریباً دس برس (۱۹۳۰-۴۰ء) اسی طرح ان کے پاس آتے اور کچھ دیر بیٹھ کر تشریف لے جاتے، عام طور پر ان کے ساتھ ایک دو طالب علم یا ٹونک سے آئے ہوئے کوئی مہمان ہوتے، گرمی سردی اور برسات میں بھی اس معمول میں فرق نہ آتا، بازار سے گزرتے تو بہت سے دوکاندار دوکانیں چھوڑ کر مصافحہ کے لئے لپکتے اور بعض دست بوسی کا شرف بھی حاصل کرتے۔

مولانا حیدر حسن خاں صاحب کی ولادت ریاست ٹونک راجپوتانہ میں ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴ء) میں ہوئی، ان کے والد صاحب کا نام مولوی احمد حسن خاں صاحب تھا، ان کے بزرگ بنیر سے نجیب آباد میں آکر رہ گئے تھے، وہاں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد یہ خاندان ریاست ٹونک منتقل ہوا جس کے بانی نواب میر خاں خود بنیر کے علاقہ کے رہنے والے تھے، ابتدائی تعلیم اپنے برادر بزرگ مفتی محمد حسن خاں اور اپنے دوسرے فاضل و متبحر بھائی مولانا محمود حسن خاں (مصنف معجم المصنفین) نیز ایک دوسرے عالم شہر مولانا محمد حسن خاں (چھاونی والے) اور مولانا عبدالکریم سے پائی، پھر لاہور کا سفر اختیار کیا، جو اس وقت بڑا علمی مرکز تھا، وہاں مولانا غلام احمد صاحب نعمانی کا دامن ایسا تھاما کہ جب تک

---

[1] ان کی وفات ۲ فروری ۱۹۲۳ء کو ہوئی۔

تمام علوم عقلیہ اور نقلیہ میں دستگاہ نہیں پیدا کرلی نہیں چھوڑا، اس وقت مولانا مدرسہ نعمانیہ کے صدر مدرس
اور اس کی زینت و شہرت کے باعث تھے، اور یہ مدرسہ ان کی وجہ سے جید الاستعداد اور عالی ہمت
طلباء کا مرکز بنا ہوا تھا، مولانا حیدر حسن خاں صاحب آخر دم تک انھیں کو اپنا علمی مربی اور محسن سمجھتے
رہے، وہ مزے لے لے کر قیام لاہور کے واقعات سناتے، اسی زمانے میں انھوں نے وہاں مرزا غلام احمد
قادیانی کو بھی دیکھا، مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کی تقریریں بھی سنیں، انھیں کے زمانۂ قیام میں
ایک مرتبہ آنجہانی منشی نولکشور لکھنؤ سے لاہور گئے اور مدرسہ نعمانیہ والوں نے کتب دینیہ کے ایک
اہم ناشر ہونے کی بنا پر ان کو اپنے مدرسہ میں دعوت دی اور اعزاز کیا، اسی زمانۂ طالب علمی میں انھوں نے
اپنے استاذ کے ساتھ پنجاب کے مشہور شیخ اور عالم پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی کی زیارت کی۔

اس زمانہ میں شاگردوں کا تعلق اپنے اساتذہ سے محدود و مشروط اور صرف حلقۂ درس
تک مقید نہیں ہوتا تھا، ان کا تعلق سعادت مند اولاد کا سا بھی تھا، جانثار خادموں کا بھی اور
وفادار رفیقوں کا بھی، اس زمانہ میں پنجاب کی نحو مشہور تھی، مولانا نے شرح جامی بڑی محنت اور
توجہ سے پڑھی اور غالباً پندرہ، سولہ برس پڑھائی ہوگی، تمام علوم عقلیہ اور ریاضیہ کی بھی بڑی
بلند ہمتی اور حوصلہ مندی سے تحصیل کی اور ان پر پورا عبور حاصل کیا، منطق و فلسفہ کے علاوہ علم ہیئت و
فلکیات کی بھی آخری کتابیں بڑی محنت و تحقیق سے پڑھیں، مولانا نے جب تمام علوم چھوڑ کر علم حدیث
ہی کو اپنا وظیفہ اور موضوع بنا لیا تھا، اس وقت بھی علم ہیئت کے شائقین ان سے شرح چغمینی
اور تصریح پڑھتے تھے، اور اصطرلاب و کرہ کا استعمال سیکھتے تھے، مسائل نحویہ کا استحضار آخر آخر تک
رہا، شرح جامی اس وقت بھی مستحضر تھی، فرماتے تھے کہ آخری سفر میں جب مولانا غلام احمد صاحب
مجھے خدا حافظ کہہ کر اپنے وطن کے اسٹیشن سے باہر جانے لگے تو پھاٹک سے پھر پلٹے اور فرمایا کہ
مولوی صاحب! میں تمہیں ایک وصیت کرتا ہوں تم حدیث سے اشتغال کرنا اور اسی کے ذوق کو

ہر ذوق پر غالب کرنے کی کوشش کرنا، مولانا نے اس وصیت پر جس طرح عمل کیا اس کا ذکر آگے آئے گا۔

لاہور سے علوم مروجہ سے فراغت کرکے مولانا نے سہیل یمانی شیخ حسین ابن محسن انصاری خزرجی نزیل بھوپال کے شہرۂ آفاق درس حدیث میں شرکت کی، جو اس وقت اپنے محدثانہ طرز، یمنی خصوصیات اور علو اسناد کے لحاظ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ اپنے عہد میں ممتاز[۱] تھا، مولانا نے شیخ صاحب سے صحاح ستہ کا درس لیا، اور پورے انہماک اور مطالعہ و تحقیق کے ساتھ مصروف استفادہ رہے، شیخ صاحب نے ان کو تمام صحاح و متداول کتب حدیث کی سند دی جو نہایت عالی اور قلیل الوسائط ہے، اور جو بیک واسطہ علامہ یمن شیخ محمد ابن علی شوکانی صاحب "نیل الاوطار" پر منتہی ہوتی ہے، مولانا آخر آخر تک اپنے شیخ کا دم بھرتے رہے، اور ان کو فن حدیث کا جید استاذ اور متبحر عالم سمجھتے تھے، فرماتے تھے کہ شیخ صاحب کو فتح الباری کی پوری تیرہ جلدیں تقریباً حفظ تھیں جہاں سے چاہتے تھے، اس کا مضمون سنا دیتے تھے، انھوں نے شیخ صاحب ہی کا طرز اپنایا تھا، اور آخر آخر تک اسی پر قائم رہے، مولانا نے اسی عہد کے دوسرے استاذ حدیث اور شیخ وقت مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی کے درس میں بھی شرکت کی اور ان سے بھی سند لی، لیکن وہ حقیقت میں شیخ صاحب ہی کے شاگرد تھے، اور اسی کو اپنا سرمایۂ حیات سمجھتے تھے۔

تکمیل علم کے بعد وہ اپنے وطن ٹونک آگئے، ٹونک اس وقت درس و تدریس کا ایک بڑا مرکز بنا ہوا تھا، راجپوتانہ کے اس ریگستان میں وہی ایک سرسبز و شاداب علمی خطہ تھا جہاں سرحد و افغانستان تک سے شمع علم کے پروانے ہجوم کرتے تھے، اس وقت وہاں دو مستقل مدرسے طلبا و شائقین علم کا ملجا و ماوی بنے ہوئے تھے، ایک مدرسہ خلیلیہ دوسرا مدرسہ ناصریہ

---

[۱] اس کی کچھ تفصیل شیخ صاحب کے پوتے شیخ خلیل ابن محمد عرب کے حالات میں ملاحظہ ہو۔

پہلے کے سرپرست خود والی ریاست نواب ابراہیم علی خاں مرحوم تھے، یہاں حکیم برکات احمد صاحب مسند آرائے تدریس تھے، جو مولانا عبدالحق خیرآبادی کے مایۂ ناز شاگرد اور ان کے علم کے وارث سمجھے جاتے تھے، اور جن کی علوم عقلیہ میں شہرت ہندوستان سے تجاوز کرکے افغانستان و یاغستان تک پہونچ چکی تھی، دوسرے مدرسہ ناصریہ کے سرپرست نواب صاحب کے بھائی صاحبزادے عبدالرحیم خاں تھے، یہاں بھی کئی جید عالم مسند درس و افادہ آراستہ کئے ہوئے تھے، جن میں مولانا سیف الرحمٰن صاحب ٹونکی مہاجر کابل خاص طور پر قابل ذکر ہیں، مولانا نے اس مدرسہ میں تدریس کا آغاز کیا، صاحبزادے صاحب ان کے بڑے قدرداں تھے، اور ان کی ہر خدمت کو اپنے لئے سعادت سمجھتے تھے، اور کسی طرح ان کے کہیں اور تشریف لے جانے کے روادار نہ تھے، مولانا بھی ان کا بڑا احترام کرتے تھے، اور ان کے خلوص، علم دوستی، تواضع حسن اخلاق اور قدرشناسی کے بڑے قائل اور معترف تھے، آخر آخر تک ان کا ذکر بڑی محبت اور احترام اور بڑے قلبی تاثر و رقت کے ساتھ کرتے رہے، مولانا نے اس مدرسہ میں سالہا سال درس دیا اور اچھے اچھے طالب علم تیار ہوئے۔

مولانا نے نوجوانی میں اپنے بڑے بھائی مولانا محمود حسن خاں ٹونکی اور غالباً صاحبزادے عبدالرحیم خاں کے ساتھ حجاز کا سفر کیا اور حج و زیارت سے مشرف ہوئے، اس وقت شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی حیات تھے، مولانا نے ان سے بیعت کی اور حاجی صاحب نے ان کی باطنی استعداد دیکھ کر اسی قیام کے زمانہ میں ان کو اجازت دے دی، ایک وصیت یہ فرمائی کہ امراء و والیان ریاست سے کوئی تعلق نہ رکھنا اور ان سے حتی الامکان بے نیاز اور دور ہی دور رہنا، مولانا نے اس وصیت پر اس سختی سے عمل کیا کہ نواب ابراہیم علی خاں کی بھی صورت دیکھنے کے روادار نہ تھے، اور آخر آخر تک نہ ان کی ملاقات کو گئے، نہ ان سے کوئی سروکار رکھا، اس سلسلہ میں یہ لطیفہ سننے کے قابل ہے، اور جب اس وصیت کا ذکر آگیا ہے تو یہیں اس کا

تذکرہ کر دیا جاتا ہے، کہ ایک مرتبہ نواب صاحب سخت علیل ہوئے، نواب صاحب کی خواہش ہوئی یا کسی مصاحب و اہل تعلق نے مشورہ دیا کہ شہر کے سب صلحار و علمار دم کرنے کے لئے آئیں چھوٹی ریاست میں مولانا جیسے بلند پایہ عالم کا اس سے بچنا یا گریز کرنا نہ صرف دشوار تھا، بلکہ خطرناک بھی، مخلصین نے عرض کیا کہ آپ کا نہ جانا آپ کے لئے یہاں قیام و خدمت کی راہ میں مشکلات پیدا کر سکتا ہے، اور حاسدوں اور بداندیشوں کو غلط فہمی پیدا کرانے کا موقع دے گا مولانا بہت کہنے سننے سے تشریف لے گئے اور بغیر چہرہ پر نظر ڈالے ہوئے دم کر کے واپس آگئے، یہ پیر کی وصیت پر عمل تھا مولانا نواب صاحب کو آخر تک نہیں پہچانتے تھے، نواب ابراہیم علی خاں کے بعد ان کے صاحبزادہ نواب سعادت علیخاں تخت نشین ہوئے، مولانا نے ان سے بھی یہی معاملہ رکھا، ہمارے خاندان میں ایک تقریب تھی، نواب صاحب سید صاحب کے خاندان کی تقریبات اور نکاح کی مجلسوں میں بنفس نفیس شرکت کرتے تھے، وہ قافلہ[۵۱] میں ایسی ہی ایک محفل میں شرکت کے لئے تشریف لائے، مولانا بھی ان دیرینہ تعلقات کی بنا پر جو اس خاندان سے تھے شریک محفل تھے، وہ نواب صاحب کو نہیں پہچان سکے، اور کسی کے بتانے سے سمجھے کہ یہ ریاست کے نواب ہیں، اس کے باوجود بھی وہ ان کو سلام کے لئے نہیں بڑھے، اور اپنی جگہ بیٹھے رہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلمار عرصہ سے کسی مشہور استاذ حدیث اور ماہر فن کی خدمات سے محروم تھا ۱۹۲۱ء میں شیخ محمد عرب (خلف الرشید شیخ حسین ابن محسن انصاری) کے استعفے کے بعد سے محدث کی جگہ خالی تھی، یہ مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کا دور نظامت تھا، وہ خود شیخ حسین کے شاگرد رشید تھے، اور میاں صاحب سے بھی ان کو اجازت تھی، ان کی نظر اپنے ہی استاذ بھائی مولانا حیدر حسن خاں صاحب

---

۵۱ سید صاحب کے خاندان اور ان کے قافلہ کے بچے کھچے افراد ٹونک کے جس محلہ میں قیام پذیر ہوئے اس کا نام اسی نسبت سے قافلہ پڑ گیا، یہ شہر کا سب سے بڑا اور بارونق محلہ تھا۔

کی طرف گئی، جن سے وہ ٹونک سے واقف تھے، اور ان کے کئی عزیز اُن کے شاگرد تھے، مولانا عبدالحی صاحب خود ٹونک میں قیام کر چکے تھے، اور مولانا کے علم و فضل، تقویٰ اور مہارت فن سے واقف تھے، انھوں نے مولانا کو ان کے شاگرد عزیز مولوی سید طلحہ صاحب کی وساطت سے ندوہ آنے اور شیخ الحدیث کا عہدہ قبول کرنے کی دعوت دی، ایک مشہور مدرسہ میں خدمت کا موقع، مشاہرہ اور منصب کا اضافہ یہ سب چیزیں ایک عام عالم و مدرس کے لئے جاذب نظر تھیں، مگر مولانا جیسے زاہد و قانع اور وضع دار باوفا خادم علم کے لئے اس نقل مکانی کے فیصلہ کے لئے کافی نہ تھا، پھر صاحبزادہ عبدالرحیم خاں جیسے شریف عالی حوصلہ رئیس اور قدرداں کے دل کو تکلیف دینا ان کے مذہب میں روا نہ تھا، انھوں نے اس کو منظور نہیں کیا، عرصہ سے اِدھر سے اصرار اُدھر سے انکار ہوتا رہا، بالآخر صاحبزادہ صاحب کی وفات کے بعد[1] . . . . . مولانا نے ماہ ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ (اگست ۱۹۲۱ء) کو دارالعلوم کے تعلق کو قبول فرمالیا، حدیث کی بڑی کتابیں مولانا کے سپرد ہوئیں، اور مولانا نے پوری یکسوئی اور انہماک کے ساتھ پڑھانا شروع کیا، اس وقت جیسا کہ ذکر کیا گیا، مولانا سید عبدالحی ناظم ندوۃ العلماءؒ اور شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ صاحب (تلمیذ رشید مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی) مہتمم دارالعلوم تھے، مولانا نے تقریباً دو سال مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کی حیات میں تدریس کے فرائض انجام دیئے، مولانا عبدالحی صاحب نے ۱۵ر جمادی الآخر ۱۳۴۱ھ (۳ر فروری ۱۹۲۳ء) کو ایک نہایت مختصر علالت کے بعد انتقال کیا، انتقال سے چند گھنٹے پہلے مولانا اپنے معمول کے مطابق جمعہ کو نماز عصر کے بعد ان سے ملنے آئے تھے، اور بعد مغرب ان سے مل کر دارالعلوم تشریف لے گئے تھے، مولانا حکیم عبدالحی صاحب کے انتقال کے بعد صفی الدولہ حسام الملک نواب سید علی حسن خاں (فرزند اصغر والا جاہ نواب سید صدیق حسن خاں مرحوم) ناظم منتخب ہوئے۔

۱۹۳۱ء سے ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کی مستقل نظامت کا دور شروع ہوا، جو

[1] [illegible] زادہ عبید[illegible] کا انتقال ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۰ رمئی ۱۹۲۱ء کو ہوا۔

مولانا حیدر حسن خاں صاحب کے قیام دار العلوم کے آخری دن تک قائم رہا مولانا نے ان میں سے ہر ایک کے ساتھ پورا تعاون اور پورے خلوص اور خیر خواہی کے ساتھ اشتراک عمل کیا، ڈاکٹر عبد العلی صاحب کے دور نظامت میں ربیع الاول ۱۳۵۱ھ سے ذوالحجہ ۱۳۵۸ھ تک جب وہ مستقل طور پر ٹونک تشریف لے گئے، سال تک اہتمام کی خدمت بھی انجام دی اور اس پورے دور اور مختلف النوع ذمہ داریوں میں انھوں نے اپنی وضع داری کی شان اور خودداری کی آن میں فرق نہیں آنے دیا' اور پوری مستعدی، تندہی، اور دلسوزی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیئے، اس دور میں بڑے بڑے حوادث و انقلابات بھی پیش آئے، اساتذہ کا عزل و نصب بھی ہوا، ناظم بھی بدلے، اسٹرائکیں بھی ہوئیں، ندوہ مالی بحران اور اقتصادی مشکلات سے بھی گزرا، تنخواہوں میں بھی تخفیف ہوئی، لیکن مولانا کے پایۂ ثبات میں لغزش اور آئین وفا میں کوئی تغیر نہیں ہوا، ان کو اپنے کام سے کام تھا، اور ان کا عمل اساتذہ قدیم کی طرح اس شعر پر تھا۔ ع

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

مجھے نیاز مندی اور حاضر باشی کا شرف ۱۹۲۹ء میں حاصل ہوا، جب میری حدیث کی بڑی کتابیں شروع ہوئیں، میں نے مولانا سے دار العلوم میں صحیحین (بخاری اور مسلم) اور ابوداؤد و ترمذی پڑھی، کچھ حصہ بیضاوی کا بھی علیحدہ سے پڑھا، اور کچھ سبق منطق کے بھی مولانا نے اپنے شوق سے پڑھائے، ایک مدت تک میں نے مولانا کے ساتھ ہی ان کے کمرہ میں جو دار الحدیث بھی تھا، اور جو دار العلوم کی عمارت کے مشرقی جنوبی حصہ کے بالائی منزل میں برجی سے متصل ہے شب و روز قیام کیا، اس وقت مولانا کو قریب سے خلوت و جلوت مشغولیت و راحت اور رات و دن کے مختلف حصوں میں بے تکلف دیکھا اور یہ سلسلہ ہفتوں مہینوں نہیں بلکہ تقریباً دو سال جاری رہا، اس وقت مولانا ایک کھلی ہوئی کتاب

کی طرح آنکھوں کے سامنے تھے۔

مولانا کا نظام الاوقات یہ تھا کہ رات کو پچھلے پہر بہت پہلے اٹھ جاتے، طویل نوافل پڑھتے، کسی قدر جہر سے نوافل ادا کرتے تلاوت میں بڑا سوز اور رقت ہوتی، بہت طویل سجدہ کرتے اور اس میں ان کے گریہ کی آواز ہم جیسے غافلوں کو بھی سنائی دیتی نوافل سے فارغ ہو کر چہرے پر رومال ڈال کر جو اُن کے پاس رہا کرتا تھا، دیر تک ذکر خفی میں مشغول رہتے، اذان کے بعد جب تک مولانا حفیظ اللہ صاحب مہتمم تھے، وہی امامت کرتے تھے، وہ مسلکاً اہل حدیث تھے اور سختی سے حدیث پر عامل، مولانا حیدر حسن خاں متصلب حنفی ہونے کے باوجود بے تکلف ان کے پیچھے نماز پڑھتے جب مولانا حفیظ اللہ صاحب سبکدوش ہوئے اور اس عرصہ میں مسجد بھی تعمیر ہو گئی تو ہمارے مولانا ہی نماز پڑھاتے، وہ درس میں اسفار کو جو مشہور حنفی مذہب ہے ثابت کرتے لیکن خود ان کا عمل یہ تھا کہ بالعموم فجر کی نماز غلس میں شروع کرتے، طویل قراءت فرماتے اور اسفار میں ختم کرتے، فرماتے تھے کہ یہی راجح اور اقرب الی السنۃ ہے، اور اس سے دونوں طرف کی حدیثوں میں تطبیق ہو جاتی ہے، مولانا قرآن مجید بہت صحت اور اہتمام سے پڑھتے تھے، جوانی میں انھوں نے حفظ کیا تھا، فجر میں بالعموم طویل سورتیں پڑھتے سورۂ قلم اور الحاقہ کا پڑھنا اس وقت بھی کانوں میں گونج رہا ہے، قراۃ موثر اور آواز دلپذیر تھی، فن تجوید میں نہ صرف دخل تھا، بلکہ اس فن میں بصیرت تامہ اور ملکۂ راسخہ رکھتے تھے، شاطبی جو تجوید کی مشکل کتاب سمجھی جاتی ہے، بے تکلف اور بسہولت پڑھاتے تھے، فن تجوید کی بڑی اہمیت اور عظمت ان کے دل میں تھی، اور علماء میں سے جو قرآن شریف صحیح نہ پڑھے اور تجوید کے مبادی سے بھی ناواقف ہو اس کو بڑا ناقص سمجھتے تھے، اسی بنا پر لکھنؤ کے مدرسہ فرقانیہ سے بڑا ربط تھا، جب تک اس کے بانی مولانا سید عین القضاۃ صاحبؒ حیات تھے، ان سے برابر ملتے رہتے تھے، ان کی وفات کے بعد بھی وہاں کے بڑے اساتذہ قاری عبدالمالک صاحب اور

قاری نذر صاحب سے بڑے تعلقات تھے، اسی ذوق کی بنا پر اپنے وطن ٹونک میں حفظ و تجوید کا ایک مدرسہ، مدرسہ فرقانیہ ہی کے نام سے قائم کیا، اور اس کے لئے قاری عبدالمالک صاحب کی خدمات کچھ عرصہ کے لئے حاصل کیں۔

فجر کی نماز کے بعد مولانا مطالعہ میں مشغول ہو جاتے، ناشتہ کا ان کا معمول نہ تھا، اور چائے کے بالکل عادی نہ تھے، یوں بھی ٹونک کے پٹھان عام طور پر ناشتہ کے عادی نہیں، دوپہر کا کھانا موسم کے مطابق اول وقت کھا لیتے، یہی ناشتہ تھا یہی کھانا، مدرسہ شروع ہوتا تو طلباء ہی ان کے کمرہ میں آجاتے اور درس شروع ہو جاتا، مولانا کا درس عملی تھا، اور طلباء اس میں صرف سامع یا مجلس وعظ کے حاضرین کی حیثیت نہیں رکھتے تھے، فن حدیث کی بنیادی کتابیں مراجع رجال و اصول حدیث اور متعلقہ فنون کی کتابیں پاس ہی الماری میں ہوتیں، طلباء کو حکم ہوتا کہ فلاں کتاب لاؤ، فلاں جگہ سے کھولو اور پڑھو، ایک حدیث یا ایک مسئلہ کے لئے دس دس کتابیں کھل جاتیں، جرح و تعدیل اور رجال کی کتابوں میں راویوں کا حال دیکھا جاتا اپنے مذہب کی تائید کے لئے دوسری کتابوں سے دلائل و نقول پیش کی جاتیں، ان پر آزادانہ بحث ہوتی، طلباء آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ اس بحث و مذاکرہ میں حصہ لیتے، مولانا حضرت مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی کے طرز تدریس کو بہت پسند کرتے تھے، اور ان کو کچھ عرصہ ان سے تلمذ کا بھی شرف حاصل ہوا تھا، فرماتے تھے کہ مولانا اپنی جگہ پر بیٹھتے اور طلباء اپنی اپنی جگہ پر اس کے بعد درس شروع ہوتا اور تھوڑی دیر میں یہ منظر نظر آتا تھا کہ استاد و طالب علم گتھم گتھا ہیں اور سوال و جواب اور رد و کد کا معرکہ درپیش ہے، یہی طرز مولانا کو بھی پسند تھا، مولانا کو وہی طالب علم زیادہ عزیز اور محبوب تھا جو آزادی سے بحث کرے اور مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش کرے، اس لئے بعض اوقات متصلب حنفی ہونے کے باوجود ان اہل حدیث طلباء پر زیادہ شفقت اور التفات ہوتا جو تیاری کر کے آتے اور بات

سمجھنے کی کوشش کرتے، ان کے مقابلہ میں خاموش رہنے والے یا ہاں میں ہاں ملانے والے طلبار زیادہ پسند نہ ہوتے، مولانا کی آواز بلند ہو جاتی اور بحث و تحقیق میں بالکل ڈوب جاتے، تدریسِ حدیث کا طرز محدثانہ تھا، غالباً محدثین یمن کی خصوصیات کا حامل اور شیخ حسین کے درس کا عکس، یمنی علمار کی کتابوں سے استفادہ بھی پورا تھا، خاص طور پر الامیر محمد بن اسمٰعیل الصنعانی[۱] اور السید محمد ابن ابراہیم ابن الوزیر[۲]، علامہ مقبلی اور علامہ شوکانی کی کتابیں برابر مطالعہ میں رہتیں اور ان کا حوالہ دیتے، علمائے احناف میں سے بھی ان کی کتابوں کا زیادہ حوالہ دیتے، جن کا پایہ حدیث میں مسلم ہے، اور جنھوں نے مذہب حنفی کے اثبات میں احادیث سے ہی زیادہ تر کام لیا ہے، مثلاً متقدمین میں امام طحاوی اور متوسطین اور متاخرین میں علامہ زیلعی اور ابن ترکمانی اور ابن ہمام، مولانا کے درس کی ایک برکت یہ تھی کہ فن حدیث سے مناسبت اور اس کی بنیادی کتابوں سے ذاتی واقفیت ان کے طبقات اور درجات سے پوری آگاہی اور اسمار الرجال اور اصول حدیث کی کتابوں سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی تھی، درود شریف کا ایک شغل خاص تھا، اور اس کو بڑی پابندی سے ادا کرتے تھے، زیارت نبوی کی سعادت بار بار حاصل ہوئی، فرماتے تھے کہ کبھی کبھی کسی اختلافی مسئلہ میں بڑا استغراق رہا، خواب میں اس کے بارے میں بھی رہنمائی یا اشارہ فرمایا گیا، مولانا کی محبت امام ابو حنیفہ کے ساتھ عشق اور ان کی عقیدت مذہب حنفی سے عقیدہ کے درجہ تک پہونچی ہوئی تھی، امام صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے کبھی کبھی ان پر رقت طاری ہو جاتی تھی، اس محبت و عقیدت میں کبھی کبھی ان کی زبان سے امام صاحب اور مذہب حنفی کے ناقدین کے حق میں بعض تنقیدی الفاظ نکل جاتے تھے، جن میں شکوہ اور احتجاج کا رنگ صاف جھلکتا تھا، انھیں میں امام بخاریؒ بھی تھے جنھوں نے قال بعض الناس کے پردہ میں امام صاحب پر بہت سے علمی اعتراضات فرمائے، امام بخاریؒ کی منفرد اور یگانہ روزگار کتاب "الجامع الصحیح" (جس کو امت نے اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا

[۱] سنہ وفات ۱۱۸۲ھ [۲] سنہ وفات ۸۴۰ھ

لقب دیا ہے) کے متعلق ان کا خیال تھا کہ اس کی روایات بحث وتنقید اور اس کے رواۃ جرح وتعدیل سے بالاتر نہیں، ان کی یہ تحقیقات بعض اوقات ان کے اکثر تلامذہ کے لئے آزمائش کا سبب بن جاتیں، لیکن مولانا کا زہد وتقویٰ اور ان کا حدیث نبوی کا احترام اور بخاری کے ساتھ شغف واہتمام اس سب پر پردہ ڈال دیتا تھا، اور ان کے تلامذہ کو حدیث وسنت کے بارہ میں کسی بدعقیدگی یا ان کی تعظیم واحترام میں کسی کمی اور کوتاہی کی طرف جانے نہیں دیتا تھا، یہ غالباً ان کی پاک نفسی اور نیک نیتی کا ثمرہ تھا، اور اس بات کا بھی کہ وہ شدت سے حدیث کی ضرورت و حجیت کے نہ صرف قائل بلکہ داعی اور اتباع سنت پر عامل تھے۔

مولانا کو پڑھنے پڑھانے کے سوا دنیا کے کسی کام سے سروکار اور کسی مسئلہ سے دلچسپی نہ تھی، سیاست کے کوچے سے تو بالکل نابلد بلکہ متوحش تھے، اخبارات ورسائل کا ان کے یہاں گزر نہ تھا، کوئی طالب علم کوئی بات سنا دے تو سن لیتے اور کبھی اظہار خیال بھی فرماتے، مدرسین کا جلسوں میں جانا اور تقریر کرنا ان کو بہت ناپسند تھا، وہ وعظ گوئی اور تدریس میں نہ صرف مغایرت بلکہ تضاد اور منافرت سمجھتے تھے، اور اس طالب علم سے مایوس ہو جاتے تھے جس کو اس کا چسکہ پڑ جائے، وہ اساتذۂ قدیم کی مکمل یادگار تھے، جو سب کشتیاں جلا کر علم کے آستانہ پر آکر پڑ گئے تھے، اور دنیا کی ہر چیز سے روزہ رکھ لیا تھا، ان کے نزدیک کسی مسئلہ کے لئے دلیل کا مل جانا، کسی قوی حدیث کا ہاتھ آجانا یا متقدمین میں سے کسی کے یہاں سے اپنے لئے تائید حاصل ہو جانا دنیا کی ہر لذت ونعمت سے بڑھ کر لذت ونعمت تھی، اسی طرح کوئی قلمی کتاب مل جائے، یا متقدمین میں سے کسی کی نئی کتاب چھپ کر آجائے تو پھر ان کے سرور اور محویت کا ٹھکانہ نہ تھا، خود کتابیں خریدتے بھی تھے، اور بعض اہم کتابوں کو صاحبزادہ عبدالرحیم خاں کے کتب خانہ یا رام پور سے نقل کروایا تھا، اور ان کو سینہ سے لگائے رکھتے تھے، دیر رات تک مطالعہ فرماتے، عینک کی ضرورت

جہاں تک مجھے یاد ہے، انھیں آخر تک نہیں ہوئی، پڑھانے کا ذوق بھی اسی طرح تھا، اس کے لئے چھوٹی بڑی کتاب کی شرط نہ تھی، وہ صرف و نحو اور منطق کی ابتدائی کتاب بھی اسی دلچسپی اور توجہ سے پڑھاتے جیسے منتہی کتابیں یا کتب حدیث، بعض ہونہار طلباء کو خود شوق دلاتے اور خارج وقت میں ان کو پڑھا کر اپنے اوپر مزید بار لیتے، اپنی صحت کا بڑا خیال رکھتے، بیماری سے بہت گھبراتے، دوا علاج سے جہاں تک ہو سکتا بچنے کی کوشش کرتے، اچھی و سادہ غذا کو وہ بڑے سے بڑے معجون پر ترجیح دیتے، بڑھاپے اور ضعیفی کے الزام سے حتی الامکان بری رہنے کی کوشش کرتے، ان میں اور اس سلسلہ میں کسی رعایت یا رحم کے روادار نہ تھے، حیا اور افغانی غیرت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، جسم کا کوئی حصہ (سوائے ان حصوں کے جو عادتاً کھلے رہتے ہیں) ان کو دوسروں کے سامنے کھولنا گوارا نہ تھا، اپنے خالص افغانی النسل ہونے پر ان کو فخر تھا، اور افغانوں کی بڑی خصوصیات بیان کرتے تھے، لیکن سادات کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے، اور ان سے بڑی تواضع اور اکرام سے پیش آتے۔

مولانا کی سب سے نمایاں صفت ان کی سادگی اور طلباء کے ساتھ شفقت اور مساوات کی ادا تھی، جس کی مثال کم سے کم میں نے علماء و مدرسین میں اپنی آنکھ سے نہیں دیکھی، وہ اپنی اولاد اور طلباء میں نہ صرف یہ کہ فرق نہیں کرتے تھے، بلکہ مبالغہ نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ ہونہار اور ذہین طلباء کو اولاد پر ترجیح دیتے تھے، اور میں نے ان کے صاحبزادوں کو خود اس بات کی شہادت دیتے اور اس کا تذکرہ کرتے ہوئے سنا ہے، وہ ان سے قطعاً کوئی امتیاز نہیں برتتے تھے، اور کسی بات میں ترفع یا خصوصیت پسند نہیں کرتے تھے، وہ ان کے کاموں میں بے تکلف شریک ہو جاتے اور ان کا ہاتھ بٹاتے تھے، بعض اوقات اس میں طلباء کے لئے بڑی آزمائش ہو جاتی تھی، لیکن مولانا باصرار اس میں شریک ہوتے تھے، کبھی ایسا ہوا کہ ہم لوگ گھاٹ پر

کپڑے دھونے گئے، دریا مدرسہ کے سامنے ہی ہے، مولانا بھی ساتھ ہو گئے، ہم نے عرض کیا کہ آپ کہاں تشریف لے جائیں گے فرمایا جہاں تم لوگ وہاں میں بھی، کوئی میں الگ ہوں، ہم لوگ کپڑے دھونے میں مصروف ہو گئے، مولانا ہمارے قریب ہی بیٹھے رہے، ایک مرتبہ میں جوتا خریدنے بازار گیا، مولانا بھی ساتھ ہو لئے، ہرچند عرض کیا نہ مانا، مولانا کو اس سے بھی چڑ تھی کہ کوئی ان کو کمزور یا معمر سمجھ کر کسی محنت کے کام یا جائز تفریح سے روکے، ہم لوگ اعظم گڑھ سید صاحب کی عیادت کے لئے گئے ہوئے تھے، ایک دن مولانا مسعود علی صاحب نے بندوق اٹھائی اور شکار کے لئے روانہ ہوئے، ہم نوجوان اساتذہ دارالعلوم بھی ساتھ ہو لئے، مولانا بھی ہمارے ساتھ چل کھڑے ہوئے، بہت عرض کیا کہ حضرت آپ کہاں شکار کے لئے چلیں گے، فرمایا واہ' کیا میں تم لوگوں سے کمزور ہوں، چنانچہ گئے، نہ کہیں بیٹھے اور نہ ہمت ہاری۔

مولانا کی ایک خاص ادا یہ بھی تھی کہ مشاہیر علماء اور مشائخ کی ملاقات سے گریز کرتے، فرماتے تھے کہ ان بڑے لوگوں سے مل کر دل خوش نہیں ہوتا وہ برابری سے نہیں ملتے اپنے کو لئے دیئے رہتے ہیں، مولانا کسی قسم کا تکلف اور ترفع پسند نہیں کرتے تھے، فرماتے تھے کہ میں نے فلاں مشہور عالم سے ملاقات کی اور اپنے اس تاثر کا اظہار کیا، انھوں نے کہا نہیں میں آپ سے مل کر بہت خوش ہوا، لیکن مولانا کو شک تھا کہ انھوں نے یہ بات تکلفاً کہی یا حقیقتاً، اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میں تم طالب علموں سے اور عوام سے مل کر خوش ہوتا ہوں اور تم ہی لوگوں سے ہم جنسی اور مناسبت معلوم ہوتی ہے، اس بارہ میں ان کا طرز عمل مبالغہ کی حد تک پہونچا ہوا تھا، غالباً ان کو بعض ایسے تلخ تجربے ہوئے تھے کہ انھوں نے اس کو زندگی کا اصول بنا لیا تھا، اہل ٹونک اور خصوصاً سادات قافلہ سے ان کو بڑی دلبستگی اور موانست تھی، خاص طور پر میرے پھوپھا مولانا سید طلحہ اور ان کے بڑے بھائی ابو حمزہ سید زبیر صاحب سے بڑا ہی انس اور انبساط تھا، ان دونوں

میں سے کوئی آجاتا تو ٹونک کے پرانے حالات کے دفتر کھل جاتے، خاص طور پر سادات کے اخراج کے زمانے کے واقعات شرح و بسط سے بیان ہوتے[۱]، اور آدھی آدھی رات تک دونوں باتیں کرتے رہتے، مولانا ان لوگوں کے آنے پر بڑے خوش ہوتے، کھانے کا اہتمام فرماتے، خود بھی کھانے کا بہت اچھا ذوق تھا، کھانے کے متعلق مولانا کا مذاق یہ تھا، کہ سادہ ہو مگر بڑی مقدار میں ہو، اس میں ان کی افغانیت اور ٹونک کی معاشرت کو بہت دخل تھا، تھوڑے کھانے سے بہت چڑتے، فیاضی اور فراخ دلی قومی و نسلی ورثہ بھی تھا، اور ماحول کا اثر بھی، دوسروں پر بالخصوص طلبا پر خرچ کر کے بہت خوش ہوتے تھے، لیکن اپنے اوپر خرچ کرنے سے ایسے متفکر اور پریشان ہوتے تھے گویا کوئی گناہ ہوا، ایک مرتبہ بیماری سے اٹھے ضعف بہت تھا، بھائی صاحب مرحوم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب نے ایک مقوی شربت ٹانک تجویز کیا، میں اس کو خرید کر لے آیا، مولانا کو اس کی قیمت معلوم ہوئی تو بہت فکر میں پڑ گئے، بہت دیر تک ان کو پریشانی رہی، فرماتے رہے کہ میں اتنی رقم (غالباً چار روپے اس کی قیمت تھی) اپنی ذات پر کیسے خرچ کروں، یہ روپیہ ٹونک بھیجتا تو گھر والوں کے کام آتا، بالآخر مجھے وہ بوتل واپس کرنا پڑی جب کہیں انھیں اطمینان ہوا، مولانا کو اپنی تنخواہ کا حساب کتاب رکھنا بھی بہت مشکل معلوم ہوتا تھا، وہ مولوی فاضل پنجاب یونیورسٹی کے ممتحن بھی تھے، اس کی ممتحنی کی فیس یا تنخواہ آتی تو کسی عزیز شاگرد کے جو اُن کے ساتھ رہتا، حوالہ کرتے، اگر وہ اس کا حساب پیش کرتا تو ناراض ہوتے، فرماتے میاں! کیا میں تم سے

---

[۱] ۱۹۲۱ء میں تحریک خلافت کے زمانہ میں سادات قافلہ والی ریاست کی بدگمانی کا شکار ہوئے اور ان کو ریاست فوری طور پر چھوڑ دینے کا حکم ہوا، اس کے نتیجہ میں وہ جاگیر و مکانات اور املاک سے محروم ہو کر اپنے وطن رائے بریلی آگئے کچھ عرصہ کے بعد ان کو واپس آنے کی اجازت مل گئی لیکن جاگیریں واپس نہ ہوئیں، اس میں کچھ حاسدوں کی ریشہ دوانیوں کا بھی دخل تھا کچھ حکمرانوں کی نازک دماغی اور وساوس کو بھی۔

حساب لوں گا۔

میں نے مولانا کے ساتھ ناگپور اور مدراس کا ایک طویل سفر بھی کیا، ندوہ کی مالی حالت اس وقت بہت کمزور تھی، بھائی صاحب مرحوم نے اس غرض کے لئے ایک وفد بھیجنا تجویز کیا، مولاناؒ سے تشریف لے جانے کی درخواست کی، اور انھوں نے بے تکلف منظور فرمالیا، اس وقت مولانا کی ہمرکابی میں مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی، مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی اور یہ راقم تھا، یکم مئی ۱۹۳۷ء کو یہ وفد روانہ ہوا، اور چند روز ناگپور ٹھہرتا ہوا مدراس گیا، طویل سفر میں انسان کی اصل حالت اور اخلاق سامنے آجاتے ہیں، اور تجربہ سے بہت سے انسان اس سے مختلف نظر آتے ہیں، جو اپنے مستقر و مقام پر نظر آتے ہیں، لیکن اس پورے سفر میں، مولانا کی سادگی بے تکلفی، عدم امتیاز اور مساوات کی عادت، جو ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، خوب دیکھنے میں آئی، کہیں کسی موقع پر بھی ان کو ہم لوگوں سے امتیاز و ترفع گوارا نہ تھا، ہم تینوں ان کے شاگرد تھے، اور وہ نہ صرف استاذ بلکہ شیخ الحدیث اور مہتمم دارالعلوم بھی تھے، اور حضرت حاجی صاحب کے مجاز بھی، عمر میں باپ بیٹے سے بھی زیادہ تفاوت تھا، لیکن انھوں نے پورے سفر میں محسوس ہونے نہیں دیا کہ وہ کسی اور طبقہ کے ہیں، یا ہمارے سن و سال اور علم و فضل میں اتنا عظیم تفاوت ہے۔

مئی ۱۹۳۶ء میں میں ان کی دعوت اور ایما پر پہلی مرتبہ ٹونک گیا، یہ تقریباً سو برس سے ہمارے خاندان کی ایک شاخ کا وطن ثانی تھا، ہمارے خاندان کے رشتے اب بھی اس شاخ سے ہوتے تھے، اور سادات قافلہ میں سے شاید کوئی ایسا تھا جس سے دو، دو تین، تین رشتے نہ ہوں، لیکن مجھے اس وقت تک وہاں جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، یہ مولانا کی کشش اور شفقت تھی، جو عزیزوں کی کشش اور تعلق پر غالب آئی، اس سفر میں میرے ساتھ

شیخ محمد العربی المراکشی استاذ دار العلوم اور ماسٹر عبدالسمیع صاحب صدیقی ایم اے۔بی۔ٹی،
استاذ اعلیٰ انگریزی دار العلوم اور جے پور سے مولانا عبدالرشید نعمانی ساتھ تھے، جو مولانا کے
عزیز ترین اور رشید ترین شاگرد ہیں، اور مولانا کے علوم و تحقیقات کے سب سے بڑے حامل
اور امین، ٹونک میں مولانا کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی، ان کی طبیعت ضیافت اور خاطر سے
کسی طرح سیر نہیں ہوتی تھی، ہر ہر چیز بڑے شوق سے دکھانے اور وہاں کے خاص خاص
آدمیوں سے بڑے اہتمام سے ملانے، ان کو اپنے وطن کا ذرہ ذرہ عزیز تھا، ان کو اس کے
پانی میں ہر پانی سے زیادہ عذوبت اور شیرینی، اس کی آب و ہوا میں سب سے زیادہ صحت
افزائی اور خوشگواری، اس کے خربوزوں میں سب سے زیادہ حلاوت، اور اس کی ترکاریوں
اور پیداوار میں سب سے زیادہ لذت معلوم ہوتی تھی، میرا قیام زیادہ تر بلکہ تمام تر
مولانا ہی کے دولت خانہ پر رہا، اپنے عزیزوں کے یہاں مہمان کی طرح جاتا، دو ایک روز
ٹھہرتا چلا آتا، مولانا کو جدائی گوارا نہ تھی، ٹونک کی ندی بناس اپنے پانی کے ہاضم اور
مفید صحت ہونے میں مشہور ہے، مولانا نے اس کے کنارے ایک گھاٹ پر جھونپڑا ڈلوادیا
اور کئی روز وہ اور ہم سب مہمان ساتھ رہے، ندی ہی کا پانی پینے اور وہیں کی کھلی آب و ہوا
میں سوتے، کھانا گھر سے پک کر آتا، وہیں میں نے ایک روز مئی ۱۹۳۶ء کی ایک تاریخ کو
ندی کے کنارہ ایک پتھر پر بیٹھ کر اور پانی میں پاؤں ڈال کر طلوع آفتاب کے وقت
سیرت سید احمد شہیدؒ کی تصنیف کا آغاز کیا، جو میری زندگی کا مبارک ترین تصنیفی کام
تھا، اور اس کا پہلا مضمون "سید صاحب کی سیرت پر ایک اجمالی نظر" ایک ہی مجلس میں لکھا گیا،
اندازہ ہے کہ اس قیام میں مولانا نے ہم عزیز مہمانوں پر بہت کچھ خرچ کیا، لیکن ان کو اس میں
ایسی لذت محسوس ہوتی تھی کہ جس کے سامنے روپئے کی کوئی حقیقت نہیں۔

مولانا نے تفریح اور سیر کے لئے تمام مواقع مہیا کئے، ہم لوگوں کو باصرار مولود کے اس جلسہ میں بھی بھیجا جو بڑی آن بان سے نواب صاحب کے محل میں ہوتا تھا، اور جس کے بڑے آداب اور آئین تھے، تاکہ ہم لوگوں کو یہاں کی اس قدیم رسم کا کچھ اندازہ ہو، شکار کے مواقع بھی مہیا ہوئے، میرا صاحبزادہ عبدالرحمن خاں سے تعارف کرایا، جو اس وقت کے والی ریاست کے بہنوئی اور نواب ابراہیم علی خاں مرحوم کے داماد اور ایک بڑے جاگیردار تھے، اور اپنے بندوق کے نشانہ اور صید افگنی میں مشہور تھے، میں اور استاد محمد العربی عرصہ تک ان کے پاس جاتے رہے، ہم لوگوں نے بندوق چلانے اور نشانہ کی وہیں مشق کی، واپسی میں جے پور میں تاریخی مقامات بالخصوص آمیر کی سیر کرائی، غرض ان میں تقشف، مشیخت اور خشکی و عبوس نام کو بھی نہ تھا، ہنسی کی بات پر ہنستے، لطیفہ کہتے، لذیذ چیز کی لذت محسوس کرتے، اور تعریف کرتے، کوئی چیز ناپسند ہوتی تو اس کا اظہار فرماتے۔

مولانا پانچ بھائی تھے، اور ماشاء اللہ پانچوں عالم و فاضل، یہ غالباً ان کے والد کی خوش نیتی، اکل حلال اور علم و علماء کی تعظیم کا ثمرہ تھا، کہ پانچوں صاحبزادے مکمل عالم، متشرع اور سعید و فرمانبردار تھے، بڑے بھائی مولانا مفتی محمد حسن خاں صاحب تو مفتی ریاست تھے، مفتی ولی حسن خاں حال مفتی دارالعلوم جامع مسجد نیوٹاؤن کراچی جنھوں نے اپنی فقہی نظر اور فضیلت کی وجہ سے خاص اعتبار اور شہرت حاصل کر لی ہے، انھیں کے پوتے ہیں، دوسرے بھائی مولانا محمود حسن خاں تو ان سب بھائیوں میں واسطۃ العقد اور بیت القصید کا درجہ رکھتے ہیں، اور نہ صرف ہندوستان بلکہ اپنے عہد کے اکابر علماء میں شمار ہونے کے قابل ہیں، ان کی کتاب "معجم المصنفین" ایک تصنیفی کارنامہ بلکہ ایک فرد واحد کی حیثیت سے

عالی ہمتی، وسعت نظر اور محنت شاقہ کا ایک شاہکار ہے، یہ کتاب ۶۰ جلدوں اور بیس ہزار صفحات پر مشتمل اور چالیس ہزار اشخاص کے تراجم پر حاوی ہے، افسوس ہے کہ اس عظیم کتاب کے صرف چار حصے مملکت آصفیہ کی توجہ سے شائع ہو سکے، ان کی دوسری تصنیف اصولِ تعارُش ہے، جو بقامت کہتر اور بقیمت بہتر کا مصداق ہے، اور ایک بڑے اہم مسئلہ یعنی توارث و تعامل کا عقائد و احکام کے ثبوت میں کیا درجہ ہے، پر لکھی گئی ہے، تیسرے نمبر پر ہمارے مولانا تھے، جو اُن اوراق کا عنوان اور اس وقت کے مضمون کی زیب داستان ہیں، چوتھے نمبر پر مولوی مظہر حسن خاں تھے، جو علم الالسنہ میں بڑی گہری نظر اور ادب عربی میں ید طولیٰ رکھتے تھے، اور عرصہ تک میسور کے ایک کالج میں عربی کے.... پروفیسر رہے، انھوں نے عربی کی تمام زبانوں کا ماخذ اور ام الالسنہ ہونے کے ثبوت میں ایک بڑی ضخیم کتاب لکھی تھی، اور اس میں بڑے بڑے نکتے بیان کئے تھے، معلوم نہیں کہ وہ دفتر کہاں اور کس حالت میں ہے، پانچویں بھائی مولوی حکیم مسعود حسن خاں تھے، وہ بھی عالم اور طبیب فاضل تھے، ان پانچوں بھائیوں کی اولاد میں بھی علم اور دین سے تعلق بحمد اللہ قائم ہے، ہمارے مولانا کے بڑے صاحبزادے مولوی اسعد حسین خاں مولوی فاضل پنجاب بڑے ذی استعداد عالم اور اچھے استاد و مدرس ہیں، ان کے چھوٹے بھائی قاری اسعد حسن خاں مدرسہ فرقانیہ کے فاضل اور بڑے اچھے قاری اور معلم تجوید ہیں، دونوں صاحبان تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے، اور وہیں مقیم ہیں، مولانا کے بڑے صاحبزادے مولوی سعید حسن خاں جوانی میں انتقال کر گئے، ان کا داغ آخر آخر تک تازہ رہا۔

یوں تو دار العلوم میں مولانا کی آمد کے بعد آخری درجوں کے تمام طلبار اور اس زمانہ کے ندوہ کے فضلار و فارغین مولانا ہی کے حدیث میں شاگرد تھے، ان میں سے بہت سے علمی خدمات میں مشغول اور ملک میں نیک نام ہیں، لیکن مولانا کے تلمیذ ارشد اور ان کے فن اور ذوق کے وارث،

ہمارے فاضل دوست مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی جے پوری حال شیخ الحدیث دینیات یونیورسٹی بھاولپور ہیں، ان کے علمی کام تعارف کے محتاج نہیں، ان میں مفردات القرآن (ندوۃ المصنفین) کی تین جلدیں اور ان کا اصل علمی اور تحقیقی کام ان کی کتاب "ما تمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجہ" جو ان کی وسعت مطالعہ اور دقت نظر کی شاہد ہے، خاص امتیاز رکھتا ہے، انھوں نے کئی سال مولانا کے ساتھ سفر و حضر میں رہ کر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بھی اور ٹونک کے زمانۂ قیام میں بھی کسب فیض کیا، اور مولانا کی تحقیقات سے پورا فائدہ اٹھایا، مولانا کو بھی ان سے بڑا گہرا تعلق اور ان پر اعتماد تھا، زمانہ قیام ٹونک کے ایک دوسرے شاگرد حکیم احمد حسن صاحب ٹونکی ہیں، جو اب جے پور میں مطب کرتے ہیں، اور مرجع خلائق ہیں، ندوۃ العلماء کے زمانہ کے طلباء میں ان کو مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی (سابق ناظم دینیات جامعہ ملیہ اسلامیہ اور حال معتمد دارالعلوم ندوۃ العلماء) اور مولوی رئیس احمد صاحب جعفری سے بڑا تعلق تھا، اور ان پر بزرگانہ اور پدرانہ شفقت فرماتے تھے، یہ دونوں مولانا سے حضرت حاجی صاحب کے سلسلہ میں بیعت بھی ہیں، اور حدیث میں باقاعدہ شاگرد اور تربیت یافتہ، اسی طرح ہمارے دوست مولوی عمران خاں صاحب ٹونکی فرزند مولانا حکیم عرفان خاں صاحب قاضی ریاست ٹونک بھی مولانا کے آخری دور کے شاگردوں میں ہیں، اور ان سے قرابت قریبہ رکھتے ہیں۔

مولانا بہت قلیل التصنیف تھے، میرے علم میں تین ہی چار رسائل ان کی یادگار ہیں، ایک حجاب شرعی پر ان کا رسالہ جو ان کے عزیز شاگرد مولوی رئیس احمد صاحب جعفری نے مطبع قیمہ بمبئی میں چھپوا دیا تھا، دوسرے صاع اور مسئلہ رفع یدین پر ان کے منفرد رسائل جنھوں نے ایک کتاب کی شکل اختیار کر لی، ان کے علاوہ اور متفرق آمالی اور تحقیقات ان کے شاگردوں

کے پاس یا ان کے مسودات میں ہوں گے، ممکن ہے، مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی اور حکیم احمد حسن صاحب کے پاس کچھ اور مواد اور تحریری ذخیرہ ہو، مولانا کو خود لکھنے کی زیادہ عادت نہ تھی، غالباً مستقلاً خط اور خوش نویسی نہیں سیکھی تھی، مولانا کے والد مولانا احمد حسن خاں صاحب بڑے اچھے خطاط اور کاتب تھے، مولانا فرماتے تھے کہ والد صاحب کی طبیعت اس کو کندن اور کاہ برآوردن سے اچاٹ تھی، فرماتے تھے کہ اس میں میں نے بڑا وقت ضائع کیا، لیکن ان کے منجھلے صاحبزادے مولانا محمود حسن خاں صاحب کا خط نہایت پاکیزہ تھا، ان کے بعض خطوط ہمارے مرقع کی زینت ہیں، اور تحریر کا ایک گلدستہ معلوم ہوتے ہیں، مولانا بہت کم خط لکھتے تھے، دارالعلوم کے بعض کاغذات پر ان کو مختصر تحریر اور دستخط کرنے پڑتے تھے، جس میں خاصہ اہتمام کرنا پڑتا تھا، اس دشواری کے باوجود میری سند حدیث اپنے قلم سے ازراہ شفقت تحریر فرمایا، مجھے یاد ہے، اس میں مولانا کا تقریباً پورا دن بھر لگ گیا، اور بڑی مشقت پڑی۔

افسوس ہے کہ ۱۹۴۰ء میں مختلف اسباب کی بنا پر مولانا کی طبیعت لکھنؤ کے قیام اور دارالعلوم کے ذمہ دارانہ تعلق سے اچاٹ ہو گئی، عمر کا بھی تقاضا تھا کہ اب آزادی کے ساتھ اپنے عزیزوں کے پاس اپنے وطن ٹونک میں جس کی آب و ہوا بھی مولانا کے لئے زیادہ موافق اور قوت بخش تھی، مستقل قیام فرمائیں، وہاں مولانا کے قائم کئے ہوئے مدرسہ فرقانیہ کے تقاضے بھی دامن کشاں تھے، غرض ۳ رذی الحجہ ۱۳۵۸ھ کو دارالعلوم سے ترک تعلق کر کے ٹونک تشریف لے گئے، اور وہاں درس و تدریس، اشاعت علم، مطالعہ اور تحقیق، عبادت ذکر و تلاوت میں تقریباً تین سال مشغول رہ کر ۱۵ ر جمادی الاولیٰ ۱۳۶۱ھ (۳۱ رمئی ۱۹۴۲ء) کو داعی اجل کو لبیک کہا اور ٹونک کے مشہور قبرستان موتی باغ میں جس میں ہزاروں صلحاء و سیکڑوں علماء اور سید صاحب کے قافلے کے بچھڑے ہوئے درجنوں رفیق اور غازی اور سادات قافلہ

مدفون ہیں، ہمیشہ کے لئے آرام فرمایا۔

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے

یہاں پر تبرکاً دو خط جو راقم سطور کے نام ہیں، نقل کئے جاتے ہیں، پہلا خط ۱۳ فروری ۱۹۳۶ء کا ہے، جب مولانا طویل چھٹی لے کر ٹونک تشریف لے گئے تھے، دوسرا خط ۴۰ء کا ہے، جب مولانا مستقل طور پر ٹونک تشریف لے جا چکے تھے۔

"حبی سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

آپ کا کارڈ ملا، آپ کی خیریت سے اطلاع ہوئی، لیکن برخوردار محمود[۱] سلمہ اللہ تعالیٰ کے علیل ہونے کی اطلاع سن کر سخت تکلیف ہوئی، اللہ تعالیٰ شفا عطا فرماوے، آپ کی خدمت کی عاقبت بخیر ہو، فرصت ہو تو خیریت سے اطلاع دیجئے، ہر وقت فکر ہے، تسکین کی بہت ضرورت ہے، نواب صاحب نے سخت تخفیف کی ہے، جس کی وجہ سے آگ لگ رہی ہے، ہر گھر میں گریہ وزاری ہے سیدوں کی تنخواہیں سب موقوف، شاید دو ایک عورتوں کی تنخواہ باقی ہیں، مخرجین کی اجازت کا قریب ہونا سنا جاتا تھا، لیکن پھر سکوت ہے، حکم ہو گیا ہے، لیکن دستخط باقی ہیں، اگر جاگیر یا تنخواہ بحال ہوں تو اجازت مفید ہوگی' ورنہ لاحاصل، تخفیف کی وجہ سے چندہ میں تخفیف ہوئی

---

[۱] اس سے مراد میرے حقیقی بڑے بھانجے سید محمود حسن ولد سید رشید احمد صاحب ہیں، جنھوں نے عنفوان شباب میں انتقال کیا، عزیزان مولوی محمد ثانی، مولوی محمد رابع و مولوی محمد واضح سلمہم انھیں کے چھوٹے بھائی ہیں۔

میرا آنا بہت ہی ضروری تھا، اس کے بدل میں سہروقت مشغول ہوں۔

حیدر حسن عفی عنہ،

۱۳ر فروری ۱۹۳۶ء

عزیزی سلمہ اللہ تعالےٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

الحمدللہ خیریت ہے، جواب میں تاخیر ہوئی، معاف کیجئے، امید ہے، انشاء اللہ تعالےٰ مجھ کو نہ بھولو گے، الاصلاح[1] کی کوئی کتاب میرے پاس نہیں ہے، منظفر صاحب[2] نے فہرست بنا کر کتابیں رکھی تھیں، دعا کیجئے، اب تو جس قدر عمر باقی ہے، آزاد ہی گزرے اسی فکر میں رہتا ہوں، اسی کی سعی میں رہتا ہوں، اللہ تعالےٰ قبول فرماوے، ہر چیز کی حد ہوتی ہے، رئیس احمد صاحب[3] کو میں نے لکھا تھا، پچیس ۲۵[4] مجھ کو روانہ کر دیجئے، باقی علی میاں کو لکھنؤ روانہ کر دیجئے، لیکن انھوں نے جواب ہی نہیں دیا، میاں عبدالستار ملتانی سے ترمذی کی شرح لے کر زبیر میاں[5] کو...... دے دینا، ۱۶ر مئی کو ٹونک آویں گے، میاں عبدالسلام صاحب سے بہت جلد خط لکھوا دیجئے، تعطیل ہونے والی ہے،

---

[1] طلبہ دارالعلوم کی انجمن "الاصلاح"، جس سے متعلق ایک کتابخانہ بھی ہے۔

[2] مولوی سید منظفر حسین ندوی کاشمیری جو اس وقت دارالعلوم میں مدرس تھے۔

[3] مولانا رئیس احمد جعفری ندوی، کثیر التعداد کتابوں کے مصنف اور مولانا کے عزیز شاگرد۔

[4] یعنی رسالہ الحجاب فی الاسلام کے ۲۵ نسخے جو مولانا کی تصنیف ہے۔

[5] ابو حمزہ سید محمد زبیر صاحب برادر اکبر مولانا سید طلحہ صاحب۔

پھر صحیح پتہ دیں تاکہ خط لکھتا رہوں، مولوی نجم الدین صاحب کو میرا سلام
کہہ دو، حلیم عطا صاحب بالکل چپ ہو گئے، یاد ہی نہیں کرتے میاں میری
تاخیر سے آپ تاخیر نہ کریں، ناظم صاحب کی خدمت میں اور مولوی عبدالغفور صاحب
کی خدمت میں میری طرف سے السلام علیکم عرض کرو مولوی عبدالغفور کی
بہت یاد ہوتی ہے۔

خاکسار

حیدر حسن"

# مولانا خلیل عربؒ

ہندوستان میں عرب ملکوں کے ہر باشندہ کو، خواہ وہ علمی و دینی حیثیت سے کوئی مرتبہ رکھتا ہو "احتراماً" عرب صاحب کہا جاتا ہے، جب سفر میں زیادہ پابندیاں نہیں تھیں، تو ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں حجاز مقدس سے آئے ہوئے مختلف حیثیتوں کے عرب، نووارد عربی لباس میں ملبوس نظر آتے تھے، اور مسلمان اپنے دینی جذبہ اور عرب کے ساتھ روحانی رشتہ کی بنا پر ان سے تعظیم و محبت کے ساتھ پیش آتے اور حسب توفیق خدمت بھی کرتے۔

لیکن ۲۵-۱۹۲۴ء سے لے کر ۳۳-۱۹۳۲ء تک لکھنؤ کی علمی و مذہبی مجلسوں اور تعلیم یافتہ حلقہ میں اگر عرب صاحب کا لفظ بولا جاتا تو اس سے ایک ہی شخصیت مراد ہوتی، اور وہ شیخ خلیل بن محمد عرب کی شخصیت تھی، جن کا لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی زبان و ادب کی تدریس کے لئے استاذ و لکچرار کی حیثیت سے نیا نیا تقرر ہوا تھا، اور وہ اپنے روایتی عربی اخلاق، شیریں گفتاری و ظرافت لسانی، زندہ دلی و سبک روحی، ذہانت و حاضر جوابی، باہمہ اور زود آشنا طبیعت اور سادگی و بے تکلفی کی بنا پر جو ان کے خمیر میں تھی، صف اول کے اساتذہ سے لے کر، عام طلبا تک

نہ صرف مقبول وہر دلعزیز تھے، بلکہ اکثر موقعوں پر شمع انجمن، اور رونق محفل، ادھر شہر میں مسلمانوں کی اعلیٰ سے اعلیٰ سوسائٹی، شاہد حسین صاحب کونسلی، مشیر حسین قدوائی، اور محمد نسیم صاحب رضا وکیل کی کوٹھی سے لے کر جہاں وہ عربی زبان کی تعلیم اور عقائد صحیحہ کی تبلیغ کے لئے بے تکلف آتے جاتے تھے، بازار جھاؤلال کے غریب محلہ کی مسجد میں جہاں وہ اکثر نماز پڑھاتے اور وعظ کہتے، اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی علمی مجلسوں میں جہاں وہ ایک فرد خاندان کی حیثیت سے ہر اہم تقریب میں شریک ہوتے، فرنگی محل، اور مدرسہ نظامیہ تک جہاں کے تعلیمی اور نصابی مشوروں میں دخیل رہتے، یکساں محبت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے، ان کا قیام بازار جھاؤلال میں اس حصہ میں تھا جس کو آج کل محمد علی لین کہتے ہیں، وہ عموماً یونیورسٹی پیدل جاتے، موتی محل پل اور کچہری روڈ کے درمیان دیکھنے والوں نے اکثر ان کو پیدل آتے جاتے دیکھا ہوگا، تیز لیکن سنجیدہ و باوقار چال، حلیہ چہرہ مہرہ یمنی عربوں کا گہرا گندمی رنگ سانولا پن لئے ہوئے، بلند بینی، فراخ چشم، پیشانی چوڑی جس سے ذہانت اور عزم نمایاں، قد میانہ، پستی کی طرف مائل، سر پر عربی مندیل، اہل یمن کے طرز او رپیچ کے ساتھ، شیروانی قبا سے کوتاہ لیکن شیروانی سے دراز، تقریباً دو بجے وہ اپنے یونیورسٹی کے پیریڈ سے فارغ ہو جاتے، عام طور پر ان کو ایم، اے اور بی، اے کی کلاسیں ملتی تھیں، اور یہ روایت سی ہوگئی تھی کہ صدر شعبہ عربی و فارسی ان کے باقاعدہ شاگرد ہوتے یا ان سے استفادہ کرتے رہتے تھے، شعبہ انگریزی ہو یا سائنس ڈپارٹمنٹ ہر شعبہ کے اساتذہ اور صدر، ایک ماہر فن، اہل زبان، ایک اعلیٰ انسان اور ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے ان کا احترام کرتے اور ان کا لوہا مانتے، پوری یونیورسٹی میں (جس کے اسٹاف میں متعدد انگریز اور زیادہ تر مدراسی اور بنگالی اساتذہ تھے) ان کی زبان دانی، سادگی کے ساتھ خودداری، خوش اخلاقی کے ساتھ استغنا و بے نیازی کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

یونیورسٹی جانے سے پہلے اور یونیورسٹی سے آنے کے بعد ان کا خانگی مدرسہ لگتا جس کے طلبہ میں وہ بھی تھے

جو یونیورسٹی میں ان سے پڑھتے تھے، اور وہ بھی جن کا تعلق مدرسہ نظامیہ، فرنگی محل یا دارالعلوم ندوۃ العلماء سے تھا، یا وہ صرف اسی مدرسہ کے باقاعدہ طالب علم تھے، اس گھر کے مدرسہ میں ان کی کوششیں، ان کی محبت و دلسوزی، ان کی تعلیمی مہارت، اور ان کی مجتہدانہ قابلیت کہیں زیادہ بارآور اور نتیجہ خیز ثابت ہوئی، ہندوستان میں عربی زبان و ادب کے صحیح ذوق، صحیح طریقۂ تعلیم اور ایک زندہ جیتی جاگتی زبان کی حیثیت سے اس کا استعمال اسی مدرسہ سے شروع ہوا جس کا نہ کوئی نام تھا نہ کوئی سائن بورڈ، نہ حاضری کا کوئی رجسٹر، نہ امتحانات کا باقاعدہ نظام، نہ وہاں کے فضلاء کو کوئی سند فراغ ملتی تھی، نہ کوئی خطاب و لقب لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسی مدرسہ سے ہندوستان میں عربی تعلیم اور عربی انشاء و تحریر کے اس نئے دور کا آغاز ہوا جس کو علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی کی آمد اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ اور فضلاء نے نقطۂ عروج تک پہونچا دیا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ یونیورسٹی کی ملازمت ایک بہانہ تھا، خدا کی حکمت اور اس کی کارسازی ان کو ڈھاکہ سے جہاں وہ عرصہ سے معلمی کے فرائض انجام دے رہے تھے، لکھنؤ خاص اسی مقصد و خدمت کے لئے لائی تھی کہ وہ ہندوستان میں قرآن کریم کی زبان کی صحیح تعلیم، اور ممالک عربیہ میں اسلام کی دعوت کے لئے ایک ہراول دستہ تیار کریں۔

لیکن یہ عرب صاحب ہندوستان میں نو وارد نہ تھے، وہ والد اور والدہ دونوں کی طرف سے خالص عربی النسل تھے، لیکن ان کی ولادت بھوپال میں ہوئی تھی، سب سے پہلے ان کے نامور دادا شیخ حسین بن محسن انصاری حدیدہ یمن سے بھوپال آئے، ان کی پہلی آمد عہد سکندر بیگم ۱۸۶۲ء میں ہوئی تھی، لیکن دو سال بھوپال رہ کر پھر یمن واپس گئے، دوبارہ وہ ۱۸۶۹ء میں شاہجہاں بیگم صاحبہ کے عہد میں تشریف لائے، لیکن چار سال قیام کے بعد پھر وطن چلے گئے، یہ ہندوستان کے مشہور و عظیم عالم و مصنف امیر الملک والا جاہ نواب سید صدیق حسن خاں کا زمانہ تھا، وہ خود بڑے صاحب نظر عالم

اور جوہر شناس رئیس تھے، حجاز کے سفر میں شیخ حسین محسن سے ملاقات ہوئی، وہ ان کے علوئے اسناد غیر معمولی حافظہ، علوم حدیث پر ان کی غیر معمولی قدرت اور ان کا تبحر علمی دیکھ کر ان کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ خود ان سے سند بھی لی اور ان کو بھوپال تشریف لانے کی دعوت بھی دی۔

۱۸۷۹ء میں بھوپال آئے اور وہیں رہ پڑے، شیخ حسین فن حدیث کے امام اور قدیم محدثین کی (جن کی قوت حفظ اور وسعت نظر کے واقعات قدیم تذکروں میں منقول اور اس دور کے لوگوں کے لئے سرمایۂ استعجاب ہیں) کی زندہ یادگار اور بولتی چالتی تصویر تھے، میں نے اپنے استاذ مولانا حیدر حسن خاں صاحب شیخ الحدیث دار العلوم ندوۃ العلماء سے جو ان کے شاگرد تھے، خود سنا ہے کہ فتح الباری (شرح بخاری) کی تیرہ ۱۳ جلدیں تقریباً ان کو حفظ اور مستحضر تھیں، ان کی سند حدیث نہایت عالی، اور قلیل الوسائط تھی، جو علمائے حدیث کے یہاں ایک وجہ افتخار و امتیاز سمجھی جاتی ہے، وہ نیل الاوطار کے شہرۂ آفاق مصنف، مجتہد یمن علامہ محمد بن علی الشوکانی (م ۱۲۵۰ھ) کے صاحبزادہ علامہ احمد بن محمد علی الشوکانی اور دوسرے جلیل القدر علمائے یمن کے شاگرد تھے، ہندوستان میں ان کے درس حدیث میں بڑی برکت ہوئی اور ان کو ایسی مرجعیت حاصل ہوئی جو ایک دو علمائے راسخین کو چھوڑ کر کسی کو حاصل نہیں ہوئی، بڑے بڑے اساتذۂ فن اور مشاہیر علماء نے جو خود صاحب درس و تصنیف تھے، اور جن کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا، ان کے تلمذ کو اپنے لئے باعث فخر سمجھا، تلامذہ میں نواب سید صدیق حسن خاں، مولانا محمد بشیر سہسوانی، مولانا شمس الحق ڈیانوی (صاحب غایت المقصود و عون المعبود) حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی بہاری، نواب وقار نواز جنگ مولانا وحید الزماں حیدرآبادی، مولانا محمد طیب مکی رامپوری، مولانا محمود حسن خاں ٹونکی، (صاحب معجم المصنفین) مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی

اور والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی سابق ناظم ندوۃ العلماء ہیں، شیخ حسین کے قیام نے بھوپال کو دارالحدیث اور شیراز و یمن کا ہمسر بنا دیا، تقریباً ثلث صدی سے زائد موتی مسجد جو اس چھوٹے سے شہر میں جامع ازہر سے آنکھیں ملاتی تھی، قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صدا سے گونجتی رہی اور نہ صرف بھوپال بلکہ ہندوستان کی فضاء کو اس نفحہ عنبریں سے معطر و منور کرتی رہی، ۱۳۲۷ھ میں اس امام حدیث نے دنیا سے رحلت کی، انتقال کے وقت ان کا اور ان کے بھائی قاضی زین العابدین کا ایک مستقل خاندان بھوپال میں آباد ہو گیا تھا، ان کے بڑے صاحبزادہ شیخ محمد بن حسین جو اپنی جوانی میں اپنے نامور باپ کے ساتھ یمن سے بھوپال منتقل ہوئے تھے، عالم و فاضل اور صاحب درس و تصنیف بزرگ تھے، اصل موضوع اور طبعی ذوق ادب و شاعری کا تھا، فن عروض و قوافی پر محققانہ نظر رکھتے تھے، صاحب قلم ادیب اور قادر الکلام شاعر تھے، عرصہ دراز تک دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ادب عربی کے استاذ اعلیٰ اور کچھ عرصہ شیخ الحدیث بھی رہے، ناچیز راقم سطور نے ان کی زیارت کی ہے، خالص عربی حلیہ و شمائل، اردو گفتگو میں بھی عربی کا اثر غالب، رنگ صاف کھلتا ہوا، قد نمایاں طریقہ پر پستہ عام عربوں کی طرح کثیر الازدواج اور کثیر الاولاد تھے، صاحبزادوں میں فخر خاندان و شرف دودمان شیخ خلیل، عبدالرحمٰن، حبیب الرحمٰن، عبید بن محمد عرب پروفیسر حمیدیہ کالج بھوپال (جن کو صدر جمہوریہ کی طرف سے عربی کی اعزازی سند ملی تھی اور چند سال ہوئے ان کا انتقال ہوا) میرے رفیق درس حسین بن محمد اور ان کے برادر خرد محسن حسن وغیرہ تھے۔

شیخ خلیل اسی عرب گھرانہ اور درس حدیث کے مرکز میں ۱۳۰۴ھ میں پیدا ہوئے، ان کی والدہ محترمہ رقیہ، ان کے والد کے حقیقی چچا قاضی زین العابدین صاحب کی بیٹی تھیں، جو خود بھی بھوپال منتقل ہو گئے تھے، اور برسوں تک مسند قضا پر متمکن رہے، ابتدائی تعلیم علمائے بھوپال اور

اپنے والد سے پائی، بھوپال اس وقت ماہرین فنون اور علمار کاملین کا مرکز تھا، پھر جب ان کے والد ماجد شیخ محمد کا قیام دار العلوم ندوۃ العلمار کی تدریس کے سلسلہ سے لکھنؤ رہنے لگا تو وہ بھی لکھنؤ آگئے اور دار العلوم ندوۃ العلمار کے فاضل اساتذہ سے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا، اور یہاں سے باقاعدہ سند لی، اس وقت مولانا سید امیر علی ملیح آبادی (صاحب تفسیر مواہب الرحمٰن و تصانیف کثیرہ) دار العلوم کے ایک ممتاز استاذ، محدث اور مہتمم تھے، شیخ خلیل ان کے تلامذۂ خاص کے حلقہ میں اس طرح شریک ہوئے، اور ان سے ایسا اختصاص پیدا کیا جیسا قدیم زمانہ میں خاص طلبہ کو خاص اساتذہ سے حاصل ہوا کرتا تھا، مولانا سید امیر علی محدث کامل، فن رجال کے بڑے وسیع النظر عالم اور بڑے بلند ہمت و جفاکش مصنف تھے[1]، شیخ خلیل کو ان سے ایسی خصوصیت، اور قرب حاصل ہوا کہ مولانا نے ان کو مستقل اپنی فرزندی میں لے کر اپنی صاحبزادی سے عقد کر دیا، غالباً کچھ عرصہ عرب صاحب نے دار العلوم ندوۃ العلمار میں تدریس کی خدمت بھی انجام دی ان کے پاس صرف ندوہ کی سند تھی۔

لیکن ان کی اصل سند جس سے ہر جگہ انھوں نے عزت پائی اور اپنے اقران و اماثل میں ممتاز و صدر نشین رہے، وہ زبان و ادب کا خداداد ذوق، ان کی تعلیم کا فطری ملکہ، تعلیم میں جانگدازی و دلسوزی کی وہ کیفیت جو مدت دراز سے تعلیمی و تدریسی حلقوں سے مفقود، اور تاریخ اوراق میں مدفون ہو کر رہ گئی ہے، اپنے طلبار و شاگردوں سے پدرانہ بلکہ مادرانہ محبت و انس اپنے ذوق و نظر کو اپنے طلبا تک منتقل کر دینے اور ان کے رگ و ریشہ میں اتار دینے کی عجیب و غریب قابلیت زیر درس کتاب میں جان ڈال دینے، فن کا صحیح ذوق پیدا کر دینے،

---

[1] فقہ و حدیث کی کئی ضخیم و کثیر الاجزار کتابوں کا ترجمہ، ان کی یادگار ہے، انھیں میں سے فتح الباری کا ترجمہ بھی ہے، جو غیر مطبوعہ ہے، ان کے کئی تراجم اور تصانیف مطبع نولکشور سے چھپ کر مقبول و متداول ہوئے۔

اور مصنف کا ہم زبان اور ہم مذاق بنا دینے کی وہ بے نظیر قدرت جو ہزاروں میں سے کہیں کسی ایک استاذ و ماہر فن میں ہوتی ہے، یہ قابلیت کسبی نہیں، وہبی ہے، اللہ تعالیٰ جن لوگوں سے کوئی خصوصی خدمت لینا چاہتا ہے، کسی دور کے نظام تعلیم کے تن مردہ میں وہ زندگی کی نئی روح پھونکتے ہیں، انھیں کو وہ تدریسی قوت، اور ذوق آفرینی کی دولت ملتی ہے، ناچیز راقم کو خدا کے فضل سے بڑے بڑے کامل الفن اساتذہ کی خدمت میں زانوئے ادب تہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے، میرا بال بال، رواں رواں ان کے احسانات کا رہین منت ہے، لیکن عربی زبان و ادب کے ذوق سلیم و ذوق صحیح، پھر اس ذوق کو منتقل کرنے کی ایسی قابلیت، نہ صرف ہندوستان (جو کہ صدیوں سے عربی کے مذاق سلیم سے نا آشنا، اور صحیح طریقۂ تعلیم سے محروم ہے) بلکہ ممالک عربیہ کے اعلیٰ علمی و ادبی حلقوں میں بھی نہیں پائی۔

میرے عربی تعلیم کے شروع ہونے کا وقت آیا تو میرے برادر معظم و مربی (ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبد العلی صاحب مرحوم) نے مجھے عرب صاحب کے سپرد کیا جن سے بھائی صاحب کو بہت یگانگت و محبت تھی، یہ خاندان ہمارے خاندان کا دو پشتوں سے استاد چلا آرہا تھا یہ تیسری پشت تھی، میرے والد صاحب نے حدیث شیخ حسین بن محسن سے پڑھی تھی، اور ان کے عزیز ترین شاگردوں میں تھے، شیخ صاحب نے بعض رسائل (جو الحمد للہ اس وقت بھی ہمارے پاس موجود ہیں) خاص والد صاحب کے لئے تصنیف کئے تھے، ادب انھوں نے ان کے فاضل فرزند شیخ محمد عرب صاحب سے پڑھا، اب ان کی اولاد کی باری تھی، میرا عرب صاحب پر، اور عرب صاحب کا مجھ پر تین پشتوں کا حق تھا، اور وہ اس بارے میں ایسے ہی حق شناس تھے، جیسا زمانۂ قدیم کے علماء و شرفاء زمانہ غالباً ۱۹۲۶ء کا تھا کہ ان کے اس سکونتی مکان میں میری عربی کی بسم اللہ ہوئی، اور انھوں نے پہلی مرتبہ ایک کاپی پر فعل ماضی کی گردان لکھ کر مجھ کو یاد کرنے کو دی، میں اس درجہ کا ایک ہی طالب علم تھا لیکن تھوڑے ہی دن کے بعد عرب صاحب

لے عربی زبان کی پہلی کتاب "المطالعۃ العربیۃ" شروع کرائی، اس کا اصل نام "المطالعۃ المصریۃ" تھا، بنگال کے اسکولوں اور ابتدائی مدارس میں رائج تھی، عرب صاحب کو زبان کی سہولت اور سلاست اور مکالمہ اور فنی تدریج اور ترتیب کی بنا پر یہ کتاب بہت پسند تھی، انھیں کی کوششوں سے اس کے کئی ایڈیشن نکلے، اور اس نے عربی مدارس کے حلقہ میں رواج حاصل کیا، جلد ہی اس درجہ میں ایک اضافہ ہوا، اور مجھے ایک رفیق عزیز میسر آئے، یہ ان کے چھوٹے بھائی حسین بن محمد تھے، جن کی عربی تعلیم مجھ سے کچھ پہلے شروع ہو چکی تھی، اب ہم دو طالب علموں کی ایک جماعت تھی، جس پر عرب صاحب کی ساری توجہ مرکوز ہو گئی، ان میں کا ایک اگر ان کا خونی رشتہ سے بھائی تھا تو دوسرا دیرینہ تعلقات اور طویل و مسلسل تلمذ کی نسبت کی بنا پر علمی و روحانی اولاد، یا عزیز۔

یہ بہت عرصہ کی بات ہے لیکن اتنا اب بھی ذہن میں تازہ ہے کہ سبق سے ذرا بھی گرانی اور وحشت نہیں تھی، عرب صاحب کی پر لطف باتیں، حوصلہ بڑھانے والی اور وحشت دور کرنے والی ظرافت، عملی مشق، ان سب چیزوں نے اجنبی زبان کی وحشت اور درسی کتابوں کی ثقالت کو دور کر دیا تھا، وہ غالباً اس وقت ہندوستان سے باہر کہیں نہیں گئے تھے، اور گئے ہوں گے تو شاید یمن و خلیج فارس کے بعض پس ماندہ علاقوں میں، مصر و شام میں عربی زبان و قواعد کی تعلیم و تدریس کے سلسلہ میں جو نئے نئے تجربے ہو رہے تھے، اور جو ترقیاں ہو چکی تھیں، ان سے وہ شاید بہت کم واقفیت رکھتے ہوں گے، اخبارات و رسائل اور نئی نئی کتابوں کے آمد و رفت کا دور بھی عام طور پر شروع نہیں ہوا تھا، لیکن ان کا ذہن نہایت سلیم، جدت پسند بلکہ حقیقت پسند و عملی واقع ہوا تھا، انھوں نے غالباً قدیم طرز ہی پر تعلیم پائی ہو گی، لیکن وہ عربی زبان و ادب کی کلاسیکل کتابوں کے علاوہ کسی قدیم و مروج کتاب کو پڑھانا جو عربی دور انحطاط میں لکھی گئی پسند نہیں کرتے تھے، چنانچہ "المطالعۃ العربیۃ" کے بعد انھوں نے "مدارج القراۃ" (بیروت) کا دوسرا حصہ اور "الطریقۃ المبتکرہ" کے تین حصے درساً درساً او

دو حصے مطالعہ کے طور پر پڑھائے، اس کے بعد انھوں نے "ابن المقفع" کی مشہور کتاب کلیلہٗ دمنہ شروع کرادی، جو ان کی بڑی محبوب کتاب تھی، اور جس کے اسلوب اور زبان کے وہ بڑے قائل تھے، یہ ان کے "خانہ ساز" نصاب کی بڑی معرکۃ الآرا کتاب تھی، وہ اس کو بڑی محنت و ذوق سے پڑھاتے تھے، لیکن کس طرح؟

ہم دونوں رفیقوں کو دن بھر اس پر محنت کرنی پڑتی تھی، پورا سبق تیار کر کے اس طرح ان کے سامنے پیش کرنا ہوتا تھا، جیسے آموختہ سنایا جاتا ہے، عبارت کا صحیح پڑھنا، اس کے صرفی و نحوی وجوہ کا جاننا، سوالات کا جواب دینا، عبارت کے مفہوم کو پورے طور پر اخذ کر لینا، یہ سب ہمارے ذمہ تھا، دراصل یہی کتاب اور اس کا یہ طریقۂ تعلیم، ہماری استعداد اور قوت مطالعہ کی کلید تھی، جس سے تعلیم کے ہر ہر مرحلہ میں (جہاں تک زبان کا تعلق ہے) ہر قفل کھلتا چلا گیا، دراصل پورے نصاب میں (قدیم نظام تعلیم میں) ایک ہی دو کتابیں ایسی ہوتی تھیں جو قوت مطالعہ پیدا کر دیتیں اور اخذ مطالعہ کے لئے کافی ہو جاتی تھیں، اس زمانہ میں عرب صاحب صرف و نحو کی عملی مشق کے لئے، ایک چھوٹے سے رسالہ سے جو میرے ہی ہم نام ابوالحسن علی الضریر کی نسبت ضریری کے نام سے مشہور ہے، عربی کے کثیر الاستعمال اور عامۃ الورود قواعد کی (جن کی تعداد زیادہ نہیں ہے) مشق کرائی، ہم دونوں نے صرف و نحو کی مختلف کتابیں مختلف اساتذہ سے پڑھیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس وقت تک کی ساری کمائی اور علمی جمع خرچ اسی چھوٹے سے رسالہ کا رہین منت ہے۔

کلیلہ و دمنہ ختم ہوئی تو عرب صاحب نے مصر کے عربی نصاب درس کی ایک کتاب جو وہاں کے مدارس میں رائج تھی، اور جس کا نام "مجموعۃ من النظم والنثر للحفظ والتسمیع" تھا، شروع کرائی، اس کا پہلا حصہ منظوم ہے، دوسرا نثر، لیکن عرب صاحب نے اپنے خداداد ذوق سلیم کی بنا پر نثر سے ابتدا کی، جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے، طلباء کے لئے اس کتاب کا زبانی یاد کرنا اور سنانا ضروری ہے،

ہم جو پڑھتے اس کو اگلے دن سناتے، اس کے بغیر نیا سبق نہ ہوتا، سب جانتے ہیں کہ تقریباً سب زبانوں بالخصوص عربی کے لئے زبان کا ایک معتد بہ حصہ اور اساتذہ و مستند اہل زبان کا کلام زبانی یاد ہونا اور حافظہ کا کسی نہ کسی طرح جزء بن جانا نہایت مفید ہے، غالباً اس طرح پورے حصۂ نثر کو زبانی یاد کرنے کی نوبت تو نہ آئی لیکن اس کا بہت سا حصہ زبانی یاد کرکے سنانا پڑا، وہ حصہ اگرچہ فراموش ہو گیا لیکن حافظہ اور ذوق میں وہ اس طرح تحلیل ہو گیا تھا کہ اس کے اجزاء و اثرات جزء بدن ہو گئے اور تحریر و انشاء میں اس کا رنگ نمایاں ہوا، عرب صاحب کے طریقۂ تعلیم کی یہ بھی خوبی تھی کہ وہ اچھے الفاظ، تعبیرات و محاورات کا اس طرح چٹخارہ لیتے، ان کی لذت و حلاوت کا اس طرح اظہار کرتے کہ وہ ہم لوگوں کے دل و دماغ پر مرتسم ہو جاتے، اور ہم سمجھتے کہ ان الفاظ کا لطف لینا اور ان کی قدر ضروری ہے، دوسری خوبی یہ تھی کہ وہ ہم لوگوں کے ذہن پر یہ اثر قائم کرتے کہ یہ الفاظ و تعبیرات کسی کی ذاتی ملکیت نہیں اور نہ یہ سربمہر خزانہ ہے، یہ ہر اس شخص کی ملکیت ہے، جو اس کو صحیح طریقہ پر استعمال کر سکے، بعض اوقات انھوں نے ہماری انشاء کی کاپیوں میں کسی محاورہ، ضرب المثل یا جملہ کے صحیح استعمال پر اپنی مسرت کا اظہار کیا، جیسے ہم لوگوں نے کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہو، اور بعض اوقات اس پر انھوں نے انعام بھی عطا کیا۔

اس طرح ہمارے عربی درس کا سلسلہ چلتا رہا، عرب صاحب کے اصول تعلیم میں سے ایک یہ بھی ضابطہ تھا جس کی اس وقت تو نہ سمجھ تھی نہ قدر، لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ اعلیٰ تعلیمی تجربوں اور اجتہاد پر مبنی ہے اور اس میں جو کامیابی ہوتی ہے، وہ دوسرے طریقوں میں نہیں، وہ یہ کہ وہ دو زبانوں کی تعلیم بلکہ عام اوقات میں دو علوم اور مضامین کی تعلیم کو بھی مخلوط نہیں کرتے تھے، جب ہماری زبان و ادب کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو برس دو برس تک صرف زبان و ادب (قدرتی طور پر قواعد و انشاء کے ساتھ) ہی کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا، یہی ہمارا اوڑھنا بچھونا تھا، یہی ہمارا منتہائے نظر اور

سرمایۂ زندگی، اسی میں کمال پیدا کرنا ہمارے نزدیک سب سے زیادہ کامیابی اور عزت کی بات تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہمارے تمام قوائے فکریہ، ہمارے تمام حواس ظاہری و باطنی اس فن کے حصول اور اس کی ترقی میں مصروف اور مرکوز تھے، ہم ان کے یہاں عربی بولتے تھے، عربی میں سوچتے اور لکھتے تھے، اور یہی ہماری دنیا تھی، عرصہ کے بعد جب ۱۹۵۱ء میں مصر کے سفر کا اتفاق ہوا، تو مجھ سے علامہ شیخ محمود شلتوت نے جو اس وقت جامع ازہر میں ایک بڑے علمی عہدہ پر فائز تھے، اور بعد میں شیخ الازہر ہو کر انھوں نے عالمگیر شہرت حاصل کی، میری تعلیم کی تاریخ پوچھی، اور یہ دریافت کرنا چاہا کہ ایک عجمی ملک میں میں نے کس اصول و طریقہ سے تعلیم حاصل کی، کہ میں اپنے علمی و دینی مقاصد کی تکمیل کے قابل ہوا، میں نے جب عرب صاحب کے طریقۂ تعلیم کا ذکر کیا اور ان کو یہ بتایا کہ میں نے ایک ہی فن اور مضمون کی تعلیم پائی اور میں مضامین کی اس کثرت و انتشار سے محفوظ رہا، جو اس وقت تمام قدیم و جدید مدارس میں پایا جاتا ہے، اور جس سے اس زمانہ میں مفر نہیں سمجھا جاتا، تو انھوں نے بے ساختہ اور بڑے جوش سے کہا کہ یہی صحیح طریقۂ تعلیم ہے۔

ادب کی متوسط کتابوں کے ختم ہونے کے بعد، عرب صاحب پر ان کا دینی ذوق غالب آیا، اور انھوں نے قرآن شریف کا وہ حصہ پڑھانا شروع کیا جس کا مرکزی مضمون توحید ہے، اور جس میں سب سے زیادہ قوت و وضاحت کے ساتھ اس عقیدہ کی تلقین کی گئی ہے، چنانچہ "سورۂ زمر" اور اس کے بعد کی چند سورتیں پڑھائیں، اسی کے ساتھ صحیح مسلم میں سے جس سے ان کو زیادہ مناسبت تھی "کتاب المغازی" پڑھانی شروع کی، کہ یہ بھی ان کا خصوصی ذوق تھا، ان دو سبقوں کے علاوہ صبح سے شام تک عربی ادب ہی کی کتابیں تھیں، لیکن تمام تر نثر، کہ وہی بے تکلف اور فطری طریقۂ ادا اور علمی نفع کی چیز ہے، نظم نسبتاً کم اور ثانوی درجہ میں، نظم میں حماسہ، لامیۃ العرب للشنفری، قصیدہ بانت سعاد، اور ابوالعلاء المعری کا دیوان "سقط الزند" پڑھایا،

اسی کے ساتھ توفیق دیاب کا لکھا ہوا "خلاصۃ تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ"۔

عرب صاحب "نہج البلاغہ" کے بڑے قائل تھے، لیکن صرف حصہ کتب (خطوط) کے خطب کے حصہ میں حقیقتاً تصنع اور الحاق کی کثرت ہے، حصہ خطوط عربی زبان کے اسالیب اور نثر فنی (ادب عالی) کا اعلیٰ نمونہ ہے "مقامات حریری" اگرچہ ان کی پسندیدہ کتابوں میں نہیں تھی اور وہ اس کے مقفیٰ اور پر تکلف اسلوب کو پسند نہیں کرتے تھے، لیکن درسی و نصابی ضرورت سے انھوں نے غالباً بیس[۲۰] مقامات اس کے بھی پڑھائے، اس زمانہ میں وہ اس کی فاضلانہ شرح "شریشی" کے مطالعہ کی خاص طور پر ہدایت کرتے تھے، اسی کے ساتھ وہ امام عبد القاہر جرجانی کے ذوق عربیت، نقد سخن اور نکتہ آفرینی کے نہایت شیفتہ اور عاشق تھے، اور منہ بھر بھر کر اس کی تعریف کرتے تھے، "دلائل الاعجاز" ان کی نہایت محبوب کتاب تھی، اور وہ اس کے پڑھانے کا حق ادا کر دیتے تھے، جس شعر پر مصنف کو سرور آتا، ان کو بھی وجد آجاتا، اور وہ جھوم جھوم کر اس کو پڑھتے، اور دیر تک اس کا مزہ لیتے رہتے، شعراء میں "بحتری" کی عربیت، شعر کی موسیقیت، اور ترکیب کی چستی کے بڑے قائل تھے، "متنبّی" کی مضمون آفرینی اور نازک خیالی کے مداح تھے، ان کو سیکڑوں شعر یاد تھے، خود بھی آبدار شعر کہتے تھے، اور بعض اساتذہ کے رنگ سے رنگ ملا دیتے، "حماسہ" کے اشعار یا "بحتری" کے بعض قصائد پڑھتے تو سوق عکاظ کا نقشہ نظر کے سامنے پھر جاتا، اور شعر عربوں کے ذوق اور اعصاب پر جو ساحرانہ اثر رکھتا تھا، اور جس طرح وہ قبائل کی قسمتوں، عزت اور ذلت کے معیار کو بدل دیتا، اور ایک صحیح المذاق عرب کو وارفتہ اور از خود رفتہ بنا دیتا، اس کی تصدیق ہو جاتی تھی، وہ شعر پڑھتے وقت ہمہ تن تصویر بن جاتے، اور ان کے روئیں روئیں سے شعر اور نغمہ ابلتا نظر آتا۔

عرب صاحب کو ہم دونوں کے پڑھانے میں اتنا انہماک تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہی

ان کا سب سے بڑا ذوق، اور یہی وقت ان کے سب سے زیادہ فرحت وانبساط کا ہے، وہ جمعہ کی چھٹی کے علاوہ (جس کو معلوم نہیں وہ کس دل سے گوارا کرتے تھے) کسی چھٹی کے روادار نہ تھے، ایسی غیر معمولی چھٹی مجھے ایک ہی یاد ہے۔

میرے بڑے بھائی مرحوم فطرتاً نہایت کم سخن اور کم گو تھے، تقریر کا کیا ذکر مجلس میں بھی ضرورت سے زائد گفتگو کے عادی نہ تھے، معلوم نہیں کیا موقع اور کیا موضوع تھا کہ انھوں نے ایک روز مسجد میں کسی نماز کے بعد پورا وعظ کہا، عرب صاحب نے ہم دونوں کو اس دن چھٹی دیدی کہ آج ایسا ایک غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے کہ اس پر چھٹی دینی چاہیئے، وہ جب یونیورسٹی سے تھکے ماندے پسینہ سے شرابور واپس آتے، آتے ہی چائے تیار کرنے کا حکم دیتے، جس کی ان کو بکثرت عادت تھی، ان کے مکان[1] کی ایک کھڑکی ہمارے قدیم مکان کے بالکل سامنے کھلتی تھی، اس پر کھڑے ہو کر وہ بلند آواز سے علی حسین پکارتے، اور ہم دونوں حاضر ہو جاتے اکثر ایسا بھی ہوا ہے، کہ وہ کسی تعلیمی کمیٹی میں شرکت کے لئے علی گڑھ وغیرہ گئے ہیں، اور واپسی سبق کے وقت سے کچھ پہلے ہوئی ہے، ہم لوگوں کو اطمینان تھا کہ آج سبق نہیں ہوگا کہ اچانک ان کی بلند آواز کانوں میں پڑی اور ہم لوگوں کی طلبی ہوئی، اندازہ ہوتا تھا کہ یہ سبق ان کی روح کی غذا بن گئی ہے، اور اس کے بغیر ان کو چین نہیں۔

وہ نسلاً و نسباً یمنی تھے، غالباً حضرت سعد بن عبادہ کی دوسری تیسری پشت کے بعد سے جو مدینہ سے یمن منتقل ہوئی ہوگی، ان کا خاندان برابر یمن میں سکونت پذیر رہا، اہل یمن کے متعلق سب سے سچے انسان (روحی فداہ) کی زبان نے یہ شہادت دی ہے کہ رقت ان کے

---

[1] یہ مکان تبلیغی مرکز واقع کچہری روڈ لکھنؤ سے جانب غرب بالکل مقابل تھا، درمیان میں تپلی سی گلی ہے، یہی وہ عربی کا مدرسہ ہے، جہاں راقم نے اور بہت سے طلبہ و علماء نے عربی زبان و ادب کی تعلیم پائی۔

خمیر میں حکمت ان کے مزاج میں داخل ہے، اور ایمان ان کا طرۂ امتیاز ہے۔

"اتاکم أھل الیمن أرق أفئدۃ، وألین قلوبًا، الایمان یمان، والفقہ یمان، والحکمۃ یمانیۃ"

راقم کو اس سرزمین رنگ و بو کی زیارت کی سعادت حاصل نہیں ہوئی، اور اب تو فرعون[1] مصر کی ناحق ضد، اور انانیت نے اس کو خاک و خون کا شہر بنا دیا ہے، لیکن اپنے محبوب و محسن استاد کو دیکھ کر جن کا خمیر اسی خاک پاک سے تیار ہوا تھا، ارشاد نبوی کی پوری پوری تصدیق ہوئی، قرآن مجید پڑھنے میں ان کا نرالا انداز تھا، پرکیف و پر درد، دلکش و دلآویز، ہم لوگوں کو حسرت ہی رہتی تھی، کہ وہ اپنے اسی یمنی لہجہ میں ایک رکوع پورا پڑھ دیں، پڑھنا شروع کیا کہ گریہ کا طوفان امنڈ آیا، آنکھیں اشکبار اور آواز گلوگیر ہوگئی، اس وقت ان کی زبان حال خواجہ میر درد کا یہ شعر پڑھتی ؎

کوئی جا کر کے کہدے ابر نیساں سے کہ یوں برسے
کہ جیسے مینہ برستا ہے ہمارے دیدۂ تر سے

مجھے یاد نہیں کہ ہمارے محلہ کی پرانی مسجد میں "جو مسجد نوازی" کے نام سے مشہور ہے، اور جس کے عرب صاحب امام تھے، انھوں نے فجر کی نماز میں سورہ شروع کی ہو اور ختم کرنے کی نوبت آئی ہو، انھوں نے خود یہ واقعہ سنایا کہ لکھنؤ کے بعض ممتاز وکلاء اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات نے (جن میں سے سب یا اکثر غیر مسلم تھے) ایک انجمن بنائی تھی، جس میں دنیا کے مختلف مذاہب کے اخلاقی تعلیم کا نمونہ پیش کیا جاتا، انھوں نے ایک مرتبہ عرب صاحب کو بھی دعوت دی، کہ وہ اسلام کی تعلیم کا کوئی نمونہ پیش کریں، عرب صاحب نے "سورۃ الفرقان" کا آخری رکوع

---

[1] اس وقت جمال عبدالناصر زندہ تھے، جب یہ مضمون لکھا گیا۔

"وعباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض ھونا" بڑے خاص عربی ترنم کے ساتھ پڑھا، غالباً ابھی ترجمہ کی نوبت نہیں آئی تھی کہ ان میں سے متعدد حضرات آبدیدہ ہوگئے، عرب صاحب کا ایک خاص لہجہ بن گیا تھا جس میں اصول تجوید اور فن سے زیادہ ان کے اندرونی سوز و کیفیت کو دخل تھا، بہت مشکل تھا کہ کوئی شخص ان کی زبان سے قرآن شریف سنے اور متاثر نہ ہو، وہ جہری نمازوں میں اکثر سورۂ آل عمران کا آخری رکوع "ان فی خلق السمٰوات والارض" الخ اور سورۂ فرقان کا مذکورۂ بالا رکوع اور سورہ صف، سورۂ جمعہ و منافقون پڑھتے تھے، قرآن کے حافظ تھے، ان کا باقاعدہ قرآن سنانا تو مجھے یاد نہیں، لیکن جہری نمازوں اور مجلس میں بکثرت ان کی زبان سے قرآن مجید سنا، بعد میں جب وہ بھوپال منتقل ہوگئے، جب بھی نیاز حاصل ہوتا یہ تمنا ہوتی تھی کہ ان کے پیچھے دو رکعت نماز پڑھنے کی سعادت حاصل ہو، یا وہ قرآن مجید کا کوئی رکوع سنا دیں، ایک مرتبہ اچانک مدینہ طیبہ میں ملاقات ہوگئی، ہر چند عرض کیا کہ مسجد نبوی میں دو رکعت نماز نفل کی امامت فرمائیں، تاکہ کچھ قرآن مجید سننے میں آئے، اور روح کو بالیدگی اور ایمان کو تازگی حاصل ہو، لیکن یہ فرمائش قبول نہ ہوئی ۱۳۴۳ھ (۱۹۲۶ء) میں جس سال مکہ معظمہ میں موتمر ہوئی ہے، انھوں نے حج بیت اللہ سے فراغت حاصل کی، اسی سال بھائی صاحب مرحوم بھی گئے اور ہندوستان کے بہت سے علماء و زعماء، مجھے یاد ہے کہ دونوں....... دوستوں میں حج کے مشورے ہوتے تھے، اور دونوں پر ذوق و شوق کی عجیب کیفیت تھی، مالی حیثیت سے فارغ البال کوئی بھی نہ تھا، لیکن جذبۂ شوق نے ہر چیز کا انتظام کرلیا، دونوں روانہ ہوئے، بھائی صاحب مرحوم کہتے تھے کہ مکہ معظمہ میں بعض بڑے فاضل اور جید علماء کی عربی میں تقریریں ہوئیں، لیکن جتنی عرب صاحب کی تقریر پسند کی گئی،

اور اس کا اثر لیا گیا، کسی کی تقریر کا نہیں لیا گیا، اس حج اسلام کے بعد، وہ بعد کی زندگی میں متعدد بار حج کو گئے، سلطان و امراء و علمائے نجد ان سے اچھی طرح واقف اور مانوس ہو گئے تھے، اور ان کا بڑا احترام کرتے تھے، اور ان کو مہمان رکھتے تھے، مدینہ طیبہ کے بعض ہندوستانی مدارس کے لئے ان کی مساعی اور سفارش بہت کارگر ہوئی۔

عرب صاحب کا فطری ذوق غیر مسلموں میں تبلیغ کا تھا، ساری عمر وہ اسی دھن میں رہے، جب تک لکھنؤ میں تھے، کسی نہ کسی بہانہ اور عنوان سے وہ اپنے رفقائے کار (یونیورسٹی کے اساتذہ وطلباء) میں اسلام کا تعارف اور سیرت نبویؐ کے پیش کرنے سے نہ چوکتے، پسماندہ اقوام اور اچھوتوں میں وہ مساوات کی اسلامی تعلیم کے مظاہرہ کے بڑے مشتاق رہتے تھے، ان کے ساتھ کھانے پینے سے نہ صرف یہ کہ خود پرہیز نہیں کرتے تھے، بلکہ دوسروں کو بھی ہمیشہ ترغیب دیتے رہتے تھے، غالباً ۱۹۳۵ء میں جب ڈاکٹر امبیدکر نے اس بات کا اعلان کیا کہ وہ اپنے اور اپنی قوم کے لئے صحیح مذہب کی تلاش میں ہیں، اور وہ کسی مذہب کے قبول کرنے کا فیصلہ کرنے والے ہیں، تو عرب صاحب بہت بے چین ہوئے، ان کے اور بھائی صاحب کے حکم سے (کہ ان کا بھی اصلی ذوق جو زندگی بھر رہا، غیر مسلموں میں تبلیغ واشاعت اسلام کا تھا) یہ ناچیز انگریزی میں کچھ تبلیغی کتابیں اور ترجمۂ قرآن لے کر ڈاکٹر صاحب سے ملنے بمبئی گیا، مجھے یاد آتا ہے کہ انھوں نے کان میں مجھ سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر بات یہاں آ کر رک جائے کہ جب تک کسی مسلمان خاندان میں رشتے نہ ہوں، وہ اسلام قبول نہیں کر سکتے، تو میری طرف سے اس شرط کی منظوری کا تم کو اختیار رہے، یہ بات غالباً انھوں نے بڑے تاثر اور کیفیت کے ساتھ کہی تھی آخر آخر تک وہ حدیث کی بعض کتابوں کے انگریزی میں ترجمہ ہونے کے بڑے خواہشمند تھے، اور یورپ میں تبلیغ کے آرزومند رہتے تھے، مگر افسوس ہے کہ ان کے شاگردوں، اور تربیت یافتہ لوگوں میں کسی نے یہ آرزو ان کی زندگی میں پوری نہیں کی، اور یہ حسرت وہ اپنے ساتھ لے کر گئے۔

ان کے گھرانہ میں جب تک وہ بھوپال رہے، گھروں کے اندر عربی بولی جاتی ہوگی، لیکن میں نے جو زمانہ پایا، اس میں سوائے ان خاص اوقات کے کہ ان کے والد صاحب یا چچا صاحب تشریف لے آتے ہوں، گھر میں اردو ہی بولی جاتی تھی، وہ اردو نہ صرف صحیح اور فصیح بولتے تھے بلکہ سخن فہم اور نقاد بھی تھے، اور مقرر و خطیب بھی، مجھے اپنے بچپن میں اول اول پہلی مرتبہ انھیں سے معلوم ہوا کہ ہر استاد کا رنگ الگ ہوتا ہے، اور شعر سننے سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کس کا شعر ہے، اساتذۂ اردو کا کلام ان کو یاد بھی تھا، اور وہ ان کے طرز کو پہچانتے بھی تھے، ایک زمانہ تک لکھنؤ میں ان سنجیدہ حلقوں میں، جو میلاد کے رسوم و آداب کے زیادہ پابند نہیں تھے، سیرت پر انھیں کی تقریر ہوتی تھی، زیادہ تر واقعات سے لبریز اور اصلاحی اور دعوتی رنگ کی، خاص طور پر دار العلوم ندوۃ العلماء میں جو سالانہ سیرت کا جلسہ ہوتا تھا، اس کے تو طے شدہ مقرر وہی تھے۔

فیاضی، مہماں نوازی، کھانے کھلانے کا ذوق ان کو فطری، قومی ورثہ میں ملا تھا، وہ مزاجاً و اخلاقاً بھی عرب تھے، جب وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں تھے، تو سال میں ایک دو مرتبہ ان کے یہاں یونیورسٹی کے اساتذہ کی دعوت ہوتی تھی، اس دعوت میں جس میں عربی و ہندوستانی کھانوں کا امتزاج ہوتا تھا، غیر مسلم بھی اسی ذوق و شوق سے شریک ہوتے، جیسے مسلمان اساتذہ، اس موقع پر ضروری تھا کہ عرب صاحب ایک دو ہانڈیاں خود پکائیں، اور اپنے ذوق کی کوئی چیز تیار کریں، قدرتاً عربوں کی روایت اور مزاج کے مطابق اس میں گوشت سے تیار کی ہوئی چیزوں کی افراط ہوتی، کھانے کی مقدار مہمانوں کے حساب سے زیادہ ہوتی، اس پر میزبان کا اصرار اور تواضع ایک اچھا خاصا جشن معلوم ہوتا، ان کی تنخواہ جو اس زمانہ کے لحاظ سے بہت خاصی تھی، اور عام طور پر علوم شرقیہ کے استادوں اور علماء کے معیار سے زیادہ تھی، ساری کی ساری کھلانے پلانے اور مصر و شام کی قیمتی مطبوعات کی خریداری میں صرف ہو جاتی، جن کو عرب صاحب بڑی عالی حوصلگی کے ساتھ خریدتے،

اس لئے ان کے گھر میں بہت زیادہ فراغت نظر نہیں آتی تھی، اور بہت سادگی کے ساتھ زندگی گزر ہوتی، ان کا ایک بڑا امتیاز یہ تھا، کہ وہ اپنی اولاد اور بھائیوں میں ذرہ برابر فرق محسوس نہ ہونے دیتے، کثیر العیال تھے، چھ صاحبزادیاں تھیں، اور لکھنؤ کے قیام کے زمانہ تک کوئی اولاد نرینہ نہ تھی، چار بھائی جس میں سے صرف ایک علّاتی اور حقیقی تھے، مستقلاً ان کے یہاں رہتے، ان کی کفالت تعلیم و تربیت سب اولاد کی طرح انھیں کے ذمہ تھی، اور بھی بھائیوں بھتیجوں اور اعزہ کے ساتھ سلوک کرتے ہوں گے اپنی طویل بیماری کی بنا پر جب یونیورسٹی سے طویل چھٹی لی اور لکھنؤ کے ایک دوسرے محلہ پھاٹک ملکہ گیتی آرا میں رہنے لگے، تو بہت دن بعد ایک دن مجھے ملے، فرمایا کہ پراویڈنٹ فنڈ کی رقم کا ایک حصہ میں نے لیا ہے، میرے پاس رہے گا نہیں، میں تمہاری دعوت کرنا چاہتا ہوں، اور ندوہ کے اساتذہ اور طلبہ میں سے جن کو تم منتخب کرو، اپنی فرمائش کی چیز بھی بتاؤ، اور ان طالب علموں سے بھی پوچھو کہ وہ کیا کھانا چاہتے ہیں، میں نے اپنے بعض احباب خاص اور طلبہ کی ایک جماعت کے ساتھ اس دعوت میں شرکت کی، اس وقت عرب صاحب کی خوشی اور ان کی مہمان نوازی دیکھنے کے قابل تھی۔

انھوں نے ۲۳ نومبر ۱۹۲۲ء کو لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں لکچرر کی حیثیت سے چارج لیا تھا، ۱۲-۱۴ برس مسلسل یہ خدمت انجام دینے کے بعد اکتوبر ۱۹۳۶ء میں مسلسل علالت کے باعث انھوں نے استعفا پیش کیا، جو ۷ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو افسوس کے ساتھ منظور کیا گیا۔

اسی زمانہ میں وہ مردان خدا اور مشائخ کی طرف متوجہ ہوئے، ان کے دادا صاحب شیخ حسین عام علمائے یمن کی طرح مسلکاً شافعی تھے، لیکن عرب صاحب نے اپنے اساتذہ اور شیوخ کے اثر سے اہل حدیث کے مسلک کو اختیار کرلیا تھا، اور وہ عامل بالحدیث تھے، لیکن شیخ حسین بھی اہل اللہ کے معتقد اور قدر شناس تھے، بھوپال میں حضرت شاہ ابو احمد صاحب مجددی رحمۃ اللہ علیہ سے

رابط و نسبت رکھتے تھے، اور جب کبھی ملاقات ہوتی، حسن خاتمہ کی درخواست کرتے، پیرانہ سالی کے باوجود گنج مرادآباد کا سفر کیا، اور اولیس زمانہ حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب کی زیارت وملاقات کا شرف حاصل کیا، عرب صاحب کی فطرت میں بھی (سلفیت کے ذوق کے ساتھ یہ چنگاری تھی) اسی اضطراب کے زمانہ میں وہ ایک بار تھانہ بھون بھی گئے اور لکھنؤ میں مولانا شاہ وارث حسن صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر غالباً بیعت بھی کرلی، پہلی ہی مجلس میں ذکر کا غلبہ ہوا، ٹیلہ کی مسجد سے گھر تک عشق کی ایک شورش، اور ذکر کی ایک محویت میں پہونچے، بھوپال میں جب آخری ملاقات ہوئی تو میں نے "تذکرہ حضرت مولانا فضل رحمٰن" پیش کیا، بڑی عقیدت سے لیا، اور فرمایا کہ میرے دادا صاحب بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کو مولانا سے عقیدت تھی۔

لکھنؤ یونیورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ اپنے وطن بھوپال منتقل ہوگئے، جہاں عرصہ تک وہ مجلس علماء کے کارکن اور ولی عہد صاحبہ کے صاحبزادہ کے اتالیق رہے، تقسیم کے بعد وہ کراچی منتقل ہوگئے، وہاں بھی عربی کی تعلیم واشاعت اور عقائد صحیحہ (بالخصوص توحید وسنت) کی تبلیغ کی ان کو دھن رہی، آخر میں حدیث کا انہماک بڑھ گیا تھا، اور صحاح کے ترجمے اور تدریس واشاعت کی فکر دامن گیر رہتی تھی، پاکستان جانے کے بعد وہ صرف ایک بار ہندوستان بلکہ اپنے قدیم وطن بھوپال آئے، جہاں اب بھی ان کے حقیقی بھائی اور ان کے تربیت یافتہ شیخ عبید بن محمد عرب ان کے پھوپھی زاد بھائی اور برادر اکبر مولوی محمد عمر صاحب وکیل اور ماشاء اللہ بہت سے بھتیجے، بھانجے موجود تھے، ان کا قیام مولوی محمد عمر صاحب کے مکان واقع قاضی زین العابدین گیٹ میں رہا، اور اہل بھوپال نے محدث وقت وفخر بھوپال شیخ حسین بن محسن کی اس آخری یادگار کو آخری بار دیکھا، اس ناچیز نے بھی بھوپال جاکر ان کی آخری زیارت کی اور اپنی آنکھیں روشن کیں، خیال تھا کہ ابھی بار بار زیارت نصیب ہوگی کہ اگست کے وسط میں خواہر عزیزہ عطیہ خلیل کا خط آیا کہ "میاں کی طبیعت بہت خراب ہے،

معالجین مایوس ہیں" دریافت خیریت کے لئے جوابی تار دیا گیا، تو جواب ملا کہ وہ دنیا سے رحلت کر گئے، یہ واقعہ ۲۶؍اگست ۱۹۶۶ء جمعہ کے دن کا ہے، بعد جمعہ ایک جماعت کثیر کے ساتھ ان کی نماز جنازہ پڑھی گئی، اور اس گنج خوبی اور مجموعہ کمالات کو کراچی کے کسی گوشہ میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ غفر اللہ لہ و أعلیٰ درجاتہ۔

عرب صاحب بالعموم عربی میں مجھے خط لکھتے تھے، جن کا ایک مختصر ذخیرہ مرقعۂ خطوط میں محفوظ ہے، خوش قسمتی سے ان کا ایک اردو کا خط جو انھوں نے کراچی سے لکھا ہے، اور اس پر ۱۰؍شوال ۷۳ھ (          ) کی تاریخ درج ہے خطوط کے ذخیرہ میں مل گیا، یہ خط غالباً میرے اس خط کے جواب میں ہے، جو میں نے اپنے پہلے سفر پاکستان کے موقعہ پر ان کی خدمت میں لاہور سے لکھا تھا، اور جس میں ان کو اپنے لاہور آنے کی اطلاع اور ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا تھا، اس خط سے جہاں ان کے شفقت و تعلق قلبی کا اظہار ہوتا ہے، اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اردو کیسی رواں و شگفتہ لکھتے تھے، اور ان کے خطوط میں کیسی بے تکلفی پائی جاتی ہے، اس خط کو بعینہٖ ایک عزیز یادگار اور محبوب نشانی سمجھ کر نقل کیا جاتا ہے، اور اسی پر اس تحریر کو ختم کیا جاتا ہے۔

۱۰؍شوال ۷۳ھ                بسم اللہ

عزیز محترم مولانا ابوالحسن علی صاحب اطال اللہ بقائہ و أعزأیاہ، ومتع المسلمین بعلومہ عدا التصوف[1] آمین

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ایک بجے دوپہر ہی میں ہارا تھکا گھر پہونچا آپ کا لفافہ پڑھکر شادمانی کا وہ عالم تھا جس کی مثال زندگی میں نہیں ملتی، بابا ستر کے قریب قافلۂ عمر پہنچ چکا ہے،

---

[1] یعنی اللہ تعالیٰ اس کے علوم سے مسلمانوں کو متمتع فرمائے بجز تصوف کے۔

کیا خبر کب وقت آجائے، بہر حال ہم آپ کے بھائی کے ملنے والے اور باپ کے دیکھنے والوں میں ہیں، اسی کے پاس و لحاظ سے کبھی ایک دن کے لئے آجایئے۔

عرب یعنی ممالک اسلامیہ کا پاسپورٹ "کتاب التقاسیم والانواع" کی تلاش کے لئے لے چکا ہوں، انشاء اللہ آخر شوال تک روانگی کا ارادہ ہے، اگر خدا نے کامیاب کر دیا تو انشاء اللہ ذخر دارین ہے۔

علی میاں! مجتہد گر کتاب ہے الجامع الصحیح حضرت امام رضی اللہ عنہ کے تفقہ کی دلیل ہے، ایک ایک حدیث سے تیس تیس چالیس چالیس مسائل ایک ایک لفظ کے کروٹوں سے استنباط فرماتے ہیں، لیکن ابو حاتم ایک حدیث سے ایک اصل منتزع فرماتے ہیں، اور اس پر پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ تفاریع اپنی روایات سے لاتے ہیں۔

رقیہ[1] سلمہا بحمد اللہ بعافیت ہیں دعا یہ دین مشغلہ لیل و نہار رہے، اللہ تعالےٰ نے ہزار ہا خدا کی بندیوں کو ورطۂ بدعات و شرک سے نجات دلائی کراچی و مضافات میں ان کے کام نے اہمیت حاصل کر لی ہے فالحمد للہ اپنی ہیئت و حالت میں دوسری باپ کا نمونہ ہیں، مشقت میں لاپرواہی میں غذا میں غرض ہر بات میں اللہ قبول فرمائے۔

علی میاں! یہ خیال کر کے لرزہ براندام ہو جاتا ہوں کہ ابو طالب نے حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کے تا زیست حفاظت و خدمت کی اس کی

---

[1] بڑی صاحبزادی رقیہ بنت خلیل۔

نامقبولیت دیکھو، شفیع الامم فرمائیں کہ چچا کان میں لا الہ الا اللہ کہہ دو، لیکن حسرتناک جواب ملتا ہے، اور ان اللہ لغنیٌّ عن العٰلمین کی تفسیر بے نقاب سامنے آجاتی ہے۔

رقیہ، عطیہ، محمد یحییٰ سلام عرض کرتے ہیں۔

آپ کا سچا مخلص

خلیل بن محمد عرب

# مولانا سیّد طلحہ صاحب حسنی ایم، اے مرحوم

مئی سنہ ۷۰ء میں نزہۃ الخواطر[1] کا آٹھواں آخری حصہ دائرۃ المعارف حیدر آباد سے چھپ کر آیا، تو اس وقت یہ احساس یا انکشاف ہوا کہ اس چودھویں صدی ہجری کی جن نامور اور باکمال شخصیتوں کے اس جلد میں حالات ہیں، اور جن کی تعداد (۵۶۳) ہے اب ان میں صرف مولانا سید طلحہ صاحب حسنی بقید حیات ہیں، باقی سب اس دار فانی سے رحلت کر چکے، اس احساس و دریافت میں حسرت و مسرت کی آمیزش تھی، حسرت زیادہ کہ اب ان صاحبان فضل و کمال میں کوئی بھی اس دنیا میں موجود نہیں، جو ایک جوہر شناس مورخ و سوانح نگار کے قلم سے کھینچی ہوئی تصویر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے اور اپنے علمی و عملی کارناموں اور کوششوں کی داد پا سکے، تھوڑی سی مسرت اس بات کی تھی [illegible] ہستی ابھی ایسی موجود ہے جو اس کتاب میں اپنا تذکرہ پڑھے گی، اور جن معاصرین کے حالات اس کتاب میں ہیں، ان میں سے اکثر کے چہرے اس کے جانے پہچانے ہیں، نامور معاصرین کی زندگیوں کا انھوں نے بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا، اور

---

[1] نزہۃ الخواطر (مولفہ مولانا حکیم سید عبد الحئی رح) میں ان باکمال و نامور افراد کے حالات ہیں جو (باقی صفحہ ۲۳۰ پر)

ان کے متعلق وہ بڑی جچی تلی اور بے لاگ رائے رکھتے تھے، انسانی زندگیوں کے بڑے باریک پہلوؤں پر اور مشاہیر و اہل کمال کے دلچسپ و عبرت انگیز تناقضات پر جو بشریت کا خاصہ اور خاص واقعات کا نتیجہ ہوتے ہیں، ان کی بڑی گہری نگاہ تھی، اس لئے اندازہ تھا کہ اس جلد کے مطالعہ سے وہ جتنے لطف اندوز و محظوظ ہوں گے شاید اس برصغیر میں کوئی اور نہ ہو سکے، اور اس کے متعلق جیسی مبصرانہ اور ناقدانہ رائے، وہ دے سکتے ہیں، شاید کوئی دوسرا نہ دے سکے، پھر مصنف مرحوم سے ان کو قرابت[1] رفاقت، محبت و عقیدت کا جو تعلق رہا ہے اس کی بنا پر وہ جس ذوق و سرشاری کے ساتھ اس کتاب کو پڑھیں گے وہ کسی دوسرے اہل علم کے لئے مشکل ہے۔

اس کا نتیجہ تھا کہ جب یہ کتاب چھپ کر آئی تو میری بڑی خواہش اور کوشش یہ تھی، کہ یہ کتاب (جس کی سات جلدیں ان کے مطالعہ سے بار بار گزری تھیں) جلد سے جلد ان کے پاس پہونچ جائے، زندگی کا چراغ گل ہوتے کچھ دیر نہیں لگتی، اور اب تو ان کی عمر اسّی سے متجاوز تھی، اور وہ عرصہ سے چراغ سحری ہو رہے تھے، کچھ وقفہ کے ساتھ کراچی سے جب کوئی خط آتا تھا تو دل ڈرتا تھا، کہ کہیں اس میں اس واقعہ کی خبر نہ ہو، جو کسی نہ کسی دن پیش آنا تھا، اِدھر پاکستان کے نئے قانون کی رو سے کوئی کتاب (خواہ وہ کیسی ہی معصوم علمی و دینی کتاب ہو) ہندوستان سے پاکستان نہیں جا سکتی تھی، خدا جانے اس عرصہ میں کتنے مصنفین کی حسرتوں کا

---

(باقی صہ ۲۲۹ کا) ہندوستان میں داخلۂ اسلام کے بعد سے اس سرزمین سے اٹھے اور انھوں نے کوئی علمی یا عملی یادگار چھوڑی یا کوئی امتیاز پیدا کیا، یہ کتاب آٹھ ضخیم جلدوں میں ہے، اور اس میں ساڑھے چار ہزار سے زیادہ علماء و اعیان کا تذکرہ ہے۔

[1] وہ مصنف نزہۃ الخواطر کے بہنوئی تھے، میری پھوپھی صاحبہ ان سے منسوب تھیں، اس تقریب سے ہمارا گھر ان کا گھر تھا، اور ان کا گھر ہمارا گھر۔

خون ہوا، اور کتنے شائقین علم کیسے کیسے محبوب مصنفین اور دوستوں کی تحریروں اور کیسی کیسی مفید اور ضروری کتابوں کے مطالعہ کا اشتیاق اور حسرت لے کر دنیا سے چلے گئے، بڑی بے کلی اور بے چینی تھی کہ یہ کتاب جس میں سیکڑوں کی تعداد میں ان مشاہیر اور اہل علم کا تذکرہ ہے، جو اس سرزمین کی خاک سے اٹھے اور وہیں پیوند زمین ہوئے، جو اب پاکستان میں شامل ہے، اور دو چار پاکستانی علماء اور احباب کے ہاتھوں میں پہونچے جو اس کے لئے چشم براہ ہیں، اور جن کو اپنی تحقیقات و تصنیفات میں اس سے کام لینا ہے، اس میں سرفہرست مولانا سید طلحہ صاحب کا نام تھا۔

اس میں کچھ جذباتی اور ذاتی لگاؤ بھی تھا، اور مسئلہ خالص علمی وافادی نہ تھا، شخصی اور خاندانی بھی تھا، اس میں کچھ خود غرضی اور طفلانہ خواہش بھی شامل تھی، درحقیقت زندگی کی لذت بہت کچھ انھیں چیزوں کے دم سے ہے، جو خالص عقل و فلسفہ کی پیداوار نہیں، جی یہ چاہتا تھا کہ وہ اس کتاب کو پڑھ کر اپنے قلبی تاثرات کا اظہار کریں، اور مصنف کی محنتوں اور کوششوں کی داد دیں، اپنا پرانا زمانہ یاد کریں، اور یاد دلائیں، جب وہ لاہور سے گرمیوں کی تعطیلات میں آتے تھے، اور مصنف اس کتاب کے بعض مقامات ان کو پڑھ کر سناتے تھے، دل کا ایک چور یہ بھی تھا، کہ یہ معلوم ہو کہ راقم سطور نے اس میں اپنے اضافہ کا جو پیوند لگایا اور قلم سے قلم ملانے کی جو کوشش کی ہے، اس میں کہاں تک وہ کامیاب رہا؟ یہ بات جیسی بصیرت اور اعتماد اور صفائی و بیباکی کے ساتھ وہ بتا سکتے ہیں کوئی دوسرا نہیں بتا سکتا، اس لئے برصغیر میں دو ہی چار آدمی ایسے ہوں گے، جو عربی انشاء و تحریر کا اتنا صحیح ذوق اور عربی کے اسالیب بیان پر ایسی ناقدانہ نگاہ رکھتے ہوں، پھر وہ میرے استاد بھی ہیں، اور بزرگ بھی، وہ اس بارے میں کسی رورعایت سے کام نہ لیں گے، ان کے اعتراف کے

دو جملے میرے لئے تقریظوں کے بیسیوں صفحات پر بھاری ہیں۔

خدا کی مہربانی سے ایک ایسا موقع و ذریعہ ہاتھ آگیا کہ یہ کتاب جون کے آخر میں ان کو مل گئی، اور جیسی توقع تھی، انھوں نے ضعف اور بیماریوں کے باوجود کم سے کم مدت میں اس کا مطالعہ کر لیا، اور اس تحفہ کی مفصل رسید بھیجی، جو اس کتاب پر کہا جا سکتا ہے کہ سب سے بڑا منصفانہ و مبصرانہ تبصرہ تھا جن لوگوں کو تحریر و تصنیف کا تھوڑا بہت تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ ایک مصنف کے لئے جس نے اپنی تصنیف میں خون جگر صرف کیا ہو بعض اوقات تعریف کے صفحات سے وخوشی نہیں ہوتی، اور ان کو وہ اپنی محنت کی اصل داد نہیں سمجھتا جتنا کسی مبصر کے دو جملے جن سے تصنیف کے اصل جوہر اور مصنف کی اصل محنت کا اظہار ہوتا ہے، کام کر جاتے ہیں، اور اس کی ساری محنت وصول ہو جاتی ہے، یہ خط کچھ اسی طرح کا تھا، اس اعتراف کے ساتھ کہ کتاب کی تکمیل کرنے والا اپنی پیوندکاری میں بڑی حد تک کامیاب ہوا ہے، اس کی تحریر پر ایک، دو استادانہ اصلاحات بھی تھیں، بہرحال خدا نے بڑی آرزو پوری کی، اور یہ کتاب ان کی زندگی میں چھپ بھی گئی، اور انھوں نے ملاحظہ بھی فرمائی، اس دور میں جب فضل و کمال کا اعتراف "داد و ستد" کا معاملہ رہ گیا ہے، اور صرف شہرت و ناموری کسی خاص جماعت و گروہ سے انتساب، تصنیفات کی کثرت، یا تلامذہ و معتقدین کے حلقے کی وسعت ہی کسی آدمی کے قابلِ تعریف و تعارف ہونے کا معیار رہ گیا ہے، اور بدقسمتی سے ان میں سے کوئی بات ان کو حاصل نہ تھی، انھوں نے اپنا تذکرہ جو حق تلفی اور مبالغہ دونوں سے مبرا تھا، خود پڑھ لیا، انھوں نے اپنے خط میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا، اور نہ ان سے اس کی امید تھی، لیکن میں اپنے قلب کو اطمینان و مسرت سے لبریز پاتا ہوں کہ یہ کتاب ان کی نظر سے گزر گئی ورنہ بہت سی حسرتوں کے ساتھ یہ حسرت بھی

رہ جاتی کہ یہ کتاب جب شائع ہوئی تو وہ اس دنیا میں نہ تھے، وہ فلاں شخصیت کا ترجمہ پڑھتے تو خوش ہوتے، اور اس کی تصویر ان کی آنکھوں کے سامنے آجاتی، فلاں بزرگ کا حال پڑھتے تو اس کی داد دیتے، اور شاعر کی زبان میں کہنا پڑتا ہے

یک حرف کاش کیست کہ صد جا نوشتہ ایم

بالآخر اس جلد کا یہ ورق بھی الٹ گیا، اور اس کی شخصیتوں میں سے یہ آخری شخصیت جو کتاب کی اشاعت کے بعد زندہ تھی، ان باکمالوں کی صف میں شامل ہوگئی، جو اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، اور اب ان اہل کمال کی طویل فہرست میں ایک نام بھی ایسا نہیں ہے، جس سے اس دنیا میں ملاقات ہو سکے، یا اس کے فضل و کمال سے استفادہ کیا جا سکے، ستمبر ۱۹۷۰ء کی آخری تاریخ تھی کہ کراچی سے پہلے ان کے بھتیجے عزیزی سید حسین سلمہ پھر ان کے چھوٹے بھائی محترمی سید ابوبکر صاحب حسنی کا خط ملا کہ مولانا سید طلحہ صاحب نے ۲۳ رجب ۱۳۹۰ھ (۲۵ ستمبر ۱۹۷۰ء) جمعہ کے دس بجے دن کو کراچی کے ایک اسپتال میں جان جانِ آفریں کے سپرد کی، کم از کم نزہۃ الخواطر کی بزم اہلِ کمال کو سامنے رکھتے ہوئے غالب کا یہ شعر حسب حال ہے۔

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

خطوط کی اطلاع کے مطابق اسی روز جمعہ کو بعد عصر شہر کے مرکز زندگی سے میلوں دور مجاہد آباد کالونی کے ایک دور افتادہ قبرستان میں جہاں اس سے پہلے غالباً ان کے نامور خاندان کا کوئی فرد دفن نہیں ہوا تھا، وہ سپرد خاک کئے گئے، دفن کرنے والوں میں بہت کم لوگوں کو اس کا حقیقی علم اور ادراک ہو گا کہ وہ کس جامع کمالات ہستی، قدیم و جدید، مشرقی و مغربی علوم اور عقلیات کے کس مجمع البحرین اور علم و معلومات کے کس خزانہ کو جو عمر بھر "کنز مخفی" رہا ہمیشہ کے لئے

زمین میں دفن کر رہے ہیں، اور کراچی کے اس شہر کو خطاب کرکے جو ہمیشہ سے صرف ایک بڑا تجارتی مرکز رہا ہے، اور اب بھی علم و کمال کا حقیقی طور پر جوہر شناس نہیں، غالب کا یہ شعر سنانا صحیح ہوگا ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم!
تو نے وہ گنجہائے گرانمایہ کیا کئے؟

آج جب کہ ان کے انتقال کو پندرہ، سولہ روز ہوئے ہیں، اور مشرقی یوپی کی طوفانی بارشوں اور سئی ندی کے سیلاب کی لائی ہوئی پریشانیوں سے نجات پاکر اپنے اس مستقر (دائرہ شاہ علم اللہ) پر واپس آنا نصیب ہوا ہے، جو ان کے آباء کرام کا مسکن و مدفن ہے، اور جہاں انھوں نے اپنی زندگی کے غالباً سب سے زیادہ سکون و مسرت کے دن گزارے ہیں، تو داغ کہن تازہ ہو گئے وہ پرانی صحبتیں، ان کی پر لطف مجلسیں، ان کے علمی افادات و تحقیقات، ان کے تبصرے و تذکرے ایک ایک کرکے حافظہ کے اندر ابھرنے لگے، اور تصویر کی طرح آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے، آج قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھا ہوں کہ ان کے متعلق لکھوں اور جو نہیں جانتے ان کو بتانے کی کوشش کروں کہ ۲۵ ستمبر کو نہایت گمنامی و خاموشی کے ساتھ علم و کمال کی کون سی شمع گل ہوئی تھی، اور علماء سلف کی جن کا اصل سرمایۂ زندگی ٹھوس علمی استعداد، نگاہ کی گہرائی اور گیرائی اور علوم و کمالات کا تفنن و تنوع تھا، کون سی نشانی نگاہوں کے سامنے سے ہمیشہ کے لئے مستور ہوگئی۔

لیکن کہانی کہاں سے شروع کروں اور اصناف کمال میں سے پہلے کس کمال کا تذکرہ کروں، وہ میری نگاہ میں صرف و نحو کے امام تھے، عربی کے ایسے ادیب و عالم تھے کہ عہد جاہلی و اسلامی کے مسلم الثبوت شعراء کے کئی ہزار اشعار (ممکن ہے کہ ان کی تعداد دس ہزار سے کم نہ ہو) ان کو حفظ اور نوک زبان تھے، اسی طرح اساتذہ فارسی و اردو کا منتخب کلام ان کو بکثرت یاد تھا، عربی کے علوم بلاغت و معانی و بیان پر ان کی وسیع اور گہری نظر تھی، اور اعجاز القرآن پر اس برصغیر ہند و پاکستان

کے چند ہی علمار کا مطالعہ اتنا وسیع ہوگا، اور اس کا علم ایسا مستحضر ہوگا، جیسا ان کو تھا، اصول فقہ وکلام کی قدیم کتابوں پر جو ائمۂ فن کے قلم سے نکلی ہیں، ان کی مدرسانہ و استادانہ نگاہ تھی منطق و فلسفہ کی اعلیٰ ومعیاری کتابوں پر حاوی تھے، جہاں تک تاریخ اسلام کا تعلق ہے، اس برصغیر میں ان سے زیادہ اگر کسی کا علم وسیع ہو تو مجھے اس سے انکار نہیں، "فوق کل ذی علم علیم" لیکن میرے علم و واقفیت کی حد تک اسلامی تاریخ، اس کے سنین اور اس کے اہم واقعات کسی کو اتنے مستحضر و محفوظ نہیں تھے، جتنے ان کو تھے، کہا جا سکتا ہے کہ وہ تاریخ کی ایک بولتی ہوئی کتاب تھے، جس کو کسی سنہ یا واقعہ کے بیان کرنے میں اصل ماخذوں کی طرف مراجعت کرنے کی کم ضرورت پیش آتی، اس میں بہت کچھ ان کے غیر معمولی حافظہ کو دخل تھا، جس کی بدولت انھوں نے اپنی تعلیم سے فراغت کے بعد صرف چار مہینے میں قرآن حفظ کر لیا، اور جہاں تک مجھے معلوم ہے، وہ آخر تک بہت پختہ تھا، نیز ان کے فطری تاریخی ذوق کو جس کو ہم تاریخی حاسہ سے تعبیر کر سکتے ہیں، اور جو ہر ایک کو فطرت سے نہیں ملا کرتا، اس سے ان کے اندر ایسا ملکہ پیدا ہو گیا تھا، کہ کسی تاریخی غلطی کی گرفت کرنے کے لئے ان کا ذوق سلیم اور ان کا بالغ تاریخی شعور کافی تھا، جیسے بعض فطری شاعر اور ماہرین فن، فن عروض کی مدد کے بغیر موزوں شعر کہتے ہیں، اور شعر کی عدم موزونیت یا بحر سے الگ ہو جانے کا ادراک کر لیتے ہیں۔

ان کے تاریخی شخصیتوں کے سنین وفات اور اہم تاریخی واقعات یاد کرانے کے عجیب عجیب چٹکلے اور آسان نسخے تھے، جو ان کے خداداد حافظہ کا نتیجہ تھے، علم فرائض میں بھی مہارت تھی، اور ان کو مشق کرانے کا بڑا ذوق تھا، نجوم کی معرفت ان کے طلوع وغروب کے اوقات وبروج کو خوب پہچانتے اور اپنے ہم نشینوں اور شاگردوں کو اس علم اور ذوق میں شریک کرنے کا ایسا شوق تھا کہ جو میرے جیسے بدذوق اور کم نگاہ آدمی کے لئے بعض اوقات آزمائش بن جاتا ہیئت فلکیات اور

جغرافیہ کے ہر دور میں ان کو مناسبت اور ذوق رہا، اور اس کے خصوصی عالم اور ماہر کہیں مل جاتے تو وہ سب بھول کر اپنے علم و معلومات کی توسیع اور اس سے استفادہ کرنے میں مشغول ہو جاتے، علم مجلسی اور معلومات عامہ میں ان کی مشکل سے نظیر ملے گی، ہر طرح کے رطب و یابس و نوادر و حکایات ان کو یاد تھیں، طبقات رجال اور تراجم و احوال ان کے مطالعہ کا خاص موضوع تھا، اور مشکل سے کوئی اہم تذکرہ اور تراجم کی کوئی کتاب شاید ان کی نظر سے مخفی رہی ہوگی، قدیم شخصیتوں کے مرتبوں و مقام اور ان کے مراتب کے تعین و ترتیب سے بڑے باخبر تھے، ان کی مجلسوں میں سلف کی عظمت، متقدمین کے مراتب سے واقفیت اور ائمہ اہل سنت و محدثین کی محبت و عقیدت ضرور پیدا ہو جاتی تھی، اس بارہ میں ذاتی طور پر مجھ پر ان کا بڑا احسان ہے کہ انھوں نے صحابہ و سلف کی عظمت اور ائمہ محدثین اور سنت کے علمبرداروں کی محبت و عقیدت ایسی دل میں جاگزیں کر دی کہ کسی دور میں بھی کوئی مطالعہ و تحقیق اور کوئی صحبت اس پر اثر انداز نہیں ہوئی۔

مولانا سید طلحہ صاحب کے والد کا نام سید محمد تھا، جو ریاست ٹونک میں معتمد الملک ظفر جنگ کے لقب سے ممتاز اور ناظم پرگنات (کلکٹر) کے عہدہ پر فائز تھے، سید محمد صاحب حضرت سید احمد شہیدؒ کے بڑے بھانجے مولوی سید محمد علی صاحب مصنف "مخزن احمدی" کے حقیقی پوتے تھے، اس طرح ان کو سید احمد شہیدؒ سے قرابت قریبہ حاصل تھی، مولانا سید طلحہ صاحب کے چچا بخشی الملک محمد عثمان صاحب بھی مالیات کے ایک بڑے منصب پر سرفراز تھے، ان کے خاندان کو ریاست میں بڑی دنیوی و دینی وجاہت حاصل تھی، اور اس کو ریاست کی طرف سے بڑی جاگیر ملی ہوئی تھی، انھوں نے بڑی فارغ البالی بلکہ ایک طرح سے تنعم اور امارت کے ماحول میں آنکھیں کھولیں اور زندگی کا ابتدائی زمانہ گزارا، ان کی پیدائش ۱۳۰۸ھ (۱۸۹۰ء) میں وہیں محلہ قافلہ[1] ٹونک

---

[1] محلہ قافلہ ریاست ٹونک کا مشہور محلہ ہے جس کو سید احمد شہیدؒ کی شہادت کے بعد نواب وزیر الدولہ والی ٹونک نے حضرت سید احمد شہیدؒ کے خاندان اور قافلہ کے لئے بسایا تھا، اور اس میں ان حضرات کو آباد کیا۔

میں ہوئی، اور وہیں ابتدائی تعلیم پائی، وہ دس سال کے تھے کہ ۱۳۱۸ھ (سنہ ۱۹۰۰ء) میں ان کے
عزیز و بزرگ مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب مددگار ناظم ندوۃ العلماء اپنے اعزا و بزرگوں سے ملنے کیلئے
ٹونک آئے جب کچھ دن قیام کرنے کے بعد واپس جانے لگے تو بزرگوں نے دینی تعلیم کے لئے اس ہونہار
بچے کو ان کے ساتھ کر دیا، اور وہ لکھنؤ آکر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہو گئے، اور وہیں کئی سال
تک تعلیم حاصل کی، اس وقت مولانا سید محمد علی مونگیری ناظم ندوۃ العلماء، علامہ شبلی نعمانی معتمد اور
ان کے قابل فخر استاد مولانا محمد فاروق چریا کوٹی صدر مدرس مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہ طالب علم تھے
پھر ٹونک میں جو ان کا دوسرا آبائی وطن اور اپنے وقت میں ایک بڑا علمی و دینی مرکز تھا، مدرسہ ناصریہ میں
مولانا سیف الرحمن صاحب مہاجر کابل اور مولانا حیدر حسن خاں صاحب سابق شیخ الحدیث
دارالعلوم ندوۃ العلماء سے علوم کی تکمیل کی، پھر درس نظامی کے عام فضلاء کے دستور کے مطابق
ذریعۂ معاش کے لئے طب کا انتخاب کیا، اور دہلی جا کر خاندان شریفی کے مقتدر فرد حکیم غلام رضا خاں
صاحب سے باقاعدہ طب کی تعلیم حاصل کی، اور کچھ عرصہ بمبئی میں مطب بھی کیا[1]۔

اس زمانہ میں پنجاب یونیورسٹی کے مشرقی امتحانات کا سارے ہندوستان میں چرچا تھا،
اور ذی استعداد اور حوصلہ مند طلبہ ملک کے گوشہ گوشہ سے کھنچ کر مولوی فاضل و منشی فاضل کا
امتحان دینے لاہور جاتے تھے، شاید کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اس عہد کے بہت سے نامور فضلاء اپنی
جوانی میں اس منزل کو طے کر چکے ہیں، عربی زبان کے مشہور محقق علامہ عبدالعزیز میمن مولوی فاضل
ہیں، اور مناظر اہل سنت مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری ہمیشہ اپنے رسالہ "اہل حدیث" کے سرورق
پر اپنے نام کے ساتھ مولوی فاضل لکھتے رہے، مولانا سید طلحہ صاحب نے بھی مولوی فاضل و منشی فاضل کا

---

[1] طب سے مولانا کو آخر تک مناسبت رہی، مجھے خوب یاد ہے کہ جب والد صاحب مرحوم کئی روز کے لئے لکھنؤ سے
باہر جاتے تو مولانا ان کی جگہ مطب میں بیٹھتے، کچھ عرصہ لکھنؤ گنے والی گلی میں مستقل مطب بھی کیا۔

امتحان دیا اور جہاں تک مجھے یاد ہے، وہ مولوی فاضل کے امتحان میں ساری یونیورسٹی میں اول آئے، یہی ان کے اورینٹل کالج لاہور میں بحیثیت استاد کے تقرری کی تقریب بن گئی، وہ ۱۳۳۵ھ (۱۹۱۶ء) میں کالج کے استاد مقرر ہوئے اور پورے چالیس سال اس عہدہ پر قائم رہے، اس طرح انھوں نے اپنی زندگی کی طویل ترین اور خوشگوارترین مدت لاہور میں گزاری جو ہر طرح کے اہل کمال کا ملجا و ماوی اور ہر ذوق، ہر تحریک، ہر سرگرمی اور ہر مسلک وخیال کا مرکز تھا، وہ لاہور کی ہر علمی وادبی سوسائٹی اور حلقہ میں نہ صرف مانوس بلکہ مکرم ومحترم رہے، ان مختلف حلقوں اور ذوقوں سے تعلق ورابطہ اور کسی ایک ادارہ یا جماعت سے عدم وابستگی نے ان کے کمالات میں رنگارنگی، ان کے ذہن میں وسعت وجامعیت پیدا کردی، ان کو اس جماعتی عصبیت اور تنگ نظری سے محفوظ رکھا، جو پوری عمر کسی مخصوص ادارہ میں گزار دینے والوں میں عام طور پر پیدا ہو جاتی ہے، وہ علم کے بلبل شیدا کی طرح ہر...... شاخ گل پر بیٹھتے اور چہکتے، شہد کی مکھی کی طرح ہر پھول سے رس چوستے اور اس کو شہد خالص میں تبدیل کر دینے، علم کے ہر چشمہ شیریں سے اپنی پیاس بجھانے، ہر صاحب کمال اور کسی فن میں بھی امتیاز خاص رکھنے والے کے سامنے ان کو زانوئے تلمذ تہہ کرنے اور طالب علمانہ استفادہ کرنے میں تکلف نہ تھا، علم کے بازار میں ان کا نعرۂ "ھل من مزید" اور "ھل من جدید" تھا، اس عادت نے جو ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، ان کو علمی طور پر جتنا فائدہ پہونچایا ہو، ان کے فضل وکمال پر ہمیشہ پردہ ڈالا اور اچھے اچھے محرمان راز سے ان کے علمی مرتبہ ومقام کو مخفی رکھا۔

ظاہر پرست معاشرہ نے کبھی ان لوگوں کا قصور معاف نہیں کیا، جو اپنے کمال کا اظہار کرنے اور دوسروں پر اپنا علمی تفوق قائم کرنے کے بجائے نئے پھولوں اور موتیوں کے لئے اپنا دامن پھیلائیں اور اپنی طلب واشتیاق کا اظہار کریں، بعض اوقات بے علم وکم نگاہ ہم وطنوں نے

نہیں مورخوں اور سوانح نگاروں نے بھی بعض ایسے اہل کمال کو ایسی سزا دی ہے جو دوسروں کے لئے تازیانۂ عبرت ہو، میں نے بہت سے ایسے لوگ دیکھے ہیں، جو تھوڑی معلومات اور محدود مطالعہ سے بہت بڑا کام لیتے ہیں، اور اپنی عظمت کا نقش قائم کر دیتے ہیں، مولانا سید طلحہ صاحب اس گروہ میں تھے، جو اپنے علمی ذوق و استفادہ کی حرص کی وجہ سے اچھے اچھے پڑھے لکھوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیتے تھے، کہ وہ اس موضوع سے ناواقف اور اس کوچہ سے نابلد ہیں، اس کا نتیجہ تھا کہ ان کو علمی دنیا میں جو شہرت اور علمی حلقوں میں جو عزت و احترام حاصل ہونا چاہئے تھا، وہ آخر تک حاصل نہیں ہو سکا، اور بہت کم درجہ کے لوگ شہرت و ناموری کے عروج پر پہونچ گئے، اس پر مستزاد ان کی بے تکلفی اور سادہ زندگی تھی، لباس، طرز گفتگو، آداب مجلس وغیرہ کسی چیز میں ان کو تکلف و اہتمام گوارا نہیں تھا، نہایت آزاد اور وارستہ مزاج تھے، اپنی راحت کو دوسروں کی تنقید یا عقیدت مندی پر مقدم رکھتے اور اس کا بہت کم خیال کرتے کہ دوسرے ان کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔

لاہور میں ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع بھی تھا، اور نہایت متنوع بھی، اس میں جہاں بڑی مقدس دینی شخصیتیں تھیں، وہاں ادیب و شاعر، مصور و رند لاابالی بھی تھے، ان کے یہاں مفسر قرآن حضرت مولانا احمد علی صاحب امیر جماعت خدام الدین، مولانا عبدالواحد صاحب غزنوی امیر جماعت الاثر اہل حدیث اور علماء میں سے مولانا داؤد غزنوی، مولانا کریم بخش صاحب (صدر شعبہ عربی گورنمنٹ کالج) اور مولانا اصغر علی صاحب روحی (صدر شعبہ عربی اسلامیہ کالج) سے تعلقات تھے، اور وہ سب حضرات ان کا لحاظ و احترام فرماتے تھے، کچھ تو ان کے علم و فضل کی وجہ سے، اور کچھ حضرت سید احمد شہیدؒ کی نسبت سے، وہاں ان کے تعلقات انگریزی زبان، ریاضی، فلسفہ، تاریخ کے مسلم و غیر مسلم پروفیسروں اور اساتذۂ فن سے بھی تھے، ان کے احباب میں خواجہ سلیم (جو فلسفۂ جدید کے ایک اچھے فاضل

اور بعد میں گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے پروفیسر ہوئے) اردو زبان کے مشہور محقق پروفیسر محمود خاں شیرانی، علامہ تاجور نجیب آبادی، میر اولاد حسین شاداں بلگرامی، ریاضی کے مشہور استاد خواجہ دل محمد، دیوان غالب مصور کے مرتب اور مشہور آرٹسٹ عبد الرحمٰن چغتائی، ریاضیات کے مشہور پروفیسر عبد الحمید، اسلامیات پر مضامین لکھنے والے خواجہ عبد الوحید اور تعلیمی لائن کے ایک تجربہ کار استاد، پرنسپل مولانا ظفر اقبال، اردو کے مشہور ناشر و خادم اور دار الاشاعت پنجاب کے بانی میر سید ممتاز علی صاحب (والد سید امتیاز علی تاج مرحوم) سے ان کے یکساں تعلقات تھے، اور ان سب حضرات کے یہاں ان کی آمد و رفت، نشست و برخاست تھی۔

اس وقت لاہور میں مولانا احمد علی صاحب سے زیادہ کسی کا حلقۂ عقیدت و ارادت وسیع نہ تھا، مولانا کی زندگی کا خاص جوہر اشاعت قرآن اور حمایت سنت کے بعد تورع و تقویٰ تھا، وہ دعوت قبول کرنے اور ہر ایک کے یہاں کھانے پینے میں بہت محتاط تھے، نہایت صحیح الادراک اور قوی الکشف تھے، رمضان مبارک میں یہ احتیاط اور بڑھ جاتی اور عشرۂ اخیرہ میں تو کسی کی دعوت قبول کرنے کا سوال ہی نہیں تھا، اس کلیہ میں اگر کسی کا استثنا تھا، تو صرف مولانا سید طلحہ صاحب کا، اکثر عشرۂ اخیرہ میں ان کے مکان پر تشریف لائے، اور کھانا تناول فرمایا، نماز میں بھی خلاف معمول ان کو بڑھا دیتے اور ان کی اقتدا فرماتے، ہمیشہ شاہ صاحب اور سید صاحب کے لفظ سے خطاب فرماتے، دیال سنگھ کالج کے بعض غیر مسلم پروفیسروں سے بھی ان کے دوستانہ تعلقات تھے، اور ان سے خصوصی مضامین پر استفادہ کا سلسلہ جاری تھا، ایک صاحب سے جن کا نام مجھے یاد نہیں، وہ فلکیات کے جدید تحقیقات و نظریات میں استفادہ کرتے رہتے تھے، ہمارے فاضل دوست و کرم فرما ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی صاحب (جو بعد میں پنجاب یونیورسٹی میں فن تعمیر و آثار قدیمہ کے پروفیسر ہوئے) ان کے بے تکلف دوست اور غالباً شاگرد بھی تھے، انھیں کی معیت میں جون ۱۹۲۹ء میں جب

پہلی مرتبہ لاہور جانا ہوا، انھوں نے مجھے ڈاکٹر سر محمد اقبال کی خدمت میں بھیجا، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی صاحب علامہ اقبالؔ کے خاص معتمد اور بعض موقعوں پر سکریٹری بھی رہ چکے تھے۔

اس یادگار تاریخی سفر میں جو میری زندگی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، انھوں نے مجھے ہر طبقہ کے اہل کمال سے ملایا، اس وقت میری عمر پندرہ یا سولہ سال کی تھی، انھوں نے مجھے جہاں علامہ اقبال سے ملایا اور لاہور کے مشہور علمی شخصیتوں سے میرا تعارف کرایا وہاں رستم زماں گاما پہلوان سے بھی ملایا، اسی سفر میں پہلی مرتبہ حفیظؔ جالندھری کے ساتھ مجلس اور کھانے میں شرکت کی، اور انھوں نے میری فرمائش پر بعض نظمیں سنائیں، اس وقت لاہور کے ادبی حلقوں میں "گل رعنا" کا جو چند سال پہلے شائع ہوئی تھی، بہت چرچا تھا، اکثر جگہ میرا تعارف مصنف "گل رعنا" کے فرزند کی حیثیت سے کیا جاتا تھا، اور کہیں ان الفاظ میں کہ یہ بچہ بے تکلف عربی لکھتا بولتا ہے، علامہ اقبال کے یہاں مجھے یہ کہہ کر پیش کیا گیا کہ یہ مصنف "گل رعنا" کے فرزند ہیں، اور انھوں نے آپ کی بعض نظموں کا عربی نثر میں ترجمہ کیا ہے[۵۷]، وہ نو وارد عزیزوں کو مشاہیر سے ملانے اور تاریخی اور قابل دید مقامات کی سیر کرانے میں بڑے فیاض و فراخ دل اور مستعد تھے، اس کے لئے اکثر خود وقت نکالتے اور اپنی وسیع معلومات سے اس سیر و سیاحت میں چار چاند لگا دیتے، میں نے اس سفر میں ان کی بدولت جو کچھ سیکھا اور دیکھا اس سے اپنی پوری زندگی میں فائدہ اٹھایا، ان کا احسان کبھی نہیں بھول سکتا کہ وہی مولانا احمد علی صاحب سے تعارف و تعلق کا ذریعہ بنے اور ان کی شفقتوں اور خصوصی توجہات کی سعادت حاصل ہوئی، جس کا میری زندگی پر بہت گہرا اور دیرپا نقش ہے، اور اس بنیاد پر اگلے سال ان کے درس میں شرکت کے لئے خصوصی طور پر سفر اختیار کیا، اور یہ تعلق یوماً فیوماً بڑھتا گیا۔

۲۲ نومبر ۱۹۳۷ء میں انھیں کی معیت میں علامہ اقبال کی خدمت میں آخری بار حاضری

---

[۵۷] اس وقت میں نے اقبال کی نظم چاند کا ترجمہ کیا تھا، اور علامہ مرحوم نے اس کو ملاحظہ فرمایا تھا۔

ہوئی اور مسلسل ان سے کئی گھنٹے گفتگو اور استفادہ کا موقع ملا، اس یادگار صحبت کا تذکرہ میں نے تفصیل کے ساتھ اپنے ایک اردو مضمون "عارف ہندی کی خدمت میں چند گھنٹے" میں کیا ہے، جو پنجاب کے ایک غیر مشہور رسالہ میں اسی وقت شائع ہو گیا تھا، اور بعد میں میری عربی کتاب "روائع اقبال" اور اس کے اردو ترجمہ "نقوش اقبال" کے دیباچہ میں اس کی مختصر روداد آئی ہے، اس تاریخی ملاقات میں ان کے حقیقی بھانجے برادر عزیز مولوی سید محمد ابراہیم حسنی بھی تھے، اس کے چند ہی مہینے بعد ان کی وفات کا واقعہ پیش آیا اور اب وہ زریں موقع بہت غنیمت معلوم ہوتا ہے جب ڈاکٹر صاحب کے خادم خاص علی بخش ان کی نقاہت اور تکان کی وجہ سے ان سے بار بار آرام کرنے کا تقاضا کرتے تھے، اور وہ ٹال دیتے تھے، اور مسلسل گفتگو میں مصروف تھے۔

انھوں نے اگرچہ اپنی عمر کا وہ حصہ جو تاثر قبول کرنے کا زمانہ ہوتا ہے لاہور جیسے شہر میں گزارا جو دینی اور ذہنی انتشار کا مرکز تھا، اور بڑے آزاد خیال لوگوں کے ساتھ ان کی صحبتیں رہیں، لیکن ان کے عقیدہ اور عمل میں کوئی فرق نہ آیا وہ سختی سے اہل سنت کے عقائد اور اپنے خاندانی مسلک پر قائم تھے، نماز باجماعت کا ہمیشہ اہتمام رہا، دو چیزوں کا ان کو کبھی تحمل نہیں ہوا، ایک کسی کو تعدیل ارکان کا خیال کئے بغیر جلد جلد نماز پڑھتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے، اس کے سلام پھیرنے کا انتظار کرتے رہتے، اور وہ خواہ کتنا ہی بڑا آدمی ہو اس کو ضرور نصیحت کرتے، دوسرے ٹخنے سے نیچے پائجامہ نہیں دیکھ سکتے تھے بعض کبار علماء و مشائخ تک کو اس پر ٹوک دیا، کبھی کبھی اس کے لئے وہ تنبیہ کے بڑے لطیف پیرائے اختیار کرتے مثلاً کسی معزز آدمی، رئیس یا فیشن ایبل نوجوان کو دیکھتے کہ اس کا پائجامہ ٹخنہ سے بہت نیچے ہے، اور زمین پر لوٹتا ہے تو اس سے کہتے کہ آپ کا پائجامہ ٹخنے کے نیچے ہے، اور زمین پر لوٹتا ہے،

اس میں مجھ جیسے غریب آدمی کی ایک ٹوپی بن سکتی ہے، جس محفل یا دعوت میں ساز یا باجہ ہوتا اس میں شرکت نہ کرتے یا اٹھ کر چلے آتے، ایک مرتبہ مجھ سے یہ قصہ بیان کیا کہ کسی ولیمہ یا دعوت میں شریک تھا، وہاں باجہ شروع ہوا، میں نے اعتراض کیا تو بند کر دیا گیا پھر کسی "صاحبِ ذوق" کی فرمائش پر دوبارہ شروع ہوا، میں نے پھر احتجاج کیا تو فرمائش کرنے والے صاحب جو انگریزی تعلیم یافتہ آدمی تھے، خود اٹھ کر میرے پاس آئے اور مجھ سے کہا کہ مولانا! اس میں کیا شرعی قباحت ہے؟ میں نے خیال کیا کہ یہ مجھ سے بحث کریں گے، اور شاید دوسروں کی تلقین کی ہوئی، بعض علمی دلیلیں دیں گے، میں نے ان کو خاموش کرنے کے لئے کہا کہ مجھے ناپسند ہے، یعنی اگر میری شرکت مطلوب ہے تو اسے بند کر دینا چاہیئے، اس پر وہ لاجواب ہو گئے، جدید خلاف دین رجحانات اور مسلکوں میں ان کو اہل قرآن اور منکرین حدیث سے نیز سرسید مرحوم کے طرز پر منصوصات و قطعیات کی پر از تکلف تاویلات اور عقل پرستی سے بڑا بُعد اور وحشت تھی، اور اسماء و صفات کے بارے میں وہ سلف کے مسلک پر قائم تھے، قرآن شریف بہت پختہ و رواں تھا، اور اس کے پڑھنے کا بہت ذوق رکھتے تھے، جب تک قوت رہی تراویح میں قرآن شریف ختم کرنے کا اہتمام کرتے تھے، جب جوش میں آکر روانی سے پڑھتے تو سننے والے کو بڑا لطف آتا اور ایک کشش محسوس ہوتی۔

۱۳۴۴ھ (۱۹۲۶ء) میں اللہ تعالیٰ نے ان کو حج کی سعادت بھی نصیب فرمائی یہ سنہ کئی حیثیتوں سے ایک یادگار سنہ تھا، اسی سال موسم حج میں سلطان ابن سعود کی دعوت پر مکہ معظمہ میں موتمر اسلامی کے اجلاس ہوئے جس میں شرکت کے لئے عالم اسلام کے بڑے بڑے علماء، زعماء اور مشاہیر آئے، ہندوستان سے بھی خلافت کمیٹی اور جمعیت علماء کے نمائندوں کی حیثیت سے مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا سید سلیمان ندوی،

مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ حضرات نے شرکت کی، مولانا سید طلحہ صاحب کے کئی بھائی، عزیز اور دوست اس سفر میں ان کے شریک و رفیق تھے، ان کے بڑے بھائی سید زبیر صاحب تو یہیں سے ساتھ گئے تھے، سید عمر صاحب جرمنی سے مکہ معظمہ پہونچے اور شریک ہوئے، ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب، شیخ خلیل عرب اور مولانا محمد سورتی بھی ہندوستان سے آئے تھے، اور اسی سال حج وزیارت کی سعادت حاصل کی۔

لاہور کی فضا اورینٹل کالج کی وجہ سے ان کا انگریزی امتحانات سے بچنا بہت مشکل تھا، اعلیٰ مشرقی امتحانات دینے والوں کو یونیورسٹی نے یہ رعایت دے رکھی تھی کہ وہ صرف انگریزی میں امتحانات دے کر ایم، اے کر سکتے ہیں، چنانچہ مولانا سید طلحہ صاحب نے بھی یہ "ہفت خواں" سر کیا، ان کا وقت اور صلاحیت اس میں بہت صرف ہوئی وہ بعد میں ہمیشہ اس پر بہت پچھتاتے اور افسوس کرتے تھے، اکثر ازراہ شفقت مجھے مبارکباد دیتے اور اظہار رشک کرتے کہ تم نے عربی زبان اور دینی علوم ہی کو مضبوطی سے پکڑا اور "یک در گیر محکم گیر" پر عمل کیا، درحقیقت اس توفیق میں بھی ان کا حصہ تھا، میں جب پہلی بار ۱۹۲۹ء میں لاہور حاضر ہوا تو انھوں نے مجھے اپنے کالج کے وائس پرنسپل اور مشہور فاضل و محقق مشرقیات و اسلامیات مولوی محمد شفیع صاحب ایم، اے کنٹیب (جو تقسیم کے بعد انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اردو کے نگراں و مہتمم مقرر ہوئے) سے ملایا اور میرے بعض عربی مضامین کو دکھا کر ان سے میرے مستقبل کے متعلق مشورہ لیا کہ مجھے کون سی لائن اختیار کرنی چاہیئے، اس زمانہ میں بہت سے لوگ جو میری باتیں سن کر میری صلاحیت کے متعلق غلط اور خلاف واقعہ تاثر لیتے تھے، مجھے، آئی سی، ایس وغیرہ کی لائن اختیار کرنے کا مشورہ دیتے تھے، خدا مولوی صاحب مرحوم کو جنت نصیب کرے کہ انھوں نے بہت جزم و وثوق سے مشورہ دیا کہ

میں صرف عربی زبان اور اس کے متعلقات ہی میں کمال پیدا کروں اور اسلامیات پر کام کرنے کے لئے کسی ایک مغربی زبان میں بھی جس میں فرنچ کو ترجیح ہے کچھ استعداد پیدا کر لوں، برسوں کے بعد جب ان سے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے دفتر میں ملاقات ہوئی تو میں نے ان کے صائب مشورہ کا ذکر کیا اور اپنے تشکر و امتنان کا اظہار کیا۔

بہرحال مولانا سید طلحہ صاحب نے انگریزی کی طرف توجہ کی اور امتحانات کا سلسلہ شروع کیا، ان کا قاعدہ تھا کہ جس چیز کی طرف توجہ کرتے وہ ان پر پورے طور پر طاری ہو جاتی اور وہ اس میں ڈوب جاتے، ہر وقت اس کا مطالعہ، ہر وقت اس کا تذکرہ، اس کے ماہر اساتذہ سے استفادہ، مشورہ، چنانچہ جب لاہور رہتے وہ اپنے مضامین ایس، سی کالج اور گورنمنٹ کالج کے انگریز پروفیسروں کو دکھاتے، غالباً ۲۵ء تھا کہ انھوں نے بی، اے کی تیاری کے لئے طویل چھٹی لی اور کئی مہینے لکھنؤ میں قیام کیا، اس زمانہ میں انھوں نے پروفیسر سدھانت سے اصلاح لینی شروع کی جو انگریزی کے مسلم الثبوت ادیب، لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے صدر تھے، اور بعد میں دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو گئے ان سے تعارف غالباً ان کے دوست و میرے استاد شیخ خلیل عرب نے کرایا تھا، جو اس وقت لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے استاد تھے۔

مولانا سید طلحہ صاحب کا حافظہ غیر معمولی طور پر قوی تھا، اس کے لئے کسی زبان و علم کی قید نہ تھی، اس کا نتیجہ تھا کہ شکسپیر کے ڈراموں کے بند کے بند اور گولڈ اسمتھ وغیرہ کی عبارتیں ان کو یاد تھیں، انگریزی ادب و تاریخ کی کتاب "جولیس سیزر" انھوں نے بڑے انہماک و شغف سے پڑھی تھی، اس کے جملے بہت جھوم جھوم کر سناتے مگر انگریزی میں انھوں نے جو محنت کی تھی، اور جو ان کے علم و مشاغل سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی تھی، ان کے کچھ زیادہ

کام نہ آئی، اور معاشی مسئلہ اور عہدہ کی ترقی میں تو اس نے کچھ بھی مدد نہ کی، ان کا رزق آخر تک عربی علوم دینیہ ہی سے وابستہ رہا اور بقول ان کے وہ اسی علم کی روٹی کھاتے رہے، یہاں تک کہ ۱۳۶۱ھ (۱۹۴۲ء) میں وہ اپنی خواہش سے اورینٹل کالج سے سبکدوش ہو گئے، اور ان ڈگریوں سے جو کچھ فائدہ کی توقع تھی، وہ بھی جاتی رہی۔

ان کو مطالعہ میں بڑا انہماک تھا، اور ان کی اصلی غذا ذوق اور ہابی (HOBBY) کسی نئی مفید کتاب کا پڑھنا تھا، کوئی پر از معلومات و پر مغز کتاب مل جاتی تو ان کو دنیا و مافیہا کا ہوش نہ رہتا اس کا مطالعہ بھی کرتے اور اس کا پاس بیٹھنے والوں سے تذکرہ بھی، مطالعہ کرتے وقت ان کے لئے بشرطیکہ کتاب ان کی ہو، سرخ پنسل ضروری تھی، جو مقامات یا جملے پسند آتے ان پر سرخ پنسل پھیر کر بالکل رنگین کر دیتے، بعض اوقات کتاب دیوالی کا کھلونا معلوم ہوتی ان پر ایک دور میں ایک ایک مصنف اور ایک ایک کتاب چھائی رہی ہے، میں نے "الندوہ" (دور سوم) کی ادارت کے زمانہ میں مشاہیر اہل علم کو اپنی محسن کتابوں کا تذکرہ کرنے اور مصنفین و کتابوں سے تاثر کے اظہار کی دعوت دی، ہندوستان کے متعدد نامور اہل علم نے اس موضوع پر خامہ فرسائی کی، میری فرمائش اور اصرار پر انھوں نے بھی اس بحث میں حصہ لیا، ان کا مضمون بڑا پر از معلومات اور اساتذہ و طلبار کے لئے خاص طور پر مفید اور معلومات افزا ہے، ان مضامین کا مجموعہ میرے محترم دوست مولانا حافظ محمد عمران خاں ندوی نے "مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں" کے نام سے شائع کر دیا ہے، اس میں ان کے اصل خیالات اور علمی و تعلیمی زندگی کے تجربات دیکھے جا سکتے ہیں۔

مولانا کو صرف و نحو کی تعلیم میں ملکۂ راسخ حاصل تھا، ان کی تعلیم میں نظری مسائل و جزئیات سے زیادہ علمی مشق اور قواعد کے اجرار پر زور تھا، انھوں نے صرف و نحو کے علمی مسائل کا جن کی روزمرہ کی زندگی میں ضرورت پڑتی ہے، ایک مختصر سا نصاب اور فہرست تیار کر لی تھی، اور پہلے وہ انھیں کو

مشق کراتے تھے، میری صرف و نحو کی محدود علمی صلاحیت زیادہ تر انھیں کی رہین منت ہے، میرے علاوہ ان کے حقیقی بھانجہ برادر عزیز احمد الحسنی جن کو عربی و انگریزی پر یکساں قدرت ہے، اور جو عربی اہل زبان کی طرح بولتے ہیں، اور خواہر زادہ عزیز محمد ثانی سلمۂ کو صرف و نحو میں ان سے استفادہ کا خاص موقع ملا۔

وہ غلطی کو بہت مشکل سے معاف کرتے تھے، اور کئی کئی روز تک اور بعض اوقات ہفتوں تک اس پر ملامت اور تکلیف کے اظہار کا سلسلہ جاری رہتا تھا، اس کی وجہ سے دوبارہ غلطی کی ہمت نہ پڑتی اور بہت چوکنا رہنا پڑتا، میں نے ان سے ادب اور زبان کی بھی کتابیں پڑھیں، لیکن زیادہ تر استفادہ صرف و نحو میں تھا، وہ سیبویہ کی "الکتاب" کے بڑے عاشق و شیدائی تھے، اسی طرح زمخشری کی "مفصل" کو بھی بہت پسند کرتے تھے، اور اس سے طلباء کو روشناس کراتے رہتے تھے، ابن حاجب کی دو مشہور کتابوں میں سے "کافیہ" کو ناپسند کرتے تھے، مگر "شافیہ" کی بڑی تعریف کرتے تھے، اس کی شرح "رضی" کو بھی بہت سراہتے تھے، علامہ سیوطی کی کتابوں میں "المزہر" ان کے بہت مطالعہ میں رہتی تھی، اور ادب کے طلباء کو اس کے پڑھنے کی بہت ترغیب دیتے تھے۔

دینیات میں ان کو صحیح بخاری سے محبت و عقیدت نہیں عشق تھا، یہ بقول ان کے نتیجہ تھا، مولانا سیف الرحمن صاحب کی تعلیم کا جو بخاری کے شیدائیوں میں تھے، مولانا طلحہ صاحب اس کی کوئی حدیث یا سند کا ٹکڑا جھوم جھوم کر پڑھتے، اور اس کے مطالعہ سے سیری نہ ہوتی، ہدایہ کے بھی وہ بڑے قائل تھے، اور ان کا خیال تھا کہ اس کے پڑھنے سے فقہ حنفی سے مناسبت پیدا ہو جاتی ہے، اپنے ادبی ذوق اور فن بلاغت سے مناسبت کی وجہ سے کشاف کے بڑے دلدادہ تھے، اور وہ اکثر ان کے مطالعہ میں رہتی، ادبیات و شعریات میں شعر العجم کے بڑے گرویدہ اور فریفتہ تھے، مولانا شبلی کے طرز تحریر و سوانح نگاری کے بڑے قائل و معترف تھے، آزاد کی "آب حیات" بھی وہ بہت مزے لے کر پڑھتے تھے۔

مجھے ان کی کتابی تعلیم سے زیادہ ان کی علمی صحبتوں سے نفع پہونچا اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ

میرے ذہن کی تربیت و تشکیل اور میرے ذوق و معلومات میں جس کو ایک مفرد لفظ "ثقافت" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، ان کا بہت بڑا حصہ ہے، ان کا ایک بڑا تعلیمی فیض یہ تھا کہ اپنی تحریر کو بار بار شک و تنقید کی نگاہ سے دیکھنے، عربی الفاظ و صلات کے صحیح استعمال کا اطمینان کرنے اور معاجم (کتب لغت) کی طرف بار بار مراجعت کرنے کی عادت پڑ گئی، ہندوستانی علماء اور عربی میں لکھنے والوں کے لئے بڑی آزمائش یہ ہے کہ اردو میں سیکڑوں الفاظ عربی کے استعمال ہوتے ہیں، مگر ہندوستان میں آنے کے بعد ان کے معنی و مفہوم اور محل استعمال اکثر بدل گئے ہیں، عربی ساخت ہونے کی وجہ سے ہندوستانی ان کو اپنی تحریروں میں بے تکلف استعمال کرتے ہیں، مگر ٹھیٹھ عرب اور ادیب ان کے وہ معنی ہرگز نہیں سمجھتے جو ہندوستان میں سمجھے جاتے ہیں، مولانا طلحہ صاحب ان الفاظ کے بارے میں بڑی احتیاط کرتے تھے، اور ان کا شک اور تامل وہم کی حد تک پہونچ گیا تھا، لیکن عربی کے ایک مضمون نگار کی حیثیت سے جس کی تحریروں کے اصل مخاطب اہل عرب تھے، مجھے ان کے تشکک اور احتیاط سے بڑا فائدہ پہونچا۔

ان کا دوسرا ذوق مجلس آرائی، لطف صحبت اور علمی و تاریخی تذکرے تھے، ان کو ہر جگہ اور ہر دور میں ایسے لوگوں کی تلاش رہتی جو ان کے فراغت کے اوقات میں گھنٹوں ان کے پاس بیٹھیں اور گفتگو میں شریک ہوں، ان کو بہت دیر میں نیند آتی تھی، اس لئے دیر رات تک ان کی مجلس جمی رہتی وہ کسی کو اٹھنے نہ دیتے، بعض اوقات یہ بہت سے عزیزوں اور شاگردوں کے لئے جو پورے طور پر ایسی علمی مجلسوں سے لطف نہ اٹھا سکتے یا جلد سو جانے کے عادی اور نیند کے بیمار تھے، بڑی آزمائش کی بات ہوتی، اور مجھ سے کم ہمت تو اکثر اس سے منہ چراتے اور کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے رخصت ہو جاتے، اسی درمیان میں اگر کوئی نیا ستارہ طلوع ہو جاتا یا تاروں بھری رات ہوتی، اور ان کو کسی ضرورت سے [illegible] ہمنشینوں کو اس موقع سے فائدہ اٹھانے اور ان تاروں سے واقف ہونے پر اصرار کرتے،

ان مجلسوں میں وہ جن لوگوں سے زیادہ مانوس ہوتے ان کو شریک کرنے اور دیر تک اپنے پاس بیٹھنے پر اصرار کرتے، یہ خصوصیت عزیزوں میں مجھے اور خواہر زادہ عزیز مولوی محمد ثانی سلمہٗ نیز محترمی سید عقیل صاحب (جو ان کے پھوپھی زاد بھائی تھے) اور عزیزی سید عامر حسنی کو حاصل تھی، عزیزی محمد ثانی سلمہٗ پر وہ بہت شفیق تھے، اور ان کی سعادت و صلاحیت سے بہت متاثر، تاریخی سنین، فرائض اور نجوم وغیرہ میں ان کو ان سے بہت فائدہ پہونچا اور بہت سے چٹکلے انھوں نے ایسے یاد کرائے جو بڑی بڑی کتابوں میں نہیں ملتے اہل علم اور دوستوں میں مولانا شاہ حلیم عطا صاحب سلونی مرحوم سابق شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء مولانا حکیم حسن مثنیٰ صاحب امروہوی مرحوم سے ان کو بہت لطف و موانست تھی، اور وہ ان کے بہت کچھ ہم مذاق اور شریک کمال تھے، اساتذہ میں مولانا حیدر حسن خاں صاحب سے ان کی خاص صحبت و مجلس رہتی، اور جب کبھی (لکھنؤ کے قیام میں) وہ مولانا کے پاس ندوہ آجاتے تو آدھی آدھی رات تک دونوں کی باتیں رہتیں، گذشتہ تاریخ و واقعات کے دفتر کھل جاتے، اس مجلس کا خاص موضوع ٹونک سے اخراج کے واقعات اور اس کی اہم شخصیتیں اور کردار ہوتے[1]، اکثر صبح کو مولانا حیدر حسن خانصاحب کو شکایت کرتے سنا کہ میاں! طلحہ نے رات بھر سونے نہیں دیا، لیکن اگلی رات پھر یہی ہوتا اور مولانا شدت تعلق اور دلچسپ و مشترک موضوع کی وجہ سے رات بھر کی نیند ان کی نذر کر دیتے مگر اپنی روحانی قوت و

---

[1] ۱۹۲۱ء میں جب تحریک خلافت کا زور تھا بعض لوگوں کی ریشہ دوانیوں سے والی ریاست نواب ابراہیم علی خاں مرحوم کو سادات قافلہ سے جو حضرت سید احمد شہیدؒ کے اخلاف و اعزا تھے، یہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ وہ ان کو بیدخل کر کے ریاست پر قبضہ کر لیں گے، اس سے متاثر ہو کر انھوں نے ان کی جاگیریں ضبط کر لیں، اور چند گھنٹے کے اندر ریاست چھوڑنے کا حکم دیدیا، مولانا طلحہ صاحب کا سارا خاندان اس زد میں آگیا، ان کی جاگیریں ضبط ہو گئیں اور وہ لوگ اپنے قدیم وطن دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں آکر مقیم ہو گئے، نواب صاحب کے انتقال کے بعد ان حضرات کو وہاں جانا نصیب ہوا مگر جاگیریں واپس نہ ہوئیں۔

علمی ذوق کی وجہ سے مطالعہ، درس وتدریس اور طبیعت کی شگفتگی میں فرق نہ آنے دیتے۔

معاصر اہل علم دین میں وہ مولانا انور شاہ کشمیری کے وسعت مطالعہ اور وسعت معلومات کے قائل تھے، دیوبند و لاہور میں ان سے ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں، اور جب کبھی شاہ صاحب کا کشمیر جاتے ہوئے، لاہور اسٹیشن پر گزر ہوتا تو وہ پابندی سے ملاقات کے لئے جاتے اور پھر اس مجلس کا لطف و افادہ دیکھنے کے قابل ہوتا شاہ صاحب بھی ان سے بہت مانوس و بے تکلف تھے فہم و فراست اور زندگی کے وسیع تجربوں اور حقیقت پسندی کے سلسلہ میں وہ اپنے استاد مولانا سیف الرحمن صاحب مہاجر کے بڑے قائل و مداح تھے، اور اکثر ان کا تذکرہ کرتے، تقویٰ اور ورع و زہد میں اپنے خاندان کے دو بزرگوں مولانا سید محمد عرفان ٹونکی اور ان کے برادر اصغر مولانا سید مصطفےٰ صاحب ٹونکی کے بڑے معتقد اور ان کی تعریف میں رطب اللسان رہتے، یہ دونوں حضرات حضرت سید احمد شہیدؒ کے حقیقی نواسے تھے، اور عامل بالحدیث، ان دونوں خاندانی بزرگوں کے علاوہ خاندان غزنویہ کے بزرگوں بالخصوص مولانا سید عبد الجبار صاحب غزنوی کا بڑی عقیدت و عظمت کے ساتھ ذکر کرتے تھے، اور ان کے بڑے مؤثر واقعات سناتے تھے۔

اپنے عزیزوں اور بزرگوں میں طبقہ علمائیں وہ والد مرحوم مولانا حکیم سید عبد الحی صاحب کی شخصیت و علمی کمالات سے بھی بہت متاثر تھے، انھوں نے اپنی دس برس کی عمر سے لے کر ان کی وفات تک ان کی زندگی کا ایک گھر میں رہ کر مطالعہ کیا تھا، ان کا تذکرہ بھی ان کی مجلس کا ایک خاص موضوع تھا۔

وہ نظری طور پر تقلید کے پابند نہ تھے، تمام معاملات و عبادات میں فقہ حنفی پر عامل تھے، لیکن اس کے ساتھ بزرگان دیوبند کے اخلاص وللّٰہیت کے بڑے قائل و معترف تھے، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کا بڑے بلند الفاظ میں تذکرہ کرتے تھے، مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی سے جو لکھنؤ میں ہمیشہ ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب مرحوم کے یہاں قیام فرماتے تھے، اور اس تقریب سے

[illegible] سے ملتے اور مولانا اکثر ان سے

مزاح فرماتے، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی حکمت دینی ان کے مواعظ اور کتابوں کی نافعیت، اور مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے اخلاص کے بہت قائل تھے، نومبر ۱۹۴۳ء میں جب پھوپھی صاحبہ مرحومہ کے انتقال پر وہ نظام الدین آئے تو مولانا نے سید صاحب کے تعلق کی وجہ سے ان کا ایسا احترام کیا جو میں نے بہت کم لوگوں کا دیکھا ہے، سردیوں کا زمانہ تھا، انگیٹھی ذرا فاصلہ پر رکھی تھی، دستر خوان بچھایا گیا تو مولانا ایک ایک روٹی گرم کرکے لاتے اور خود پیش کرتے یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا، اور مولانا نے صاحبزادہ گرامی منزلت مولانا محمد یوسف صاحب کو بھی اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ یہ خدمت انجام دیں، اس سفر میں وہ چند روز کے لئے میوات بھی گئے، چند روز مولانا عبد القادر صاحب کی خدمت میں رائے پور بھی قیام کیا اور حضرت نے بڑا احترام فرمایا۔

مولانا سید طلحہ صاحب میں زندہ دلی اور شگفتگی کوٹ کوٹ کر بھری تھی، وہ اپنے لطیفوں اور بذلہ سنجیوں سے روتوں کو ہنساتے اور راستہ چلتوں کو ٹھہرا لیتے، ہر بات میں کوئی پہلو ہوتا تھا، نئے نئے نام رکھتے تھے، اور مزے مزے کی چٹکیاں لیتے تھے، اس شگفتگی اور زندہ دلی میں سب سے پہلے اس وقت فرق آیا، جب ان کے قابل فخر اور محبوب ترین بھائی سید محمد عمر صاحب حسنی انجینیر نے ۱۳۶۰ھ (۱۹۴۱ء) ریاست جوناگڑھ میں انتقال کیا، سید محمد عمر صاحب مکارم اخلاق، انسانی شرافت و محامد کا ایک عجیب نمونہ تھے، یہ موقعہ تفصیل سے اس تذکرہ کا نہیں ہے، مولانا سید طلحہ صاحب ان کی شخصیت سے بے حد متاثر اور ان کی محبت سے سرشار تھے، وہ ان کو اپنے خاندان کا ایک نگینہ اور ہیرا سمجھتے تھے، اور واقعہ بھی یہی تھا، ان کی بے نفسی، صلہ رحمی، فیاضی و ایثار اور ان کا توازن و اعتدال ان کے لئے روشنی کا ایک مینار تھا، ان کے انتقال کے بعد ان کی طبیعت میں ایسا اضمحلال پیدا ہوا کہ ملازمت میں جی نہ لگا اور ۱۳۶۲ھ (۱۹۴۳ء) میں خود اپنی خواہش سے اورینٹل کالج کی خدمات سے سبکدوشی حاصل کرلی۔

دوسرا حادثہ میری پھوپھی صاحبہ کے انتقال کا تھا، اس نے کہنا چاہیئے ان کی کمر توڑ دی،

ان کی زندگی میں ایک عظیم تغیر رونما ہوگیا، اگرچہ انھوں نے اس کے بعد دو عقد کیے، بالکل آخر میں اللہ تعالےٰ نے ان کو ایک لڑکا (داؤد سلمہ) عنایت فرمایا لیکن وہ شگفتہ دلی اور اطمینان پھر نصیب نہ ہوا، ملازمت سے سبکدوشی کے بعد دوبارہ زیادہ وقت لکھنؤ میں صرف کرنے لگے، میرے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب مرحوم سے ان کو بڑا انس تھا، اور ان کا ان کے پاس بہت جی لگتا تھا، غالباً ۴۴-۱۹۴۵ء میں انھوں نے لکھنؤ میں طویل قیام کیا، اور ادارہ تعلیمات اسلام جو انگریزی داں لوگوں کو قرآن شریف سے متعارف کرنے میں اور آسان عربی سکھانے کے لئے قائم ہوا تھا، اور جس کے ناظم و روح رواں میرے دوست مولانا عبد السلام صاحب قدوائی ندوی (حال ناظم دینیات جامعہ ملیہ دہلی) تھے، وہ کچھ وقت دیتے تھے، اس کے علاوہ ان کا سارا وقت مطالعہ اور لطف صحبت میں گذرتا وہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان منتقل ہو گئے، اور کراچی میں انھوں نے مستقل قیام کر لیا، پاکستان سے وہ صرف دو مرتبہ ہندوستان آئے، ایک ۱۹۵۰ء میں لیکن اس وقت میرا قیام مصر و حجاز میں تھا، اس لئے اس کے متعلق کچھ لکھ نہیں سکتا، دوسری مرتبہ ۱۹۵۵ء کے آخر میں آئے غالباً چھ مہینہ کے قریب رہے، قیام کا اکثر و بیشتر حصہ لکھنؤ و بھوپال میں گذارا، لکھنؤ میں عرصہ تک دار العلوم ندوۃ العلماء میں مقیم رہے، جہاں وہ کتب خانہ سے اپنی زیر تصنیف کتاب "عہد صحابہ کا تمدن" کے لئے مواد جمع کرتے اور مطالعہ و تحریر کے کام میں مشغول رہتے تھے، دار العلوم کے زمانۂ قیام میں نوجوان اساتذہ نے ان کی علمی مجالس اور مذاکرات سے بہت فائدہ اٹھایا، بھوپال میں بعض ان کے پرانے احباب تھے، جن میں سے ان کے فاضل دوست مفتی رضوان الدین صاحب اور ان کے عزیز شاگرد ملا حسن علی اور نور محل کے متعدد اعزا و افراد خاندان خاص طور پر قابل ذکر ہیں، بھوپال کے زمانۂ قیام میں وہ حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتے تھے، حضرت بھی ان سے بہت مانوس اور ان کی وسعت معلومات اور تاریخ و رجال سے واقفیت کے بڑے معترف تھے، میرے سامنے کئی مرتبہ ان کی

تشریف آوری اور بعض علمی افادات کا ذکر فرمایا۔

کراچی میں کچھ عرصہ بعد ان کا تعلق دار التصنیف لمیٹڈ سے ہوگیا، یہ ادارہ مولانا طفیل احمد صاحب دیوبندی کی سرپرستی میں کام کر رہا ہے، ان کا کام یہ تھا کہ اس ادارہ کے تحت ہونے والے ترجمۂ قرآن انگریزی پر نظر ثانی کریں اور اپنی وسیع و گہری دینی و لسانی واقفیت کی روشنی میں مشورہ دیں، مولانا طفیل احمد صاحب نے ان کی بڑی قدر و اعانت فرمائی، اب ان کی عمر و صحت کسی ملازمت اور باقاعدہ تعلق کے قابل نہیں تھی، اگر اللہ تعالےٰ کراچی کے دیندار اور اہل ثروت کو عقل و توفیق سے بہرہ یاب فرماتا تو ایسے صاحبِ کمال و جامع صفات عالم کو عزت و سکون کے ساتھ اپنے گھر میں بیٹھ کر اور آزادی کے ساتھ مطالعہ و افادہ میں مصروف رہ کر باطمینان زندگی گذارنے کا موقع فراہم کرتے، لیکن ایسا نہیں ہوا، بلکہ یہ زمانہ ان کے بڑے تفکر میں گذرا جس کا قلق آج سب عزیزوں اور شاگردوں اور احسان مندوں کو عمر بھر رہے گا، جنھوں نے لاہور میں ان کے مکان پر مہینوں اور برسوں رہ کر تعلیم حاصل کی جن کی فہرست خاصی طویل ہے، وہ بعد مکانی یا قانونی دقتوں کی وجہ سے خدمت سے قاصر رہے۔

ادھر پے در پے ایسے حوادث پیش آئے کہ انھوں نے ان کی زندگی کو اور بے لطف بلکہ مجموعۂ آلام بنا دیا، ان کو اپنے منجھلے بھائی سید محمد عمر صاحب کے بعد سب سے زیادہ محبت اپنی اکیلی بہن (والدہ برادر عزیز سید احمد الحسنی سلمہٗ) سے تھی، ۱۹۶۰ء میں انھوں نے دفعتاً داغ مفارقت دیا، چند ہی روز کے فصل سے آگے پیچھے ان کے سب سے بڑے بھائی ابو حمزہ سید زبیر حسنی صاحب نے انتقال کیا، اور کچھ ہی عرصہ کے بعد ان کے سب سے چھوٹے بھائی سید محمد علی صاحب حسنی نے جو تقسیم کے بعد بھی ہندوستان میں رہے، اور ۶۲ء میں کراچی منتقل ہوئے اور وہاں پہونچنے کے صرف نو مہینہ کے بعد اچانک اِس دنیا سے کوچ کیا، دو بھائیوں اور ایک بہن کے پے در پے انتقال نے ان کی ساری شگفتگی زندہ دلی

ختم کردی، میری آخری ملاقات جب اپریل ۱۹۶۵ء کو کراچی کے ہوائی اڈے پر ہوئی تو وہ میرے پاس جب تک رہے روتے رہے، اور زار و نزار جسم جو کبھی پرگوشت اور باوجاہت تھا، مرتعش جسم اور کانپتی ہوئی آواز دیکھ کر عبرت ہوتی تھی کہ یہ وہی انسان ہے، جو اپنے جلو میں کتنی بہاریں، کتنی دل نوازیاں، کتنی رونقیں اور کتنا لطف و انبساط رکھتا تھا، آج ایک مرقع عبرت اور تصویر حیرت بنا ہوا ہے۔

مولوی محمد حسین آزاد نے آب حیات میں میر سید انشار کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ مولانا طلحہ صاحب کے بھی حسب حال ہے، وہ لکھتے ہیں۔

"بعض فلاسفہ یونان کا قول ہے کہ مدت حیات انسان کے سانسوں کے شمار پر ہے، میں کہتا ہوں کہ ہر شخص جس قدر سانس یا جتنا رزق اپنا حصہ لایا ہے اسی طرح ہر شے کو جس میں خوشی کی مقدار اور ہنسی کا اندازہ بھی داخل ہے لکھوا کر لایا ہے، سید موصوف نے اس ہنسی کی مقدار کو جو عمر بھر کے لئے تھی، تھوڑے وقت میں صرف کر دیا، باقی وقت یا خالی رہا یا غم کا حصہ ہو گیا۔" آب حیات ص ۲۹۳

مجھ سے بار بار فرماتے تھے کہ کئی دن کے لئے آؤ اور ساتھ رہو، خطوط میں اس کی خواہش اور فرمائش کرتے رہے، اور مشکل سے کوئی خط ان کا اس سے خالی جاتا تھا، کیا معلوم تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے۔

ان کا اصل ذوق کتابوں کا مطالعہ و معلومات میں اضافہ تھا تصنیف و تالیف سے ان کو کچھ زیادہ مناسبت نہ تھی، شاید ان کا وفور علم اور ذوق مطالعہ اپنے معلومات کو منضبط و منظم طریقہ پر پیش کرنے سے مانع ہوتا ہو، پھر ان کو پابندیوں اور ضوابط سے فطری مناسبت نہ تھی، اس کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے تصنیف و تالیف کی طرف توجہ نہیں کی، اپنی جوانی کے زمانہ میں جب ان کا کچھ عرصہ بھوپال میں قیام رہا تو نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ والیٔ ریاست کی فرمائش یا اشارہ سے

ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی سیرت لکھی جس کا ان کو معاوضہ ملا لیکن چھپنے کی نوبت نہیں آئی، لاہور کے زمانہ قیام میں ۱۹۲۹ء میں پنجاب ایڈوائزری بورڈ فار بکس نے "ولیم ٹانس وڑٹے باٹ" کے لغت کو اردو میں منتقل کرنے کا کام ان کے سپرد کیا لیکن کام کے وسیع ہونے کی وجہ سے اس میں انھوں نے اپنے بہت سے تلامذہ واحباب کو شریک کر لیا، یہ لغت ۱۹۳۸ء میں چھپا، لیکن کتاب میں ان کا کہیں نام نہیں ہے، شروع میں بتیس ۳۲ صفحہ کا ان کا ایک فاضلانہ وناقدانہ مقدمہ ہے، جس میں بہت سے لغوی ونحوی فوائد بھی آگئے ہیں۔

لیکن ان کی اصل علمی یادگار ان کی فاضلانہ عربی کتاب کا وہ نامکمل مسودہ ہے، جو انھوں نے عہد صحابہ کے تمدن ومعاشرت اور علمی زندگی پر سالہا سال سے لکھنی شروع کی تھی، اور اس کے سلسلے میں انھوں نے ۱۳۷۷ھ (۱۹۵۷ء) میں اپنے قدرداں دوست ڈاکٹر عبدالوہاب عزام سابق سفیر مصر متعینہ پاکستان کی مدد سے حجاز، مصر، شام وترکی کا سفر کیا تھا، تاکہ وہاں کے نادر روزگار کتب خانوں سے استفادہ کریں، اور کتاب کے لئے نیا مواد مہیا کریں، ان کی آرزو یہ تھی کہ یہ کتاب ان کی زندگی میں شائع ہو جائے، لیکن نہ وہ اس کو مکمل کر سکے اور نہ اس کا سامان ہو سکا، اس خصوصی شفقت وتعلق کی بنا پر جو وہ مجھ ناچیز کے ساتھ رکھتے تھے، وہ سارا مسودہ بیاضیں اور یادداشتیں انھوں نے مولانا ظفر احمد صاحب انصاری رکن رابطہ عالم اسلامی کے ذریعے میرے پاس مکہ معظمہ بھیج دیں، اگر یہ کتاب مکمل اور شائع ہو جاتی تو اندازہ ہے کہ اس موضوع پر منفرد اور ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی، اللہ اس کی تکمیل وطباعت کا سامان مہیا فرمائے تاکہ ان کی علمی یادگار باقی رہے، صحابہ کرام کی خصوصیات اور کارنامے اپنے ایک نئے پہلو سے اجاگر ہوں اور جو لوگ واقف نہیں، ان کو تقریباً ایک گمنام فاضل ومحقق کے علمی مرتبہ فضل وکمال سے آگاہی ہو۔

پھوپھا میاں! (اور ناظرین معاف فرمائیں کہ جب سے ہوش سنبھالا آخری ملاقات تک

انھیں لفظوں میں ان کو خطاب کرتا رہا) آپ اس دنیا میں نہیں ہیں، بے شک آپ پر ایسے حجابات پڑے رہے کہ آپ کے گرد و پیش بسنے والے انسانوں نے آپ کو نہیں پہچانا اور آپ کی قدر و منزلت کو نہیں جانا، لیکن ہم آپ کی یاد ہمیشہ دل سے اور آپ سے حاصل کئے ہوئے معلومات وافادات کو ہمیشہ سینہ سے لگائے رکھیں گے، آپ کراچی سے پاکستان بلکہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے مگر ہمارے دلوں کی بستی اور ہمارے یادوں کی دنیا سے رخصت نہیں ہوئے۔

اے ہم نفساں صحبت ما
رفتید، مگر نہ از دل ما [له]
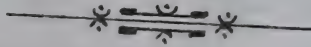
---

له یہ مضمون رسالہ "البلاغ" کراچی میں شائع ہوا

# چند ہستیاں

## بلند مقام لیکن گم نام

# مولانا شاہ حلیم عطا سلونی رح

استاذی مولانا خلیل عرب صاحب کے اس مدرسہ میں جو اُن کے مکان واقع بازار جھاؤلال لکھنؤ میں قائم تھا، ایک روز ایک صاحب تشریف لائے، کہولت کی ابتدائی منزل میں، کشیدہ قامت، نحیف البدن، گورا رنگ، سفیدی جس میں سرخی کی کمی بتاتی تھی کہ خون کی قلت ہے یا ابھی بیماری سے اٹھے ہیں، آنکھیں فراخ اور روشن لیکن حلقے پڑے ہوئے جو کثرت مطالعہ اور شب بیداری کی غمازی کرتے تھے، لباس لکھنؤ کے شرفا یا اودھ کے رؤسا کا سا، جسم پر قدیم طرز کا انگرکھا، ایک برکا پائجامہ، لکھنؤ کی دوپلی ٹوپی، بہت ٹھہر ٹھہر کر گفتگو فرماتے گفتگو ساری نئی مطبوعات کے متعلق، مطبوعات زیادہ تر حدیث، ادب و بلاغت اور تاریخ و رجال کی، خدا معاف کرے، ہم نو عمر طلبا یہ سمجھے کہ لکھنؤ کے کوئی مجتہد ہیں، عرب صاحب کے سب سے تعلقات تھے، خیال ہوا کہ علم کے کوئی شائق اور ادب کے کوئی رسیا ہیں، جن کا اس شعر پر عمل ہے۔ ع

تمتع زہر گوشۂ یافتم
زہر خرمنے خوشۂ یافتم

عرب صاحب اپنے معمول و عادت کے خلاف ان سے بڑے احترام سے ملے احترام میں محبت کی جھلک، ہم مذاقی کی مناسبت اور مزاج و ظرافت کی چاشنی تھی، گفتگو کا انداز بتلاتا تھا کہ پرانی ملاقات اور خاندانی واقفیت ہے، تھوڑی دیر میں معلوم ہوگیا کہ وہ ہمارے ہی ضلع رائے بریلی کے نامی گرامی قصبہ سلون کے موجودہ سجادہ نشین، شاہ نعیم عطا صاحب کے چھوٹے بھائی، مولانا شاہ حلیم عطا صاحب ہیں، اور خلیل عرب صاحب سے ان کے دیرینہ تعلقات ہیں، تھوڑی دیر کے بعد وہ رخصت ہوئے، یہ ان کی پہلی زیارت تھی۔

دوسری بار ان کو اپنے پھوپھا مولانا سید طلحہ صاحب ٹونکی کے پاس دیکھا، دونوں ایک دوسرے سے بڑی گرم جوشی سے ملے، اور تھوڑی دیر میں یہ معلوم ہوا کہ علم و معلومات کے دو چشمے جو الگ الگ بہہ رہے تھے، ایک دوسرے سے مل گئے، مصنفین و کتابوں کا ایسا تذکرہ شروع ہوا کہ ہم نوعمر اور نوآموز طالب علم بس کہتے رہ گئے کہ۔ ع

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

گلچین بہار تو ز داماں گلہ دارد

اسی زمانہ میں امیر المومنین یحییٰ[1] یمنی کی کتاب "الطراز" جو بلاغت و اعجاز قرآن کے موضوع پر بڑی معرکۃ الآرا کتاب ہے، نئی نئی شائع ہوئی تھی، خاص طور پر موضوع سخن تھی، شاید دو ایک بار ان کو اپنے محلہ میں آتے اور عرب صاحب یا مولانا طلحہ صاحب سے ملتے ہوئے دیکھا، انھوں نے کچھ مدت لکھنؤ میں ابوعبداللہ مولانا محمد سورتی کی صحبت میں گزاری تھی، اس وقت ہمارے ٹونک کے ایک عزیز جن کا نام مولوی سید محمد اسمٰعیل تھا، اور سعدی میاں کہلاتے تھے، مولانا سورتی کی صحبت اور درس سے استفادہ کرتے تھے، شاہ صاحب، ملاقاتوں میں اکثر ان صحبتوں کا ذکر کرتے تھے۔

---

[1] ائمۂ یمن جو مسلکاً زیدی تھے، اپنے کو امیر المومنین کہلواتے اور لکھتے تھے۔

شاہ صاحب کو قریب سے دیکھنے اور ان کے کمالات و اوصاف سے بقدر استعداد و سن و سال واقف ہونے کا موقع حقیقتاً اس وقت ملا جب میں اپنے دو بزرگوں ابو حمزہ، سید زبیر حسنی صاحب اور ان کے بھائی مولانا سید طلحہ صاحب کی ہمرکابی میں پہلی بار سلون گیا، زمانہ غالباً ۳۱ء کا تھا، میری عمر ۱۷ سال رہی ہوگی، سبزہ آغاز اور علم و مطالعہ کی وادی میں نو وارد، ضابطہ کی طالب علمی ختم ہوئی تھی، اور حقیقی طالب علمی شروع، سلون رائے بریلی کی ایک تحصیل ہے، فاصلہ ۱۹، ۲۰ میل ہے، قصبہ نہ تحصیل ہونے کی وجہ سے مشہور ہے، نہ کسی اور امتیاز کی وجہ سے، اس کی ساری شہرت و عزت اس خانقاہ کی بدولت ہے جس کی بنیاد گیارہویں صدی کے نامور چشتی شیخ حضرت شاہ پیر محمد صاحب سلونی (۱۰۹۹ھ) نے ڈالی، اس وقت سے یہ قصبہ چشتی نظامی سلسلہ کا ایک عظیم روحانی مرکز رہا ہے، اس خانقاہ کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ وہ خانقاہ رشیدیہ جونپور اور خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کی طرح بیک وقت خانقاہ و مدرسہ اور علم و ادب تجرد و تفرید اور تصنیف و تالیف، تعلق و بے تعلقی اور فقر و غنا دونوں کا مرکز رہا ہے، سلون میں ہمارے ان دونوں بزرگوں کے کچھ اعزا بھی اس وقت موجود تھے، جن کا ننہالی سلسلہ ٹونک میں تھا، وہ اور ان کے ساتھ میں بھی ان عزیزوں کے یہاں ٹھہرا، پہونچنے کے کچھ دیر بعد ہی یہ یاد نہیں کہ شاہ صاحب نے پیش قدمی فرمائی اور بازدید کے طور پر ہم لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، یا ہم ہی لوگوں نے پہل کی، بہرحال ان کے یہاں جانا یاد ہے، اس خاندان کے تمام افراد ہمارے خاندان کے لوگوں سے بڑے احترام و محبت سے ملتے ہیں، اور یہ احترام ان کو اپنے بزرگوں سے ورثہ میں ملا ہے، یوں بھی سنا ہے کہ فاروقی شیوخ سادات کے احترام اور حق شناسی میں ہمیشہ ممتاز رہے ہیں، خود شاہ نعیم عطا صاحب کو (جو اپنے ذوق و مشرب اور اعمال و رسوم میں ہمارے خاندان کے مسلک و عقیدہ سے بہت الگ تھے) ہمیشہ اس خاندان کے چھوٹے سے چھوٹے افراد سے بہت فروتنی

اور تواضع سے ملتے دیکھا، باوجود معاصرت اور اختلاف ذوق و مشرب کے ہمارے خاندانی بزرگ حضرت شاہ علم اللہ نقشبندی اور خاندان سلون کے بزرگ حضرت شاہ پیر محمد چشتی میں ہمیشہ احترام و اعتراف کا معاملہ رہا ہے، اور ہر ایک نے دوسرے کے متعلق بڑے بلند الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے، غرض شاہ صاحب نے ان حضرات کا بڑا اعزاز و اکرام کیا، دیرینہ خاندانی تعلقات کے علاوہ ان کو ہم لوگوں سے ذوقی علمی مناسبت بھی تھی، اور وہ اپنے عقیدہ و مسلک میں (جو انھوں نے اپنے مطالعہ و تحقیق سے اختیار کیا تھا) اپنے برادر بزرگ اور افراد خاندان سے زیادہ ہم لوگوں سے قریب تھے، ان کی تعلیم و تربیت اور ان کا ذہنی نشو و نما زیادہ تر اپنے عم محترم شاہ حسام عطا صاحب کے زیر سایہ ہوا تھا، وہ بڑے معتدل المزاج، صحیح الخیال، اور حق پسند بزرگ تھے، انھیں نے شاہ صاحب کے دل میں شیخین (ابن تیمیہؒ اور ابن قیم) اور ان کے دبستان کے علماء کی عظمت و محبت اور ان کی تصنیفات کا شوق پیدا کیا تھا، پھر میاں سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کے شاگرد رشید مولانا سید ابوالحسن دہلوی کی تعلیم نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا، شاہ صاحب اپنے چچا صاحب کا بہت ہی محبت و عقیدت کے ساتھ ذکر کرتے تھے، اور ان کا یہ بہت بڑا احسان سمجھتے تھے کہ انھوں نے اس محدود ماحول سے نکالا اور حدیث و سنت اور ان کے داعیوں اور علمبرداروں کی محبت کا بیج ان کے دل میں بویا، وہ گویا زبانِ حال سے گویا تھے، اور یہ شعر میں نے سب سے پہلے انھیں کی زبان سے سنا کہ۔ ع

روح پدرم شاد کہ فرمود باستاد
فرزند مرا عشق بیاموز دگر ہیچ

یہ بھی فرماتے تھے کہ چچا صاحب اپنے زمانہ اور قرب و نواح کے دو بزرگوں کا بڑی عقیدت کے ساتھ نام لیتے تھے، اور فرماتے تھے کہ ہمارے زمانہ میں یہ دو حضرات بڑے بلند پایہ ہیں، ایک فرنگی محل کے مولانا محمد نعیم صاحب اور ایک تکیہ رائے بریلی کے سید شاہ ضیاء النبی صاحب۔

ہم لوگوں کے پہونچنے سے گویا شاہ صاحب کی عید ہوگئی وہ اس بھرے پرے قصبہ میں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ پورے ضلع میں، اپنے ذوق، اپنے مطالعہ، کتابوں کے ساتھ عشق، حدیث و سنت کے ساتھ شغف اور ابن تیمیہؒ اور ابن قیم اور ان کے تلامذہ و منتسبین کے ساتھ والہانہ تعلق میں بالکل نرالے تھے، اور اپنے وطن، اہل قصبہ اور افراد خاندان کے درمیان غربت و مسافرت اور عزلت و خلوت کی زندگی گزار رہے تھے، اور اقبال کا یہ شعر بالکل ان کے حسب حال تھا ع

من مثال لالۂ صحرا ستم
درمیان محفلے تنہا ستم

ہم لوگ پہونچے تو معلوم ہوا کہ جیسے وطن سے کوئی ہمصفیر اور ہمزبان آیا، وہ خود پڑھتے تھے، اور خود مزا لیتے تھے، کوئی ایسا ہم نفس اور ہم مذاق نہ تھا جس سے وہ ان مضامین کا تذکرہ بھی کرتے، اب مولانا سید طلحہ صاحب جیسا ہم مشرب اور ہم مذاق مل گیا، معلوم ہوا کہ فہرست ابن الندیم اور کشف الظنون کے اوراق کھلے ہوئے ہیں، ابھی کسی مصنف کی خصوصیات کا تذکرہ ہے، اور ابھی کسی تصنیف کی منفرد تحقیقات کا، ان کے دونوں صاحبزادے شاہ ہادی عطا مرحوم اور شاہ حسن عطا سلمہٗ ۸، ۱۰، ۱۱ سال کے بچے تھے، شاہ صاحب خود اٹھ اٹھ کر کتابیں لاتے، کبھی ان بچوں سے منگواتے، ان کی زندگی کا سب سے بڑا شوق اور ان کی آمدنی کا سب سے محبوب مصرف کتابوں کی خریداری تھی، وہ بمبئی اور سورت کے کتب خانوں کو برابر آڈر دیتے رہتے، اور حدیث، اسماء الرجال، تاریخ، طبقات، یہاں تک کہ ادب و محاضرات کی کوئی کتاب نئی چھپی یا کسی قدیم کتاب کے نئے ایڈیشن کا انھوں نے اعلان پڑھا اور فوراً فرمائش بھیجی، اس طرح ان کے گھر میں کتابوں کا ایسا ذخیرہ جمع ہوگیا تھا جو بڑے بڑے شہروں میں آسانی سے دستیاب نہیں ہو سکتا، شاہ صاحب

چھوٹے بچوں کی طرح ان کتابوں کو سنبھال کر رکھتے اور ان کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے، آج ان کی مراد بر آئی تھی، اور وہ بڑے شوق و اعتماد کے ساتھ ان کتابوں کو دکھا رہے تھے۔

شاہ صاحب کے محبوب مصنف پانچ تھے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ، علامہ ابن قیم، ابن رجب، ابن عبدالہادی اور علامہ ابن جوزی، شاہ صاحب نے ان کی وہ کتابیں دکھائیں جو نئی نئی چھپ کر آئیں تھیں، مولانا طلحہ صاحب خود وسیع النظر عالم تھے، ان کے لئے ممکن ہے کہ یہ چیزیں نئی نہ ہوں، لیکن میں نے کئی کتابیں پہلی بار دیکھیں "احیاء العلوم" عراقی کی تخریج کے ساتھ وہیں دیکھی، ابن جوزی کی تلبیس ابلیس ابن رجب کا رسالہ "فضل علم السلف علی الخلف" دفائن الکنوز" کے نام سے ایک مجموعہ جس میں ابن جوزی کا رسالہ "لفتة الکبد فی نصیحة الولد"، فریابی کا رسالہ "صفة النفاق وذم المنافقین" وغیرہ وغیرہ، ابن جوزی کی ایک نہایت دلچسپ کتاب "صید الخاطر" شاہ صاحب کو بہت عزیز تھی، اس کی پہلی بار وہیں زیارت کی، رائے بریلی آکر ان میں سے اکثر کتابوں کا مکتبہ قیمہ بمبئی کو آرڈر دیا جو اس زمانہ میں نئی مصری مطبوعات کا ہندوستان میں سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا، اور الحمد للہ یہ کتابیں آئیں ان کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا، اگر اس سے کوئی دینی و علمی نفع ہوا (اور ضرور ہوا) تو اس کا اجر شاہ صاحب ہی کو ملے گا۔

شاہ صاحب کی آمد و رفت لکھنؤ کم لیکن کچھ کچھ وقفہ کے بعد ہوتی رہتی تھی، اور وہ مولانا طلحہ صاحب اور خلیل عرب صاحب سے ضرور ملتے، سلون کی حاضری کے بعد وہ مجھ پر بھی خصوصی کرم فرمانے لگے، تکیہ رائے بریلی بھی کئی مرتبہ تشریف لائے، اور لکھنؤ کے مکان پر بھی، کسی تقریب روزہ کشائی وغیرہ میں تشریف لاتے، یا اتفاقاً ان کی موجودگی میں کوئی تقریب ہوتی تو قدیم رسم و وضع کے مطابق خاندانی بزرگوں کی طرح حصہ لیتے اور اس میں شرکت کرنے سے خوش ہوتے، جس قدر ملنا زیادہ ہوا،

ان کے مطالعہ کی وسعت اور ان کے ذوق کی لطافت اور پاکیزگی کا نقش، دل و دماغ پر گہرا ہوتا گیا' یہ دیکھ کر قلق اور صدمہ ہوتا تھا کہ وہ ایک ایسے ماحول میں زندگی گزار رہے ہیں، جو ان سے ناآشنا اور وہ اس سے بیگانہ ہیں، اردو کی ایک مثل ہے کہ مور جنگل میں ناچا کس نے دیکھا، شاہ صاحب کا بعینہ یہی حال تھا کہ ان کے علم و مطالعہ سے کوئی فائدہ اٹھانے والا نہ تھا، دوسری طرف ہمارے مدارس عربیہ میں ایسے حضرات کی بڑی کمی تھی' جو طلبار میں صحیح مذاق، مطالعہ کا شوق اور نظر میں وسعت و بلندی پیدا کریں اور جن سے خود اساتذہ کو علمی رہنمائی اور متقدمین کی کتابوں کی طرف رسائی حاصل ہو' اور کسی دوسرے مدرسہ میں اختیار نہ تھا، دارالعلوم ندوۃ العلمار ہی میں ان کی ذات سے فائدہ اٹھانے کی کوئی سبیل نکالی جا سکتی تھی، خوش قسمتی سے اس وقت ندوہ اور دارالعلوم کے سب سے بڑے باختیار کارکن دو تھے' ایک برادر معظم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب ناظم ندوۃ العلمار دوسرے استاد محترم مولانا سید سلیمان ندوی معتمد دارالعلوم' دونوں علم و علمار کے مرتبہ شناس اور خود صاحب علم و صاحب ذوق، مہتمم و شیخ الحدیث دارالعلوم مولانا حیدر حسن خاں صاحب فضلا کے سچے قدرداں اور علم کے جوہر شناس تھے، مجھے شاہ صاحب کو دارالعلوم میں لانے میں کوئی دشواری نہ ہوئی یوں تو (منطق و فلسفہ کو چھوڑ کر) تمام علوم قدیمہ سے ان کو مناسبت اور ان میں مشارکت تھی' لیکن حدیث و تاریخ سے زیادہ' انھوں نے حدیث جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، میاں صاحب کے شاگرد رشید مولانا سید ابوالحسن صاحب دہلوی سے پڑھی تھی، شاہ صاحب کو شیخ حسین عرب صاحب سے بھی اجازت حاصل تھی، اور انھوں نے ان کو اوائل سنا کر سند لی تھی' یہ اس وقت کا واقعہ ہے، جب شیخ صاحب شاہ نعیم عطا صاحب کی درخواست پر بہ نفس نفیس سلون تشریف لائے تھے، شاہ حلیم عطا صاحب کا حافظہ غیر معمولی تھا، اور سلف کے حافظہ کی ایک نشانی تھی' اس لئے متون و شروح حدیث میں انھوں نے جو کچھ پڑھا تھا' وہ بہت کچھ ان کے حافظہ میں محفوظ تھا، پھر امام ابن تیمیہ' ابن قیم اور حافظ ابن حجر کی کتابوں کے

بار بار مطالعہ سے ان کے اندر حدیث سے گہری مناسبت پیدا ہو گئی تھی، غرض یہ کہ ۱۹۳۹ء میں شاہ صاحب دار العلوم میں بحیثیت استاد حدیث کے تشریف لے آئے، مولانا حیدر حسن خاں صاحب کے تشریف لے جانے کے بعد صحیحین کا درس بھی ان سے متعلق ہوا، شاہ صاحب کو اس سے پہلے درس دینے کا موقع نہیں ملا تھا، ان کا اصل ذوق، مطالعہ اور کتابوں سے تمتع و لطف اندوزی کا تھا، لیکن ان کا قوی حافظہ، علمی استحضار، مطالعہ کی وسعت اور معلومات کی فراوانی طلبا کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی تھی، وہ بعض اوقات اتنے معلومات مہیا فرما دیتے تھے، اور نقول و حوالوں کی اتنی کثرت ہوتی تھی کہ طلبا ان کو اخذ و ہضم نہیں کر پاتے تھے، تعلیم کا یہ تجربہ ہے کہ بعض اوقات ایک ایسا معلم جس کا مطالعہ تو زیادہ وسیع نہیں، لیکن وہ اپنے فن اور مضمون یا کتاب پر حاوی ہے، زیادہ وسیع المطالعہ اور کثیر المعلومات استاد سے زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے، اور طلبا اس کو ترجیح دیتے ہیں، یہ آزمائش جو کسی نقص کا نتیجہ نہیں بلکہ کمال کا نتیجہ تھی، شاہ صاحب کو بھی پیش آئی، یوں کہنا چاہئے کہ یہ ان کے کمال کا تاوان تھا، جو ہر صاحب کمال کو ادا کرنا پڑتا ہے، لیکن رفتہ رفتہ ان کا درس زیادہ مفید اور طلبا زیادہ مطمئن ہوتے گئے اور خاص طور پر علم کا ذوق، مطالعہ کا شوق، متقدمین کی تصنیفات تحقیقات کی قدر، ہر موضوع پر بنیادی کتابوں اور صحیح ماخذ کی واقفیت، جو علمی ترقی اور کمال کا بہت بڑا زینہ اور علوم دینیہ کے وسیع کتب خانہ کی "شاہ کلید" ہے، طلبا کو حاصل ہوئی اور اس سے طلبا نے بقدر استعداد فائدہ اٹھایا۔

شاہ صاحب کا اصل فائدہ اور ان کی قدر و قیمت یہ تھی کہ اساتذہ کو ان سے مفید رہنمائی حاصل ہوتی تھی، اور ان کا بہت سا وقت کتابوں کی ورق گردانی سے بچ جاتا تھا، میرا ذاتی تجربہ ہے کہ مجھے علین درجہ میں جاتے وقت راستہ میں یاد آیا کہ فلاں مقام ابھی تشنۂ تحقیق ہے یا فلاں آیت کی تفسیر دیکھنی رہ گئی ہے، یا فلاں حدیث کے متعلق پوری تحقیق نہیں ہوئی، اتنا وقت نہیں تھا کہ کتب خانہ میں جا کر تشفی کی جاتی، اتفاق سے شاہ صاحب درجہ میں جاتے ہوئے یا آتے مل گئے

وہ اشکال ان کے سامنے پیش کیا، انھوں نے گھڑے کھڑے ایسی تقریر کردی اور کتابوں کی عبارتیں سنا دیں کہ شاید دو چار گھنٹے میں بھی اتنا مواد حاصل نہ ہوتا، امام ابن تیمیہ، ابن قیم کی کتابوں کے صفحے کے صفحے ان کو یاد تھے، اور وہ رکوع کی طرح ان کو سناتے تھے، بڑی مدد ان سے جو ملتی تھی، وہ یہ کہ وہ یہ بتاتے رہتے تھے کہ اس موضوع پر سب سے بہتر کس نے لکھا ہے، اور اس کے لئے کون سی کتاب دیکھنی چاہئے "تاریخ دعوت وعزیمت" کی تصنیف کے زمانہ میں نیز اپنے دوسرے مضامین اور رسائل کی ترتیب کے موقع پر مجھے بار بار اس کا تجربہ ہوا کہ انھوں نے جو کتاب یا مقام متعین کردیا، ہفتوں کے مطالعہ کے بعد بھی اس سے بہتر ماخذ نہ مل سکا۔

حدیث ورجال اور تاریخ ان کا پسندیدہ موضوع تھا، ادب کا بھی بڑا صحیح مذاق رکھتے تھے، اچھے ادیبوں، اہل طرز اور ان کی خصوصیات سے واقف تھے، انھوں نے قدیم طرز پر پڑھا لیکن ان کی نظر جدید چیزوں پر بھی تھی، وہ ان معائب اور کمزوریوں سے بھی واقف تھے جن میں عربی زبان و ادب پچھلی صدیوں، عجمیت وترکی اثر و اقتدار کے دور میں مبتلا ہوئے، مختارات کی تالیف کے زمانہ میں مجھے ان کے سلامت ذوق اور حسن انتخاب کا تجربہ ہوا، مثال کے طور پر مجھے مقامات بدیع الزماں میں سے ایک مقامہ کا انتخاب کرنا تھا، جو بدیع الزماں کی بہترین خصوصیات کی نمائندگی کرتا ہو، اور طلبا کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید، شاہ صاحب نے برجستہ کہا کہ "المقامۃ المضیریہ" انتخاب کیجئے، بعد میں دیکھا تو اس سے زیادہ جاندار، لطیف و بلیغ نثر کا نمونہ نہ صرف مقاماتِ بدیع ہی میں نہیں ملتا بلکہ اس عہد کی تحریروں میں بھی اس کا خاص امتیاز ہے۔

شاہ صاحب کو تو نثر میں لکھنے کی نوبت کم آتی تھی، اور یہ ان کے عہد کا عام حال تھا، لیکن عربی نظم پر ان کو اچھی خاصی قدرت تھی، اور بہت سہولت اور روانی کے ساتھ وہ طویل قصیدہ لکھ دیا کرتے تھے، ان کے عربی اشعار میں روانی، سلاست اور عربیت ہے، اس کا بہترین نمونہ ان کا قصیدہ

"نونیہ" ہے، جو اپنے محبوب مشہور عالم ابن قیم کے تتبع میں لکھا گیا، ایک مرتبہ وہ ایک تبلیغی سفر میں گئے وہیں سفر میں انھوں نے ایک قصیدہ شروع کیا جس میں سفر کے حالات اور رفقاء کا تذکرہ ہے۔

جدید مصنفین میں وہ علامہ کرد علی کو زیادہ پسند کرتے تھے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی کتابوں میں معلومات اور مطالعہ کا حصہ نمایاں رہتا ہے، اور شاہ صاحب کو ان میں اپنی دلچسپی کی چیزیں اکثر مل جاتی تھیں، کرد علی کی میں نے کئی کتابیں ان کے پاس دیکھیں، جن میں "غرائب العرب، القدیم، الحدیث" اور "کنوز الاجداد" اس وقت یاد آتی ہیں۔

شاہ صاحب کا قرآن مجید بڑا پختہ اور مستحضر تھا، مجھے معلوم نہیں کہ وہ روزانہ دور کرتے تھے، یا نہیں، لیکن جب چاہتے جہاں سے چاہتے سنا دیتے تھے، رمضان المبارک میں ختم کا اہتمام تھا، اس استحضار اور قرآنی ذوق کی وجہ سے وہ بڑی برموقع آیات پڑھتے، طبیعت میں شگفتگی اور شعریت تھی کبھی کبھی بڑا لطیف مزاح فرماتے، اور قرآنی آیات یا قدیم ابیات کے پردے میں بڑی حقیقت کہہ جاتے، ایک مرتبہ وہ دار العلوم کے مہمان خانہ میں ٹھہرے ہوئے تھے، ان کے رہنے کی اور سونے کی کوئی اور موزوں جگہ نہ تھی، مولانا سید سلیمان ندوی جو ہمیشہ مہمان خانہ میں ٹھہرتے تھے، تشریف لانے والے تھے، ان کی آمد آمد سن کر دفتر اہتمام نے کئی بار اشارتاً پھر صراحتاً شاہ صاحب سے کہا کہ وہ کہیں دوسری جگہ منتقل ہو جائیں، اس لئے کہ مہمان خانہ میں سید صاحب اور ان کے رفقاء کا قیام رہے گا شاہ صاحب کو کسی قدر گرانی ہوئی، ایک دن ہم لوگوں سے فرمانے لگے کہ آج کل یہ آیت میرے حسب حال ہے "يَا أَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوا مَسَاكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمَانُ وَجُنُودُهُ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ"

ایک روز عزیز گرامی مولوی عبد اللہ عباس ندوی اپنے زمانہ تدریس میں درجہ گئے اور دیکھا کہ طلباء ابھی تک نہیں آئے تھے، اسی اثناء میں جب وہ طلباء کے انتظار میں کھڑے تھے، شاہ صاحب تشریف لائے شاہ صاحب ان کے استاد تھے، اور شاہ صاحب نے ان کا دورِ طالب علمی بھی دیکھا تھا اور جانتے تھے کہ

ہر دور کے طالب علم ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں، "کل غانیۃ ھندُ"

مولوی عبداللہ صاحب نے ان سے طلباء کی بدشوقی اور کم ہمتی کی شکایت کی، شاہ صاحب نے برجستہ فرمایا: "کَذٰلِکَ کُنْتُمْ مِنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ۔"

شاہ صاحب خالص علم و مطالعہ اور علمی ذوق کے آدمی تھے، وہ صاحب جائداد تھے اور ایک بڑے ذی وجاہت اور محترم ذی علم خاندان کے رکن رکین، ان کے والد شاہ مہدی عطا صاحب ایک بڑی خانقاہ کے سجادہ نشین اور ضلع کے نامی رؤساء اور زمینداروں میں تھے اس سلسلہ کے اگلے سجادہ نشینوں کی طرح وہ مشیخت کے ساتھ صاحب علم و فضل، عالی طبع اور کریم النفس بزرگ تھے، شاہ صاحب ان کے چھوٹے بیٹے تھے، ان سے بڑے دو اور بھائی تھے، سب سے بڑے شاہ نعیم عطا صاحب، صاحب سجادہ، ان سے چھوٹے شاہ علیم عطا صاحب جو منجھلے میاں کہلاتے تھے، اور شاہ صاحب میں اور ان میں بڑا اتحاد تھا، ان کے بڑے بھائی شاہ نعیم عطا صاحب جن سے انھوں نے کچھ پڑھا بھی تھا، بڑے ذہین و ذکی، قوی الحافظہ اور جید الاستعداد تھے، لیکن ان کا ذوق و مسلک اور ان کے مشاغل زندگی، شاہ صاحب سے بالکل الگ اور علم و مطالعہ سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے تھے، تعلقات بھی کچھ زیادہ استوار اور خوشگوار نہ تھے، لیکن شاہ صاحب کی طرف سے ہمیشہ احتیاط اور احترام کا معاملہ تھا، ان کو سجادگی اور اس کے فوائد سے کوئی تعلق نہ تھا مسلکاً بھی وہ ان رسوم کو پسند نہیں کرتے تھے، ان کی جائداد اب بھی ان کے گزر اوقات کے لئے بالکل کافی تھی، اور ان کا شمار ضلع کے زمینداروں میں تھا، لیکن ان کو انتظام جائداد تحصیل وصول سے کوئی مناسبت نہ تھی، یہ سب کام ان کے ہونہار سعید و رشید فرزند شاہ ہادی عطا مرحوم انجام دیتے تھے، شاہ ہادی عطا اپنے خاندان کی بہترین ذہنی خصوصیات اور وہبی کمالات کے وارث تھے، ذہین اور قوی الحافظہ، سخت محنتی، کتاب کا کیڑا اور شمع علم کا پروانہ مڈل سے لے کر بی۔ اے تک ہمیشہ امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی اور بی۔ اے آنرز میں تو پوری

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ریاضی میں امتیاز اور تمغہ حاصل کیا، اسی کے ساتھ نہایت سعید و فرمانبردار اپنے خاندان کی ترقی اور نیک نامی کے خواہشمند، اسلاف کے کارناموں کو زندہ کرنے کے متمنی اور اس کے لئے کوشاں، لکھنے کی بھی اچھی صلاحیت تھی بعض مضامین الندوہ اور دوسرے رسالوں میں شائع ہوئے، لیکن اس غیر معمولی محنت نے جو وہ امتحانات میں امتیاز حاصل کرنے کے لئے کرتے تھے ان کی صحت پر برا اثر ڈالا، وہ تپ دق میں مبتلا ہوئے، اور عین جوانی (۲۲) سال کی عمر میں ایک شیر خوار بچی چھوڑ کر دسمبر ۱۹۴۶ء کو رائے بریلی میں انتقال کیا، اور اپنے والد کی تمناؤں کا خون اور اپنے خاندان کے دوبارہ عروج کے امکانات کو ختم کر کے رخصت ہوئے، شاہ صاحب کے لئے یہ داغ اتنا سخت تھا کہ انھوں نے اس کو اپنی قوت ایمانی اور ذوق علمی سے چھپا تو لیا، لیکن ان کی کمر گویا ٹوٹ گئی اور ان کی زندگی اب ہمیشہ کے لئے بے لطف اور بے معنی سی ہو کر رہ گئی، اسی کے ساتھ دوسرا داغ، جوان و تعلیم یافتہ بیٹی کے انتقال کا تھا، جس کو انھوں نے بڑے شوق سے عربی اور دینیات کی تعلیم دی تھی، اور جس کو ذکاوت و حافظہ اپنے خاندان کا ملا تھا، اس نے بھی شادی کے عین بعد داغ مفارقت دیا، ان دونوں صدموں نے شاہ صاحب کو نیم جاں کر دیا، اب ان کا دل صرف کتابوں سے بہلتا یا دارالعلوم کے درس و تدریس میں وقت کٹتا تھا۔[1]

ان سب حوادث، مطالعہ کی کثرت اور راحت کے اسباب کے فقدان نے شاہ صاحب کو قبل از وقت بوڑھا کر دیا تھا، اور وہ اپنی عمر سے زیادہ ضعیف اور معمر نظر آنے لگے تھے، بالآخر شوال ۱۳۷۴ھ (جون ۱۹۵۵ء) میں ان پر دماغی فالج (BRAIN HAEMORRHAGE) کا حملہ ہوا اور زندگی و موت کی کشمکش میں کئی مہینے مبتلا رہنے کے بعد جس میں علاج و تدبیر میں کوئی کمی نہیں کی گئی تھی، ۲۰ صفر ۱۳۷۵ھ کو

---

[1] شاہ ہادی عطا مرحوم کے علاوہ شاہ صاحب کے تین صاحبزادے اور ہیں، اور تینوں ذہین و ذکی اور خاندانی خصوصیات کے حامل، شاہ حسن عطا ایم۔ اے علیگ، مولوی شاہ شبیر عطا ندوی، اور شاہ منیر عطا سلمہم اللہ تعالیٰ۔

اس جہانِ فانی سے رحلت کی، الہ آباد (جہاں وہ تبدیل آب وہوا کیلئے گئے تھے) سے لاش سلون لائی گئی اور خانقاہ سلون میں اپنے کتب خانہ کے سامنے آسودۂ خاک ہوئے، میں نے اس حادثہ کی اطلاع لاہور میں سنی اور دل پکڑ کر رہ گیا۔ ع

اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

اب ایسے فنا فی العلم، ایسے کتابوں کے عاشق بلکہ ایسی زندہ و ناطق کتابیں کہاں پیدا ہوں گی، اب بھی تصنیف و تالیف میں مشکل مقام آتا ہے یا کوئی علمی مسئلہ پیش آتا ہے تو بے اختیار شاہ صاحب یاد آتے ہیں، اور نگاہیں ان کو تلاش کرتی اور مایوس و ناکام واپس آتی ہیں۔ ع

یک حرف کاشکے ست کہ صد جا نوشتہ ایم

شاہ صاحب ہمارے شیخ و مرشد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری سے لکھنؤ میں بیعت ہوئے تھے، ان کی مجلسوں میں بڑے اہتمام اور ادب سے شرکت کرتے تھے، حج کی بڑی تمنا تھی، اور ۱۹۵۵ء میں اس کی تیاری بھی کرلی تھی، مجھے بھی یہ شوق تھا کہ وہ علمائے حجاز اور اطراف عالم سے آئے ہوئے مختلف اہل علم و فن (جو زمانہ حج میں مکہ معظمہ میں جمع ہوجاتے ہیں) سے ملیں اور ان سے علمی مذاکرات ہوں، اور یہ عرب علماء بھی دیکھیں کہ ہمارے ہندوستان میں کیسے کیسے وسیع النظر اور قوی الحافظہ عالم ہیں، لیکن یہ تمنا پوری نہیں ہوئی اور شاہ صاحب کا جانا نہ ہوسکا۔

شاہ صاحب کے مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں کوئی مناسبت نہ تھی، وہ تحریر کے زیادہ عادی نہ تھے، اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب اور دوسرے بہت سے قدیم علماء کی طرح انھوں نے لکھنے کی خاص طور پر مشق نہیں کی تھی، الندوہ میں جب مشاہیر اہل علم کی محسن کتابوں کا سلسلہ شروع ہوا، اور ہندوستان کے ممتاز اہل علم و فکر اور اصحاب درس کے مضامین شائع ہوئے، تو میں نے ان سے بھی اس بزم میں شرکت کی فرمائش کی، وہ ایک دن رائے بریلی تشریف لائے تو میرے

اصرار پر انھوں نے ایک مضمون قلم بند کرا دیا، جو حسب توقع بہت پر از معلومات اور طلباء کے لئے مفید ہے، اور اس مجموعہ کی زینت ہے، باوجود تصنیف سے زیادہ اشتغال نہ ہونے کے انھوں نے تصنیفات کا قابل قدر ذخیرہ چھوڑا جو زیادہ تر حدیث و رجال کے موضوع پر ہے، ان میں سے حسب ذیل کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

الکتاب الکریم فی استخراج الدرر من القرآن العظیم، المعجم المفہرس، نسمۃ السحر (دیوان شعر) افسوس ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی حلیہ طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی، اللہ تعالیٰ ان کے اخلاف اور تلامذہ کو توفیق دے کہ ان کو چھپوا کر ان کا فیض جاری کریں، "والباقیات الصالحات خیر عند ربك ثوابا وخیر أملا"
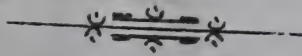
# مولانا حکیم سید حسن مثنیٰ صاحب ندوی امروہی

میرے دو عزیز قریب تقریباً ہم عمر ہیں، ان میں سے بڑے بھائی کا نام حسن مثنیٰ ہے، دوسرے کا نام محمد مسلم ہے، ہمارے خاندان میں یہ دونوں نام کچھ نئے معلوم ہوتے تھے، میں نے اپنے بچپن میں ایک مرتبہ ان کی والدہ سے (جو میری حقیقی خالہ زاد بہن تھیں) پوچھا کہ آپ نے یہ نام کیسے رکھے، انھوں نے کہا امروہہ میں ہمارے عزیزوں میں دو بھائی ہیں جن کا نام حسن مثنیٰ اور مسلم ہے، مجھے یہ نام بڑے پسند آئے اور میں نے اپنے بچوں کا یہی نام رکھا، یہ شاید پہلا موقع تھا کہ مجھے معلوم ہوا کہ امروہہ میں ہماری عزیزداری ہے، اور وہاں اس نام کے ہمارے ایک عزیز حسن مثنیٰ ہیں۔

کچھ عرصہ کے بعد جب شعور ہوا تو میں نے ان کی ذہانت اور علم و مطالعہ اور ادبی و علمی ذوق کا تذکرہ سنا زیادہ تر اپنے استاد بزرگ مولانا سید طلحہ صاحب سے جو اُن کے عزیز قریب بھی تھے، اور ٹونک میں عرصہ تک ساتھ بھی رہا تھا، علامہ سید رشید رضا مصری کی آمد کے موقع پر جو ۱۹۱۲ء کے جلسہ ندوۃ العلماء کی صدارت کے لئے مصر سے

تشریف لارہے تھے، ندوہ کا سالانہ جلسہ دارالعلوم کی نئی عمارت کے ہال میں منعقد ہونا طے پایا تھا، یہ علامہ شبلی نعمانی کا دور تھا، اور بہت سی حیثیتوں سے اس اجلاس کی بہت اہمیت تھی، ندوۃ العلماء کی طرف سے ذہین و سنجیدہ طلباء کے مختلف وفود اس تاریخی اجلاس میں شرکت کی دعوت دینے اور ندوۃ العلماء اور اس کے مقاصد کے تعارف کے لئے روانہ کئے گئے، ایک وفد میں مرحوم بھی تھے، انھوں نے ضلع رائے بریلی کے ایک قصبہ میں جو تقریر کی اس سے وہاں کے مسلمانوں اور اہل ذوق پر خطابت اور ذہانت کی دھاک بیٹھ گئی، اور عرصہ تک لوگوں کو وہ تقریر یاد رہی۔

مرحوم اپنے مختلف عوارض اور صحت کی کمزوری کی بنا پر عرصہ دراز سے گوشہ گیر ہو چکے تھے، اور سفر ترک کر چکے تھے، اس لئے نہ کسی خاندانی تقریب میں وہ عرصہ سے رائے بریلی اور ٹونک تشریف لائے تھے، اور نہ مجھے اپنی تعلیمی مشغولیتوں کی وجہ سے امروہہ جانے کا اتفاق ہوا تھا، وہ چونکہ خاندانی انساب اور خاندان کی شاخوں اور قرابتوں سے بڑے واقف تھے، اور اس موضوع پر سند کا درجہ رکھتے تھے، اور انھوں نے میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (مولانا سید عبدالحی) کے دور نظامت میں ندوہ میں تعلیم پائی تھی، اور زمانۂ قیام میں خاندانی تعلق کی بنا پر ان کے پاس بھی آتے جاتے تھے، اور رائے بریلی بھی جا چکے تھے، اس لئے وہ ہم دونوں بھائیوں (برادر معظم ڈاکٹر سید عبدالعلی مرحوم اور ناچیز) سے خوب واقف تھے، لیکن مجھ سے خط و کتابت کا سلسلہ اور التفات و عنایت خاص کا معاملہ اس وقت شروع ہوا جب ۱۹۳۹ء میں میری کتاب "سیرت سید احمد شہیدؒ" کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا اور میں نے ایک نسخہ ان کی خدمت میں بھیجا، انھوں نے اس کے پہونچنے پر ایک بڑا شفقت آمیز اور پر محبت خط لکھا، جس کے لفظ لفظ سے ان کی قلبی مسرت

اور تعلق خاطر کا اظہار ہوتا تھا، اسی کے ساتھ اس کا بھی اندازہ ہوا کہ ان کو حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی سے جن کو وہ میرے والد صاحب کے تتبع میں ہمیشہ شہید سعید لکھا کرتے تھے، والہانہ تعلق اور غیر معمولی عقیدت ہے، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے عقیدت و محبت کے دینی و علمی اسباب کے علاوہ ایک سبب قوی یہ بھی تھا کہ ان کی والدہ صاحبہ مرحومہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے شہید و سعید بھانجے حضرت سید احمد علی (شہید پھولڑہ) کی حقیقی پوتی تھیں، حکیم صاحب کے نانا سید ابوالقاسم (فرزند سید احمد علی شہید) مردانہ اوصاف و کمالات کے جامع، نہایت حسین و جمیل، ذہین و طباع شخص تھے، وہ قادر الکلام شاعر بھی تھے، صحابۂ کرام کی جنگوں اور فتوحات کو نظم کرنے کی ابتدا انھیں نے کی جس کو ان کے بھتیجے سید عبدالرزاق صاحب کلامی نے پایۂ تکمیل تک پہونچایا، اور پچیس ہزار (۲۵۰۰۰) اشعار کا مجموعہ "صمصام الاسلام" کے نام سے جو عام طور پر "فتوح الشام" کے نام سے مشہور ہے، نظم کر دیا، فارسی میں بھی بڑی قدرت تھی، عرفی کے قصائد کے جواب میں قصائد لکھے، شروع میں آزاد منش تھے، لیکن بعد میں دنیا سے دل سرد ہو گیا، خوف و خشیت غالب ہو گئی شب و روز حدیث کا مطالعہ کرتے، ۱۰ محرم سنہ ۱۳۰۱ھ کو سارے اعزہ کو جمع کیا، قرآن شریف کی سورتیں خود پڑھیں اور دوسروں سے سنیں، پھر کہا آج ۱۰ محرم امام حسین کی شہادت کا دن ہے، پھر ذکر کرتے کرتے جان جان آفریں کے سپرد کر دی، میں شاید بھول جاؤں حضرت سید احمد علی نے جب پھولڑہ کے میدان میں مردانہ وار شہادت پائی تو ان کے پاس قرآن مجید کے دو نسخے نکلے، ایک جو بہت چھوٹے سائز کا تھا، ان کے بازو پر بندھا ہوا تھا، دوسرا نہایت قیمتی اور خوشخط قلمی نسخہ، ان کی پوتی (حکیم صاحب کی والدہ مرحومہ) کو ترکہ اور تبرک میں ملا تھا، پہلے نسخہ کی تفصیل مجھے یاد نہیں رہی غالباً وہ ضائع ہو گیا، دوسرا نسخہ حکیم صاحب نے مجھے عنایت فرما دیا جو میرے لئے سرمایۂ افتخار و برکت ہے، اور اس کی عظمت و منزلت کے

ماسوا کئی عزیز و قابلِ احترام یادیں اس سے وابستہ ہیں۔

غرض حکیم صاحب کو حضرت سید صاحب کی ذات سے ایسا گہرا تعلق تھا، اور اس کے کچھ ایسے طبعی اور عقلی اسباب ان کی ذات میں جمع ہو گئے تھے، جن کی بنا پر ان کو ہر اس چیز سے تعلق تھا جس کا تعلق و انتساب سید صاحب سے ہو۔

حکیم صاحب کے والد کا نام حکیم سید عزیز الرحمٰن اور دادا کا نام حکیم سید علی حسن تھا، حکیم علی حسن صاحب بڑے حاذق طبیب تھے، وہ عرصہ تک ٹونک میں شاہی طبیب رہے، اسی زمانہ میں حکیم سید عزیز الرحمٰن کی شادی سید ابو القاسم صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی، حکیم علی حسن صاحب حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب سے بیعت تھے، اس تعلق سے حکیم حسن مثنیٰ صاحب کا بچپن ٹونک میں گزرا، اس وقت ٹونک اہلِ کمال اور نامی گرامی علماء اور ہر فن کے ماہرین سے آباد تھا، انھوں نے انھیں کے سایۂ عاطفت میں آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا، وہ اپنے دادا کے بڑے لاڈلے اور چہیتے تھے، اور انھوں نے اولاد کی طرح ان کی پرورش کی تھی۔

ان کا آبائی تعلق امروہہ کے سادات رضویہ سے تھا، جو خود وجہ افتخار ہے، لیکن حضرت سید صاحب اور ان کے جد امجد شاہ علم اللہؒ کی وجہ سے ان کو اپنے ننہال سے بہت گہرا تعلق اور شغف تھا، اور وہ اس خاندان کے حالات و انساب اور جزئیات و واقعات سے ایسے واقف تھے کہ اب اس دور میں ہمارے خاندان میں ان کی نظیر نظر نہیں آتی، انھوں نے سیرت سید احمد شہیدؒ کا لفظ لفظ غور سے پڑھا، اس کی خامیوں اور مسامحات پر جو مصنف کی نو عمری اور نو مشقی کا نتیجہ تھی، مبصرانہ گرفت کی، خاص طور پر نسب نامہ کے سلسلہ میں اور خاندانی تاریخ کے تذکرہ میں جو فرو گذاشتیں ہو گئی تھیں، ان کی نشان دہی کی اور مجھے ایک بڑا مفصل خط لکھا جس کو میں نے عرصہ تک محفوظ رکھا اور کتاب کی بعد کی اشاعتوں میں اس سے بڑی بیش قیمت

مددملی جس کا اعتراف کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے مقدمہ میں موجود ہے۔

یہ خط وکتابت کے سلسلہ کا آغاز تھا، میں تصنیف وتالیف میں بدنام ہونے کے باوجود خط وکتابت میں بڑا کوتاہ قلم اور مختصر نویس واقع ہوا ہوں، اس کے برعکس حکیم صاحب تصنیفی و صحافتی دنیا میں کوئی شہرت نہ رکھنے کے باوجود خط وکتابت میں بڑے شیریں قلم، خوش تحریر اور انشاءپرداز تھے، ان کے خطوط مفصل وطویل بڑے جاندار اور بڑے مرصع ہوتے تھے، مبیضہ اور مسودہ یکساں ہوتا تھا، کہیں کاٹ پیٹ، الجھاؤ یا اکھڑا پن نہیں ہوتا تھا، وہ قیمتی معلومات پر مشتمل ہوتے تھے اور اس سے کاتب کی کہنہ مشقی، علم وخیالات کی پختگی اور مذاق کی پاکیزگی کا اندازہ ہوتا تھا؛ افسوس ہے کہ میں اپنی بدانتظامی کی بنا پر ان کو محفوظ نہ رکھ سکا، ورنہ وہ ایک اچھا علمی وادبی ذخیرہ ہوتا۔

اس خط وکتابت سے ہم دونوں کو ایک دوسرے کو دیکھنے اور ایک دوسرے سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا اس فرط اشتیاق میں میں نے امروہہ جانے سے پہلے ہی ایک مرتبہ خواب میں امروہہ اور حکیم صاحب کی زیارت کرلی، پہلی مرتبہ (سنہ مجھے یاد نہیں) رفیق محترم مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کی معیت میں امروہہ حاضر ہوا، مولانا منظور نعمانی صاحب عرصہ تک امروہہ میں مدرس رہ چکے تھے اور حکیم صاحب سے ذاتی طور پر واقف اور ان کی خداداد صلاحیتوں اور کمالات کے بڑے مداح تھے، اور انھیں نے ایک مرتبہ ذکر کیا تھا کہ حکیم صاحب امروہہ کی میونسپلٹی کے چیرمین بھی رہے، اور بڑی قابلیت اور نیک نامی کے ساتھ انھوں نے یہ خدمت انجام دی، نیز یہ کہ جمعیۃ العلماء کے معرکۃ الآرا اجلاس امروہہ کے اس جلسہ (جس کی صدارت مولانا معین الدین صاحب اجمیری نے کی تھی) کے خطبہ استقبالیہ میں حکیم صاحب کے مشورے شامل تھے، بہرحال بارش کا موسم تھا اور آموں کا زمانہ ہم لوگ امروہہ پہونچے، میں سراپا اشتیاق،

حکیم صاحب سراپا انتظار و مجسم شفقت، اس مسرت اور شفقت کا اظہار مشکل ہے، جو حکیم صاحب نے اپنے اس دور افتادہ اور خورد سال عزیز کے حال پر فرمائی اس وقت ان کی والدہ صاحبہ مرحومہ حیات تھیں، مجھے ابھی تک ان کا جملہ اور لہجہ کی حلاوت یاد ہے، جب انھوں نے میرے دادا صاحب کا نام "فخر الدین بھائی" کہہ کر لیا، بڑی شفقت فرمائی غالباً دو روز قیام رہا، اس وقت حکیم صاحب کے عزیز قریب حکیم ابو النظر صاحب مرحوم بھی موجود تھے، اور انھیں کے مردانہ میں قیام رہا تھا مولانا حافظ عبد الرحمن صاحب امروہوی بھی حیات تھے، اور میں نے حکیم صاحب ہی کی رہبری اور معیت میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی اس آخری یادگار کی زیارت کی، حکیم صاحب نے اپنا کتب خانہ بھی دکھلایا، اپنی طالب علمی کی یادگاریں بھی دکھلائیں اور سارا وقت بڑی مسرت اور دلچسپی، علمی مذاکرہ اور استفادہ میں گزرا۔

اس کے بعد سے میرا معمول ہو گیا کہ جب میری کوئی چیز شائع ہوتی میں حکیم صاحب کی خدمت میں بھیجتا، ان کو خوشی ہوتی اور مجھے فائدہ، ان کا تبصرہ ان کے تاثرات بڑے جچے تلے مبصرانہ اور ماہرانہ ہوتے، اردو عربی دونوں میں یکساں بڑا پاکیزہ اور بلند مذاق رکھتے تھے، اور دونوں کے محاسن اور کمزوریوں پر گہری نگاہ تھی، عربی انشا، زبان اور طرز بیان کا ایسا صحیح اور سلیم ذوق رکھنے والا اور اس سے لطف لینے والا طبقہ علما میں بہت کم دیکھنے میں آیا ہے، ایک ایسی شخصیت کے متعلق جو اپنے مختلف عوارض اور تقدیری امور کی بنا پر کوئی شہرت حاصل نہ کر سکی، اور جس نے کوئی علمی یادگار نہیں چھوڑی، شاید میرے یہ الفاظ مبالغہ پر محمول کئے جائیں، لیکن میں نے اس میں کسی مبالغہ سے کام نہیں لیا یہ ایک خداداد چیز ہے جس میں کسی محنت اور علمی کمال کو دخل نہیں۔

اس کے بعد ایک دور ایسا آیا کہ حکیم صاحب بعض خانگی حوادث کی بنا پر سخت علیل

ہو گئے وہ فطرتاً نہایت ذکی الحس واقع ہوئے تھے، اور یہ اکثر ذہین اور حساس طبیعت رکھنے والوں کی طبعی کمزوری اور خاصہ ہے، ذکاوت حس اور حزن وملال کی کیفیت نے حکیم صاحب کے اندر دماغی عدم توازن اور ایک وارفتگی کی کیفیت پیدا کر دی، انھوں نے سب سے ملنا ترک کر دیا، اور خانہ نشین ہو گئے، کچھ عرصہ ایسا بھی گزرا کہ ان پر ایک ایسی کیفیت رہی جس کو جنون سے تعبیر کر سکتے ہیں، میرے مکرم فاضل دوست مولانا نسیم احمد صاحب فریدی نے مجھے اس کیفیت سے مطلع کیا اور مجھے بتایا کہ اس وقت خط وکتابت کا موقع نہیں ہے، اور کوئی ایسی چیز جو بھولی ہوئی باتوں کو یاد دلائے اور جس سے ان کا قلب متاثر ہو مناسب نہیں، میں نے سکوت اختیار کیا اور عرصہ تک خط وکتابت کا سلسلہ موقوف رہا، خدا جزائے خیر دے، پھر مولانا نسیم صاحب ہی نے اطلاع دی کہ اب وہ کیفیت زائل ہو گئی ہے، اور حالات میں اعتدال پیدا ہو گیا ہے، اب آپ کا لکھنا مفید ہے، میں نے خط وکتابت کا بھی آغاز کیا، اور آنا جانا بھی شروع کیا، مزاج میں اگرچہ اعتدال پیدا ہو گیا تھا، لیکن اب بھی وہ گوشہ گیر اور خانہ نشین تھے، بالکل کہیں آتے جاتے نہیں تھے، میں جب اپنی آمد کی خبر دیتا تو بے حد مسرت ہوتی اور بلا مبالغہ عید کی طرح اس کا انتظار کرتے، پہلے سے اس کا اہتمام ہوتا، میں جب پہونچتا تو یہ پابندی عائد فرما دیتے کہ نہ کہیں کوئی تقریر ہوگی، اور نہ کہیں گھر سے باہر کا کوئی پروگرام، اگر قصبہ سے کسی مدرسہ یا انجمن کے لوگ یا متعارف احباب کوئی پروگرام رکھنا چاہتے اور حکیم صاحب سے اس کی اجازت لیتے تو سختی سے انکار فرما دیتے، اسٹیشن پر حکیم صاحب کا کوئی نمائندہ لینے کے لئے موجود ہوتا، اکثر مولانا نسیم احمد صاحب عزت افزائی فرماتے تاکید تھی کہ جلد سے جلد اور اسٹیشن سے سیدھے مکان لایا جائے، میں آتا تو حکم ہوتا کہ نمازیں بھی گھر ہی پر جماعت کے ساتھ پڑھی جائیں (مکان کے بالکل قریب کوئی مسجد نہ تھی) میری چارپائی اپنی چارپائی کے قریب بچھواتے، کتابوں پر تبصرہ ہوتا، میرے سفروں کی

روداد سنتے، عالم اسلام کی ممتاز شخصیتوں کے متعلق میری رائے معلوم کرتے اور میرے تاثرات پوچھتے، خاندان کے اکابر و شیوخ کے متعلق اپنی معلومات سے مستفید فرماتے، فرطِ محبت و تعلق میں عجیب عجیب فرمائشیں کرتے تھے، کبھی مجھے قرآن مجید کا کوئی رکوع سنانے کا حکم دیتے (عجیب اس لئے کہ میں قرأت و تجوید سے ناواقف اور خوش الحانی سے محروم ہوں) کبھی میری کسی عربی کتاب کا کوئی حصہ مجھ سے پڑھوا کر سنتے اور تاکید فرماتے کہ بالکل عربی لہجہ میں سنایا جائے جس میں ان کی بزرگی اور اپنی افتادِ طبع کی بنا پر کامیاب نہ ہوتا، ان حصوں کے انتخاب سے (جو مجھ سے سننا چاہتے، اور جن کے متعلق اپنے گہرے تاثر کا اظہار کرتے تھے) ان کی ژرف نگاہی اور نکتہ شناسی کا اندازہ ہوتا، میری عربی تصنیف "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" (جس کا ترجمہ "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" کے نام سے شائع ہوا ہے) کے ایک مقام کو جس کا عنوان ہے "محمد رسول اللہ روح العالم العربی" ان کو بہت پسند تھا فرماتے تھے کہ یہ کتاب کا سب سے جاندار اور طاقتور حصہ ہے، اور بلا کسی تواضع و انکسار کے میرا بھی یہ خیال ہے کہ یہ مصنف کے لئے سرمایۂ سعادت و نجات ہے، اس حصہ میں عربوں سے بڑی صفائی اور بے تکلفی سے کہا گیا ہے کہ ان کی ساری عزت و شرف ان کی تاریخ اور ان کا کارنامہ اسی وجود گرامی کا صدقہ اور فیض ہے، اگر ان کو اس پر فخر و یقین نہیں تو محمد رسول اللہ اور ان کے ذریعہ سے خدا نے ان کو جو کچھ عطا کیا ہے، وہ واپس کریں اور پھر دیکھیں کہ ان کے پاس کیا باقی رہ جاتا ہے، میں نے ان کی خوشی کے لئے یہ فرمائشیں پوری کیں، اس وقت ان کی حمیت ایمانی اور رگ ہاشمیت جنبش میں آگئی اور ان کے چہرے اور آنکھوں میں گہرا تاثر جھلک رہا تھا، اسی طرح "سیرت سید احمد شہیدؒ" میں جہاں مصنف نے حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی تکفیر کرنے والوں کا سخت شکوہ کیا ہے کہ انھوں نے تکفیر کے لئے ایسے مرد مومن کا انتخاب کیا جس نے ان کی عزت و ناموس کی

حفاظت کے لئے اپنی جان قربان کر دی، اور اس تلخ نوائی کی غالب کے الفاظ میں معذرت کی ہے:

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

حکیم صاحب نے فرمایا میں نے اس ٹکڑے کو بار بار پڑھا ہے، غالباً یہ بھی فرمایا کہ میں نے جب پڑھا آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔

میری ناچیز تصنیفات کے علاوہ جس سے عزیزانہ تعلق کی بنا پر تعلق خاطر تھا، حکیم صاحب دوسری بلند پایہ تصنیفات پڑھنے کا ہمیشہ شوق رکھتے تھے، وہ اگرچہ ایک مردم خیز و علمی قصبہ میں مقیم تھے، لیکن گوشہ گیر اور سب سے منقطع تھے، جب ان کو کسی نئی بلند پایہ تصنیف کی اطلاع ملتی یا کسی پرانی تصنیف پڑھنے کا کسی وجہ سے خیال پیدا ہو جاتا تو مجھے خط لکھ کر میرے پاس سے یا ندوۃ العلماء کے کتب خانہ سے منگواتے اور پڑھ کر واپس فرما دیتے، اردو کی وہ کتابیں جو وقتاً فوقتاً انھوں نے منگوا کر پڑھیں ان سے ان کے ذوق کے تنوع کا اندازہ ہوتا ہے۔

امیر شکیب ارسلان کی "حاضر العالم الاسلامی" کی چاروں جلدوں کا انھوں نے مطالعہ کیا، امیر کی ذات اور ان کی اسلامیت سے ان کو بڑی عقیدت تھی، اور وہ ان کے حالات اور تحریریں پڑھنے کے ہمیشہ خواہش مند رہتے تھے، مصر و شام کے موجودہ مصنفین میں سے کسی سے وہ زیادہ متاثر نہیں تھے، ان کے عقیدے اور خیالات میں ایسی پختگی تھی کہ جن لوگوں میں ٹھیٹ اسلامیت نہ ہوتی، اور جن کے یہاں مستشرقانہ خیالات اور مغربی مصنفین کی تقلید میں کچھ بھی انحراف یا مرعوبیت پائی جاتی وہ ان کو پسند نہیں کرتے تھے۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے ان کو والہانہ عشق تھا اور ان کا یہ تأثر اور تعلق صاف نمایاں تھا، انشاء اللہ یہ قلبی تعلق ان کے لئے آخرت کا ذخیرہ اور قرب رضا کا وسیلہ

ہوگا، اہل بیت سے ان کو اسی نسبت گرامی کی بنا پر وہ قلبی تعلق تھا، جو ان کے جذبۂ ایمانی اور تعلق نسبی کی بنا پر ہر طرح قرین قیاس ہے، ان کی ایک شدید خواہش اور بڑی پرانی خواہش تھی کہ میں سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی سوانح لکھوں اس زمانہ میں ان کا کوئی خط اس تقاضہ اور یاددہانی سے خالی نہیں جاتا تھا، اکثر فرماتے تھے کہ یہ تمہارے ذمہ قرض ہے اس کو تمہیں ادا کرنا ہے۔

معاصر شخصیتوں میں ان کو حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی اور مولانا سید سلیمان ندوی سے بڑی عقیدت و محبت تھی، اگرچہ مولانا مدنی سے بیعت نہیں تھے، لیکن خادمانہ عقیدت وارادت رکھتے تھے، اور ان کے اخلاص کے بڑے معتقد تھے، مولانا سید سلیمان ندوی سے .... انھوں نے دارالعلوم میں پڑھا بھی تھا، سید صاحب جمعیۃ کے اجلاس میں امروہہ میں شرکت کے لئے تشریف لائے تھے، تو اسی رشتہ کی بنا پر حکیم صاحب کے ہاں ٹھہرے، وہ علمی ادبی ذوق کے غلبہ کے ساتھ ہمیشہ اہل اللہ کے معتقد اور اصلاح و تزکیۂ نفس کی ضرورت کے قائل رہے، انھوں نے مجھ سے (غالباً رائے پور کے قیام کے زمانے میں) فرمائش کی کہ میں ان کو غائبانہ حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری سے بیعت اور ان کے سلسلہ میں داخل کرادوں، حضرت نے ان کی بیعت قبول فرمائی اور داخل سلسلہ کیا، وہ اس اطلاع سے بڑے خوش اور مطمئن ہوئے، آخر آخر تک ان کو حضرت سے عقیدت و تعلق رہا۔

اسی طرح اپنی قدیم و عزیز درسگاہ ندوۃ العلماء سے بھی بڑی دلچسپی اور محبت تھی، اور اس کی موجودہ ترقیات اور تبدیلیوں کو دیکھنے کی بڑی آرزو رکھتے تھے، فرماتے تھے کہ طالب علمی کے بعد صرف ایک مرتبہ امروہہ میونسپلٹی کی چیرمینی کے دور میں ایک ضرورت سے لکھنؤ جانا ہوا تھا تو چھتر منزل والی سڑک پر گذرتے ہوئے اُسے دور سے دیکھا تھا، اپنے عوارض کی وجہ سے سفر ترک کر چکے تھے، میں نے کئی بار استدعا کی کہ وہ ایک بار لکھنؤ تشریف

لائیں، اور دارالعلوم میں چند روز قیام کریں، لیکن یہ آرزو پوری نہ ہوسکی، دارالعلوم کی مطبوعات اور وہاں کے عربی رسائل "البعث الاسلامی" اور "الرائد" کا بڑے شغف سے مطالعہ کرتے اور بڑے اصرار سے اس کا چندہ دیتے۔

میں اگرچہ متعدد بار حاضر ہوا، لیکن ان کا شوق ملاقات اور ان کا جذبۂ قلبی میری حاضری پر غالب رہا، اور میں بقدر شوق حاضری نہ دے سکا، نہ ان کی خدمت میں قیام کرسکا، ان کو برابر میری حاضری کی شکایت رہی، اور یہ داغ تو دل پر عمر بھر رہے گا کہ انتقال سے چند دن پہلے مجھے یاد فرمایا اور لکھا، میں بہت بیمار ہوں ایک مرتبہ آکر مجھے دیکھ جاؤ، اور میری سن جاؤ کوتاہ بیں نگاہ نے وقت کی کوتاہی اور حادثہ کے قرب کا اندازہ نہیں کیا اور اپنی وقتی مشغولیتوں اور موانع کا زیادہ لحاظ کیا، قصد تھا کہ کچھ ضروری کاموں کو ختم کرکے خدمت میں حاضر ہوں گا کہ اچانک ایک شب میں عزیزی سید حسین مجتبیٰ کا تار ملا کہ والد صاحب کا انتقال ہوگیا، دل پر ایک بجلی گری اور اپنی پست ہمتی اور تقصیر کا شدت سے احساس ہوا۔

جن اہل علم اور اہل تصنیف کی دنیا میں شہرت ہے یا جن کا کوئی علمی کارنامہ یا علمی یادگار نگاہوں کے سامنے ہے، ان کے کمالات کا نہ اظہار مشکل ہے نہ احساس و اقرار، لیکن جس گنج مخفی کا کوئی نشان نہیں اور جو نہ کبھی اسٹیج پر نظر آیا نہ مصنفین کی فہرست میں اس کا نام ہے، اور جس سے عوام تو عوام ہندوستان کا علمی حلقہ بھی واقف نہیں، اس کے متعلق کیا بتایا جائے کہ وہ کن خداداد صلاحیتوں کا مالک اور کن کمالات کا حامل تھا، کسی انگریز ادیب نے کسی گورغریباں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ کوئی نہیں جانتا کہ اس قبرستان میں کیسے کیسے شکسپیر اور ملٹن دفن ہیں، جن کے کمالات کا اظہار نہیں ہوسکا اور وہ گمنامی میں زندگی گذار کر گم نام انسانوں کی طرح زیر خاک ہوگئے۔

حکیم صاحب مرحوم کے لئے اگر اللہ کو منظور ہوتا اور وہ تصنیف و تالیف کے میدان میں اترتے اور تاریخ و تراجم ادب و انشا یا عربی میں کوئی علمی کام کرتے تو واقعہ یہ ہے کہ وہ بہت ممتاز مقام حاصل کر سکتے تھے، اور ہندوستان کے بلند پایہ اہل قلم اور مصنفین میں ان کا شمار ہوتا لیکن وہ اپنے عوارض اور تقدیر الٰہی کی بنا پر گوشۂ عزلت کی زندگی گزار کر گمنامی اور خاموشی کے ساتھ دنیا سے چلے گئے، اور بہت تھوڑے آدمیوں نے جانا کہ ۷ر دسمبر ۱۹۶۲ء کی رات کو انھوں نے امروہہ کی مردم خیز سرزمین میں کس ہستی کو سپرد خاک کیا۔ ع

خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہوگئیں
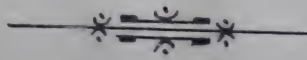
# سیّد صدّیق حسن آئی سی ایس[1]

ایک چوتھائی صدی سے جس قلم کا شیوہ رہا ہے کہ ہمیشہ علماء، و مشائخ، درویشوں اور بزرگوں اور تاریخ اسلام کی مشہور دینی شخصیتوں کے فضائل و مناقب بیان کرنے اور ان کے کارناموں کو اجاگر کرنے میں اپنی سعادت شمار کرے، وہ آج ایک ایسے مرد مسلمان کے لئے اشک بار ہے، جو نہ مشہور اصطلاح کے مطابق درویش یا صوفی تھا، نہ اس کا شمار زہاد و کاملین میں تھا، بلکہ اس سب کے برعکس اس ریاست کے ایک اعلیٰ ترین عہدہ پر فائز اور اس طبقہ کا ایک فرد تھا، جو گذشتہ انگریزی عہد میں اور موجودہ دور میں بھی نہ صرف اہل دین بلکہ عوام سے بھی بالکل الگ تھلگ اپنی فرنگیت و صاحبیت میں بدنام رہا ہے۔

لیکن قلم اور صاحبِ قلم کو اس انتخاب پر نہ تأسف ہے نہ تعجب، نہ ندامت نہ معذرت، جوہر انسانیت، مکارم اخلاق، دردمند دل، خدمت خلق، فیض رسانی عام، قبولیت و مقبولیت ان میں سے کوئی بھی دولت کسی طبقہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے "ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ"۔

---

[1] یہ مضمون "ندائے ملت" لکھنؤ کے "صدیق حسن نمبر" کے لئے لکھا گیا، جو مرحوم کی وفات پر نکالا گیا تھا۔

سید صدیق حسن صاحب مرحوم کڑا مانک پور کے رہنے والے تھے، جو میرے خاندان کا بھی قدیم وطن اور ہمارے مورث اعلیٰ سید قطب الدین محمد المدنیؒ کا مدفن ہے، اوپر کے سلسلہ میں قرابتیں بھی ہوں گی، خاندانی طور پر ہم لوگ ایک دوسرے سے ناآشنا نہیں تھے اپنے بچپن میں بھی ان کو ایک آدھ بار دیکھا ہوگا، لیکن اس سب کے باوجود ہمیشہ ایک بیگانگی سی رہی، ان کا عہدہ ان کی بلند حیثیت ہمیشہ حجاب رہی، وہ لکھنؤ میں مختلف عہدوں پر رہے لیکن کبھی عملی واسطہ نہیں پڑا ہم دونوں کا حلقۂ عمل ایک دوسرے سے اتنا جدا تھا کہ ایک کا دوسرے سے ملنا بھی شاذونادر ہوتا تھا۔

۱۹۴۷ء کے بعد اس ملک کے حالات میں ایسا تغیر ہوا کہ مسلمان اچانک یہ محسوس کرنے لگے کہ وہ اس ملک میں بے یارومددگار ہیں، نئی نئی مشکلات، نئے نئے مسائل نئی نئی الجھنوں، شکوک وشبہات وبدگمانیوں سے ان کا واسطہ پڑنے لگا، سیاست تو ایک اونچی سطح کی چیز ہے اور وہ پوری زندگی پر حاوی نہیں ہے، مسلمانوں کو اپنے اجتماعی اور ملی مسائل میں بے شک بااثر اور طاقتور سیاسی رہنماؤں کی ضرورت محسوس ہوتی تھی، اور اس کے لئے ہندوستان میں چند مرکزی شخصیتیں تھیں جو جانی پہچانی ہیں، اور جن کا خلا سب کو محسوس ہوتا ہے، لیکن روزمرہ کی زندگی میں مسلمان شرفاء کو سرکاری ملازمین کو، دفاتر کے اہلکاروں، محکموں کے افسروں اور ماتحتوں کو قصبات کے قدیم عزت دار اور سربرآوردہ لوگوں کو صدہا ایسے مسائل اور ایسی مشکلات پیش آتی ہیں، جن میں ایک بااثر سرکاری شخصیت ایک اعلیٰ عہدہ دار اور ایک صاحب رسوخ سویلین کی رہنمائی بعض اوقات مداخلت، بعض اوقات سفارش اور بعض اوقات اظہار تعلق اور دلچسپی کی سخت ضرورت محسوس ہوتی ہے، تقسیم سے پہلے ہماری ریاست اترپردیش میں تقریباً ایک درجن مسلمان آئی سی ایس رہے ہوں گے اور ان سے ہزاروں مصیبت زدہ اور ہزاروں ضرورت مند غرباء و شرفاء کو جائز مدد ملتی ہوگی، لیکن تقسیم کے بعد مشکل سے دو تین افراد ایسے رہ گئے تھے، جو ایسے نازک موقع پر کام آسکیں اور جن سے بروقت کوئی اخلاقی

امداد حاصل ہو سکے۔

لیکن اس اخلاقی امداد اور آڑے وقت پر کام آنے کے لئے جس جرأت و اعتماد جذبۂ ہمت مضبوط و مستحکم پائے اور بے داغ سیرت و کردار اور غیر مشکوک اور ہر شبہ سے بالاتر ماضی اور تاریخ کی ضرورت ہے ہر وہ شخص جو کسی بلند عہدہ پر فائز تھا، ضروری نہ تھا کہ وہ یہ سب اوصاف بھی رکھتا ہو بہت سے مسلمان افسر ایسے تھے، جو اپنی بہت سی ذاتی خوبیوں کے باوجود اور شاید گہری مذہبیت اور شرافت نفس کے باوجود بھی مسلمانوں کے معاملات سے دلچسپی یا کسی مسلمان سے ہمدردی کے اظہار سے بھی گریز کرتے تھے، اور بعض اوقات ان سے زیادہ شریف النفس انسان دوست اور سچے محبّ وطن غیر مسلم افسروں اور غیر مسلم رہنماؤں سے مدد ملتی تھی، کوئی کیسا ہی اعلیٰ درجہ کا جمہوری اور ترقی یافتہ ملک ہو اور اس ملک کے انتظامی افسروں اور حکام حکومت کے کارکنوں اور اہل کاروں میں ذمہ داری کا احساس اور فرض شناسی کا جذبہ کتنا ہی بڑھا ہوا ہو کچھ لوگوں کے ساتھ شعوری یا غیر شعوری طور پر ناانصافی، حق تلفی کا معاملہ اور بھول چوک ہوتی ہی رہتی ہے، اس میں کسی خاص فرقہ کی خصوصیت نہیں، ایسے موقعہ پر ایسے خدا ترس انصاف دوست، اور دردمند اعلیٰ افسران اور حکام کی اخلاقی مدد اور ہمدردی کی ضرورت ہوتی ہے، جو اپنے رسوخ اور اثر سے کام لے کر انصاف کے راستہ کو مختصر بنا سکیں، اور جن کی توجہ سے وہ غریب بھی اپنا حق پا سکیں جو کسی کوتاہ نظری یا غلط فہمی یا ذاتی رجحان کا شکار ہو گئے، ایسے لوگوں کا وجود ہر سوسائٹی میں باعث رحمت ہوتا ہے، اور وہ قانون میں مزاحم نہیں بلکہ بڑے معاون ہوتے ہیں۔

سید صدیق حسن مرحوم ادیب و شاعر بھی تھے، پاکیزہ علمی ذوق رکھتے تھے، عمر کے ساتھ ساتھ ان میں دینی ذوق، قرآن مجید کے مطالعہ کا شغف اور دینی اداروں کی خدمت کا جذبہ بڑھتا ہی جا رہا تھا، یہ سب ایسی راہیں تھیں، جن میں ان کا اور میرا کہیں نہ کہیں ساتھ اور گراس ہو سکتا تھا لیکن اس کو

خود غرضی کہئے یا خاص حالات کا نتیجہ کہ تعلق کی بنیاد ایسے ہی ضرورت مندوں یا مصیبت زدہ لوگوں کی سفارش سے پڑی جب کبھی کوئی ایسا موقعہ آیا تو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ بغیر کسی ادنیٰ تامل یا ہچکچاہٹ کے مدد کے لئے آمادہ ہو گئے اور بغیر کسی تاخیر انھوں نے اس معاملہ میں ایسی مدد فرمائی کہ فوراً کام ہو گیا، شروع میں تو اس کا اندازہ نہیں ہوا، لیکن دو چار تجربوں کے بعد معلوم ہو گیا کہ انھوں نے اس طرح کی مدد کو اپنی زندگی کا اصول اور اپنی اس پوزیشن اور عہدہ کی قیمت اور اصل فائدہ سمجھ رکھا ہے، اور وہ اس کو اعلیٰ درجہ کی عبادت اور اپنے لئے سعادت سمجھتے ہیں، ان کو جب کسی معاملہ میں اس بات کا اطمینان ہو جاتا تھا کہ کوئی شخص مظلوم ہے، یا اس کی حق تلفی کی گئی ہے یا وہ حقیقتاً ضرورت مند اور مصیبت زدہ ہے، تو پھر وہ اپنی پوزیشن، اپنے اعلیٰ عہدہ، اس کے تقاضوں اور آداب کا خیال کئے بغیر اس کی مدد کے لئے تیار ہو جاتے تھے، اور اس کا لحاظ نہیں کرتے تھے کہ اس سلسلہ میں ان کو اپنے سے کم درجہ کے افسر سے کہنا پڑے گا یا ان کی بات گرے گی، یا یہ بات ان کے وقار یا ان کی حیثیت کے خلاف ہے، ان کی یہ ادا دیکھ کر اکثر عہد اکبری کے ایک باخدا بزرگ حضرت خواجہ حسام الدینؒ کا واقعہ یاد آجاتا تھا، جو عرصہ تک دربار اکبری میں ایک بڑے عہدہ پر فائز رہ چکے تھے، اور ارکان سلطنت میں سے تھے، پھر اس منصب سے استعفا دے کر، مسند امیری چھوڑ کر بوریائے فقر اختیار کیا اور خواجہ باقی باللہ کے آستانہ کی جاروب کشی اختیار کر لی، سابق تعلق اور رسوخ کی بنیاد پر لوگ ان سے کثرت سے ارکان سلطنت کے نام سفارشی خطوط لکھواتے تھے، وہ بڑی فراخ دلی سے لکھ دیتے تھے، صاحبزادوں نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ آپ بڑی فیاضی سے سلطنت کے اعلیٰ عہدہ داروں کے نام سفارشی خطوط لکھ دیتے ہیں، بہت سفارشیں آپ کی نہیں قبول کی جاتیں، آپ کو اپنی عزت و آبرو کا بھی خیال نہیں، فرمایا کہ مجھے اس "آب رو" سے کوئی پن چکی چلانی ہے؟ مجھے یقین ہے کہ سید صاحب کی نظر سے یہ واقعہ نہیں گزرا ہو گا اور ایسی سفارشیں کرتے وقت انھیں اس کا

خیال بھی نہ ہوگا، لیکن ان کا طرزِ عمل بالکل یہی تھا۔ اور وہ ایسے موقعوں پر اپنے وقار اور اپنی عزت کا کچھ بھی خیال نہیں کرتے تھے، بعض اوقات ان کو کئی کئی بار کہنا پڑتا تھا، اور بعض اوقات اگرچہ اپنی خداداد محبوبیت، اپنے غیر معمولی رسوخ و وقار، اور اپنی اخلاقی بلندی کی وجہ سے اس کی بہت کم نوبت آتی تھی، بعض سفارشوں اور کوششوں میں ناکامی بھی ہوتی تھی، لیکن وہ اس کی مطلق پرواہ نہیں کرتے تھے، اور ہمیشہ اس کے لئے آمادہ و کمربستہ نظر آتے تھے، خدائے عالم الغیب کے علاوہ کوئی ان ضرورت مند، مصیبت زدہ، پریشان حال اور بے روزگار لوگوں کا شمار نہیں کرسکتا جن کی پریشانی ان کی بروقت امداد سے رفع ہوئی، جن کو روزگار ملا، جن کی رکی ہوئی ترقی، یا نامنظور کی ہوئی چھٹی بحال ہوئی، اس کا کسی قدر اندازہ اس عظیم سوگوار مجمع کی اشک بار آنکھوں، شکر گزار زبانوں سے کیا جاسکتا ہے، جو ان کی شرافت و مروت، خلائق پروری، اور غربا نوازی کی شہادت دیتی تھیں، اور جو اس سے پہلے کم سے کم ان گنہگار آنکھوں نے کسی بڑے سے بڑے امیر و وزیر، حاکم و افسر کی وفات پر نہیں دیکھا، اور جس سے حدیث مشہور "انتم شھداء اللہ" (تم خدا کے گواہ ہو) اور زبان خلق کی شہادت کی بنا پر جنت کی بشارت کے بموجب بہت کچھ قبولیت و مغفرت کی امید کی جاسکتی ہے۔

یہ ان کی زندگی کا ایک پہلو ہے، اور بلاشبہ بڑا روشن اور شاندار، اور کم ہمتی، کمزوری، احساس کمتری کے اس دور میں کہ اسلام کی طرف انتساب اور مسلمان کی حمایت اور اس سے تعلق کے اظہار میں بھی احتیاط سے کام لیا جاتا ہے، بڑی نادر اور قابل فخر چیز ہے، اگرچہ ان کا یہ رویہ مسلمانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں تھا، غیر مسلم دوستوں، رفقاءِ کار، ماتحتوں اور اہلکاروں کے ساتھ بھی ان کا رویہ نہ صرف شریفانہ و منصفانہ بلکہ فیاضانہ و کریمانہ تھا، اس سلسلہ میں انھوں نے اپنے کیریکٹر اور اپنی بلند نظری اور اپنی شہامت، اور بلند حوصلگی کی ایسی شاندار روایت قائم کردی ہے، جو سچے محبانِ وطن اور بلند پایہ شریف انسانوں کے لئے قابل تقلید ہے، اور اس قابل ہے کہ کورس کی کتابوں میں سچی حب الوطنی

اور انسانیت کے نمونہ پر پیش کی جائے، اگر ہندو مسلمانوں میں یکساں طریقہ پر حق ہمسائگی، شرافت نفس، حسن سلوک اور اخلاقی جرأت کی ایسی مثالیں بار بار پیش کی جائیں تو اس سے ہمارے ملک کے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں، جو سیاسی سطح پر حل نہیں کئے جا سکتے اس سلسلہ میں اپنے ایک سابق رفیق اور انڈین سول سروس کے ایک پرانے ساتھی بی بی سنگھ کے معاملہ میں انھوں نے جس اخلاقی جرأت اور انسانی شرافت کا ثبوت دیا، جس طرح انگریز گورنر کے منشا اور ایما کے خلاف ان کی ضمانت کی، اور پھر جس طرح ان کی طرف سے مدافعت کا فرض انجام دیا، اور ان کے انتقال کے بعد ان کے بچوں کی کفالت و پرورش کی، ان کو انگلستان بھیج کر اعلیٰ تعلیم دلائی، پھر ان کی شادیاں کیں، اس سے انھوں نے نہ صرف اپنی اس اخلاقی بلندی کا ثبوت دیا، جو خود غرضی اور مصلحت پرستی کے اس دور میں نایاب ہے، بلکہ انھوں نے ایک سچے مسلمان کا کردار پیش کیا جس کی فیاضی اور شرافت کا دائرہ اس کے فرقہ کے افراد کے ساتھ محدود نہیں اور جو اپنے اندر ایک دردمند دل اور ایک بلند دماغ رکھتا ہے، کاش! ایسی مثالیں ہمارے ملک میں عام ہوں ہندوستان میں مسلمانوں کے مسئلہ کا یہ بہت بڑا حل ہے، اور مسلمان ایسے ہی بلند کردار، اور اسلام کی ایسی سچی ترجمانی سے وقار و اعتبار حاصل کر سکتے ہیں۔

عمر کے ساتھ ساتھ اور اسی طرح سے عہدہ کی ترقی، اور اعزاز و منصب میں اضافہ کے دوش بدوش ان کا دین سے اور اہل دین سے ربط و تعلق اور دینی اداروں اور دینی کاموں سے شغف و انہماک بڑھتا ہی گیا، اپنے مکان پر قرآن مجید کا درس قائم کیا جو ہر ہفتہ سنیچر کے روز بعد مغرب پابندی سے ہوتا تھا، اس کام کے لئے انھوں نے مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی کو زحمت دی جو قرآن مجید کے ایک صاحب نظر اور محقق عالم ہیں، اور دار العلوم ندوۃ العلماء میں شیخ التفسیر ہیں، اس درس کا ان کو ایسا اہتمام تھا کہ شدید مجبوری کے سوا اس سے کبھی غیر حاضر نہ ہوتے، یہاں تک کہ ایسے موقعہ پر بھی انھوں نے ناغہ نہیں کیا جبکہ شہر میں ایک ایسی سرکاری تقریب ٹھیک درس کے وقت

ہونے والی تھی، جس میں اپنے عہدہ کے اعتبار سے ان کا شریک ہونا ہر طرح مناسب و قرین قیاس تھا، ان کے اثر، مقبولیت اور وسیع تعلقات کی بنا پر اس درس میں اعلیٰ مسلمان افسران اور نہایت چیدہ ممتاز معززین شریک ہوتے، خود پہلے سے مطالعہ کرتے، درس کے نکات اور افادات اپنے نسخہ پر نوٹ کرتے جاتے، عام طور پر مولانا عبدالماجد دریابادی کا ترجمہ اور تفسیر سامنے ہوتی، قرآن مجید کے گہرے مطالعہ اور شغف نے ان میں اچھی خاصی واقفیت اور مناسبت پیدا کر دی تھی، عربی انھوں نے زمانۂ طالب علمی میں پڑھی تھی، آکسفورڈ میں وہ پروفیسر مارگولیتھ کے شاگرد تھے، جو اپنی اسلام دشمنی میں مشہور رہے، لیکن اپنی سلامت طبع، جذبۂ ایمانی، اور مطالعہ سے مستشرقین کے معاندانہ طرز اور ان کی دسیسہ کاریوں سے بڑے بیزار تھے، اسلامی حقائق پر راسخ ایمان رکھتے تھے، سرکاری مصروفیتوں اور ذمہ داری اور سرکاری ضرورتوں میں کم سے کم مسلمانوں کے سلسلہ میں مرجع خلائق ہونے کے باوجود سیرت و اسلامیات پر بلکہ فلسفہ اور نفسیات تک پر تازہ بتازہ (UP-TO-DATE) کتابوں کے مطالعہ کے لئے وقت نکال لیا کرتے تھے، اور اپنے دوستوں سے ان موضوعات پر مذاکرہ و تبادلۂ خیال کیا کرتے تھے، خود راقم سطور کو ان کے ذریعہ سے بہت سی نئی کتابوں کے مطالعہ کا موقع ملتا تھا، لکھنؤ میں "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" قائم ہوئی اس سے اپنی گہری دلچسپی اور شغف کا اظہار کیا، اسی بنا پر اس کے نائب صدر منتخب ہوئے راقم سطور کی فرمائش پر کریسی موریسن کی مشہور کتاب (MAN DOES NOT STAND ALONE) جو وجود باری کے ثبوت میں جدید سائنس اور فلکیات کی ایک ناطق شہادت ہے، کا اردو میں ترجمہ کیا اس پر مفید حواشی بڑھائے اور ایک مبسوط فاضلانہ مقدمہ لکھا، آخری سفر پاکستان اور درحقیقت سفرِ آخرت سے ایک روز پہلے میری قیام گاہ "مرکز اصلاح و تبلیغ" لکھنؤ تشریف لائے کتاب کا ذکر ہوا، فرمایا کہ اب کوئی دوسری کتاب ترجمہ کے لئے انتخاب کر کے دیجیے، مشہور مستشرق منٹگمری واٹ کی

دونوں کتابیں (MOHAMED IN MEDINA, MOHAMED IN MECCA)
پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا، اور مجھ سے پوچھا کہ امام غزالیؒ پر اس کی تازہ کتاب کا آپ نے مطالعہ کیا
یا نہیں؟ نفی میں جواب دینے پر باوجود سفر کی تیاریوں اور شدید مصروفیت کے ایک خط کے ساتھ
وہ کتاب بھیجی، یہ خط غالباً ان کی آخری تحریر ہے۔

"ندائے ملت" کے اجراء کے وقت ہی سے انھوں نے اس سے اپنی گہری دلچسپی کا اظہار
کیا، اور اس کی امداد و توسیع اشاعت کو بھی اپنی مصروفیت و گراں بار زندگی کے پروگرام میں شامل
کرلیا، آخر وقت تک وہ اپنے مفید مشوروں اور اپنی علمی امداد سے اس کے ادارہ کی ہمت افزائی کرتے
رہے، اور توسیع اشاعت میں کوشاں رہے، نظموں اور مضامین کے لئے بھی وقت نکال لیتے تھے،
وفات سے چند روز پہلے ان کا ایک فاضلانہ مضمون "ذہنی ارتداد" پر ندائے ملت میں شائع ہوا، جو
بہت پسند کیا گیا۔

اس دینی شغف اور دلچسپی کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کو دارالعلوم ندوۃ العلماء سے جس کے گزشتہ
سال سے وہ رکن انتظامی بھی منتخب ہو گئے تھے، ان کی دلچسپی بہت بڑھ گئی تھی، مولانا محمد اویس صاحب
ندوی کے تعلق کی وجہ سے ان کی وہاں بکثرت آمدورفت رہتی تھی، وہ بڑے بے تکلف تھے، اپنے
منصب و عہدہ کا احساس تو ان کو کبھی نہ رہا، لیکن وہاں آکر تو وہ بالکل ہی اس غریب دینی برادری
کے ایک فرد معلوم ہونے لگتے تھے، طلباء حتیٰ کہ چھوٹے بچے تک ان سے مانوس تھے، کسی کو کسی وقت
یہ احساس نہیں ہونے پاتا تھا، کہ وہ یوپی کے سب سے بڑے عہدہ دار سے بات کر رہے ہیں، جمعہ کی
نماز پابندی سے ندوہ کی مسجد میں پڑھتے تھے، وہاں کے چھوٹے سے چھوٹے شعبہ اور چھوٹے
سے چھوٹے کام سے ان کو گہری دلچسپی معلوم ہوتی تھی، تعمیرات، چمن بندی، راستوں اور روشوں
صفائی اور انتظام ہر چیز کے متعلق مشورہ دیتے، اور مدد کے لئے ہر وقت تیار رہتے، ان کی اس روش

اور طرز عمل سے دار العلوم کے منتظمین کچھ ایسے بے تکلف اور بیباک ہو گئے تھے کہ ہر اس چھوٹے سے
چھوٹے کام کے لئے جو کسی سرکاری محکمہ یا کسی حکومتی اہل کار سے متعلق ہوتا انھیں کو زحمت دیتے
اور بجائے آخر میں ان کی طرف رجوع کرنے کے سب سے پہلے ان کی طرف رجوع کرتے۔

اس موقعہ پر لکھنؤ کا وہ تاریخی دن کبھی نہ بھولے گا جب گومتی کے سیلاب (سنہ ۶۰ء) نے
شہر پر قیامت ڈھائی تھی، اپنے جائے وقوع کی وجہ سے ندوۃ العلماء گویا اس طوفان کے
منجدھار میں تھا، طلباء اور اساتذہ کی پوری جماعت جو پانچ سو سے کم نہ ہوگی اس سیلاب میں
بری طرح سے گھر گئی تھی، ان کو رسد پہونچانے کے لئے سرکاری امداد کی ضرورت تھی، ۱۰ اکتوبر سنہ ۶۰ء
کا دن تھا کہ نماز فجر کے بعد ان کی کوٹھی پر پہونچا، اور ان کو صورت حال سے آگاہ کیا وہ اسی وقت
مجھے لے کر اپنی کار پر روانہ ہو گئے، حضرت گنج کی سڑک پر گھٹنوں گھٹنوں پانی تھا، ڈرائیور نے
موٹر لے جانے سے انکار کر دیا، لیکن انھوں نے اس کو موٹر لے جانے کا حکم دیا، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے
بنگلہ پر پہونچے تو ان کی کوٹھی کے سامنے پانی بھرا ہوا تھا، وہ تبدیل مکان کر چکے تھے، وہ اسی وقت
مجھے لے کر کمشنر کی کوٹھی پر آئے، وہاں سے انھوں نے ایک سرکاری کشتی اور ٹرک کے دینے کا آرڈر
حاصل کیا، ملاحوں نے کشتی لے جانے سے انکار کر دیا تو موٹر لانچ کی ضرورت محسوس ہوئی سید صاحب مرحوم نے
پھر کمشنر سے ملاقات کی، اور اگرچہ اپنے عہدہ کے اعتبار سے وہ کمشنر سے بھی بلند حیثیت رکھتے تھے،
اور خاص طور پر سنگھا صاحب جو اس وقت کمشنر کے فرائض انجام دے رہے تھے، ان کا خاص طور پر ادب
اور احترام کیا کرتے تھے، پھر بھی ان کو اس ضرورت کی وجہ سے ان سے بار بار ملنے اور کہنے سننے
میں کوئی تامل نہیں تھا، دوپہر کو ہماری پوری پارٹی نے جو سیلاب زدہ لوگوں کی امداد کے لئے روانہ
ہوئی تھی، ان کے اصرار پر انھیں کے یہاں کھانا کھایا، نماز پڑھی اور روانہ ہوئے، ہم لوگوں کی
خیریت ملنے میں تاخیر ہوئی تو وہ خود مرکز خیریت دریافت کرنے کے لئے تشریف لائے، رات تک

وہ برابر فکرمند اور بے چین رہے، ٹیلہ کی مسجد سے واپس آکر میں نے سب سے پہلے ان کے یہاں حاضری دی، اور خیریت سنائی، تب جاکر وہ مطمئن ہوئے، وقت گزر جاتا ہے، اور وقت کے ساتھ واقعات کی سنگینی اور اہمیت بھی ختم یا کم ہو جاتی ہے، اب کوئی کسی کو کس طرح بتائے کہ اس وقت ہم پر کیا گزری تھی، شہر میں کیسا نفسی نفسی کا عالم تھا، ہم کو اس موقع پر کیسے کیسے تلخ تجربے اور مایوسیاں ہوئیں، اس موقعہ پر اس شریف اور دردمند انسان اس عالی حوصلہ مسلمان کی ہمدردی اور غمگساری نے ہماری کیسی چارہ سازی کی، نہ وہ دن ہم کو کبھی بھولے گا، نہ ان کی شرافت اور آدمیت کا نقش کبھی مدھم پڑے گا۔

سید صاحب کی صحت اور عمر کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے فوری خطرے کا احساس ہو، وہ بڑے مستعد، پابند اوقات اور مشغول انسان تھے، ان کے بعض قریبی اعزہ پاکستان میں تھے، جن کی ملاقات کے لئے وہ گھر والوں کے ساتھ پاکستان جا رہے تھے، کہ ۶ ستمبر ۱۹۶۳ء کو امرتسر کے اسٹیشن پر جب وہ اپنے سفر کے بعض انتظامات کے سلسلہ میں بات کر رہے تھے، اچانک وقت موعود آپہنچا، ان کو اچانک قلبی دورہ پڑا اور انھوں نے وہیں داعی اجل کو لبیک کہا، لکھنؤ میں کسی کو کچھ خبر نہ تھی، اگلے روز یہ خبر بجلی بنکر اہل تعلق اور واقفین کے دل پر گری، ان کی نعش امرتسر سے لکھنؤ لائی گئی، ۷ ستمبر ۱۹۶۳ء کو ان کی کوٹھی کے سامنے کے میدان میں مولانا محمد اویس صاحب ندوی شیخ التفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء نے نماز جنازہ پڑھائی، نماز جنازہ میں اتنی بڑی تعداد تھی، جو بہت کم دیکھنے میں آتی ہے، سارا مجمع متاثر تھا، عیش باغ کے قبرستان میں سرکاری اعزاز کے ساتھ سپرد خاک کئے گئے۔

یوں تو یہاں جو آیا ہے، جانے کے لئے آیا ہے، ان کو بھی یہاں سے جانا ہی تھا، دیر سویر یہ واقعہ پیش آنا، لیکن بڑے خوش نصیب تھے کہ اپنے ساتھ بہت سے ٹوٹے ہوئے دلوں کے جوڑنے کا ثواب، بہت سے دکھے ہوئے دلوں پر مرہم رکھنے کا اجر، بہت سے مظلوموں اور غریبوں کی دعائیں اور

بہت سے مسلم وغیر مسلم دوستوں کا اعتراف شہادت، اپنے ساتھ لے گئے، اور انھوں نے اس شعر پر عمل کر کے دکھا دیا۔ ع

پس چناں زی کہ بعدِ مردن تو

ہمہ گریاں بوند تو خنداں

اپنے وقت کے مشہور عارف حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ نے اپنے خطوط میں اپنے زمانہ کے ایک شریف و مہذب امیر کے متعلق بار بار یہ فقرہ لکھا ہے کہ "وہ نسخۂ آدمیت" ہیں، پھر ان کی وفات ناگہانی پر اپنے دوستوں کو یہ دلدوز فقرہ لکھا جو میرے نزدیک سید صدیق حسن مرحوم پر بھی صادق آتا ہے، اور اسی پر اس مضمون کا خاتمہ کرتا ہوں کہ "مردند و آدمیت بخاک بردند" (دنیا سے چلے گئے اور آدمیت خاک میں مل گئی)
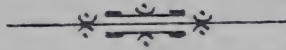
# الحاج سید محمد خلیل صاحب نہٹوری

میرے والد ماجد مولانا حکیم سید عبد الحی رحمۃ اللہ علیہ پر اللہ تعالے کی جو خصوصی عنایات تھیں، ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ ان کو اپنی زندگی میں بڑے مخلص باوفا، جاں نثار اور دیندار احباب اور ہم نشین ملے، ان کو اللہ تعالے نے جو گوناگوں کمالات علمی وادبی ذوق، مرنجاں مرنج طبیعت اور ندوۃ العلماء جیسی ہندگیر تحریک کی طویل عرصہ تک رہنمائی اور نظامت کا طویل موقعہ عطا فرمایا تھا، اس کا تقاضہ تھا کہ ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع اور طویل و عریض ہو، لیکن احباب کے انتخاب میں ان کا خاص معیار اور ذوق و نقطۂ نظر تھا، جس کی وجہ سے ان کا حلقۂ تعارف و حلقۂ خدمت تو بہت وسیع تھا، لیکن حلقۂ احباب مختصر و محدود تھا، مشکل سے چھ سات آدمی ہوں گے، جن کو ان کے احباب خاص اور یاران با اختصاص کہنا صحیح ہوگا، اور جو ان کے ہم نشین، ہمدم اور محرم راز کہے جا سکتے ہیں، بالعموم یہ وہ لوگ تھے، جن کو اویس زمانہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ سے شرف بیعت حاصل تھا، یا حضرت مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلیؒ سے تعلق تھا، اول الذکر مولانا مرحوم کے پیر و مرشد اور ثانی الذکر مولانا کے محبوب استاد تھے، یہی وہ رشتہ اور

نسبت تھی، جس نے ان متفرق عناصر کو جو اپنے مشاغل، خاندان و وطنیت اور تعلیم و نشو ونما کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف تھے، محبت و خلوص کے رشتہ سے منسلک و مربوط کر دیا اور رنگارنگ پھولوں کو ایک ایسے گلدستہ میں تبدیل کر دیا، جو مجموعی طور پر بہت دلکش تھا، اور جس کی نظیر مادیت و خود غرضی اور سطحی تعلقات کے اس دور میں ڈور ڈور ملنی مشکل ہے۔

یہ حلقۂ احباب جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ۶ - ۷ اشخاص سے متجاوز نہ تھا، ان کے نام حسب ذیل ہیں۔

(۱) مولوی نعیم الدین صاحب ہنسوی (۲) منشی رحمت اللہ صاحب (۳) منشی محمد خلیل صاحب (۴) شاہ محمد خاں صاحب (قائم گنج ضلع فرخ آباد) (۵) منشی عبدالغنی صاحب (۶) نواب سید نورالحسن خاں صاحب (فرزند اکبر والا جاہ امیرالملک نواب سید صدیق حسن خانصاحب) ان میں آخرالذکر کے ماسوا جو اپنے والد نامدار کی نسبت اپنی خاندانی وجاہت اور علمی ذوق کی وجہ سے اپنے زمانہ میں معروف و ممتاز تھے، کوئی بھی علمی شہرت نہیں رکھتا تھا، بلکہ ان میں سے سوائے مولوی نعیم الدین صاحب کے کوئی بھی عرفی معنوں میں مولوی و عالم نہ تھا، بلکہ ایک صاحب (منشی عبدالغنی صاحب مرحوم) تو ایسے تھے کہ اردو میں دستخط بھی نہیں کر سکتے تھے، لیکن سب بڑے دیندار و متشرع، باوضع اور مہذب، بلکہ باخدا اور درویش صفت تھے، ان میں سے صرف ایک صاحب (منشی رحمت اللہ صاحب مرحوم) کا تعلق مولانا محمد نعیم صاحبؒ سے تھا، اور ایک صاحب (منشی عبدالغنی صاحب) حضرت مولانا عبدالحی صاحبؒ فرنگی محلی کے حاضر باشوں اور ان کے مواعظ میں شرکت کرنے والوں میں سے تھے، اور باوجود ناخواندگی کے دینی علوم بالخصوص حدیث سے اتنے واقف تھے کہ معمولی مولوی ان کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا تھا، ایک مرتبہ وہ رام پور کے سفر میں مولانا محمد شاہ ... صاحب محدثؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے انھوں نے

یہ سمجھ کر کہ یہ مولانا حکیم عبدالحی صاحب کے یاران بزم میں سے ہیں، ان کو اپنے کتب خانہ کی سیر کرائی جس میں حدیث کی کتابوں کا بہت منتخب ذخیرہ تھا، درمیان درمیان وہ ان کتابوں اور علوم پر تبصرہ بھی کرتے جاتے تھے، اور ان سے گفتگو بھی کرتے تھے، منشی عبدالغنی صاحب مرحوم نے آخر تک یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ ناخواندۂ محض ہیں، اور اس علم کے ابجد شناس بھی نہیں ہیں، یہ اس زمانہ کی صحبتوں کا فیض تھا جن میں علمی مذاق پیدا کرنے کی صلاحیت اس وقت کے بہت سے مدارس سے بھی زائد تھی۔

میں نے اپنے بچپن میں (اس لئے کہ والد صاحب کے انتقال کے وقت میری عمر ۱۰ سال کی تھی) والد صاحب کے پاس جن لوگوں کی زیادہ آمد و رفت دیکھی ان میں ایک صاحب تھے، کشیدہ قامت، چھریرا بدن، نحیف جسم، کتابی چہرہ، سیاہ شرعی داڑھی، سرخ سفید رنگ، کشمیریوں یا سرحدیوں جیسا کھڑا ناک نقشہ، لباس کچھ پنجابیوں جیسا، ٹوپی جہاں تک مجھے یاد آتی ہے، ترکی جو اس زمانہ میں جدید تعلیم یافتہ شرفاء کا لباس تھا، یہ صاحب ڈاکخانہ میں ملازم تھے، اور اس زمانہ کے لحاظ سے متوسط درجہ کے عہدہ پر تھے، یہ ۱۹۲۰ء، ۱۹۲۱ء کی بات ہوگی، اس زمانہ میں ہمارے گھر میں دو نام ساتھ ہی ساتھ لئے جاتے تھے، اور میرے کان ان دونوں سے بیک وقت آشنا ہوئے، گویا دونوں حقیقی بھائی تھے، (حالانکہ دونوں میں کوئی رشتہ نہ تھا) یہ دو نام تھے، منشی رحمت اللہ صاحب، منشی محمد خلیل صاحب۔

جن کا ذکر کر رہا ہوں، اور جو اس مضمون کا عنوان اور موضوع ہیں، وہ منشی محمد خلیل صاحب تھے، جن کا اوپر میں نے حلیہ بیان کیا ہے، اور جن کا انتقال ابھی اگست ۱۹۶۵ء کی آخری کسی تاریخ میں کراچی میں ہوا، اور ہندوستان میں کیا، پاکستان میں بھی... اور شاید کراچی میں اور کراچی کے اس محلہ میں بھی جہاں ان کی تقسیم کے بعد بود و باش تھی، بہت کم لوگوں نے جانا ہو گا کہ

اس تاریخ کو کس مرد خدا نے وفات پائی اور کس گنج خوبی کو انھوں نے کراچی کی سرزمین میں سپرد خاک کیا۔

منشی محمد خلیل صاحب کو بالعموم اس زمانہ میں منشی جی کے نام سے سب بڑے چھوٹے یاد کرتے تھے، جب وہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے تو بعض لوگوں نے ادب و احترام کی بنا پر جس کے وہ شروع سے مستحق تھے، حاجی سید محمد خلیل صاحب کہنا شروع کیا، لیکن بے تکلف دوستوں اور پرانے آشناؤں کی زبان پر اب بھی وہی لقب تھا، جو اس زمانہ میں سربرآوردہ شرفاء ورؤساء (جیسے منشی اطہر علی صاحب رئیس کاکوری، مشیر قانونی انجمن تعلقداران اودھ، منشی امتیاز علی صاحب مدار المہام ریاست بھوپال وغیرہ) کے نام کا جزء تھا، وہ نہٹور ضلع بجنور کے مشہور خاندان سادات کے چشم وچراغ تھے، اس خاندان کے مورث اعلیٰ ایک بزرگ حضرت شاہ کمال تھے، جو غالباً کیتھل یا اس کے اطراف وجوانب میں مدفون ہیں، یہ مشہور قادری بزرگ اور عالی مرتبہ شیخ حضرت شاہ کمال کیتھلی کے علاوہ ہیں، جو ہندوستان میں سلسلۂ قادریہ کے ایک عالی مرتبہ شیخ گذرے ہیں، منشی جی مرحوم کو اخیر زمانہ میں ان کے حالات وتاریخ کی بڑی تلاش تھی، فارسی کی ایک کتاب بھی ان کو دستیاب ہوگئی تھی، جس میں ان کے مورث اعلیٰ اور ان کی اولاد واحفاد کا تذکرہ تھا، اس خاندان میں اعلیٰ انگریزی تعلیم بہت عام تھی، لڑکوں کے علاوہ لڑکیوں میں بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا رواج ہوگیا تھا، اس کے افراد جن کی بڑی تعداد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تعلیم یافتہ تھی، اعلیٰ سرکاری عہدوں پر ممتاز تھے، مشہور ادیب و مزاح نگار سید سجاد حیدر یلدرم جو اب بھی بہت سے لوگوں کو یاد ہوں گے، اسی خاندان کے ایک فرد تھے، اور ان کے متعدد بھائی اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز تھے، دینی تعلیم کا جہاں تک مجھے علم ہے، انقلاب زمانہ سے اس خاندان میں بہت کم رواج رہ گیا تھا، منشی صاحب مرحوم

اس دینی غفلت اور دینی تعلیم سے دوری پر بہت ملول اور دل گیر رہا کرتے تھے، اور خاندان کے بچوں کی دینی تعلیم اور خاندان کی دینی اصلاح و ترقی کے بے حد آرزومند اور اس کے لئے کوشاں رہتے تھے۔

منشی صاحب مرحوم کے والد کا نام سید محمد عرفان تھا، وہ سرحد کے مختلف مقامات پر بسلسلۂ ملازمت مقیم رہے، اس لئے منشی صاحب کی ابتدائی عمر کا زمانہ زیادہ تر پنجاب اور صوبۂ سرحد میں گزرا، یہیں کسی مقام پر انھوں نے نوعمری میں انٹرنس پاس کیا اور ڈاکخانہ میں ملازم ہو گئے، ابتدائے عمر میں انھوں نے اپنے فطری دینی ذوق اور طلب کی بنا پر حضرت قاضی محمد اسماعیل صاحب منگلوری[1] سے بیعت کی تھی، جو اس نواح میں اور یوپی کے مغربی اضلاع سہارنپور، مظفر نگر وغیرہ کے ایک مشہور و مقبول شیخ طریقت اور صاحب تاثیر و فیض بزرگ تھے، ان کو حضرت شیخ محمد تھانوی سے خلافت اور حضرت شیخ محمدؒ کو حضرت میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانویؒ سے خلافت تھی، جن کے خلفاء میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ شیخ العرب والعجم کے لقب سے شہرۂ آفاق ہیں۔

منشی جی مرحوم نے قاضی صاحب کی وفات کے بعد حضرت مولانا فضل رحمٰنؒ گنج مرادآبادی سے بیعت کی، انھوں نے اسی مقصد عالی کے لئے سفر اختیار کیا اور گنج مرادآباد حاضر ہوئے، مجھے انھوں نے بارہا اپنی حاضری گنج مرادآباد کا حال سنایا، افسوس ہے کہ مجھے وہ سنہ یاد نہیں رہا، جب وہ گنج مرادآباد حاضر ہوئے تھے، بہرحال یہ ۱۳۱۳ھ سے پہلے کا واقعہ ہے، اس لئے کہ اسی سنہ میں مولانا کی وفات ہو گئی تھی، یہ تعلق و عقیدت آخر تک

---

[1] مشہور شاعر اصغر گونڈوی اور جگر مرادآبادی نے انہی بزرگ کے صاحبزادے قاضی عبدالغنی صاحب منگلوری کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔

قائم رہی اور اسی تعلق نے لکھنؤ میں اس مختصر سی برادری کا ان کو ایک رکن رکین بنا دیا جس کی اس تعلق و محبت نے بنیاد ڈالی تھی، جب ۱۳۷۶ھ ۱۹۵۷ء میں تذکرہ حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی میرے قلم سے نکل کر شائع ہوا تو انھوں نے اس کو بڑے شغف کے ساتھ پڑھا، اپنی حاضری کے حالات بھی لکھ کر دینے کا وعدہ فرمایا تھا، جو میری کوتاہی سے پورا نہ ہو سکا۔

تعلق ملازمت سے پہلے وہ ایک بار اپنی نوجوانی میں پہلی مرتبہ لکھنؤ آئے، اس سفر کا حال انھوں نے مجھے خود سنایا، فرماتے تھے کہ میری نوجوانی تھی، میں لکھنؤ آیا اور ڈریجے گنج کی سرائے میں ٹھہرا، وہاں نورانی شکل کے ایک نہایت باوجاہت بزرگ ٹھہرے ہوئے تھے، بزرگ اور بابرکت شخص سمجھ کر میں خالی اوقات میں ان کے پاس بیٹھا کرتا تھا، ان کی خدمت میں ان کے ایک عزیز نوجوان حاضر ہوا کرتے تھے، جو لکھنؤ میں طالب علمی کرتے تھے، اور جن کے چہرے سے شرافت و سعادت عیاں تھی، ان بزرگ نے میرا ان طالب علم سے تعارف کرایا اور کہا کہ یہ پردیسی ہیں، ان کو لکھنؤ کے خاص خاص مقامات دکھا دو اور بزرگوں سے ملاؤ، لیکن خواہ اپنی تعلیمی مشغولیت کی بنا پر خواہ دیر آشنا ہونے کی وجہ سے انھوں نے کچھ زیادہ توجہ نہیں کی اور کوئی رہنمائی نہیں کر سکے، اور میں نے خود ہی لکھنؤ کی سیر کی اور بزرگوں سے ملا، یہ نوجوان طالب علم راقم سطور کے والد مولانا سید عبدالحی صاحبؒ تھے، کسے معلوم تھا، کہ یہ اجنبیت، اور یہ سرسری ملاقات عمر بھر کی رفاقت اور ایک لازوال رشتہ کی شکل میں تبدیل ہو جائے گی، اور اسی لکھنؤ میں جہاں وہ مسافرانہ آئے تھے، ان کی زندگی کا طویل ترین اور بہترین حصہ گزرے گا۔

چند برس کے بعد منشی صاحب مرحوم پوسٹ ماسٹر جنرل کے آفس میں ملازم ہو کر آئے،

اور لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کی، عرصہ تک خیالی گنج ان کا قیام رہا، یہ جگہ بازار جھاؤلال سے جہاں مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کا قیام تھا، اور اسی کے قریب احاطہ لعل خاں میں ان کے رفیق کار اور یار غار منشی رحمت اللہ صاحب مقیم تھے، بہت قریب تھی، اس لئے ان تینوں حضرات کی بہت آسانی سے ملاقات ہو جاتی تھی، یہیں سے چند قدم پر محلہ "ماموں بھانجہ کی قبر" میں قدیم دار العلوم ندوۃ العلماء اور دفتر ندوۃ العلماء واقع تھا، اس لئے جو علماء و صلحا اس تحریک سے متعلق تھے، یا جو اس تقریب سے آیا جایا کرتے تھے، ان سے منشی صاحب مرحوم مانوس اور واقف ہوتے رہے، رمضان المبارک میں احباب کا یہ خاص حلقہ مولانا سید عبدالحی صاحب ہی کے ساتھ افطار کرتا اور بڑی رونق اور لطف مجلس رہتا۔

قرب مکانی، کثرت ملاقات، اور سب سے بڑھ کر ایک ہی مرکز روحانی سے وابستگی، پھر مسلک و مذاق کی وحدت نے آپس میں بڑا اخلوص اور بڑا گہرا روحانی تعلق پیدا کر دیا تھا، منشی صاحب مرحوم والد صاحب کے پاس آتے اور گھنٹوں بیٹھتے جو بات سمجھ میں نہ آتی بے تکلف پوچھتے اور فرط خلوص کی بنا پر اعتراض بھی کرتے، اکثر بڑی حسرت اور دلی تڑپ کے ساتھ ان واقعات کا تذکرہ کرتے، اور والد صاحب کی شفقت تحمل اور مروت کا تذکرہ کر کے بہت دل گیر ہوتے، فرماتے تھے کہ ایک روز مولوی صاحب مرحوم نے (عام طور پر ان کے احباب ان کو اسی لقب سے یاد کرتے تھے) مجھ سے فرمایا کہ منشی جی بہت دن سے تمہارے یہاں سے کوئی تحفہ نہیں آیا؟ میں نے عرض کیا کہ محمد جمیل[1] کی تعلیم کے سلسلہ میں بہت زیر بار ہو گیا ہوں اس لئے اس کی نوبت نہیں آئی، فرمایا کہ تحفہ کے لئے کسی اہتمام و تکلف کی ضرورت نہیں، حدیث میں آتا ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کو تحفہ دو اس سے محبت بڑھے گی، کچھ نہیں تو کبھی کبھی دال ہی بھیج دیا کرو،

---

[1] برادر محترم سید محمد جمیل صاحب سابق اکاؤنٹنٹ جنرل، پاکستان۔

اس سے اس بے تکلفی اور محبت کا اندازہ ہوتا ہے، جو جانبین میں تھی، فرماتے تھے کہ کبھی کبھی مجھے روک لیتے اور فرماتے کہ علی کی والدہ نے فلاں چیز تیار کی ہے، اس کو کھاتے جاؤ، فرماتے تھے کہ ایک دن میں آیا تو میں نے دیکھا کہ اوپر صحن میں ٹہل رہے ہیں، اور کچھ پڑھ رہے ہیں، دیر تک میری طرف توجہ نہیں کی مجھے اس کا احساس بھی ہوا کہ آج کس عالم میں ہیں، پھر فرمایا کہ میں ایک شعر پڑھ رہا تھا، اسی میں دیر تک محو رہا، تم کچھ خیال نہ کرنا، پھر یہ شعر پڑھا ؎

جاں بجاناں دہ وگرنہ از تو بستاند اجل

خود تو منصف باش اے دل این نکو یا آں نکو

منشی صاحب مرحوم سالہا سال گزر جانے کے بعد بھی جب اس واقعہ کو یاد کرتے یا یہ شعر پڑھتے تو ان کے چہرہ پر اس کا اثر محسوس ہوتا اور آواز گلوگیر ہو جاتی۔

لکھنؤ کے اس قیام میں وہ ملازمت میں ترقی کرتے کرتے اپنے آفس کے سپرنٹنڈنٹ ہو گئے، ان کی اور منشی رحمت اللہ صاحب کی ذات سے ملازمت کے ضرورت مند شرفا اور غریب خاندان کے نوجوانوں کو بہت مدد ملی اور ان میں سے کئی برسرکار ہو کر اپنے خاندانوں کی کفالت کا ذریعہ بنے، یہیں ان کے بڑے صاحبزادے سید محمد جمیل صاحب نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی، اور ایم، اے، ایل، بی کرنے کے بعد فنانس (مالیات) کے مقابلہ کے آخری امتحان میں بیٹھے، اس امتحان مقابلہ کا ایک واقعہ ناقابلِ فراموش ہے، اور تاریخی حیثیت رکھتا ہے، اس سے منشی صاحب کی دینی حمیت اور خدا پر اعتماد و توکل اور جذبۂ قربانی پر روشنی پڑتی ہے، جو آخر تک ان کی زندگی کا طرّۂ امتیاز رہا، واقعہ یہ ہے کہ جب سید جمیل صاحب انٹرویو کے لئے طلب کئے گئے تو انھوں نے اس زمانہ کے عام رواج و شہرت اور تجربہ کاروں کے بیان کی بنا پر منشی صاحب سے عرض کیا کہ دوستوں اور بہی خواہوں کا

یہ کہنا ہے کہ داڑھی انتخاب میں حارج ہو گی اور اندیشہ ہے، کہ کمیٹی کے ارکان صرف اس کی بنیاد پر نااہل قرار دیں، منشی صاحب نے اس کا جو جواب دیا اور جس کا ان کے تمام حلقۂ تعارف میں عرصہ تک چرچا رہا، وہ ایسا تھا کہ جس کی ہمت بڑے بڑے درویش صفت اور عبادت گذار لوگ اور خاندانی علماء و مشائخ بھی کم ہی کر سکتے ہیں، ایک بڑی اعلیٰ ملازمت کا سوال تھا، جس کی ترقیاں اور اس کا منتہیٰ منشی صاحب کو خوب معلوم تھا، اور ان کو اس وقت کے اپنے معاشی حالات میں اس کی سخت ضرورت بھی تھی، انھوں نے فرمایا کہ رزاق خدا ہے، اور سب کچھ اسی کے اختیار میں ہے، میں ایک امتحان میں کامیابی اور ایک عہدہ کے حصول کے لئے اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ خدا اور رسولؐ کی نافرمانی کی جائے، تم اللہ پر بھروسہ کر کے اسی طرح جاؤ اگر خدا کو منظور ہے تو تمہارا انتخاب ضرور ہو گا، اور کوئی چیز اس میں مزاحم نہیں ہو سکتی، الفاظ تو مجھے یاد نہیں مگر اس کی روح یہی تھی، چنانچہ سید جمیل صاحب داڑھی کے ساتھ گئے اور سب کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ وہ نمایاں طریقہ پر کامیاب ہو گئے اور ان کا جلد ہی تقرر ہو گیا، اور وہ خدا کے فضل و کرم سے برابر ترقی کرتے ہوئے اس کے آخری اسٹیج پر پورے پاکستان کے اکاؤنٹنٹ جنرل کے عہدہ سے نیک نامی کے ساتھ ریٹائر ہوئے۔ اطال اللہ حیاتہ۔

۲ر فروری ۱۹۲۳ء میں والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ نے وفات پائی اور اس بزم صلحاء کی وہ جگہ خالی ہو گئی، جس کو انھوں نے اپنے وجود سے پُر کر رکھا تھا، یہ صدمہ ان کے مخلص و جان نثار احباب کے لئے ایسا تھا کہ جو آخر آخر تک فراموش نہیں ہوا، منشی صاحب نے کراچی منتقل ہو جانے کے بعد بھی جبکہ اس واقعہ پر چالیس برس کے قریب گزر رہے تھے، کئی بار مجھ سے فرمایا کہ جب کبھی رات کو مولوی صاحب مرحوم کا خیال آجاتا ہے تو نیند

اڑجاتی ہے، اور دل کی عجیب کیفیت ہو جاتی ہے، اسی تعلق کا نتیجہ تھا کہ وہ ان کی علمی یادگاروں کو بہت عزیز رکھتے تھے، کئی بار اصرار فرمایا کہ نزہۃ الخواطر (جو عربی کی آٹھ ضخیم جلدوں میں ہے) کا اردو میں ترجمہ کرایا جائے، اس کی اشاعت کی ... ذمہ داری اور اس کے مصارف کا بار بھی اٹھانے پر تیار تھے، لیکن یہ کام نہ ہو سکا، والد صاحب کی ایک مفید اور مقبول طبی تصنیف "طبیب العائلہ" ہے، جس میں بچوں اور عورتوں کے امراض کے مختلف مجرب نسخے اور تدابیر درج ہیں، اور وہ ایک چھوٹے موٹے فیملی ڈاکٹر کا کام دیتی ہے، یہ کتاب عرصہ سے نایاب ہے، انھوں نے کئی بار مجھ سے فرمائش کی کہ میں اس کا کوئی نسخہ مہیا کر دوں، اور وہ اپنے صرف سے کراچی میں چھپوائیں، افسوس ہے کہ اس کی بھی تعمیل نہ ہو سکی، اسی تعلق و محبت کی بنا پر ان کی خواہش تھی کہ ہمارے گھر کی سب تصنیفات اور ہمارا خاندانی نسب نامہ ان کے پاس موجود رہے، اور ان کے اس کتب خانہ کی زینت بنے، جس کو انھوں نے بڑے شوق و اہتمام سے جمع کیا تھا۔

والد صاحب کے انتقال کے بعد منشی صاحب کی محبت اور تعلق میرے برادر معظم و مربی مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب مرحوم کی طرف منتقل ہو گئی، اور ان کو انھوں نے قریب قریب اسی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا جس نظر سے والد صاحب کو دیکھتے تھے، حالانکہ وہ اپنی عمر کے اعتبار سے ان کے لئے بمنزلہ اولاد کے تھے، اسی کشش سے انھوں نے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ہمارے ہی محلہ میں قیام اختیار کر لیا، اور جب تک لکھنؤ میں رہے وہیں رہے۔

وہ ۳۴ء میں ریٹائر ہوئے اور ان کو پنشن ملی، سبکدوش ہونے کے بعد پہلا کام جو انھوں نے کیا وہ حج بیت اللہ کا عزم تھا، اگلے ہی سال جبکہ ان کے لائق فرزند جمیل صاحب

ریاست رامپور کے فنانشل سکریٹری تھے، انھوں نے حج کا احرام باندھ لیا، لکھنؤ سے ان کے یارِ غار منشی رحمت اللہ صاحب اور ان کے پیر بھائی شاہ محمد خاں مرحوم نیز منشی رحمت اللہ صاحب کے فرزند اکبر منشی ہدایت اللہ صاحب مرحوم ساتھ ہوئے، یہ ان کا پہلا سفر حج تھا، بعد میں اللہ نے دو مرتبہ اور ان کو یہ سعادت عطا فرمائی، جس میں سے آخری وہ موقعہ تھا جب مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ علماء و صلحاء کے ایک بڑے قافلہ کے ساتھ ۱۳۸۳ھ میں عازم حجاز ہوئے۔

ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد منشی صاحب مرحوم کا دینی شغف، دینی تعلیم کی اشاعت کا جذبہ اور تبلیغ کا ولولہ بہت نمایاں ہو گیا، وہ نہٹور اور لکھنؤ میں بچوں کی دینی تعلیم اور مکاتب اسلامیہ کے قیام کے بڑے محرک اور مبلغ تھے، اس زمانہ میں بھائی صاحب مرحوم بعض پسماندہ اقوام میں اسلام کی تبلیغ کے بڑے خواہشمند اور اس سلسلہ میں بڑے کوشاں رہتے تھے، منشی صاحب اپنی حلال کمائی سے بڑی اولو العزمی کے ساتھ ان کی مدد فرماتے تھے، بھائی صاحب مرحوم نے مجھ سے کئی بار فرمایا کہ "کئی بار تجربہ کیا ہے کہ جب کوئی تبلیغی کام منشی صاحب کے پیسہ سے کیا، اس میں بڑی کامیابی اور اثر محسوس ہوا" منشی صاحب مرحوم کے محلہ میں قیام اور ان کی تلقین سے کئی آدمیوں کی اصلاح ہوئی، اور انھوں نے بعض اسلامی احکام و شعائر کو اختیار کیا، اور وہ ابھی تک منشی صاحب کے اس احسان کو یاد کرتے ہیں، سید محمد جمیل صاحب کا اپنی اعلیٰ ملازمت کے دوران میں جہاں جہاں تبادلہ ہوتا رہا، مثلاً رام پور، مدراس، دہلی وہاں منشی صاحب بھی ان کے ساتھ قیام فرماتے رہے، اور سب جگہ ان کی دینی تلقین کا سلسلہ جاری رہا، اور جہاں جہاں وہ رہے اہل محلہ یا آنے جانے والے ان کے خلوص، للّٰہیت اور دینی جذبہ سے بڑے متاثر، اور ایک شیخ کی طرح ان کے معتقد رہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد جب سید جمیل صاحب پاکستان منتقل ہو گئے، تو منشی صاحب مرحوم بھی قدرتی طور پر وہیں منتقل ہو گئے، وہاں ان کا دینی جوش، دینی تعلیم کی اشاعت کا ولولہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی غفلت و مادیت سے ان کی بیزاری و فکرمندی اپنی انتہا کو پہونچ گئی۔ میں نے (اور اس میں ذرا مبالغہ یا عقیدت مندی کو دخل نہیں) بڑے بڑے دینداروں، علماء و صلحاء میں ایسی دینی حمیت، اور ایسی دینی تڑپ اور بے چینی نہیں دیکھی، جیسی پاکستان پہونچ کر ان کے اندر نظر آتی تھی، صحیح معنی میں ان کو ہر وقت دین کی خدمت کی دھن اور دین کی لو لگی رہتی تھی، اور یہی ان کا اوڑھنا بچھونا اور ان کا مقصد زندگی بن گیا تھا جب سید جمیل صاحب کا ڈھاکہ تبادلہ ہوا، اور وہ مشرقی پاکستان کے اکاونٹنٹ جنرل بن کر گئے، منشی صاحب ہی کی بے چینی اور تقاضائے قلبی تھا، کہ انھوں نے اشاعت قرآن عظیم کا منظم کام شروع کیا، اور دینی تعلیم اور قرآن مجید کی نشر و اشاعت کے لئے ایک حلقہ بن گیا، پھر جب وہ پورے پاکستان کے اکاونٹنٹ جنرل بن کر کراچی آئے تو منشی صاحب نے اس موقعہ سے پورا فائدہ اٹھایا، وہ دینی تعلیم کی اشاعت کے مقصد اور مکاتب اسلامیہ اور مدارس کے قیام کے لئے ایک جانباز اور انتھک سپاہی بن گئے، جس کو نہ دن میں چین تھا نہ رات کو، جو دیکھتا اس کو محسوس ہوتا کہ وہ گویا اس کام کے لئے مامور اور اس سلسلہ کے ایک مجذوب ہیں، پیدل اور سواری سے سارے کراچی میں پھرتے، اہل خیر سے رابطہ پیدا کرتے، ان مکاتب و مدارس کے مصارف کے لئے چندہ جمع کرتے، اساتذہ فراہم کرتے، ان مکتبوں اور مدرسوں کا دفتری نظام چلاتے، کام کی نگرانی کرتے، غرض وہ ایک شعلۂ جوالہ تھے، جس نے تنہا اپنی ذات سے وہ کام کیا، جو بلا مبالغہ بڑی بڑی انجمنیں اور مستقل ادارے نہیں انجام دے سکتے، افسوس ہے کہ مجھے باوجود کوشش کے بھی صحیح اعداد و شمار، اور وہ تفصیلات مہیا نہیں ہو سکیں، جن کے جانے بغیر ان کے کام کی وسعت، اور ان کی ذات کی عظمت کا

اندازہ نہیں ہو سکتا، لیکن جو لوگ ان سے اور ان کے کام سے واقف ہیں، وہ شہادت دیں گے کہ بغیر روحانیت، اعلیٰ خلوص، قلبی بے چینی، اور رضائے الٰہی کے شوق کے اتنا بڑا کام ان جیسے کبیر السن نحیف البدن، اور کمزور آدمی سے انجام نہیں پا سکتا تھا، ان کی عمر وفات کے وقت سو برس سے کچھ ہی کم تھی، اور اس کام کا بڑا حصہ انھوں نے اس وقت انجام دیا جب وہ اسّی سے متجاوز ہو چکے تھے، لیکن ان کی جفاکشی، مستعدی اور محنت میں کوئی فرق نہ تھا، ان کو دیکھ کر اکثر یہ شعر یاد آتا۔

رہ رواں را خستگی راہ نیست
عشق خود راہ است و ہم خود منزل است

یہ اسی عشق کی کرامت تھی کہ وہ تھکنے کا نام نہیں جانتے تھے، اور کبھی ہار نہیں مانتے تھے، اس پر مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا، وہ غالباً ۱۹۵۶ء سے ایک آدھ سال پہلے لکھنؤ تشریف لائے سید جمیل صاحب بھی ہمراہ تھے، ان کے ایک نیازمند اور میرے مکرم دوست سید محمد یوسف صاحب نے دوپہر میں کھانے پر مدعو کیا، مئی یا جون کا وسط تھا، خوب لو چل رہی تھی، کھانے سے ہم لوگ فارغ ہوئے تو ہم سب کی اندرونی خواہش تھی کہ وہیں، آرام کرنے کا موقع مل جاتا، اتفاق سے کریم النفس میزبان نے اس کی پیش کش بھی کردی، اور منشی صاحب سے عرض کیا کہ دوپہر کو یہیں آرام فرمالیں، وہاں سے مرکز آنا تھا، جو کچہری روڈ پر واقع ہے، جو باوجود زیادہ فاصلہ پر نہ ہونے کے گلیوں کا راستہ تھا، اور سب کو معلوم تھا کہ پیدل چلنا ہوگا، منشی صاحب نے سن کر برجستہ فرمایا کہ آرام کریں ہمارے دشمن، یہ کہہ کر اپنی لاٹھی اٹھائی اور روانہ ہو گئے، وہ عموماً طور پر تیز قدم تھے، تیر کی طرح سیدھا جسم، پر عزم لیکن باتمکنت چال، وہ آگے آگے تھے، اور سارا قافلہ جس میں اکثر جوان تھے، پیچھے پیچھے تھا، ہم سب نے اس پیر کہن سال کی جواں مردی کا

لوہا مان لیا، اور اپنی کم ہمتی پر گردن جھکا لی۔

جب سید محمد جمیل صاحب نے توفیق الٰہی سے پاکستان میں عیسائیت کے بڑھتے ہوئے خطرے کے مقابلہ کا بیڑا اٹھایا، اور اس پر مضامین اور دوروں کا سلسلہ شروع کیا، تو منشی صاحب ہی ان کی اصل پشت پناہ اور سرپرست تھے، اور وہ اس وقت ہمہ تن اس فتنہ عظیم کی مخالفت و مقابلہ کی طرف متوجہ ہو گئے اس سلسلہ میں اپنی بے سروسامانی کے باوجود اہل حکومت اور اہل درد کو متوجہ کرنے میں منشی صاحب کے خلوص، دردمندی، اور سید جمیل صاحب کی سعی جمیل، لیاقت، مطالعہ، اور فکرمندی کا بڑا حصہ ہے، اللہ تعالےٰ ان کی ان مساعی کو قبول فرمائے۔

وہ نہایت کم خوراک تھے، اور شاید اسی میں ان کی صحت کا راز تھا، ان کی صحت کا دوسرا ظاہری سبب ان کی مستعدی، اور کثرت سے پیدل چلنا پھرنا تھا، ان سب سے بڑھ کر اس میں سب سے بڑا دخل ان کی شب بیداری کو تھا جس کے وہ سختی سے پابند تھے، رات کو بہت کم سوتے مسجد کہیں فاصلہ پر ہو، نماز جماعت کے ساتھ پڑھتے تھے، فاطمہ جناح کالونی کراچی میں جہاں ان کا قیام تھا مسجد ان کے مکان سے خاصے فاصلہ پر ہے، بعض مرتبہ ہم جوان بھی ہمت ہار جاتے، لیکن وہ جواں ہمت کہن سال کبھی ہمت نہ ہارتا، پانچوں وقت مسجد ہی میں نماز پڑھتے، اور سوائے شدید مرض کے اس میں کبھی فرق نہ پڑتا، کراچی کے قیام میں اکثر فرماتے تھے، کہ جب میں مسجد میں جاتا ہوں تو ضرور یہ دعا پڑھتا ہوں۔

"اللّٰھم انی اسئلک بحق السائلین علیک وبحق ممشای ھذا الیک" الخ اور ضرور ڈاکٹر عبدالعلی مرحوم کے لئے دعا کرتا ہوں، کہ یہ دعا انھیں نے سکھائی تھی۔

۱۳۷۳ھ ۱۹۵۴ء میں میرے شیخ و مرشد حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری
نے جن سے سید جمیل صاحب کو بیعت کا تعلق تھا، رمضان گھوڑا گلی، کوہ مری، پاکستان میں گزارا،
میں بھی حاضر تھا، منشی صاحب مرحوم، سید جمیل صاحب اور میرا قیام ایک ہی کمرہ میں تھا،
منشی صاحب کا اکثر معمول تھا کہ دن میں پیدل کوہ مری تک تشریف لے جاتے جو کئی میل کا
فاصلہ بھی ہے، اور چڑھائی بھی، وہاں سے کچھ پھل، میوے اور تفکہ کا سامان خرید کر لاتے، اور
پھر بڑے اصرار کے ساتھ اور بزرگانہ غصہ اور حکم کے ساتھ ہم دونوں کو کھلاتے اور بار بار
فرماتے کہ تم لوگوں کی صحت و قوت کیسے قائم رہے گی، کہ تم لوگ تو کچھ کھاتے ہی نہیں، کوئی
ناواقف دیکھتا تو اس کے سوا ہرگز نہیں سمجھ سکتا تھا کہ یہ دونوں (سید جمیل صاحب اور یہ ناچیز)
بڑے چھوٹے حقیقی بھائی ہیں، جو اپنے شفیق باپ کو یکساں محبوب اور عزیز ہیں، منشی صاحب
کی یہ ادا ان کی زندگی بھر کا معمول تھا، کھلانے، ضیافت کرنے میں ان کو ایسا مزہ آتا تھا، اور
وہ اس کے اس قدر حریص تھے کہ شاید دینی فرائض کے بعد یہی ان کی زندگی کا سب سے اہم اور
دلچسپ ترین کام تھا، خاص طور پر اہل علم و اہل صلاح کی دعوت و ضیافت کا ان کو
بڑا شوق تھا، حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے ان کو خصوصی عقیدت
تھی، مولانا کا قیام لکھنؤ میں، ہمارے محلہ میں بھائی صاحب کے یہاں ہوتا تھا، اور گویا یہ
ایک طے شدہ اصول تھا، اسی کے ساتھ یہ اصول بھی تھا کہ صبح کی چائے منشی صاحب کے
یہاں ہوگی، منشی صاحب بڑی اولوالعزمی اور بڑے ہی ذوق کے ساتھ یہ خدمت انجام
دیتے، انواع اقسام کی چیزیں ہوتیں اور بالعموم بڑی اِفراط کے ساتھ، ان کے متعلق
واقفین میں یہ لطیفہ مشہور تھا کہ وہ دوا اور مقویات میں بھی دوسروں کو شریک کرتے
ہیں، اور بغیر دوسروں کو شریک کیے کوئی چیز ان کے حلق سے نہیں اترتی، اور ہم لوگ سنتے تھے کہ

بھائی جمیل صاحب جب ان کے لئے کوئی مقوی حلوہ یا خوش ذائقہ اور بے ضرر معجون بنواتے تو اس کی مقدار میں اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ وہ دوسروں کو بھی کھلائی جائے گی، علماء کا ایسا احترام کرنے والا، اور ان کی خدمت سے اس طرح خوش ہونے والا میں نے اس طبقہ میں جس سے ان کا تعلق تھا، بہت کم دیکھا، ان کی زندگی کی ساری دلچسپیاں، اور ان کی عمر بھر کی وابستگی اسی طبقہ سے مخصوص تھی، کسی عالم خصوصاً مخلص عالم کی خواہ اس سے کیسے ہی سیاسی اختلاف کے اسباب ہوں، اہانت، یا تنقید ان سے برداشت نہیں ہوتی تھی، اور ان کی موجودگی میں کم ہی کوئی اس کی جرأت کر سکتا تھا۔

والد صاحب کے ساتھ اسی لازوال تعلق اور ان کی بزرگانہ شفقت و محبت کا نتیجہ تھا کہ باوجود اس کے کہ کراچی میں میرے متعدد قریبی اعزہ ہیں، اور بعض گھر تو ایسے ہیں، جن کو میں اپنے گھر ہی کی طرح سمجھتا ہوں، ان کو چھوڑ کر کسی اور عزیز کے یہاں اترنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، ان کی مبارک زندگی میں میرا بیرون ہند کے سفروں کے سلسلہ میں پانچ مرتبہ کراچی اترنا ہوا، ہر مرتبہ انھیں کے دولت کدہ پر ٹھہرا، ان کی شفقتوں کو دیکھکر مجھے ہمیشہ یہی محسوس ہوتا تھا، کہ مرے والد صاحب کے حقیقی بھائی ابھی دنیا میں ہیں، اور وہ بھی یہی سمجھتے تھے کہ ان کی عزیز ترین اولاد ان کے گھر مہمان ہے، جو مسرت ان کو میرے قیام سے ہوتی تھی، اس کا اثر مدتوں دل پر رہے گا، پیرانہ سالی کے باوجود وہ ہوائی اڈہ پر پہونچنے کی کوشش فرماتے تھے، اور اپنے ساتھ لے کر آتے، میں دست بوسی میں بہت محتاط ہوں، ایک دو بزرگ ہستیوں کے سوا جن سے میرا تعلق ارادات مندانہ اور معتقدانہ ہے، میں کسی کا ہاتھ نہیں چومتا، لیکن آخری سالوں میں میرا معمول تھا، اور یہ معمول مجھے بہت عزیز تھا، کہ جب ملاقات ہوتی یا جب رخصت ہوتا تو ان کی دست بوسی کرتا، اس میں صرف

اس تعلق ہی کو دخل نہ تھا جس کا اوپر بار بار تذکرہ آیا ہے، بلکہ ان کی بزرگی، ان کی للّٰہیت اور ان کی مقبولیت کو بھی دخل تھا، میں ان کو اہل اللہ کے گروہ میں سمجھتا تھا، اور اللہ تبارک وتعالےٰ کی کریم ذات سے یہی امید ہے کہ ان کے ساتھ ایسا ہی معاملہ ہوا ہوگا، خدا رسیدہ درویشوں اور مقبول بارگاہ ہستیوں کے لئے یہ بالکل ضروری نہیں کہ وہ شیخ طریقت یا بڑے عالم وفاضل ہی ہوں، لباس دنیا میں کتنے درویش صفت، اور اولیاء اللہ ہیں، اور قرآن مجید نے تو یہ کہہ کر حجت ہی تمام کردی ہے کہ "اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ، الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ" معلوم نہیں بزرگوں کا مقولہ ہے یا کوئی اثر وروایت، لیکن اس کا مضمون بالکل صحیح ہے۔" أولیائی تحت قبائی لایعرفھم سوائی" (مرے دوست اولیاء اللہ میری قبا کے دامن کے اندر مستور ہیں، جن کو مرے سوا کوئی نہیں پہچانتا۔)

مری آخری ملاقات یکم نومبر ۱۹۶۴ء کو ہوئی، اتفاق سے اسی روز منشی صاحب مرحوم کے ایک عزیز کے یہاں رات کو کھانا تھا، کھانا تو بہانا تھا، منشی صاحب نے سادات نہٹور کا، اور خاص طور پر اپنے قریب ترین عزیزوں کا ایک دینی حلقہ بنایا تھا جس کے ایک ممبر کی طرف سے ہر ہفتہ کھانا ہوتا تھا، وہاں منشی صاحب اپنے اعزہ کو جو تقریباً سب ان کے عزیز اور ان کے خورد تھے، اپنی دینی اصلاح، احکام شرع کی پابندی، اور خاندان کے بچوں کی دینی تعلیم کی طرف متوجہ فرماتے، اور بتاتے کہ سادات کا اصل منصب اور مقام کیا ہے، منشی صاحب کی خواہش تھی کہ میں ساتھ چلوں اور کچھ خطاب بھی کروں، میں اسی روز یورپ کے ایک بہت طویل سفر سے پہونچا تھا، اور رات بھر کا جگا تھا، بھائی جمیل صاحب نے مجھے آرام کرنے کا مشورہ دیا، لیکن منشی صاحب کی جواں ہمتی اور دینی بے چینی کے سامنے یہ کوئی عذر نہ تھا،

ان کا ایما ہوا کہ میں ضرور ساتھ چلوں میں نے تعمیل کی، اور وہاں جاکر میں نے بھی کچھ عرض کیا، اور منشی صاحب نے اپنی فطری دلسوزی اور دردمندی کے ساتھ کچھ نصائح فرمائے، ذی قعدہ ۱۳۸۴ھ ۱۹۶۵ء میں جب میں رفیق محترم مولانا محمد منظور نعمانی صاحب اور عزیزی مولوی معین اللہ صاحب کی معیت میں عازم حجاز ہوا، تو ہمارا سفر کراچی ہی کے راستہ سے ہوا، یہ خیال کرکے بڑی مسرت ہوتی تھی کہ منشی صاحب کی زیارت ہوگی، اور شب کے چند گھنٹے ان کی صحبت بابرکت میں گذریں گے، اسی بنا پر بھائی جمیل صاحب کو اپنے کراچی پہونچنے کی اطلاع تار سے دی، لیکن کراچی کے ہوائی اڈہ پر کسی کو نہ پاکر حیرت بھی ہوئی اور تشویش بھی، تھوڑی دیر کے بعد منشی صاحب کے ایک داماد افتخار صاحب کا ٹیلیفون آیا کہ میں پہونچ رہا ہوں، میرا انتظار کیجئے، دیر کے بعد وہ ایرفرانس کے ہوٹل میں پوچھتے پوچھتے پہنچے، اور انھوں نے بتایا کہ منشی صاحب پر نمونیہ کا حملہ ہوا ہے، اور بالکل صاحب فراش ہیں، بھائی جمیل صاحب بھی ان کی تیمارداری کی وجہ سے نہیں آسکے، میں اطلاع کیلئے آیا ہوں، ہم لوگوں کو صبح صادق سے پہلے ہی بحرین روانہ ہونا تھا، اس لئے ملاقات سے محروم رہے، کسے معلوم تھا کہ یہ ان کی آخری علالت ہے، اور اب اس جہان فانی میں ان سے ملاقات نہ ہوسکے گی، بالآخر کئی ماہ علیل و کمزور رہ کر اگست ۱۹۶۵ء کی کسی آخری تاریخ کو وہ اپنے خالق سے جا ملے، اور جس ساعت کے لئے انھوں نے یہ سب تیاریاں کی تھیں وہ آپہونچی۔

منشی صاحب بڑے خوش نصیب اور صاحب اقبال تھے، اللہ تعالٰی کے ان پر بڑے انعامات تھے، ان میں سے ایک انعام یہ تھا کہ ان کو عمر طویل، صلاح، عبادت و خدمت کے ساتھ ملی، اس میں حدیث کی اطلاع کے مطابق ان کی صلۂ رحمی، حُسن سلوک اور صدقات کو بہت دخل تھا، جس کو درازیٔ عمر میں بڑا دخل ہے، دوسرا یہ کہ اللہ تعالٰی نے سعادت مند اولاد عطا فرمائی، برادر محترم سید محمد جمیل صاحب (اللہ تعالٰی ان کو اپنے والد کی عمر اور سعادت عطا فرمائے) اپنی سعادت مندی، والد کی خدمت، ادب و احترام میں نہ صرف ممتاز بلکہ اس زمانہ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ذی حیثیت اولاد کے لئے قابل تقلید اور لائق رشک ہیں، ان کی ساری کمائی والد کی خدمت، اور ان کے احکام و منشا کی تعمیل کیلئے وقف تھی، لوگوں نے ان کو اس مرتبہ اور وجاہت کے باوجود جو اُن کو حاصل تھی، والد کے جوتوں کے فیتے کھولتے دیکھا ہے اور یہ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ والد صاحب استنجا کے لئے گئے ہوئے ہیں، اور وہ ان کا کوٹ لئے انتظار میں کھڑے ہیں،

اللہ تعالیٰ نے منشی صاحب کو تین فرزند دئیے، سید محمد جمیل صاحب، سید محمد اسماعیل صاحب اور سید محمد ابراہیم سلمہ پھر وہ اپنی زندگی میں اپنے نواسوں اور پوتوں کو دیکھ کر، اور ان کی خوشیوں میں شریک ہو کر گئے، تیسرا بڑا انعام یہ تھا کہ وہ ابتدائے جوانی سے عمر کے آخری مرحلہ تک علماء و صلحاء مشائخ اور دین کے بے لوث خادموں سے متعلق اور منسلک رہے، اور یہی ان کا حلقۂ محبت و تعلق تھا، ان کے دوستوں، اور تعلق والوں میں ہمیشہ صحیح العقیدہ عالم اور مخلص دینی کارکن رہے، ہندوستان میں جب تک رہے، مولوی بدیع الزماں خاں صاحب فتح پوری، مولوی فضل الرحمان صاحب ندوی مقیم سرہند شریف، مولانا سید طلحہ صاحب، مولوی عبدالرؤف صاحب مرحوم وغیرہ سے ربط رہا، حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام اور کام کا تذکرہ سب سے پہلے اس عاجز نے انھیں سے عظمت کے ساتھ سنا، حضرت مولانا حسین احمد صاحب کی خدمت میں خصوصیت کے ساتھ حاضر ہوتے، اور وہ منشی صاحب کے ساتھ خصوصی معاملہ فرماتے، دہلی قرول باغ میں رہے تو مولانا محمد سلیم صاحب (مدرسہ صولتیہ مکہ) جو اس زمانہ میں دہلی ہی میں مقیم تھے، مولانا عبدالسبحان صاحب، اور ارکان ندوۃ المصنفین کے ساتھ نشست و برخاست رہی، حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ سے بھی عقیدت اور صحبت تھی، پاکستان منتقل ہوئے، تو حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ اور پاکستان کے صلحاء اور علماء سے ربط و ضبط رہا، حضرت رائے پوریؒ جب لاہور میں قیام فرماتے تو اہتمام کے ساتھ لاہور تشریف لاتے اور بھائی جمیل صاحب کے ساتھ ہفتوں حضرت کی خدمت میں مقیم رہتے، اور پابندی سے حضرت کی مجالس میں شرکت کرتے، کراچی میں مولانا محمد یوسف صاحب بنوری بانی دارالعلوم نیوٹاؤن سے بہت رابطہ اور انس تھا، اور اپنے بزرگوں کی طرح ان کا احترام فرماتے تھے، مولانا نے ان کو دارالعلوم کا خازن اور سرپرست بھی بنا رکھا تھا، اللہ تعالیٰ نے انتقال کے بعد بھی وہیں ان کو جگہ دی جہاں چاروں طرف قال اللہ اور قال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آوازیں بلند ہوتی رہتی ہیں۔ ع

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے<br>
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

# چند ہستیاں

## کچھ دوست کچھ بزرگ

# مولانا مسعود عالم ندوی[1]

۲۹ء کی ابتدا میں مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم سے پہلے پہل تعارف ہوا، وہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے ایک نوجوان طالب علم تھے، عمر تقریباً ۱۸، ۱۹ سال، کشیدہ قامت، چھریرا بدن، صاف رنگ، کتابی چہرہ، کشادہ پیشانی، زبان میں لکنت لیکن قلم میں اسی قدر روانی، انھوں نے دار العلوم ندوۃ العلماء کے آخری سال (درجۂ ہشتم) کا امتحان دیا تھا، اور تکمیل ادب کے طالب علم تھے، وہ عربی ادب و انشاء میں شروع ہی سے ممتاز تھے، زمانۂ طالب علمی میں بھی وہ اپنا روزنامچہ عربی میں لکھتے تھے، ان کا یہ عربی ذوق سب کو معلوم تھا، اور جو لوگ ان کے ذوق میں کسی طرح کے شریک تھے، ان کا وہ مرکز اور سرحلقہ تھے، راقم سطور کو بھی اپنے عرب اساتذہ کی صحبت اور فیضِ درس سے اس کا چسکا تھا، اور وہ بھی عربی میں لکھتا پڑھتا رہتا تھا، اس وقت میرا تعارف ندوی حلقہ میں سابق ناظم ندوۃ العلماء (مولانا حکیم سید عبد الحی رحمۃ اللہ علیہ) کے فرزند اور اس وقت کے ناظم ندوۃ العلماء (ڈاکٹر سید عبد العلی) کے چھوٹے بھائی اور ایک ایسے طالب علم کی حیثیت سے تھا، جس کو اپنی نوعمری کے باوجود عربی ادب و انشاء سے شغف تھا، اس وقت مسعود صاحب شبلی دار الاقامہ میں مقیم تھے، مولانا شبلی مرحوم فقیہ دار العلوم کے پاس میرا ایک فقہ کا سبق تھا، اور مسعود صاحب کا کمرہ راستہ میں پڑتا تھا، ایک آدھ بار گذرتے ہوئے مسعود صاحب نے مجھے اندر آنے اور کچھ دیر بیٹھنے کی دعوت دی، میرے لئے دلچسپی کا ایک سامان یہ تھا کہ عربی رسائل و مجلات جو طلبہ کے دار المطالعہ میں آتے تھے، وہ دن میں اکثر مسعود صاحب

---

[1] یہ مضمون "چراغ راہ" کراچی کے "مسعود عالم ندوی نمبر" کیلئے لکھا گیا، خفیف سی ترمیم و اضافہ کے ساتھ اس مجموعہ میں شامل کیا جا رہا ہے

کے پاس رہتے، دمشق کے مشہور علمی و ادبی رسالہ "المجمع العلمی" کے دیکھنے کا سب سے پہلے وہیں اتفاق ہوا۔

کچھ عرصہ بعد طلبۂ دار العلوم کی روایات کے مطابق مسعود صاحب نے عربی کا ایک قلمی رسالہ جاری کیا، جس کا نام "الفائد" تھا، اس کے مضمون نگاروں کیلئے یہ شرط تھی کہ وہ اپنے مضامین خود اپنے قلم سے لکھ کر شامل کریں، رسالہ کے ممتاز مضمون نگاروں میں ہونہار ایڈیٹر کے علاوہ مولانا عبد الرحمٰن کاشغری ندوی[۱]، مولانا محمد ناظم ندوی (سابق شیخ الجامعۃ العباسیہ بہاولپور) اور جواں مرگ ادیب ابو یوسف بہاری مرحوم تھے، اس رسالہ کے شمارے ابھی تک طلبہ کی انجمن میں محفوظ ہیں، انکو دیکھ کر آج بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس قلمی رسالہ کا نوعمر مدیر ایک دن ملک کا بہت بڑا ادیب اور پختہ کار صحافی بنے گا۔

مسعود صاحب مرحوم زمانہ طالب علمی ہی میں بڑی بے چین اور عالی حوصلہ طبیعت رکھتے تھے، وہ تحریک خلافت اور اس کے افکار و ادبیات سے بہت متاثر تھے، ہم لوگوں میں ان کا مطالعہ سب سے زیادہ وسیع اور تازہ تھا، ان میں شروع سے انقلابی رجحانات اور انگریزی حکومت کے خلاف شدید نفرت پائی جاتی تھی، اور وہ احیاء خلافت اور اسلامی اقتدار کی بازگشت کے متمنی تھے، وہ ترکی کی انجمن اصلاح و ترقی کے نوجوانوں کی طرح سوچتے اور منصوبے بناتے تھے، طلبہ اور نوجوانوں میں انقلابی خیالات کی تخم ریزی اور دینی جذبات کی پرورش کے لئے مختلف تجاویز سوچی جاتی تھیں، اس سلسلہ میں مطالعہ کے مراکز اور حلقے بنانے کا پروگرام تھا، اسی زمانہ کا ایک خط کسی طرح پڑا رہ گیا ہے، جو ایک تاریخی یادگار ہے، یہ خط مرحوم نے اس ناچیز کو لکھا تھا، اس میں ان کے بلند عزائم ان کی ادبی پختگی اور ان کی غیر معمولی صلاحیتیں اچھی طرح جھلکتی ہیں، اور "الہلال" کا اسلوب تحریر صاف نمایاں ہے، یہ خط ۲ ذی الحجہ ۵۰ھ کا لکھا ہوا ہے، اور بہار شریف سے لکھا گیا ہے، جہاں مولانا تعطیل میں مقیم تھے، لکھتے ہیں۔

---

[۱] مولانا عبد الرحمٰن کاشغری ندوی عربی کے قادر الکلام شاعر تھے، لغت پر ان کی بڑی اچھی نظر تھی، وہ شیر بنگال مولوی فضل الحق صاحب کی دعوت پر جو اس وقت بنگال کے وزیر اعلیٰ تھے، مدرسہ عالیہ کلکتہ منتقل ہو گئے تھے، تقسیم ملک کے بعد وہ مدرسہ عالیہ، ڈھاکہ منتقل ہوئے، اور اخیر تک وہیں رہے، ۱۹۷۱ء کے شروع میں ڈھاکہ میں انتقال کیا، ان کے اشعار کا مجموعہ "الزہرات" (جس پر مولانا مسعود عالم صاحب نے مبسوط مقدمہ لکھا ہے) اور "امثال اللغتین" کا سلسلہ مضامین جس میں انھوں نے عربی، اردو کے ہم معنی ضرب الامثال جمع کئے ہیں، ان کی علمی یادگاریں ہیں، غفر اللہ لہ۔

برادر مخلص

ازکی التحیات

"محبت نامہ ملا لیکن وقت پر شافی جواب نہ لکھ سکا کیوں؟ افسوس! کہ عذر لنگ بیان کرنے کو جی نہیں چاہتا، صرف معذرت خواہ ہوں ـــــ جذبات کا ہجوم ہے، خیالات کا انبار ہے، دل چاہتا ہے کہ دل کھول کر رکھدوں، درد جگر کا تقاضا ہے کہ صفحہ قرطاس کو داغہائے جگر سے لالہ زار بنادوں، کیا لکھوں؟ اپنی تباہی کا مرثیہ، مگر اب یہ بھی بے سود جنت نگاہ کشمیر کی گلگوں پیراہنی کا ذکر کروں[1] کیا فائدہ؟ کہ اخبارات کے ذریعہ آپکے دل ودماغ بھی بادہ سے مخمور ہوں گے کیا اپنی بدنصیبی کا ماتم کروں، شیوخ قوم تو سنت سجاد کی یاد تازہ کر رہے ہیں، عالمان دین کو زنجیریں پہنائی جارہی ہیں، اور ہم نشہ غفلت سے ایسے سرشار ہیں کہ سروں پر جوں بھی نہیں رینگتی، تمام چیزیں اپنی جگہ پر توجہ کی محتاج اور دل وجگر کو ذوق جگر کاوی دے رہی ہیں، لیکن میں نہ شب دوشنبہ کی شغل مے خواری کا ذکر چھیڑوں گا اور نہ صبح سعادت کی کیف آور رنگینیوں سے بحث کروں گا، بلکہ اجازت دیجیے تو افسانۂ دیرینہ کے متعلق کچھ منتشر وغیر مربوط جملے پیش کردوں۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، میں اپنے خیالات میں مستقل ہوں، جو کچھ بن پڑتا ہے، اس سے باز نہیں رہتا، معنوی اعتبار سے ایک شاخ قائم کرنے میں بھی کامیاب ہو جاؤں گا، لیکن سوال یہ ہے کہ آپ کن خطوط پر اس کام کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں، اگر پروپگینڈہ اور دعایت پر اعتماد ہے تو اب تک اس کا بھی کافی سامان نہیں، افراد کا پیدا کرنا تو مشکل کام ہے، جبتک تربیت گاہ کا انتظام نہیں ہوتا، یہ کام صحیح طور پر نہیں ہو سکتا ـــــ اس وقت اصل میں ہم خیال حضرات کی تنظیم اور ان میں کام کی صلاحیت پیدا کرنا ہے، مختلف جگہوں میں جمعیت نوجوانان اسلام کی بناڈالنی چاہیے جس کا ظاہری

---

[1] اس زمانہ میں کشمیر کی تحریک چل رہی تھی اور بہت سے مسلمان رہنما وعلماء قید وبند میں تھے۔

مقصد تبادلۂ افکار، زبان و ادب کی ترقی، مطالعہ جرائد و اخبارات ہو ــــ یہ تمام باتیں ابتدائے کار سے پیش نظر ہیں، امید ہے کہ آپ تمام امور پر غور فرما کر جواب سے مطلع فرمائیں گے۔"

مسعود صاحب اس وقت درجۂ تکمیل کیلئے اپنا تحقیقی مقالہ (THESIS) تیار کر رہے تھے، جس کا عنوان یہ تھا کہ "اسلام کے آنے کے بعد عربی شاعری کا زوال نہیں ہوا، بلکہ اس نے ترقی کی" اس مضمون میں انھوں نے مورخین ادب کے اس مشہور دعوے کو چیلنج کیا تھا کہ اسلامی اثرات سے عربی شاعری کے زور، روانی اور مضامین کی آمد میں فرق پڑ گیا تھا، اسلامی عقائد و آداب اور اس کی تہذیب و تربیت اور ماحول نے اس کو پابند و بے روح بنا دیا تھا، اس سلسلہ میں انھوں نے اسلامی دور کے شعراء کا کلام اپنے ثبوت میں پیش کیا تھا، اور تفصیل سے اس پر بحث کی تھی کہ اسلام نے زندگی کے اور شعبوں کی طرح ادب و شاعری کو بہت کچھ عطا کیا، اسی خط میں اس مضمون کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں "میں نے ڈاکٹر صاحب[1] کے نام ایک جوابی کارڈ روانہ کیا تھا، مگر جواب سے محروم ہوں، میرا مؤدبانہ سلام عرض کر دیجئے، انشاء اللہ میں "اطروحہ"[2] جلد از جلد بھیج دوں گا، ایک صاحب کو املا کرا دیتا ہوں، دیکھئے کب تک پایۂ تکمیل تک پہونچتا ہے۔"

اس زمانہ کا ایک اہم واقعہ جس نے ہم سب کی زندگی پر خاص اثر ڈالا، یہ تھا کہ شیخ تقی الدین الہلالی المراکشی ہمارے دار العلوم میں استاذ ادب ہو کر آئے، موصوف عالم عربی کے ممتاز ترین محقق و ادیب اور صرف و نحو میں سند و حجت کا درجہ رکھتے تھے، ان کی بول چال اور عام تحریر کی زبان پوری عربی دنیا میں اپنی صحت، سلاست، برجستگی اور عربی محاورات میں بے نظیر ہے۔

شیخ کے آنے سے دار العلوم میں ایک نئی ادبی زندگی اور چہل پہل پیدا ہو گئی، مسعود صاحب اگرچہ دار العلوم سے فارغ ہو گئے تھے، اور صاحب قلم و ادیب تھے، لیکن شیخ کی ملاقات کے بعد انھوں نے اندازہ کر لیا کہ انکی طالب علمانہ زندگی کا اختتام نہیں، بلکہ اس کا ایک نیا دور شروع ہو رہا ہے، یوں تو ہم سب شیخ کے تلامذۂ خاص اور مریدان با اختصاص تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ انکی ذات سے سب سے زیادہ مسعود صاحب نے فائدہ اٹھایا اور پھر اس فائدہ کو اپنے قلم و اخلاص سے چمکایا۔

---

[1] ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب ناظم ندوۃ العلماء [2] تھیسس یا تحقیقی مقالہ جو پی۔ ایچ۔ ڈی کے طالب علم پیش کرتے ہیں۔

غالباً ۳۲ء تھا کہ میں نے شیخ کی معیت میں بنارس، اعظم گڑھ، مئو اور مبارک پور کا سفر کیا، دار المصنفین کے زمانۂ قیام میں مولانا سید سلیمان ندویؒ اور ہلالی صاحب نے دار العلوم سے ایک عربی رسالہ کے اجراء کا فیصلہ کیا، اور اس کی ادارت کے لئے قرعۂ فال قدرتی طور پر مسعود صاحب کے نام پڑا، ان سے زیادہ نہ صرف ہمارے حلقہ میں بلکہ سارے ہندوستان میں اس کام کے لئے کوئی موزوں نہ تھا، محرم ۵۱ھ سے رسالہ "الضیا" کا اجراء ہوا، رسالہ کے مضمون نگار اگرچہ بہت محدود تھے، اور پرچہ پتھر پر چھپتا تھا، جو عرب قارئین کے مذاق طبیعت کے بہت خلاف اور ان کی نگاہوں پر بار ہوتا ہے، لیکن زبان کی صحت حسن انشاء اور مضامین کی بلندی کی وجہ سے وہ ممالک عربیہ کے سنجیدہ علمی و ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوا، اور اس کا بڑی گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا گیا، اور موقر و وقیع رسائل و مجلات نے دل کھول کر اس کی داد دی، لبنان کے امیر ناصر الدین نے جو اپنی ادبی تنقید اور ادبی ذکاوت جس میں بدنامی کی حد تک نامور تھے اپنے اخبار "الصفا" میں بڑے بلند کلمات کے ساتھ تبصرہ کیا، غالباً اسی میں تھا کہ یہ ہندی رسالہ اپنی صحت زبان اور عربیت میں خود ممالک عربیہ کے بہت سے رسالوں پر فوقیت رکھتا ہے، اسی طرح "صیدا" (شام) کے مشہور ادبی رسالہ "العرفان" نے بڑا زوردار تبصرہ کیا، بغداد کا عیسائی محقق "انتاس کرملی" نے جو اپنی ادبی گرفتوں میں بہت خوردبین اور حرف گیر واقع ہوا تھا مسعود صاحب کو ایک خط میں "علامہ" کے لفظ سے خطاب کیا اور لکھا کہ اگرچہ آپ کم عمر ہیں، لیکن آپ کے علم و فضل کی وجہ سے میں مجبور ہوں کہ آپ کو علامہ کے لفظ سے خطاب کروں۔

اس رسالہ میں علاوہ ادبی مضامین کے عالم اسلام کی اہم خبریں اور ہندوستان کے سیاسی حالات پر تبصرہ اور تلخیص بھی ہوتی تھی، مسعود صاحب یہ حصہ بھی پوری روانی اور بے تکلفی سے لکھتے تھے، وہ عموماً مضامین قلم برداشتہ لکھتے تھے، اور اپنے مسودہ میں بے تکلف حک و اصلاح کرتے، میں بھی ایک

طرح سے رسالہ کا ایک مستقل مضمون نگار ہونے کی وجہ سے شریک ادارت تھا، اور بہت غور و فکر کے ساتھ بنا سنوار کر لکھنے کا عادی تھا، جو مضامین جلد دینے کے ہوتے تھے، یا ادارتی یا صحافی قسم کے ہوتے وہ مسعود صاحب خود ہی لکھتے تھے، جس مضمون کو بہت اہتمام سے لکھنا ہوتا تھا، وہ اکثر میرے سپرد کرتے، اور کہتے تھے کہ میں تو پیشہ ور لکھنے والا (PROFESSIONAL) ہوں اس سرعت کے باوجود ان کے ہر مقالہ میں ادبی چاشنی اور زبان کا لطف ہوتا تھا۔

سنہ ۵۲ھ میں ہلالی صاحب دار العلوم سے علیحدہ ہو کر زبیر (عراق) چلے گئے اور وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی، مسعود صاحب پر یہ جدائی بہت شاق تھی کہ ان کو ابھی اپنے فاضل استاذ سے بہت کچھ حاصل کرنا تھا، انھوں نے اس کا عزم کر لیا کہ وہ دار العلوم سے چھٹی لیکر کچھ عرصہ کے لئے ہلالی صاحب کے پاس "زبیر" میں قیام کریں گے اور علوم عربیہ میں مزید ان سے استفادہ کریں گے، ۷ محرم سنہ ۵۳ھ کے خط میں لکھتے ہیں۔

"ہلالی صاحب زبیر میں قیام پذیر ہیں، میرا ارادہ ہو رہا ہے کہ ایک سال کے لئے ہو آؤں، ڈاکٹر صاحب راضی ہیں، اور پوری تائید کے ساتھ، مسعود[۵] صاحب پہلے متامل تھے، مگر اب راضی معلوم ہو رہے تھے، مگر ان کا پہلے مطالبہ یہ ہے کہ علی میاں کو بلا کر "الضیاء" سپرد کر دو، اس کے بعد رخ کر سکتے ہو، سید صاحب کو خط لکھا ہے، اب صرف ان کے جواب کا انتظار ہے، اگر حسب توقع انھوں نے اجازت دیدی تو میرا سفر صرف آپ کے اختیار میں رہے گا، ادارت و ترتیب کا آپ ذمہ لے لیں، دوڑ دھوپ کا کام کوئی اور صاحب کر لیں گے۔"

پھر اس کے ایک ہفتہ بعد ۱۴ محرم کو لکھتے ہیں۔

---

۵ مولانا مسعود علی ندوی ناظم دار المصنفین اعظم گڑھ و رکن انتظامی دار العلوم ندوۃ العلماء۔

"مقصود سفر کیا ہے، کیا کہا جائے؟ آپ میرے خیالات و ارادوں سے بخوبی واقف ہیں، پہلے ہلالی صاحب کے پاس "زبیر" حاضر ہوں گا اور وہیں قیام کروں گا، اگر حالات و مصارف نے اجازت دی تو بغداد، عراق، فلسطین تک کا ارادہ ہے، مگر ابھی خواب ہی خواب ہے۔"

اس خواب کی تعبیر اس طرح نکلی کہ صوبہ کی حکومت نے خفیہ پولیس کی رپورٹ پر پاسپورٹ منظور نہیں کیا، مسعود صاحب تو عراق نہ جا سکے مگر میں دار العلوم آ گیا، ہم لوگ دار العلوم کی بالائی عمارت کے جنوب مغربی حصہ میں ایک کمرہ میں مقیم تھے، مسعود صاحب "الضیا" کی ادارت کے علاوہ دار العلوم میں ادب و انشاء کے معلم بھی تھے، میں ادب و تفسیر کا معلم اور "الضیا" کا مستقل مضمون نگار تھا، ہمارا کمرہ، ہماری رہائش گاہ، "الضیا" کا دفتر اور عربی ذوق رکھنے والوں کا مرکز تھا، "الضیا" کے تبادلہ میں بکثرت رسائل و مجلات آتے تھے، ان کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم لکھنؤ میں نہیں، بلکہ کسی عرب شہر میں ہیں، ہر وقت عرب ادباء و اہل قلم پر تبصرہ و تنقید اور مختلف ادبی موضوعات پر اظہار خیال اور مذاکرہ رہتا، عرب ڈاک ہاتھوں ہاتھ لی جاتی اور بڑے شوق سے پڑھی جاتی، اس وقت یہ ہمارا چھوٹا سا کمرہ اور محدود ماحول اس ہندی فضا میں عربی کا جزیرہ بنا ہوا تھا، شب و روز ساتھ گذرتے، صبح و شام کی تفریح بھی ساتھ ہوتی، اس زمانہ کے نظام اوقات کی ہلکی سی جھلک یہ ہے کہ صبح کی نماز کے بعد مسعود صاحب پابندی سے قرآن مجید کی تلاوت کرتے، اکثر بہت انہماک اور لطف و ذوق کے ساتھ وہ قرآن مجید پڑھتے، اس کے بعد دار العلوم کے اسباق یا ان کی تیاری میں ہم لوگ لگ جاتے، دس گیارہ بجے ڈاک آ جاتی جس کا بڑا حصہ عربی ڈاک پر مشتمل ہوتا، مصر و شام کے اکثر مشہور رسالے تبادلے میں آتے تھے، بعض مصنفین اور دار الاشاعت "الضیا" میں جو (ہندوستان بھر کا

واحد عربی رسالہ تھا) تبصرہ و تنقید کے لئے اپنی مطبوعات بھیجتے، اکثر کھانے کے بعد تھوڑا سا وقت ان کے مطالعہ میں گذرتا، پھر اطمینان کے وقت کے لئے ان کو رکھ دیا جاتا، دوسرے وقت اکثر "الضیاء" کے مضامین کی ترتیب و تحریر میں شمولیت ہوتی، عصر کے بعد ساتھ ہی تفریح کو جانا ہوتا، رات کے کھانے کے بعد کچھ وقت چہل قدمی میں صرف ہوتا، اس دوران میں اکثر عربی اردو کے شعراء اساتذۂ فن کے اشعار زبان پر ہوتے، اردو میں مسعود صاحب کو غالبؔ و اقبالؔ کے کلام کا ذوق تھا، وہ اکثر ان کے اشعار پڑھتے تھے، عربی کے جدید شعراء میں شوقی اور معروف الرصافی کے کلام سے مناسبت تھی، معاصرین میں سے مسعود صاحب ہندوستان کے اندر مولانا آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی کے افکار و مضامین اور مولانا محمد علی مرحوم کے اخلاص و عزیمت سے بہت متاثر تھے، عالم اسلامی میں سے سب سے زیادہ وہ امیر شکیب ارسلان اور علامہ رشید رضا کے معترف تھے، امیر شکیب ارسلان کے حواشی "حاضر العالم الاسلامی" اس وقت ہم لوگوں کی گویا "بیاض" تھی، خود بھی بار بار پڑھتے اور دوسروں کو مشورہ دیتے، مسعود صاحب امیر کی شخصیت سے بھی متاثر تھے، اسی زمانہ میں طلبہ کی "انجمن الاصلاح" میں ایک بڑا معرکہ کا ادبی مباحثہ ہوا، جس کا موضوع تھا، "اکبر رجل فی العالم الاسلامی" (عالم اسلامی کی سب سے بڑی شخصیت) مقررین اس جوش و خروش و سنجیدگی اور اصرار کے ساتھ اس بحث میں حصہ لے رہے تھے، گویا عالم اسلام کی سب سے بڑی شخصیت کا انتخاب اسی وقت کرنا ہے اور اس کے سر پر عظمت کا تاج رکھنا ہے، اس بحث میں شام کے ایک اخبار نویس سیاح محمود خیر الدین الدمشقی، اساتذہ میں سے ہم دونوں اور شیخ محمد العربی المراکشی نے اور طلبہ میں سے اکثر ہونہار نوجوانوں نے حصہ لیا، اس موقع پر جن لوگوں کے نام لئے گئے ان میں سے اندرون ملک کی شخصیتوں میں مولانا آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی، علامہ اقبالؔ مرحوم

اور باہر کی شخصیتوں میں امیر عبدالکریم الریفی، علامہ سید رشید رضا، اور امیر شکیب ارسلان تھے،
مسعود صاحب کے رجحان اور صدر جلسہ (راقم سطور) کے فیصلہ نے امیر شکیب ارسلان کا پلڑا
بھاری کر دیا، اور حاضرین کی اکثریت نے ان کے حق میں فیصلہ کیا، اس جلسہ کی صدائے بازگشت
مصر میں سنی گئی، امیر شکیب ارسلان نے مسعود صاحب کو ذاتی خط لکھا جس میں ان کے حسن ظن
کا شکریہ ادا کیا، اور بہت صفائی سے لکھا کہ یہ جامہ صرف محمد عبدالکریم الریفی کے قد و قامت
پر راست آتا ہے، اور وہی اس دور کی سب سے بڑی شخصیت ہیں، جنھوں نے اپنی خداداد
جنگی قابلیت اور عبقریت سے فرانس کے چھکے چھڑا دئے، امیر مرحوم نے اپنی کتاب
"السید الرشید رضا او اخاء اربعین سنۃ" میں اس جلسہ کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے، اس جلسہ
سے ہم لوگوں کی اس وقت کی ذہنی سطح اور ذوق و مطالعہ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

مسعود صاحب اس زمانہ میں ترقی پسند سیاسی خیالات رکھتے تھے، اور ان کو ان
جماعتوں سے جو حکومت کے ساتھ تعاون کرتی یا اس کے حق میں نرم تھیں، شدید نفرت تھی،
وہ انگریزی اخبار پابندی سے پڑھتے تھے، اور سیاسی جماعتوں اور افراد پر آزادانہ تبصرہ
کرتے تھے، وہ اپنے خیالات کے اظہار میں بڑے جری، دلیر اور صاف گو تھے، وہ شدت سے
اپنے افکار و معتقدات کے داعی و مبلغ تھے، اور مشکل سے کوئی مجلس ان تذکروں سے
خالی جاتی، طلبہ کا ایک حلقہ ہمیشہ ان کے گرد رہتا جن پر وہ شفقت بھی فرماتے، ضرورت
ہوتی تو عتاب و احتساب سے بھی کام لیتے، ان سے بے تکلف کام بھی لیتے، اور ان کی
علمی رہنمائی بھی کرتے، طلبہ ان کی تلخ و شیریں کو انگیز کرتے اور ان سے استفادہ کرتے رہتے
ان کا تعلق اپنے عزیز شاگردوں سے بڑے بھائی و اتالیق کا سا تھا، درجہ میں وہ بڑے
اہتمام اور دلچسپی سے پڑھاتے اور باہر بھی وہ اپنے مخصوص طلبہ سے ذاتی تعلق رکھتے، اسی زمانہ

میں ہم چند نوجوان اساتذہ نے اپنے استاذ شیخ تقی الدین کے اصول کے مطابق عربی زبان کی تعلیم کا ایک نیا تجربہ شروع کیا، جو پورا کا پورا طرز مستقیم (DIRECT METHOD) کے اصول پر تو نہیں تھا، لیکن اس سے بہت قریب تھا، اس تجربہ کی کامیابی نے ہماری بڑی ہمت افزائی کی، اور اس نے دار العلوم کے ساتھ ہماری دلچسپی اور انہماک کو بہت بڑھا دیا۔

"الضیا" کا حلقۂ اشاعت محدود اور مضمون نگاروں کا حلقہ محدود تر رہا، وہ عرب ممالک میں جس قدر وقعت و قبولیت رکھتا تھا، ہندوستان میں اسی قدر غیر معروف اور نامعلوم تھا، اشاعت کی کمی اور مصارف کی زیادتی نے اس کے منتظمین کو اسکے التواء پر مجبور کیا، اور رسالہ چار سال نکلنے کے بعد بند ہو گیا، اب مسعود صاحب صرف دار العلوم کے ایک استاد اور معلم ادب تھے، لیکن اس رسالہ کے ذریعہ ان کی شہرت دور دور تک پہونچ گئی تھی، اور وہ ممالک عربیہ کے ادبی حلقوں میں روشناس ہو چکے تھے، "الضیا" کے علاوہ وہ مصر کے "الفتح" میں بھی اکثر لکھتے رہتے تھے، وہ خود "الفتح" اور اس کے مدیر استاذ محب الدین الخطیب کے بڑے قائل و گرویدہ تھے، مسعود صاحب کا بھی شمار "الفتح" کے مخصوص و ممتاز مقالہ نگاروں میں تھا، اسی رسالہ میں ان کی سب سے عزیز تصنیف "حاضر مسلمی الہند و غابرہم" بالاقساط چھپنی شروع ہوئی۔

مسعود صاحب اسباق و تعلیم کے علاوہ طلبہ کی علمی و ذہنی تربیت سے بھی غافل نہیں تھے، ہر دور زندگی میں دعوت کا رنگ ہمیشہ ان پر غالب رہا وہ جہاں رہتے تھے اپنے خیالات کی برابر اشاعت کرتے رہتے تھے، جو طلبہ ان کے پاس زیادہ اٹھتے بیٹھتے تھے، ان کو منتخب کتابوں کے مطالعہ کا مشورہ دیتے رہتے، انھوں نے ایسی کتابوں کی ایک فہرست مرتب کی تھی، جو نوجوانوں کو اسلامی انقلاب کے لئے تیار کرے، اور ان کے اندر تجدید و اصلاح کی خواہش اور ماحول سے

بے اطمینانی پیدا کرے، وہ ذہنی طور پر سید جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہٗ، سید عبدالرحمٰن الکواکبی اور ہندوستانی مصنفین میں سے مولانا شبلی، مولانا آزاد اور علامہ اقبال کی تحریروں اور نتائج افکار کے مطالعہ کا مشورہ دیتے، الہلال کے فائل، مولانا محمد علی کے مضامین اور "سچ"[۱] کی جلدوں کا ضرور مشورہ دیتے، طلبہ دارالعلوم کی انجمن کے ساتھ ایک اچھا کتب خانہ بھی تھا جس کے منتظم طلبہ تھے، مسعود صاحب مرحوم نے بڑی توجہ اور محنت کے ساتھ طلبہ کے مطالعہ کے لئے ان کتابوں کی فہرست مرتب کی تھی، جو ان کے ذہن کی اسلامی تربیت کرے، یہ فہرست عرصہ تک "جمعیۃ الاصلاح" میں محفوظ رہی اور اس سے طلبہ نے فائدہ اٹھایا، عرب انشاپردازوں میں وہ سب سے زیادہ مصطفیٰ صادق الرافعی کے قائل تھے، اور ان کو اس دور کا مجدد ادب مانتے تھے، نئے ادیبوں میں وہ خود اپنے استاذ شیخ تقی الدین، امین ناصر الدین، محمد البہبہاوی اور محب الدین الخطیب کے مداح تھے، ڈاکٹر طٰہٰ حسین سے ان کے غیر اسلامی خیالات اور اپج کی وجہ سے تعصب رکھتے تھے، اور اس کی تعریف ان سے برداشت نہیں ہوتی تھی، یہ دینی حمیت اور بغض فی اللہ ان کی طبیعت کا خاصہ تھا، اور واقعہ یہ ہے کہ اس میدان میں وہ اپنے رفقا سے ممتاز تھے۔

لباس اور کھانے کے معاملہ میں وہ بہت سادہ مزاج اور زاہد سے واقع ہوئے تھے، جہاں تک مجھے علم ہے، وہ آخر تک سودیشی کے پابند رہے، اور اس دور میں تو وہ کھدر استعمال کرتے رہے، وہ طبعاً نظافت پسند تھے، کئی کئی شیروانیاں رکھتے تھے، لیکن ان کے رنگ اور ڈیزائن کے انتخاب کا ذوق نہیں رکھتے تھے، اور اس کا اعتراف بھی کرتے تھے، حساب بہت صاف رکھتے تھے، اور اکثر کہا کرتے تھے کہ اس میں مروت سے کام نہیں لینا چاہیئے، یہ فقرہ ان کی زبان زد تھا، "حساب جو جو بخشش سو سو" وہ خرچ کرنے میں بڑے فراخ دل اور عالی ہمت تھے لیکن قرض کے

---

[۱] مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی کا شہرۂ آفاق ہفتہ وار رسالہ جو اب "صدق جدید" کے نام سے نکلتا ہے۔

بارے میں وہ اپنے لئے بھی محتاط تھے، اور دوسروں کے لئے بھی اس کا نتیجہ تھا کہ ہر وقت کے ساتھ رہنے والوں کے تعلقات پر کبھی اثر نہ پڑتا تھا۔

عقائد میں وہ ہمیشہ سے سلفی تھے، توحید واتباع سنت میں ان کو تصلب تھا، اس بارہ میں وہ کسی کا لحاظ نہیں کرتے تھے، کچھ تو خاندانی اثر تھا، ان کے ننہالی بزرگ اہل حدیث علماء اور مولانا عبداللہ صاحب غازی پوری کے شاگرد تھے، شیخ تقی الدین الہلالی کی صحبت نے (جو سخت اہل حدیث تھے) اس رنگ کو اور شوخ کر دیا، ان کے استاذ حدیث مولانا حیدر حسن خاں صاحب صدر مدرس دارالعلوم ندوہ اگرچہ اتنے ہی سخت حنفی تھے، لیکن ان کے فیض تعلیم نے اس رجحان میں کوئی کمی پیدا نہیں کی، کچھ اہل صادق پور کے تعلق وطنیت، کچھ خاندانی روایات واثرات، اور زیادہ تر مطالعہ نے ان کے دل میں حضرت سید احمد شہیدؒ حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور ان کی پاکباز جماعت سے ایک والہانہ تعلق اور عاشقانہ ارادت پیدا کر دی تھی، ان کے تمام خیالات ورجحانات میں ہمیشہ یہ چیز شامل رہی کہ وہ جس چیز کو صحیح سمجھ لیتے تھے، اس پر شدت سے قائم رہتے تھے، اور کثرت سے اس کی تبلیغ کرتے تھے، کچھ ان کی صحت، کچھ ان کی افتاد طبع اور کچھ ان کے حالات نے مزاج میں حدت اور ذکاوت حس پیدا کر دی تھی، جو بعض اوقات مخاطب کو غیر معمولی معلوم ہونے لگتی تھی۔

اس وقت ہم لوگوں کا ذوق تمام تر علمی وادبی تھا، ابھی ہم میں پختگی اور گہرائی نہیں آئی تھی، کوئی واضح اور منظم دعوت بھی سامنے نہیں آئی تھی، کوئی مؤثر وطاقتور دینی ماحول بھی سامنے نہیں تھا، ایسی شخصیتیں اور ایسی صحبتیں بھی مفقود تھیں، جن کو دیکھ کر ہم کو کچھ اپنی زندگی میں خلا محسوس ہو، اور اس کو پر کرنے کی تڑپ اور خواہش پیدا ہو، ہم لوگ گویا ایک علمی وادبی حصار میں تھے، باہر کی دنیا دیکھنے کا ہم کو بہت کم اتفاق ہوا تھا، کچھ خاندانی رجحان، کچھ خاص مطالعے اور

کچھ بعد کے حالات نے مجھے بعض ایسی شخصیتوں سے تعارف و قرب کا موقع دیا جن کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ صرف ادب، فکر و نظر اور معلومات و مطالعہ ہی سب کچھ نہیں، بلکہ کچھ اور کیفیات و حالات بھی ہیں، جو مخصوص ذہانت، مطالعہ اور ضوابط سے نہیں پیدا ہوتے، یعنی یقین، اخلاص، ایمان و احتساب شدت تعلق مع اللہ، ذوق دعا، درود و محبت، جس طرح سے احکام و ضوابط کا سلسلہ محفوظ و متوارث چلا آرہا ہے، اسی طرح یہ احوال و کیفیات بھی یکسر ضائع اور ناپید نہیں ہو گئے ہیں، اور جس طرح پہلی چیز کے لئے وسائل اساتذۂ فن اور نظام ہے، اسی طرح دوسری چیز کا مآخذ و ذرائع موجود ہیں، اور اس کے لئے بھی اہتمام و طلب کی ضرورت ہے، یہ چیز روح شریعت اور فقہ باطن ہے، اس کا منصوص نام کتاب و سنت کی زبان میں تزکیہ و احسان ہے، بعد کی صدیوں میں معلوم نہیں کیوں اس کا نام تصوف پڑ گیا اور اس کے ساتھ بعض ایسی چیزیں شامل ہو گئیں جن کا حقیقتاً شریعت میں ثبوت نہیں، یہ نام اور بعد کے لوازم بہت سی طبیعتوں کے لئے موجب بُعد اور وحشت بن گئے، لیکن جو شخص اس شعبہ کی روح کے حاملین اور فن کے مجتہدین کو دیکھتا ہے، اس کے اندر یہ اذعان پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کی اصل اور اس کی روح شریعت کا عین مطلوب اور نبوت کی میراث ہے، وہ آسانی سے اصل و زوائد میں امتیاز کر لیتا ہے۔

مسعود صاحب کی علمی مشغولیت بڑھتی گئی، اور ان کے خیال میں پختگی آتی گئی، ان کے مخصوص حالات نے اس کا موقع نہیں دیا کہ وہ اس شعبہ کے صاحب نظر اور مجتہد الفن اشخاص سے ملتے، اور ان کی رائے و نظریات میں کچھ تبدیلی واقع ہوتی، اس کے برخلاف بُعد کے اسباب کچھ بڑھتے ہی چلے گئے، جس کا اندازہ ان کی تحریروں اور تنقیدوں سے ہوتا ہے، لیکن چونکہ وہ سلیم الطبع اور طالب حق تھے، اس لئے جب کبھی کتاب و سنت کی روشنی میں ان سے گفتگو کی جاتی تو وہ تزکیہ و احسان کی ضرورت تسلیم کرتے اور اعتراف کرتے تھے کہ اس کے بغیر

کچھ اہم خلا رہ جاتے ہیں۔

۱۳۵۶ھ (۱۹۳۷ء) میں دارالعلوم میں کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ مسعود صاحب وہاں کے قیام سے کچھ غیر مطمئن ہو گئے، اسی زمانہ میں "مدینہ" بجنور کی طرف سے ایک پیش کش ہوئی اور مسعود صاحب شریک ادارت ہو کر بجنور چلے گئے، اور انھوں نے اپنے فرائض خوش اسلوبی اور لیاقت سے انجام دیئے، عالم اسلام کی واقفیت اور بالخصوص ممالک عربیہ کے حالات میں وہ سند (AUTHORITY) کا درجہ رکھتے تھے، وہ ہمیشہ سے شستہ اور شگفتہ اردو لکھتے تھے، اور کامیاب صحافی بن سکتے تھے، ان کے بہت سے دوستوں نے ان کی اس نئی ذمہ داری کو پسند کیا، قارئین مدینہ نے بھی ان کے ادارتی شذرات و مضامین پر پسندیدگی کا اظہار کیا، لیکن خود ان پر دارالعلوم ندوۃ العلماء کی جدائی شاق تھی، اور خالص صحافتی زندگی ان کی افتادِ طبع اور علمی مذاق کے خلاف تھی، ۶ر جمادی الاول ۱۳۵۶ھ ۱۹۳۷ء کو میرے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں۔

> "میں یہاں آیا حالات سے مجبور ہو کر، لیکن معلوم ہوا کہ عربی ختم ہو جائے گی دو ہی ہفتوں کے بعد ارادہ متزلزل ہو گیا، اتنے میں "فاران" بند ہونے لگا شبیر محمد صاحب[1] کو ایک جگہ مطلوب تھی، سید صاحب مدظلہ کا گرامی نامہ آیا کہ تم ندوہ چلے آؤ، کوئی صورت نکالی جائے گی، اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ، فوراً تیار ہو گیا، شبیر محمد صاحب بھی خوش ہوئے، مالک اخبار کو کچھ رنج ہوا، ڈاکٹر صاحب مدمجدہ نے بھی اپنی عنایت سے مسرت کا اظہار کیا ہے، اب اس ناچیز کو اور کیا چاہیئے، میرے پاس اس دوران میں متعدد خطوط آئے، مدینہ ہر جگہ جاتا ہے

---

[1] مولانا ابو اللیث ندوی (سابق امیر جماعت اسلامی ہند) جو اس وقت فاران کے ایڈیٹر تھے۔

تمام ملنے والوں نے اپنی بڑی بھلی رائے دی، لیکن اب تک اس کا خط نہیں آیا
تھا جس کی محبت میرے دل میں جاگزیں ہے، محبت نہیں، بلکہ احترام[1]، سچ کہتا
ہوں کچھ تکلیف محسوس کر رہا تھا، معلوم نہ تھا کہ آپ کہاں ہیں، ورنہ خود لکھتا
آخر آج صبح نوید بشارت ملی، اور دل کا ایک بوجھ دور ہو گیا، میں اس کا تصور
نہیں کر سکتا تھا کہ آپ دارالعلوم سے الگ ہوں، اور نہ اپنے لئے پہلے تصور
کر سکتا تھا، لیکن حالات سے مجبور ہو گیا، پھر کشمش لے جا رہی ہے، سید صاحب
کا فرمان ایک بہانہ بن گیا، آپ سے دل کی بات کہہ دی، ورنہ لوگوں کو
یہی لکھا ہے کہ سید صاحب کی حسب ہدایت جانا پڑ رہا ہے"

غالباً چھ سات مہینے ان کا قیام بجنور رہا، پھر وہ جیسا کہ انھوں نے خط میں لکھا ہے دارالعلوم آگئے، لیکن یہاں شاید دو ہی ایک مہینہ قیام کیا تھا کہ پٹنہ خدا بخش خاں مرحوم کے مشہور کتاب خانہ کے مرتب فہرست (CATALOGUER) ہو کر چلے گئے، وطن اور والد صاحب (مولانا حکیم عبدالشکور صاحب مدظلہ) سے قرب اور کتب خانہ کی پرسکون و خاموش فضا کی وجہ سے ان کو وہاں زیادہ راحت تھی، اور معاشی حیثیت سے بھی زیادہ فائدہ میں تھے، ۲۲ شوال ۵۶ھ کو پٹنہ سے وہ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"اطمینان کی بات یہ ہے کہ میرے پٹنہ آجانے سے والد ماجد، اعزہ احباب
سب کو انتہائی مسرت ہے، پٹنہ کا ذی علم اور باذوق طبقہ بھی مطمئن ہے، اور
سب خواہش مند ہیں کہ میرا قیام یہاں مستقل ہو جائے کتب خانہ کی فضا بہت
پرسکون ہے، کوئی افسر، نہ ماتحت، نفیس عمارت، الماریاں دیدہ زیب،

---

[1] اس سے مراد راقم سطور کی حقیر ذات ہے۔

کتابوں کی جلدیں نظر فریب، کام خاموشی کا، میرے کام کے نگراں عظیم الدین صاحب ہیں۔[1]

آخر میں انگریزی کی تصحیح کے لئے ایک انگریز پروفیسر سے مشورہ لینا پڑتا ہے، کام بڑا ہے، کام پانچ سال کا ہے، تو سیع ہو جائے گی، شاید وقت نہ ہو، ممکن ہے یہ رائے قبل از وقت ہو، بہر صورت دو تین مہینے میں صحیح اندازہ ہو جائے گا، البتہ مستقل (PERMANENT POST) کے حصول کے لئے کچھ جد و جہد کرنی پڑے گی، جس کے لئے ابھی نفس تیار نہیں، ممکن ہے آئندہ اس ماحول سے متاثر ہونے کے بعد یہ چیز بھی کر لوں ایک ندوی (حاجی معین صاحب[2]) کی مثال تو بہت حوصلہ افزا ہے، وہ آٹھ سال رہنے کے بعد بھی ذرہ برابر نہیں بدلے، کسی سے نہیں ملے اور اسی جرم میں مستقل جگہ نہ مل سکی۔"

لیکن وہ ماحول کے اثرات اور تقاضوں کے باوجود "ملازمت پیشہ" لوگوں کی سطح پر نہ اتر سکے، ان کی خودداری اس مقام کے شرائط پورا کرنے سے مانع رہی، پھر بھی ان کی اہلیت اور امتیازی قابلیت ان کے لئے سب سے بڑی سفارش تھی، اور اسی بنا پر ان کی توسیع ہوتی رہی، ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"مستقل تو نہیں ہوا کہ یہ سعادت ڈاکٹر سید محمود صاحب[3] کے آستانہ پر جبیں سائی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی، جو کچھ بلا منت غیرے اور اللہ کے فضل و کرم سے ہو سکا وہ یہ ہے کہ ایک سال کی توسیع ہو گئی ہے، اور جب تک

---

[1] ڈاکٹر عظیم الدین احمد پی ایچ، ڈی سابق پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور و پروفیسر پٹنہ یونیورسٹی [2] حاجی معین الدین صاحب ندوی مصنف "مہاجرین" وغیرہ۔ [3] ڈاکٹر سید محمود صاحب مرحوم جو اس وقت بہار میں وزیر ترقیات تھے۔

کام باقی ہے، اسی طرح توسیع ہوتی رہے گی، میرے تخمینہ سے بقیہ کام کم از کم سات سال کا ہے، یوں بڑھ جائے تو تعجب نہیں، اللہ کا ہر حال میں شکر ہے، کتنے مجھ سے اچھے اور ہونہار نوجوان بہت معمولی تنخواہوں پر کام کر رہے ہیں، کتنے بیکار ہیں، مجھ میں کوئی زیادہ اہلیت نہیں، کارساز حقیقی کا احسان ہے کہ اس نے ایک عاجز و درماندہ کے واسطہ سے ایک شریف خاندان کی عزت اور ظاہری خودداری کا سامان بہم پہونچایا۔" فالحمد للہ اولاً و آخراً۔"

مسعود صاحب زمانہ ملازمت اور پٹنہ کے قیام کے دوران میں اپنے عقائد و خیالات میں زیادہ پختہ اور ان کی تبلیغ و اشاعت میں زیادہ سرگرم و پرجوش ہو گئے تھے، نامناسب فضا اور ناجنس رفیقوں نے دبی ہوئی چنگاریوں کو روشن اور مشتعل کر دیا، اسی زمانہ کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"آپ کو حیرت ہوگی میں یہاں آکر "عقیدۃً" زیادہ مولوی، بلکہ ملا ہو گیا ہوں مولانا سجاد صاحب سے بارہا ملاحدہ اور دہریوں کی مخالفت اور سیاسی حوصلہ شکنی پر گفتگو آئی، ممکن ہے، دہلی کی نحبی کانفرنس میں وہ اسے پیش بھی کریں، رات تشریف لے گئے ہیں، دنیا نئی ہے، فضا بدلی ہوئی، پورے پٹنہ میں کوئی اپنا ہم خیال نہیں کسے داستانِ درد سناؤں۔"

(یکم جمادی الثانیہ ۵۷ھ)

وہ اپنے مخصوص تعلیمی خیالات و افکار میں جن کے مجموعہ کا نام "ندویت" ہے نیز مذہبی خیالات و عقائد جن کے مجموعہ کا نام مشہور عوام "وہابیت" ہے، نیز خاص اپنے علمی و ادبی ذوق میں جس کا عنوان "عربیت" ہے، خاصے متصلب تھے، اور جہاں رہتے، اس کی دعوت و تبلیغ

سے باز نہ رہتے، پٹنہ سے وہ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"آپ کی یاد کس کس تقریب سے آتی ہے؟ کیا کہوں؟ میرا یہ اعتقاد ہے کہ آپ عبدالسلام صاحب[1] اور مسعود سے زیادہ دنیا میں کوئی تین آدمی ہم خیال نہیں ہو سکتے، لیکن کس قدر تکلیف کی بات ہے کہ ایک الگ غیر اور اجنبی ماحول میں پڑا ہوا ہے، بہر حال یقین رکھئے کہ میں یہاں جب تک رہوں گا "ندویت" مخصوص قسم کی "وہابیت" اور "عربیت" پھیلاتا رہوں گا خواہ اس راہ میں شہید کیوں نہ ہو جاؤں"۔

(۲۱ ذی قعدہ ۵۶ھ)

"وہابیت" میں وہ سخت سے سخت تر ہو گئے خصوصاً جب انھوں نے شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب کی سیرت لکھنی شروع کی تو یہ نشہ دو آتشہ ہو گیا، ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"آج کل وادی نجد میں ٹھوکریں کھا رہا ہوں، اس بادیہ پیمائی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہابیت اور زیادہ تلخ بلکہ دو آتشہ ہو گئی ہے، گو اب تک صرف لفظی وہابیت ہے، عمل سے محروم ہوں، اعظم گڈھ گیا تھا، لفظ تصوف سے نفرت ذرا کم ہوئی، پر ابھی زبان سے اقرار نہیں، آپ کے سامنے یہ اقرار محض بہ سبیل اعتراف ہے"۔

(۱۲ ربیع الاول ۵۹ھ)

مسعود صاحب کمال اتاترک کی لادینیت، شعار اسلام کے الغاء و ابطال اور عربی تہذیب و ثقافت کی مخالفت کی بنا پر اس سے سخت بیزار اور ناقد تھے، اس بارہ میں وہ ہندوستان

---

[1] مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی بانی ادارۂ تعلیمات اسلام لکھنؤ و سابق ناظم دینیات جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی۔

کے عام علماء کے جو (الغاء خلافت کے بعد بھی) کمال کے عقیدت مند اور قصیدہ خواں تھے، اور عام طور پر ترکی جدید کے اندرونی حالات و حقائق سے بے خبر، قدیم اطلاعات اور جذبات پر تکیہ کرتے تھے، سخت شاکی تھے، ایک خط میں بڑی صفائی سے لکھتے ہیں۔

"میں آج کل پوری جمیعۃ العلماء سے نالاں ہوں، ایک بزرگ مراد آباد سے "قائد" نکالتے ہیں، ایک نمبر کمال نمبر انھوں نے شائع کیا ہے، جس میں کمال اتاترک کی تمام بیہودگیوں کی تائید کی ہے، اور فرید وجدی کی طرح لچر تاویلیں کی ہیں، اس خاکسار نے سب کے علی الرغم کمال کی موت پر خوشی منائی نہیں تو کم از کم دل میں محسوس کیا اور سب سے برملا اظہار کیا، بحثیں کیں، کتنوں کو قائل کیا، کتنوں سے (اپنی قدامت پسندی کا) فتویٰ لیا، "معارف" میں ایک مضمون (دنیا میں اسلام) نظر سے گذرے گا، شاید دنیا میں دو آدمی (علی میاں اور عبدالسلام صاحب) اس سے پورا پورا اتفاق کریں مضمون طویل ہے، شاید پچاس ساٹھ صفحوں میں آئے۔"

صرف کمال اتاترک کی حد تک نہیں، اہل قلم، ادباء اور اہل فن میں بھی وہ جس میں لادینی رجحان اور دین و عقیدہ کی گمراہی پاتے اس کو معاف کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، اور اس کا اعزاز پسند نہیں کرتے تھے، مصر کے مشہور ادیب ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے اسلوب نگارش اور زبان سے ایک دنیا مسحور ہے، لیکن مسعود صاحب اپنے عزیز دوست کو لکھتے ہیں، جو ایک ادبی انتخاب (مختارات من ادب العرب) میں طٰہٰ حسین کو بھی جگہ دے رہا تھا۔

"طٰہٰ حسین کی شمولیت پر بھی مجھے اعتراض ہے، آپ کہیں گے ادب میں دین کیوں؟ سو اول تو طٰہٰ حسین ہر معنی میں بے ادب ہے، اور دوسرے اب کچھ

تعصب بھی پیدا ہوتا جارہا ہے۔" (۶ر۵، ۶۰ھ)

مسعود صاحب اپنے فرائض منصبی اور علمی مشغولیتوں کے ساتھ نوجوانوں کی فکری اصلاح اور علمی تربیت میں بھی مشغول رہتے تھے، اور انھوں نے پٹنہ میں (جہاں وہ اپنی غریب الوطنی کا ہمیشہ شکوہ کرتے تھے) ایک حلقہ اپنے شاگردوں اور ہم خیالوں کا پیدا کر لیا تھا، ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"پیشہ ور" عربی کے طالب علموں کے علاوہ دوسرے اصحاب کو عربی سیکھنے اور پڑھنے کی عام دعوت دے رکھی ہے، فی الحال دو تین شاگرد ہوئے ہیں، ...... دو چار سوشلسٹ حضرات کو بھی رام کر رہا ہوں، میں نے ان سے کہا ہے کہ پہلے قرآن پڑھ لو، اس کے بعد تم کو اللہ میاں کے انکار و اقرار کا اختیار حاصل ہے، بے پڑھے اور بے سمجھے صرف مارکس کے کہنے پر وحدہ لاشریک کا انکار تو ایک "روشن خیال" نوجوان کو زیب نہیں دیتا، یہ فقرہ ان کے دلوں کو لگ گیا ہے۔" (۲۵ر۳-۶۹ھ)

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں۔

"اس جگہ اپنے کو لکھنؤ سے زیادہ پردیسی پاتا ہوں، میں یہاں بالکل غریب ہوں، میرے خیالات غریب، میری رہائش غریب ؎

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

اس جگہ سے صرف اتنا تعلق پیدا ہوا ہے کہ میں نے مسلسل (CONVEYSSING) کے بعد اپنا ایک حلقہ پیدا کر لیا ہے، بلکہ ہم لوگوں کے مخصوص خیالات کی ایک چھوٹی موٹی دنیا بسنے لگی ہے، گو ابھی مختصر ہے، جمال الدین، سنوسی، سید احمد،

اسماعیل شہیدین وغیرہم (رحمہم اللہ و نصر اللہ) سے آشنا ہو گئی ہے بس اس منحوس
اور بنگال زدہ علاقہ سے اتنا تعلق پیدا ہوا ہے۔" (۲۹ر۱۰-۵۹ھ)

مسعود صاحب معاصر علماء، سیاسی رہنماؤں اور بزرگوں میں سب سے زیادہ ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد صاحب بہاری مرحوم کی اصابت رائے، خلوص اور فہم کے قائل تھے، اور ان کو مرحوم سے نہ صرف عقیدت تھی، بلکہ محبت اور ذاتی تعلق بھی تھا، اور ان کی ذات سے بڑی تقویت اور سکون حاصل تھا، مولانا بھی مرحوم پر بڑی شفقت فرماتے تھے، اور بڑی توجہ سے ان کے مشورے اور خیالات سنتے تھے، ۱۷رشوال ۵۹ھ کو مولانا کی وفات کا داغ لگا، مسعود صاحب کا دل اس حادثہ سے سخت متاثر ہے، ان کی تحریروں میں یہ تاثر صاف جھلکتا ہے، اور یتیمی کا سا داغ معلوم ہوتا ہے، ۲۹رشوال کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"گھر (اوگانواں) سے لوٹا تو خیال ہوا کہ آپ لوگوں سے ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑوں، یعنی دو چار خط لمبے لمبے لکھوں کہ آہ مخدومی مولانا سجاد صاحب کی علالت کی خبر ملی اور دو ایک روز میں حالت غیر ہونے لگی، تا آنکہ ۱۷رشوال (۱۸رنومبر) کو یہ پاک باز ہستی رہ گزار آخرت ہو گئی، ہم لوگوں پر کیا بیتی، اسے زبان سے بیان نہیں کر سکتا، دو چار دن تو ہوش و حواس قابو میں نہیں رہے جس سے ملاقات ہوئی طرفین سے دیدہ باری۔۔۔ اور پھر مخصوص حالات نے اور بھی کچوکے لگائے، مرنے کے وقت گھر میں کفن کو بھی ایک کوڑی نہیں تھی، (بالکل لفظی معنوں میں) ۔۔۔ اور کیا لکھوں آپ جانتے ہیں کہ مجھے مولانا سے کتنا تعلق تھا، اور وہ بھی مجھے بہت مانتے تھے، پچھلے تین سالوں میں یہ تعلق اور بھی گہرا ہو گیا تھا، اب یہ حال ہے کہ پٹنہ کاٹے کھا رہا ہے، اگر اللہ موقع دے تو

آج چھوڑ دوں "

اسی تاثر اور جذبۂ ادائے حق کا نتیجہ ان کی کتاب " محاسن سجاد " ہے، جو مولانا کی وفات کے بعد شائع ہوئی، اور جس سے بہت سے لوگوں کو جن کو مولانا سجاد صاحب کے ساتھ کام کرنے اور ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا، ان کے محاسن و کمالات کا علم ہوا، اب یہ کتاب ان کی تنہا یادگار اور ان کی زندگی کا آئینہ ہے، اسی زمانہ میں انھوں نے شیخ الاسلام شیخ محمد بن عبدالوہاب پر کام شروع کیا، شیخ ہمارے دینی حلقوں میں جس قدر بدنام ہیں، وہ کسی سے مخفی نہیں، انگریزوں اور ترکوں نے اور علمارِ حجاز نے اپنی اپنی مصلحت سے ان کے متعلق جو کچھ مشہور کر دیا ہمارے علماء نے بلا تحقیق و تفتیش تسلیم کر لیا، اور کسی نے براہ راست ان کی تصانیف اور ان کے حالات کے صحیح ماٰخذ کے مطالعہ کی زحمت گوارا نہیں کی، ضرورت تھی کہ کوئی مردِ حق شناس ان کے صحیح حالات وخیالات پیش کرتا تاکہ اہل علم وطالبین حق کو صحیح رائے قائم کرنے کا موقع ملتا، علمارِ نجد اور شیخ کے جانشینوں نے تو متعدد کتابیں لکھیں اور وہ حجاز و مصر میں شائع ہو چکی ہیں، لیکن اردو میں کوئی کتاب نہ تھی، مسعود صاحب نے اس بدنام مظلوم مصلح کی سیرت نگاری کا بیڑا اٹھایا، اور خاص مؤرخانہ اور محققانہ حیثیت سے ان کی سوانح، ان کی تحریک دعوت کی تاریخ مرتب کرنی شروع کی، اس سلسلہ کا کوئی مضمون شاید معارف میں شائع ہوا تھا، اور اس پر راقم سطور نے مسعود صاحب کو داد دی تھی۔

اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" محبت نامہ آیا گویا دل پژمردہ میں جان آگئی اللہ جانے آپ کی تحریریں کیسی دلنوازی ہے کہ بار بار پڑھنے پر بھی سیری نہیں ہوتی، کاش آپ برابر

اسی طرح لکھا کرتے تو مجھے شکایت نہ ہوتی اور اس "پردیس" میں ندوہ کی صحبتوں کا مزہ آجاتا، خیر میں تو عرصہ ہوا "عہد رفتہ" کی واپسی سے مایوس ہو چکا، ورنہ یوں غرق ہو کر بھی بیڑوں کو اچھلتے دیکھا ہے۔

آپ نے مضمون کی تعریف کی، اسی خیال سے تسکین ہوتی ہے کہ دنیا میں ایک مسعود بے نوا ہی سر پھرا اور مجنون نہیں، اس دشت میں اس کے ہمنوا اور بھی ہیں، علی میاں! کیا ایسا دن بھی آئے گا، جب ہم دیوانوں کی اکثریت ہوگی، شیروانی اور پائجامہ پہننے والے مسلمانوں کی نہیں!" ولیس ذلک علی اللہ ببعید"

پہلا باب ہے، جو معارف کے ۵۰ صفحوں پر آئے گا، پوری کتاب اس سائز کے ۲۰۰ صفحوں سے زائد نہ ہوگی، کتاب تکمیل کے قریب ہے، خوشی کی بات ہے کہ سید صاحب قبلہ نے سلسلہ دار المصنفین میں چھاپنے کی ہامی بھر لی ہے، لکھنا اور لکھنے کے بعد پھر بیچنا اور چھاپنا یا چھپانا اور بیچنا مستقل دردِ سر ہے" (۶ر ۵-۶۰ء)

اس کتاب سے پہلے مسعود صاحب سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد کی تاریخ اور ان کی جماعت کی مجاہدانہ کوششوں کی روداد لکھنا چاہتے تھے، دار العلوم کے قیام کے زمانہ میں ہی کام اس طرح تقسیم کیا گیا تھا کہ یہ ناچیز سید صاحب کی سیرت لکھے اور مسعود صاحب اپنا سفر بالاکوٹ سے شروع کریں، اسی دوران میں مسعود صاحب کو شیخ محمد بن عبد الوہاب کی سیرت و تاریخ لکھنے کا خیال پیدا ہوا اور انھوں نے اس کام کو مکمل کر لیا مگر ان کو اس پہلے کام کا خیال برابر رہا، اسی خط میں لکھتے ہیں۔

"اب میری تمنا ہے کہ جلد از جلد سیرت محمد بن عبد الوہاب کو ختم کر کے اصل کتاب میں ہاتھ لگا دوں، اللہ سے دعا کیجئے کہ صحت اور وقت میں اتنی کشادگی پیدا کرے کہ یہ کام جلد از جلد تکمیل کو پہونچ جائے، اس ملازمت میں کہیں کا نہ رہا، عوارض[1] نے اور خراب کر رکھا ہے، ایک ہفتہ کی بھی چھٹی نہیں، ورنہ اگر سال میں ماہ دو ماہ کی تعطیل ہوتی تو بہت کام ہو جاتا، خیر انھیں حالات میں جو بن پڑے کرنا ہے۔"

بالآخر انھوں نے یہ کتاب "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" کے نام سے مکمل کر دی اور وہ شائع ہو کر مقبول ہوئی۔

اسی عرصہ میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کی کتاب "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" نکلی، اس کتاب میں بعض ایسے "نئے حقائق وانکشافات" تاریخی رنگ میں پیش کئے گئے تھے، جو ہم سب لوگوں کے لئے موجب حیرت بھی تھے، اور باعث تکلیف بھی، اس کتاب میں سید صاحب کی بے تکلف تحریک وتنظیم کو ایک "خیالی اسٹیٹ" کے رنگ میں پیش کیا گیا تھا جس کے سید صاحب محض "فوجی افسر اور آلہ کار" تھے اور حضرت شاہ اسحاق صاحب جن کو مولانا الصدر الحمید کے نام سے یاد کرتے ہیں، صدر ریاست اور نگران اعلیٰ، نیز اس میں اہل مغرب یا مرکزی بورڈ (حضرات دہلی) اور اہل مشرق (اہل صادق پور) کے درمیان ایسی رقابت دکھائی گئی تھی، جو کبھی سورج بنسی اور چندر بنسی خاندان میں تھی، اور اسی رقابت اور اہل صادق پور کی خود رائی کو تحریک کی ناکامی کا سبب گردانا گیا تھا، اس بارہ میں خود سید صاحب کے متعلق فاضل مصنف کے قلم سے ایسے جملے نکل گئے ہیں، کہ گویا وہ بھی دہلی کے مرکز کے مشوروں اور ہدایتوں کے پابند نہ رہے، اور اس سے

---

[1] دمہ کی شکایت جو ساری زندگی مولانا کی ہمدم ودمساز رہی اور بالآخر پیام موت ثابت ہوئی۔

نقصان پہنچا، یہ محض ایک خیالی ریاست کا نقشہ تھا جس میں تاریخی تحقیق سے زیادہ مولانا کی ذہانت، قوت تخئیلی اور تنظیمی دماغ کام کر رہا تھا، واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب کی اشاعت سے بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور بالخصوص اس جماعت کی بڑی حق تلفی ہوئی، جو ہندوستان کی سب سے بڑی مجاہد اور سرفروش جماعت اور سید صاحب کے حقیقی جانشین اور فدائی تھے، میں نے مسعود صاحب کو اس کتاب کی طرف توجہ دلائی اور ان سے خواہش کی کہ وہ اس کا جواب لکھیں، اس کا جواب دیتے ہوئے، وہ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"جی ہاں مولانا سندھی کا رسالہ ایک ہفتہ ہوا میں نے دیکھا اور مطالعہ کے دوران یہ ارادہ کرتا جاتا تھا، اب ارادہ ہوتا ہے کہ اسے لکھ ڈالوں انشاء اللہ مفصل اور طویل مضمون ہوگا، جی چاہتا ہے کہ یہ نوٹ آپ کے پاس بھیج دوں اور آپ اسے دیکھ کر فوراً واپس کر دیں، مگر شرط یہ ہے کہ جلد۔"

۲۲ صفر ۶۲ھ کے خط میں میری کوتاہ قلمی کا شکوہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ہاں تو میں آپ سے بے حد خفا تھا، خط پر خط لکھے مگر جواب ندارد، آخر یہ کہاں کی مولویت ہے، آپ نے تو مجھے مولانا سندھی سے بھڑا دیا اور خود الگ جا بیٹھے، خیر خاکسار نے اس سلسلہ کے دو مضمون لکھ لئے، پہلا مضمون فروری کے معارف میں چھپ گیا، اس میں صرف (سید صاحب اور مودودی صاحب کی زبان میں) سید مظلوم کی مدافعت کی گئی ہے، ضمنی طور پر ان کے ثنا خوانوں اور منقبت نگاروں کی بھی مدافعت ہو گئی ہے، پہلا مضمون صرف سید صاحب کے متعلق ہے، معارف کے ۳۵ صفحوں میں آیا ہے، دوسرا اس کا جواب ضرور لکھوں گا، صرف تامل اس بات سے تھا کہ کہیں، اہل دیوبند اس تنقید کو "مدرسہ"

اور دبستان کے اختلاف پر محمول نہ کریں، بہرحال لکھنا ضرور ہے، آج کل میں فارغ بھی ہوں آپ آجائیں تو مشورہ کرکے لکھ ہی ڈالوں، مولانا داؤد غزنوی صاحب سے بعض چیزیں دریافت کی ہیں، اور آج کل میں مولوی عبدالمجید صاحب[1] کو بھی لکھتا ہوں، یہ بنارس میں شوکانی کے شاگرد کون[2] تھے؟ بہرحال اس کتاب کے مفروضات اور مفروضاتی ہفوات کا جواب دینا ضروری ہے، حیرت ہے کہ ایسا ذی علم اب تک ایک مشرب اور اسکول کے چاہ زمزم سے نہیں نکل سکا۔"

(۲۷ر۷۔۶۱ھ)

۱۱ر رمضان المبارک کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" مولوی عبدالغفار[3] صاحب کے یہاں گئی تھی، انھوں نے اس پر ایک طویل مضمون اہل حدیث اور اہل صادق پور سے متعلق لکھا ہے، عقیدہ غیبوبت وغیرہ کی بحث بھی آئی ہے، یہ مضمون اغلب یہ ہے کہ مارچ کے معارف میں پورا چھپ جائے گا، تیسرا حصہ زیر قلم ہے، اس میں شوکانی، زیدیت، نجد و یمن پر بحث کرنا چاہتا ہوں، شوکانی اور زیدیت پر گویا لکھ چکا ہوں، اب نجد پر گفتگو ہوگی۔"

مسعود صاحب میں ان کی تمام علمی ترقیوں کے ساتھ انگریزی حکومت سے نفرت اور

---

[1] مولانا عبدالمجید الحریری سابق قنصل حکومت ہند متعینہ جدہ جو ایک صاحب نظر اور صاحب ذوق اہل حدیث فاضل تھے، تقریباً دو سال ہوئے ان کا انتقال ہوگیا۔

[2] مولانا عبدالحق نیوتنوی بنارسی جو سید صاحب کے قافلہ میں تھے، اور یمن جاکر امام شوکانی سے حدیث پڑھی۔

[3] خاندان صادق پور کے ایک باخبر اور ذی علم فرد۔

مجاہدانہ جذبات برابر رہے، اور کسی دور میں بھی وہ ان سے علیحدہ نہیں ہو سکے، ۱۹۴۲ء کے ہنگامہ میں جب اکثر مسلمان بے تعلق اور دور کے تماشائی بنے رہے بلکہ ان میں اکثر ان ہنگاموں کا لطف لیتے تھے، اور اپنے ہم وطنوں کی ابتلا پر فاتحانہ مسرت و شماتت کا اظہار کرتے تھے، ان کی طبیعت بہت بے چین تھی، اور دبی ہوئی چنگاریاں مشتعل ہو گئی تھیں، ۲۵ر اگست ۱۹۴۲ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"پرسوں صبح کو حسب معمول قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا، اس آیت پر آکر رک گیا، بار بار پڑھتا رہا مگر تسکین نہ ہوئی" ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یاتکم مثل الذین خلوا من قبلکم مستہم الباساء والضراء وزلزلوا حتیٰ یقول الرسول والذین اٰمنوا معہٗ متیٰ نصر اللّٰہ الا ان نصر اللّٰہ قریب" اور پھر اس ایک آیت کے بعد "کتب علیکم القتال وھو کرہ لکم" الآیۃ پر نظر گئی تو یقین آگیا، ایک اور لطیفہ ملاحظہ ہو، شوقی کا ایک شعر ہے (دمشق کی تباہی ۲۶ کے مرثیہ کا شعر ہے) وہ مرثیہ جس کا مطلع ہے ؎

سلام من صبا بردیٰ ارق
ودمع لا یکفکف یا دمشق

ہاں تو شعر یہ ہے ؎

ومن یسقی ویشرب بالمنایا
اذا الاحرار لم یسقوا ویسقوا

کیا فرماتے ہیں، "اذا الاحرار لم یسقوا ویسقوا" کے بارہ میں؟ کہاں

ساقی گری جام شہادت کی اور کہاں الاستعمار الاروبی کی طرف بدالمعونہ بڑھانا
تف ہے، یہ شذرات ہیں اور مرآت افکار بھی، دماغ اچٹا ہوا ہے، اور دل اجڑا
ہوا، امیر شکیب نے کہیں لکھا ہے "لا یجتمع الاسلام والمیل الی الاستعمار
الاوربی فی قلب واحد" مگر یہ کیا اندھیر ہے کہ صادق پور کے ہمسائے
اور ہم وطن اسی استعمار اوربی کو اپنا ملجا و ماوی سمجھنے لگے ہیں، گذشتہ تین ہفتوں
میں یہ عجیب (.........) (مصری "ظاہرہ") نگاہوں کے سامنے آیا میرا ذاتی
خیال یہ نہیں تھا کہ سلطان شہید کی برادری اس قدر "جعفریت" اور "صادقیت"
میں ڈوب گئی ہے، پچھلے سالوں میں راقم پاکستانیوں سے کچھ حسن ظن رکھنے لگا
تھا، لیکن اس گھناونے مظاہرے کے بعد تو ان پیدائشی مسلمانوں سے ہر قسم کی
امید اٹھ گئی"۔ ۱۲/۸-۶۱ھ - ۲۵/۸-۶۴۲"

مسعود صاحب دار العلوم ندوہ سے تعلق و قیام کے زمانہ ہی میں "ترجمان القرآن" کے
علمی و کلامی مضامین کے مداح، اور مدیر "ترجمان" کے قائل اور معترف تھے، ان کی ثقافت (کلچر)
ان کی تعلیم و تربیت اور ان کے مطالعہ نے ان کو جماعت اسلامی کے فکری و دینی مزاج سے
بہت کچھ ہم آہنگ کر دیا تھا، وہ بھی مزاجًا ذکی الحس اور نقاد واقع ہوئے تھے، وہ بھی اپنی تحریروں
میں ہمیشہ اسلام و مسلمانوں کے درمیان امتیاز قائم رکھتے، ان کا قلم بھی اسلام کی تاریخ نگاری
میں یا اسلامی دعوتوں اور تحریکوں اور اصلاحی کوششوں کا جائزہ لینے میں مسلمان بادشاہوں
کے غیر اسلامی افعال اور غلط نمائندگی پر سخت تنقید کرتا رہا[1]، اور تنقید کے اس دائرہ سے وہ

---

[1] ملاحظہ ہو الفرقان کے شاہ ولی اللہ نمبر میں ان کا مضمون "شاہ ولی اللہ سے پہلے ہندوستان کی حالت"
نیز "حاضر مسلمی الهند وغابرهم"۔

علماء بھی خارج نہیں رہے، جنھوں نے ان کے نقطۂ نظر سے وقت کا فریضہ ادا نہیں کیا، یا فقہ و تصوف ہی ان کی توجہ اور سرگرمی کا مرکز رہے، وہ بھی تجدد کے مخالف تھے، اور اسی بنا پر کمال اتاترک اور جدید ترکیہ کے بانیوں کے سخت مخالفین اور ناقدین میں تھے، فقہی آراء و مسائل میں وہ اپنے خاندانی اثرات و افتاد طبع کی بنا پر ہمیشہ سے متوسع اور مسائل و احکام بالخصوص عبادات میں بالعموم حنفی تحقیقات و مسائل پر عمل کرنے کے باوجود اپنے لئے کسی خاص نسبت کو پسند نہیں کرتے تھے، ان کا ذہن و ذوق کسی ایک فقہی مذہب کے التزام و تقلید سے "ابا" کرتا تھا، جیسا کہ ان کے متعدد خطوط و تحریروں سے معلوم ہوتا ہے، اسی کے ساتھ وہ اہل حدیث حضرات کے تحزّب اور جماعتی عصبیت کے بھی شاکی اور مخالف[1] تھے، ان کے سیاسی خیالات و افکار بھی ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے بنے بنائے سانچوں میں سے کسی سانچہ میں کلی طور پر فٹ نہیں ہوتے تھے، ان کا خود ایک ذہنی سانچہ تھا، مسلم لیگ اور جمعیۃ العلماء دونوں سے وہ یکسر غیر مطمئن تھے، یہ سب وجوہ تھے، جن کی بنا پر وہ روز بروز جماعت اسلامی سے قریب اور دوسرے جماعتوں اور حلقوں سے دور ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ ایک منطقی نتیجہ کے طور پر وہ جماعت اسلامی کے ہمنوا و ہم خیال اور بالآخر اس کے رکن رکین بن گئے، ۱۹۴۱ء میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھنؤ آئے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہمان خانہ میں قیام کیا، انھوں نے مجھ سے ایک عربی رسالہ کے اجراء کی تجویز کا تذکرہ کیا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ میں اس کی ادارت کی ذمہ داری قبول کرلوں میں نے بے تکلف عرض کیا کہ اس کام کے لئے موزوں ترین شخص مولانا مسعود عالم ندوی ہوسکتے ہیں، اور اپنے خصوصی تعلق کی بنا پر اس کا ذمہ لیا کہ میں ان کو اس خدمت کے لئے راضی کرلوں گا، اس سلسلہ میں مولانا سے میری خط و کتابت بھی ہوئی اور وہ اس پر آمادہ ہوگئے،

---

[1] ملاحظہ ہو "دیار عرب میں"۔

انتظامی مشکلات کی بنا پر رسالہ کا اجرار تو نہیں ہوا، لیکن ۱۹۴۲ء میں مسعود صاحب جماعت کی عربی نشر و اشاعت کے شعبہ کے انچارج اور کلیۃً اس کام کو انجام دینے کے لئے جالندھر منتقل ہو گئے، جہاں انھوں نے "دار العروبۃ للدعوۃ الاسلامیۃ" کے نام سے نشر و اشاعت اور دعوت کا مرکز قائم کیا، اور چند رفقار کے ساتھ اپنا کام شروع کر دیا، جو خطوط اس عرصہ میں انھوں نے لکھے، افسوس ہے کہ بہت سے محفوظ نہیں رہے، جن کی مدد سے اس دور کے نقوش و تاثرات کو روشن کیا جائے، اس عرصہ میں غالباً صرف ایک بار ان سے ملاقات ہوئی جب وہ لکھنؤ آئے اور دار العلوم ندوۃ العلمار کے مہمان خانہ میں قیام فرمایا، البتہ ان کے پر محبت سلام و پیام پہنچتے رہے، اور یہ معلوم ہوتا رہا کہ حسب عادت ان کی مجلسیں اپنے قدیم دوستوں کے تذکرہ بالخصوص اس عاجز کے ذکر سے معمور رہتی ہیں، میں جن نوجوان طلبہ کو ہونہار سمجھتا تھا، ان کے متعلق خواہش پیدا ہوتی تھی کہ وہ اپنی تحریری و ادبی تربیت کے لئے کچھ مدت ان کے پاس قیام کریں، اور ان کی رہنمائی اور مشوروں سے فائدہ اٹھائیں، متعدد طلبہ کی سفارش کی جن کو انھوں نے ہمیشہ بڑی گرم جوشی اور خوش دلی سے منظور کیا، وہ بڑے خرد نواز اور شفیق تھے، اور اسی وفاشعاری کی توقع اپنے دوستوں اور شاگردوں سے کرتے تھے، اس سلسلہ میں وہ اپنے پورے حلقۂ تلامذہ میں سید مظفر حسین شاہ[1] ندوی کی شرافت و سعادت کے ہمیشہ معترف رہے، اور ان کے ساتھ ان کا سلوک بالکل چھوٹے بھائی کا تھا۔

۱۹۴۷ء میں جب کہ میں حجاز میں تھا، ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی اور آبادی کا تبادلہ و انتقال ہوا، جس نے دونوں ملکوں کی چولیں ہلا دیں، اور پوری زندگی کو زیر و زبر کر دیا، اس طوفان میں "دار العروبۃ" کا سا نوخیز و کمزور ادارہ کیا قائم رہتا، وہ بھی ہندوستان سے پاکستان

---

[1] حال ناظم دینیات آزاد کشمیر مظفر آباد

منتقل ہوا، اس نقل مکانی میں مولانا کا اچھا خاصا کتابی ذخیرہ ضائع ہوگیا، پاکستان پہنچ کر انھوں نے
از سر نو "دارالعروبۃ" کی بنیاد ڈالی اور کچھ عرصہ گوجرانوالہ کچھ عرصہ حیدر آباد سندھ قیام
کرنے کے بعد انھوں نے راولپنڈی کو اپنا مستقر بنالیا، جس کی خشک آب وہوا ان کی صحت
کے لئے بہت سازگار تھی، اس عرصہ میں ہم دونوں کی خط وکتابت اور علمی روابط قائم رہے۔

۱۹۴۹ء میں انھوں نے عراق کا سفر کیا جس کی ان کو مدتوں سے آرزو تھی، قارئین کو یاد ہوگا
کہ ۱۹۳۴ء میں انھوں نے بغداد وزبیر کی بالکل تیاری کرلی تھی، مگر ان کو پاسپورٹ نہیں مل سکا
تھا، اور سفر ملتوی ہوگیا تھا، وہ سفر اگر میسر بھی آتا تو صرف علمی ترقی اور ادبی ذوق کے لئے ہوتا،
یہ سفر بڑے بلند عزائم اور مقاصد کے ساتھ تھا، اب وہ اپنی کتابوں اور ادبی شہرت کی بنا پر
علمی ودینی حلقوں میں روشناس اور ایک دعوت وتحریک (جماعت اسلامی) کے نقیب و
ترجمان سمجھے جاتے تھے، قدیم آرزو کی تکمیل کا سامان بھی موجود تھا، ان کے محبوب استاد
شیخ تقی الدین الہلالی بغداد میں موجود تھے، جو اب ان کے تلمذ پر فخر کرتے تھے، اور حلقۂ احباب
میں شمار کرنے کے لئے تیار تھے، ۲۸ر اپریل ۱۹۴۹ء سے ۱۳ر دسمبر ۱۹۴۹ء تک یہ سفر ممتد رہا،
جس کی مفصل روئداد اور روزنامچہ "دیارِ عرب میں چند ماہ" میں محفوظ ہے، اور وہ ان کی
جد وجہد وانہماک، جذبۂ دعوت اور ان کی ذہنی وعلمی صلاحیتوں کی ناطق شہادت ہے،
اس کتاب میں وہ بولتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور ان کے ذہن ومزاج کی پوری تصویر آگئی ہے،
وہی صاف گوئی، وہی تلخ نوائی، کہیں تنقید کی تلخی، کہیں محبت کی شیرینی، اکثر وبیشتر عقل کی
پاسبانی لیکن کبھی کبھی اقبال کے اس مشورہ پر عمل کہ۔

لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

"الفرقان" کے کسی شمارہ میں ان کی زندگی ہی میں اس کتاب پر مفصل تبصرہ کرچکا ہوں،

جس میں کتاب پر تبصرہ ہی نہیں دو دوستوں کی مفصل کہانی بھی آگئی ہے جن کی طویل رفاقت و ہم سفری کے بعد راہیں الگ الگ ہوگئیں لیکن اس کے باوجود بھی محبت والفت کا رشتہ ان دونوں کے درمیان بدستور قائم رہا، مسعود صاحب نے ایک خط میں لکھا تھا کہ کئی بار پڑھ چکا ہوں، لیکن سیری نہیں ہوئی۔

برسوں کے مطالعہ، شب و روز کی صحبت، موروثی اثرات، اور تجربات و مشاہدات سے ذہن کا جو سانچہ بن جاتا ہے، اس کا یکسر ٹوٹ جانا، اور کسی آدمی کا کسی تحریک یا تنظیم میں اس طرح ڈھل جانا کہ ماضی کا اس پر بالکل اثر باقی نہ رہ جائے، اور وہ جذبات سے یکسر معری ہوجائے، اگر محال عقلی نہیں تو محال عادی ضرور ہے، مسعود صاحب نے ایک دینی ماحول، اور علماء کے ایک حلقہ میں زندگی کا وہ حصہ گذارا تھا، جو اثر قبول کرنے کا زمانہ ہوتا ہے، علماء میں سے ان کو اپنے محبوب استاد و مربی مولانا سید سلیمان ندوی اور ان کے بعد ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد بہاری نائب امیر شریعت بہار واڑلیسہ سے گہری محبت و عقیدت تھی، اداروں اور دبستانوں میں ندوۃ العلماء کے ساتھ ان کی حمایت حمیت کے درجہ تک پہونچی ہوئی تھی، وہ متقشف نہ تھے، لیکن دینی شعائر و اتباع سنت کی ان کے دل میں بڑی اہمیت اور عظمت، اور اس کی پابندی اور اہتمام کرنے والوں کی محبت و وقعت تھی، اس لئے اس جماعت اسلامی میں شامل ہونے اور سالہا سال اس کی ترجمانی کرنے کے باوجود ان کا دینی فکر اور ذہنی سانچہ کلیۃً تبدیل نہیں ہوا تھا، وہ جماعت کے ارکان کا دینی معیار، اتباع سنت کا اہتمام، اور عبادت کا ذوق اس سے زیادہ بلند دیکھنا چاہتے تھے، جتنا عام طور پر نظر آتا تھا، ان کے ذہن نے کام کرنا اور ان کے قلب نے محسوس کرنا ترک نہیں کیا تھا، جن دوستوں نے ان سے ان کی زندگی کے آخری دور میں ملاقات کی، اور جن سے وہ اپنے ان احساسات کا

اظہار کر سکتے تھے، انھوں نے بیان کیا کہ وہ تنہائی کی گفتگو میں اپنے دل کی اس خلش کو چھپا نہیں سکے، اور ان سے انھوں نے اپنے ان دینی جذبات کا اظہار کیا جن سے ان کی قدر و عظمت، اور خلوص و وفا شعاری میں کمی ہونے کے بجائے اضافہ ہوتا ہے۔

راولپنڈی کے زمانہ قیام میں وہ خرابی صحت کے باوجود کام میں مشغول رہے، اس عرصہ میں کئی کتابیں ان کی نگرانی اور مدد سے شائع ہوئیں، "المسلمون" "الدعوۃ" اور "منبر الشرق" میں بھی ان کے مضامین شائع ہوتے رہے، ملاقات کو اب آٹھ، نو برس ہو چکے تھے، اتنا طویل وقفہ ہماری ملاقاتوں اور دید و شنید میں زندگی بھر نہیں ہوا تھا، شاعر نے تو کہا تھا "منزل دوست چوں شود نزدیک" لیکن منزل دوست دور ہونے کے باوجود آتش شوق تیز تر ہوتی چلی جا رہی تھی، تقسیم کا بھلا ہو کہ جن دوستوں اور بزرگوں کی جیتے جی جدائی کا خیال بھی نہیں آتا تھا، وہ زندگی ہی میں ایسے جدا ہوئے کہ برسوں ان سے ملاقات کی نوبت ہی نہ آئی اور بیگانہ ملکوں کے باشندے ایک دوسرے سے قریب تھے، اور ان کی........ ملاقات و سفر کے امکانات زیادہ، مگر ہندوستان سے پاکستان، اور پاکستان سے ہندوستان کا سفر جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔

اس عرصہ میں برابر ان کا معمول رہا کہ ان کی کوئی تحریر کہیں شائع ہوتی وہ سب سے پہلے اس دور افتادہ نیاز مند کو بھیجنے کی کوشش کرتے، اکثر لفافوں میں اپنے مضامین کے تراشے نشان لگا کر بھیج دیتے، "دیار عرب" شائع ہوئی تو پہلا نسخہ جو پریس سے ان کو ملا وہ انھوں نے مجھے بھیجا، یہی حال اس راقم کا تھا کہ مضمون لکھتے وقت اور چھپنے کے بعد اس کا تصور رہتا کہ مسعود صاحب کی نظر سے گزرے گا، اور اس تصور سے طبیعت میں شگفتگی پیدا ہوتی، غالباً یہ دوسرے مضمون نگاروں کو بھی پیش آتا ہوگا، اور زندہ انسان کی زندہ تحریریں

ایسا ہونا بھی چاہیئے، ورنہ مضمون کیا ہے، ایک عدالتی دستاویز، راقم سطور ۱۹۵۱ء میں مصر و شام گیا، اور وہاں اس کی کچھ تقریریں اور تحریریں شائع ہوئیں، تو وہیں سے مسعود صاحب کو بھیجتا رہا، اور وہ اپنے حلقۂ احباب میں محبت آمیز الفاظ کے ساتھ ان کا تعارف کراتے رہے، میری ہندوستان واپسی کے بعد انھوں نے ان مضامین پر "ترجمان القرآن" میں تبصرہ و تنقید کی، تنقید میں وہ ذاتی تعلق و محبت کو زیادہ دخل نہیں دیتے تھے، اگرچہ یہ تعلق ان کے چھپائے نہیں چھپتا تھا، ان کا تبصرہ اس تعلق و بے تعلقی کا ایک عجیب گلدستہ ہوتا تھا، بہرحال انھوں نے تبصرہ کیا، مضمون نگار کی حالت ہر وقت یکساں نہیں رہتی، بعض رسائل و مضامین پر انھوں نے ایسا تبصرہ کیا، جس کی توقع نہ تھی، "اسمعی یا مصر" اور "شاعر الاسلام محمد اقبال" پر توقع تھی کہ وہ کچھ زیادہ لکھیں گے کہ دونوں رسالے ان کے ذوق کے عین مطابق اور ان کی دلچسپی کے تھے، لیکن ان کے حصہ میں چند جملوں سے زیادہ نہ آئے، ان کی بعض گرفتیں بھی ایسی تھیں جو غلط فہمی پیدا کر سکتی تھیں، بہرحال اس عاجز نے ایک خط میں بے تکلف اس تاثر کا اظہار کیا۔

مسعود صاحب جن کو ان کے صدہا قارئین اور بیسیوں واقفین ایک بے لاگ ناقد اور ایک خشک مصنف کی حیثیت سے جانتے ہیں، محبت سے بھرا ہوا دل رکھتے تھے، ان کی مثال ایک پہاڑی چشمہ کی سی تھی، جو بہت دور تک پتھر کی سلوں کے نیچے بہتا ہے، لیکن پتھر کو ہٹایئے تو ابل پڑتا ہے، میرے اس خط نے ان کے ساز محبت کو چھیڑ دیا، اور انھوں نے اس خط کا جواب اس طرح دیا۔

"پرسوں یا چوتھے روز محبت نامہ ملا، پڑھ کر سکتہ سا ہو گیا، یہ چار دن اور راتیں بلا مبالغہ آپ کی یاد اور پچھلی فراموش شدہ (جو الحمد للہ کہ مسعود بے نوا نے کبھی فراموش نہیں کی) صحبت کے خیالی تذکروں میں گزر رہی ہیں، "تزویر کلام" جس کا عمر فاروق سقیفہ والی روایت میں ذکر کرتے ہیں، مجھ پر مسلط ہے،

باتیں بناتا رہا، انشا پردازی کا زور دکھلاتا رہا، دل ہی میں لمبے لمبے خط لکھ ڈالے، دماغ کے لوح و قلم پر جانے کتنی صفائی پیش کر ڈالی، یا یوں سمجھئے کہ ان چار دنوں میں صرف یہی خیال مسلط رہا کہ کسی طرح علی میاں کے دل و دماغ سے یہ اثر دور ہو جائے، ندوہ سے علیحدگی، فکر و مسلک میں تھوڑا سا تفاوت، بعض مسائل میں اختلاف اور زندگی کی راہوں کے بدل جانے کے باوجود دو شخصیتوں سے میری محبت کم نہ ہوئی، پٹنہ، جالندھر، راولپنڈی اور بغداد ہر جگہ ان کے ذکر سے مجلس معطر رہی، اس حد تک کہ میرے رفیق، عزیز اور شاگرد سب کے سب انھیں اپنا استاد، مربی اور اپنے سے قریب سمجھتے ہیں، جماعت اسلامی اور دوسرے حلقوں کی چھوٹی بڑی مجلسوں میں جب کبھی ذکر آیا تو اسی محبت و اظہار قربت کے ساتھ اور اس جرأت و صفائی کے ساتھ کہ تحزب کی ماری ہوئی مخلوق کو بارہا حیرت ہو ہو گئی، آپ سمجھے یہ دو بزرگ کون ہیں؟ آپ جیسے ذہین آدمی سے صاف صاف کیا عرض کروں، مگر وقت آ گیا ہے کہ صاف صاف کہوں، یہ دونوں دودمان شجرۂ نبوت، صورت و سیرت میں سادات کرام کے سچے نمونے، ایک استاد، دوسرا دوست و محبوب، محبوب تو استاد بھی ہیں، پر انھیں "محبوب" کہتے ہوئے ادب مانع ہے، سید صاحب قبلہ کی محبت کبھی کم نہیں ہوئی، اللہ گواہ ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سید صاحب بھی اس کسک کو محسوس کرتے ہیں، بارہا ناظم صاحب کہہ بھی گئے ہیں "مسعود عالم باغی ہے، مگر وفادار" اس نالائق کے لئے یہ شہادت کافی ہے، جانے علی میاں بھی یہ کسک محسوس کرتے ہیں، یا نہیں؟ کہتے ہیں "دل را بہ دل رہیست"۔

لیکن اس پرجوش محبت کے ساتھ ان کی پختگی اور توازن دماغی دیکھئے کہ وہ اپنے مسلک پر قائم ہیں، اور اس کے لئے کسی معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتے، بڑی صفائی سے کہتے ہیں۔

"امابعد، آخر ماجرا کیا ہے؟ تنقید و تحسین میں آخر برا ماننے کی بات کیا ہے، جہاں تک فکر ورائے کا تعلق ہے، دوستوں کے درمیان اختلاف قابل برداشت ہونا چاہیئے۔" الخ

اللہ تعالےٰ کروٹ کروٹ آرام پہونچائے۔ ع

ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

ان کی کتاب "نظرۃ اجمالیۃ" شائع ہوئی تو حسب معمول انھوں نے مجھے بھیجنے میں پیش دستی کی، کتاب پر سرسری نظر ڈالی تو اس میں چند خلا محسوس ہوئے، اور بعض مباحث کسی قدر تشنہ، خیال تھا کہ ان کو نجی خط میں اس طرف توجہ دلادوں گا، ابھی اس کی نوبت نہیں آئی تھی کہ ایک عزیز نے اس پر تبصرہ اور تنقید کی، اس تنقید میں کچھ شوخی اور طنز کی جھلک آگئی، اور قلم حدود سے تجاوز کر گیا، اس کا جواب جماعت اسلامی کے ایک پرجوش رفیق نے تلخ لہجہ میں دیا، اس کا جواب الجواب بھی اسی لہجہ و انداز میں شائع ہوا، اس پورے سلسلہ میں الحمدللہ ایک طرف یہ راقم سطور، دوسری طرف مولانا ابواللیث صاحب اور خود صاحب کتاب بالکل بے تعلق رہے، یہ دو نوجوانوں اور ادیبوں کی نوک جھونک تھی، جو حدود سے تجاوز کر گئی، بدگمانیوں کا بڑا موقع تھا لیکن اخلاص و اعتماد نے الحمدللہ ان کو راہ نہیں دی، مسعود صاحب کا خط آیا کہ آپ اس مناظرہ سے دل گرفتہ نہ ہوں، میری طبیعت بھی متاثر نہیں ہے، آپ بھی متاثر نہ ہوں، میں نے ۲۳ جنوری ۱۹۵۶ء کے خط میں جواب دیا۔

"مولوی عبداللہ صاحب نے میری نادانستگی اور لاعلمی میں مضمون لکھا اور مولوی

جلیل احسن صاحب نے مولانا ابواللیث صاحب کی لاعلمی میں مضمون لکھا، دونوں نے اس سلسلہ کو ناپسند کیا، اور تنبیہ کی، اب مجھے معلوم نہیں جواب الجواب شائع ہونا ہے یا نہیں، بہرحال آپ اطمینان رکھیے، "وتلک شکاۃ ظاہر عنک عارھا"

تحریک ختم نبوت کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی نوازا اور اس زار و نزار مریض کو جس کو ہمیشہ راحت و احتیاط کی ضرورت رہتی تھی، راولپنڈی جیل میں اسیری اور نظربندی کے دن گزارنے پڑے، مسعود صاحب کی اس سعادت پر بڑا رشک آیا، ان کے علمی فضائل و کمالات کا اعتراف ہمیشہ سے تھا، لیکن اس موقع پر دل نے ان کی سبقت و فضیلت اور اپنی پسماندگی کا صاف اعتراف کیا، اسی زمانہ میں عزیزی محمد عاصم سلمہٗ کو میں نے ایک خط لکھا جس میں ان سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ مولانا تک میری مبارک باد پہنچا دیں اور میرے ہم نام شاعر ابوالحسن التہامی کا یہ مصرعہ خفیف سی ترمیم کے بعد سنا دیں۔

فسبقتنی واخوک فی المضمار

چار مہینے کی اسیری کے بعد ۲ راگست ۵۳ء کو جب وہ رہا ہوئے تو میں نے مسرت و تہنیت کا خط لکھا، اس کا انھوں نے جو جواب دیا وہ ان کے صحیفۂ اعمال میں انشاء اللہ ہمیشہ درخشاں رہے گا، اور کیا عجب ہے کہ وہ میزان قیامت میں بھی وزنی ثابت ہو۔

"محب گرامی!

سلام و تحیت فراواں

آپ کے عنایت نامے رہائی کے بعد نظر سے گزرے، محبت و اخلاص کے

نقوش اور گہرے ہوگئے، اللہ تعالیٰ آپ کو خدمت دین کے زیادہ سے زیادہ

مواقع عطا کرے، مجھ فقیر کے لئے یہ بس ہے کہ ایک پاک باز نوجوان سید کے

دامن الفت سے وابستہ ہے۔

دوسرا خط بھی مل گیا، شکریہ پر شکریہ! کیا گرفتاری کیا رہائی؟ سیرت نگاری

کرتا رہا، مولوی جعفر تھانیسری اور مولانا یحییٰ علی کی مشقتوں کے مقابلہ میں

یہ میٹھی میٹھی اور بی کلاس کی آسائشیں کس شمار میں ہیں؟ حاشا! کہ ابتلا کو دعوت

نہیں دیتا، اور نہ اس مریض ناتواں میں برداشت کی طاقت ہے، پر یہ

مہمانی جچی نہیں، بس سیاسی زبان میں زیارت (یاترا) ہوگئی جھجک تو

الحمد للہ کبھی نہیں تھی، اور کچھ چھپی چھپائی ہو گی تو وہ بھی دور ہوگئی۔

اس تنہائی میں کچھ حدیث پڑھ لی، اللہ کرے یہ سلسلہ جاری رہے کل لاہور

جا رہا ہوں، پھر کبھی اطمینان سے۔"

والسلام عاجز مسعود (۱۶/۱۲-۷۲ھ)

اللہ تعالیٰ کا فضل خاص تھا کہ یہ سنت یوسفی ادا ہوگئی، اور جس نے امام احمد کی

استقامت اور صادقین صادق پور کی عزیمت کی داستان ہمیشہ مزے لے لے کر بیان کی تھی،

اس کو بھی اس مئے الفت کا ایک جرعہ چلتے چلتے عطا فرما دیا گیا،... رہائی کے بعد مجھے مسلسل

خطوط لکھے کہ مصر و شام کے سفر سے متعلق اپنے مشورے اور تجربات لکھو، مصر و شام کا عزم

پختہ تھا، اور اس کی ضروری تیاریاں ہو رہی تھیں، لیکن کسی کو اور خود ان کو معلوم نہ تھا کہ کون سا

سفر درپیش ہے، ۲۱ جمادی الآخرہ ۷۳ھ کو مجھے آخری خط لکھا جس میں ان کی زبان سے

یہ الہامی فقرہ نکل گیا۔

"محب عزیز!

سلام ونحیات

"اب تک ہنوز روزاول ہے، یہاں بڑی پوچھ گچھ ہے، پہلی مارچ پیر کے دن کراچی جارہا ہوں، دیکھیں اللہ کو کیا منظور ہے۔"

اللہ کو منظور یہ تھا کہ تھکا ہارا مسافر جو بیماریوں کا شکار اور تکلیفوں سے زار ونزار تھا، اب آرام کرے۔

اس خط کے ٹھیک اٹھارہ روز کے بعد ۱۰ رجب ۱۳۷۳ھ (۱۶ مارچ ۱۹۵۴ء) کو رات کو ۹½ بجے کراچی میں ایک سخت دورہ کے بعد آخری ہچکی آئی اور جان جانِ آفریں کے سپرد کی، رحمہ اللہ وغفرلہ ورفع درجاتہ۔

۱۷ مارچ کو اچانک انتقال کا تار ملا، ادھر سفر پاکستان کی تیاری تھی، خیال تھا ۸، ۹ برس بعد ملاقات ہوگی، جی کھول کر باتیں ہوں گی، یہاں جانے والا دوسرے عالم میں پہنچ گیا، اس عالم میں ملاقات کی امید منقطع ہوگئی۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

دوسرے روز مسافرت درمسافرت کے عالم میں اس گنج خوبی کو سپرد خاک کیا گیا، دوستوں نے لکھا کہ بہت بڑا مجمع تھا، بعض عرب سلطنتوں کے سفراء اور شہر کے عمائد اور صاحب علم رخصت کرنے آئے تھے، سفیر شام استاد جواد المرابط جو ان کے علم وفضل کے خاص طور پر گرویدہ تھے، اور کچھ ہی عرصہ پہلے بڑے ذوق وشوق سے مجھ سے "الضیاء" کی فائل طلب کر چکے تھے، خاص طور پر متاثر تھے، اور سنا ہے کہ کہتے تھے کہ کاش ان کی جگہ میں ہوتا۔

ان کے جاننے والوں نے تعزیت کے خطوط لکھے، ان کا کوئی حقیقی بھائی زندہ نہ تھا، جو لوگ ان سے واقف تھے، انھوں نے جس طرح ان کے والد صاحب (مولانا حکیم عبدالشکور صاحب مدظلہ) کو تعزیتی خطوط لکھے، وہاں انھوں نے پرانے رفیق اور بھائی کی حیثیت سے بجا طور پر مجھے بھی تعزیت کا مستحق سمجھا، مخلص دوستوں اور قدیم رفیقوں نے ایک دوسرے کی تعزیت کی، علمی و ادبی و دینی حیثیت سے یہ ایک بڑا خسارہ تھا، بلاشبہ ایک بڑا صاحب قلم اور اس برصغیر ہند و پاکستان کا سب سے بڑا عربی کا انشا پرداز اٹھ گیا، اس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے، لیکن میرے لئے یہ حادثہ ذاتی نوعیت کا ہے، میرا انتیس برس کا مخلص رفیق، چاہنے والا دوست، شفقت کرنے والا بھائی، میری کامیابی سے خوش ہونے والا، لغزشوں پر متنبہ کرنے والا ساتھی، دنیا سے اٹھ گیا، زمانہ جس رخ پر جا رہا ہے، اور جس خود غرضی اور مادیت کا دور دورہ ہے، اس کے پیش نظر اس کی بہت کم امید ہے کہ ایسے سچے دوست، باوفا رفیق اور مخلص ساتھی پیدا ہوں گے۔

اگر ہماری قوم بیدار ہوتی اور اس میں جوہر شناسی اور فراخ حوصلگی کا مادہ ہوتا تو ان کی ذات سے بڑا نفع اٹھایا جا سکتا تھا، ان سے نصاب کی ترتیب میں مدد لی جا سکتی تھی، ان سے عربی مدارس عربیت و انشاء کے بارہ میں استفادہ کر سکتے تھے، طلبہ اور علوم عربیہ کے شائقین اطراف و اکناف سے ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے آتے، لیکن افسوس ہے کہ ان سے ان کے شایان شان فائدہ نہ اٹھایا گیا، اور ایک محدود حلقہ کے سوا بہت کم لوگوں نے ان کو پہچانا اور ان سے فائدہ اٹھایا۔

ان کی عمر ۴۴ سال سے زیادہ نہیں ہوئی، اس عمر میں انھوں نے بڑے بڑے کام کئے اور ایسی تصانیف یادگار چھوڑیں جو ایک شخص کو کامیاب مصنف اور نامور صاحب علم و صاحب قلم

بنانے کے لئے کافی ہیں، کسی شخص کے افتخار کے لئے وہ سرمایہ کافی ہے، جو انھوں نے چھوڑا مگر جو لوگ ان کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں سے واقف تھے، اور جو ان کے علم و فکر کا ارتقاء دیکھ رہے تھے، اور جن کو اس کی آرزو تھی کہ بہت دن زندہ رہیں اور کام کریں، ان کی زبان پر بصد حسرت و یاس یہ مصرعہ ہے۔ ع

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود
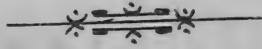
# جگرؔ مرادآبادی

جگرؔ مرادآبادی اپنے عہد کے بہت بڑے شاعر تھے، آخری دور میں بلکہ کہنا چاہئے کہ غالبؔ و مومنؔ کے بعد جو دور شروع ہوتا ہے، اس میں روایتی غزل گوئی جس کی بنیاد فارسی تغزل، نزاکت خیال اور معاملہ بندی پر پڑی تھی، حسرتؔ و جگرؔ پر ختم ہوگئی، آخر میں جگر ہی رہ گئے تھے جن کے سر پر اس تختی برّاعظم کے ادبی حلقوں نے ملک الشعراء کا تاج رکھ دیا تھا، ہندوستان (اور پاکستان) کے مشاعرے ان کی شرکت کے بغیر معتبر ہی نہ سمجھے جاتے، اور لکھنؤ تو اردو کا مرکز اور گونڈہ سے قریب ہونے کی وجہ سے ان کے نام و کلام سے گونج رہا تھا، اور ان کی شاعری اور خوش نوائی کی دھوم مچی ہوئی تھی، غرض شوکت تھانوی کے بلیغ و معنی خیز الفاظ میں "ایک دنیا کی دنیا جگرؔ کی مریض تھی"۔

وہ کثرت سے لکھنؤ آتے تھے، مشاعرے کی شرکت ان کی زندگی کا ایک معمول بن گیا تھا، لکھنؤ میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہونے کے بعد وہ وہاں بھی اپنا کلام سنانے آتے، لکھنؤ سے ان کے دیرینہ تعلقات تھے، وہاں ان کے بہت سے قدرداں بلکہ ان کی شمع کے پروانے موجود تھے،

بالعموم ان کا قیام لکھنؤ میں بھوپال ہاؤس لال باغ میں رہتا تھا، والاجاہ امیر الملک نواب سید صدیق حسن خاں مرحوم رئیس بھوپال کے چھوٹے صاحبزادے صفی الدولہ حسام الملک نواب سید علی حسن خاں مرحوم زندہ تھے، وہ خود بڑے پایہ کے سخن شناس اور ادب نواز تھے، وہ شعر کہتے بھی تھے، لیکن سخن سنج سے زیادہ سخن فہم تھے، ان کے منجھلے صاحبزادے نواب زادہ سید شمس الحسن خاں شمسؔ بی۔اے، ایل۔ایل۔بی علیگ نوجوان شاعر تھے، کلام باوقار اور سنجیدہ ہوتا تھا، ان کا کلام اکثر "معارف" میں شائع ہوتا تھا، جو خود ایک سند ہے، غالباً نواب سید علی حسن خاں مرحوم کی کشش یا سید شمس الحسن صاحب کی کوشش سے بھوپال ہاؤس ہی لکھنؤ میں جگر صاحب کا مستقر تھا، عجیب اتفاق ہے کہ ایک ایسے ادبی ماحول میں نشو ونما پانے کے باوجود جس میں بڑے سے بڑے ثقہ اور باوقار لوگ بھی شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے، اور مشاعروں میں شرکت کو عیب نہیں سمجھتے تھے، اور ایک ایسے گھر میں پلنے اور بڑھنے کے باوجود جس میں "تذکرہ گل رعنا" لکھا گیا، مجھے لکھنؤ کے کسی مشاعرے میں (سوائے ایک مشاعرہ کے جو مرشد آباد پیلیس گولہ گنج میں نواب جعفر علی خاں اثرؔ کی صدارت میں ہوا تھا، اور جس میں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی بھی تشریف رکھتے تھے) شرکت کا اتفاق نہیں ہوا، وجہ غالباً وہی پرانی کمزوری تھی، جس نے بہت سی دلچسپیوں سے بھی محروم رکھا اور بہت سی سعادتوں سے بھی یعنی دیر تک نہ جاگ سکنے کی عادت، غرض یہ کہ میں نے تقسیم ملک تک جگر صاحب کی زیارت نہیں کی تھی، اتنا یاد ہے کہ ایک روز مولانا سید سلیمان ندویؔ ندوہ کے مہمان خانہ میں مقیم تھے، مولانا عبدالباری صاحب ندوی بھی تشریف رکھتے تھے کہ نواب سید شمس الحسن خاں ملنے آئے باتوں باتوں میں جگر صاحب کا تذکرہ آگیا، ان دنوں جگر صاحب انھیں کے مہمان اور بھوپال ہاؤس میں مقیم تھے، اور شاید یہی تذکرہ کی تقریب تھی، یہ وہ زمانہ تھا کہ جگر صاحب اپنی قدیم عادت (مے نوشی) سے توبہ کرچکے تھے، نواب

شمس الحسن صاحب نے کہا کہ کل کا واقعہ ہے کہ جوش صاحب ہمارے یہاں آئے اور باصرار جگر صاحب کو لے گئے اور وہ اپنی توبہ پر قائم نہ رہے، وہاں سے آئے تو دروازہ بند کر لیا اور بہت روئے مولانا عبدالباری صاحب جو اصلاً فلسفہ اور تصوف کے رمز شناس ہیں، بڑا اچھا ادبی مذاق رکھتے ہیں، اور بعض مرتبہ بڑے اچھے فقرے ان کی زبان سے نکل جاتے ہیں، بے ساختہ بولے کہ "معلوم ہوتا ہے، جگر خراب ہے دل اچھا ہے"۔

واقعہ بھی یہی تھا کہ جگر صاحب کا دل ہمیشہ اچھا رہا معلوم نہیں کب اور کہاں ان کو یہ بری عادت پڑ گئی تھی، لیکن دل و جگر کی یہ کشمکش ان کی زندگی میں ہمیشہ جاری رہی، جگر پر بار بار اور سخت حملے ہوئے، سوزش جگر نے ہمیشہ اپنی تسکین کا سامان مانگا اور سید انشاء کی زبان سے ہمیشہ کہا۔ ع

لگا کے برف میں ساقی صراحیِ مے لا

جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا

لیکن قلب نے اپنا کام کبھی نہ چھوڑا اس میں ان کی فطرت کی خوبی، شرافت نسبی کو بھی دخل ہے، اور ان کے دل کی بھی تعریف ہے، لیکن اس میں ایک اور طاقت بھی کام کر رہی تھی، جس کا ان کے مخصوص احباب اور ہم نشینوں کے علاوہ بہت کم لوگوں کو علم ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے آغاز شباب میں اپنے بزرگ دوست لیکن درحقیقت مربی حضرت اصغر گونڈوی کی تحریک سے قاضی عبدالغنی صاحب منگلوری سے بیعت ہو گئے تھے، قاضی صاحب اپنے والد ماجد قاضی محمد اسمٰعیل صاحب منگلوری کے خلیفہ و جانشین تھے، اور وہ مولانا شیخ محمد تھانوی کے حضرت شیخ محمد تھانوی کو حضرت سید احمد شہیدؒ سے نو عمری میں براہ راست بیعت کا شرف حاصل ہوا تھا، لیکن وہ اصلاً حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانوی کے تربیت یافتہ اور مجاز تھے،

جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے شیخ و مرشد تھے، اور جن کا سلسلہ اس وقت بھی عرب و عجم میں زندہ و تابندہ ہے۔

غرض یہ تعلق اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہا اور بالآخر اس نے جگر صاحب کو بزم خرابات سے اٹھا کر اہل دل کی صف میں بٹھا دیا اور اس چیز کو جس کے متعلق کسی کہنے والے نے کہا ہے، ہمیشہ کے لئے چھڑا دیا۔

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

اور وہ وقت جلد آگیا، جب وہ اپنے یاران کہن اور خاص طور پر اپنے پرانے دوست جوش ملیح آبادی سے یہ کہنے کے قابل ہوئے۔ ع

تو بہت پہلے جہاں تھا وہیں ہے اب بھی
دیکھ رندان خوش انفاس کہاں تک پہونچے

ان کا کلام اور ان کی زندگی اس کی پوری طرح تصدیق کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ اس "آبِ نشاط انگیز" کے چھوڑ دینے کے بعد دل کے شعلے سرد ہو جاتے ہیں اور کلام پھیکا اور بے نمک ہو کر رہ جاتا ہے، لیکن جگر کا معاملہ اس کے برعکس تھا، جگر کا کلام اس تغیر حال کے بعد کہیں بلند، زیادہ پرجوش، زیادہ نشاط انگیز اور ولولہ خیز ہے، اور اس میں کہیں زیادہ زندگی اور تابندگی ہے، جس کا جی چاہے "شعلۂ طور" اور "آتش گل" کا مقابلہ کر کے دیکھ لے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے وہ حرارت و جوش، بادۂ عنبی سے حاصل کرتے تھے، اب وہ حرارت و جوش پیمانۂ دل اور میخانۂ باطن سے حاصل کرنے لگے، جس کا جوش کبھی سرد نہیں ہوتا، اور ان کو حق ہوا کہ وہ خواجہ میر درد کے الفاظ میں یہ کہہ سکیں۔ ع

جائیے کس واسطے اے درد میخانہ کے بیچ     کچھ عجب مستی ہے اپنے دل کے پیمانہ کے بیچ

بات کہاں سے کہاں تک پہونچی میں نے اپنے عہد کے بہت سے نامور شعراء کی زیارت کی، لاہور میں اقبال، ظفر علی خاں، حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی کو دیکھا اور خواجہ عزیز الحسن مجذوب سے روشناس ہوا، لیکن عجیب اتفاق ہے کہ جگر صاحب کی زیارت سے عرصہ تک محروم رہا، معلوم ہوا کہ ایک مرتبہ وہ رائے بریلی گئے، اور میرے ماموں زاد بھائی مولوی سید ابوالخیر صاحب[1] برقؔ اور خاندان کے دوسرے باذاق نوجوان ان کو خاص ہمارے مسکن دائرہ شاہ علم اللہؒ میں بھی لے گئے، یہ غالباً ۳۰ء تھا، جگرؔ صاحب اس وقت عینک کا کاروبار کرتے تھے، اور اس سلسلہ میں دورے بھی کرتے تھے، غالباً اسی سلسلہ میں وہ رائے بریلی آئے تھے، اس وقت میں شاید لکھنؤ میں تھا، جگرؔ صاحب کو دیکھ بھی نہیں سکا، میری ملاقات اور نیازمندی کی تاریخ اور جگرؔ صاحب کی بزرگانہ نوازش بہت سے انقلابات اور حوادث کی طرح تقسیم ملک سے

---

[1] یادش بخیر برادر محترم مولانا سید ابوالخیر صاحب برقؔ کی ہستی بھی عجیب باکمال ہستی تھی، لکھنؤ کی ٹکسالی اردو کے ایک ماہر، زباں کے اداشناس ونقاد، خوش گو اور پختہ کلام شاعر جس نے کئی مشاعروں میں دادِ سخن اور تمغہ حاصل کیا، عربی لغت پر اچھا عبور رکھنے والے، حافظ حدیث جس کو کئی ہزار حدیثیں معہ سند کے یاد تھیں، صاحب طرز نثر نگار جس میں مولوی محمد حسین آزاد، اور رتن ناتھ سرشار کا رنگ جھلکتا ہوا، لیکن مزاج کی وارستگی وخودداری، شہرت سے نفرت، اور زندگی کی تلخیوں اور ناکامیوں نے روشناس نہ ہونے دیا، یکم جون ۶۷ء کو تقریباً ستر سال کی عمر میں لکھنؤ میں انتقال کیا، اور اپنے آبائی مقبرہ تکیہ شاہ علم اللہؒ میں اپنے دادا عارف باللہ شیخ وقت حضرت سید شاہ ضیاء النبیؒ کے پائیں آسودۂ خاک ہوئے عربی کی تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء میں پائی، حدیث مولانا عبدالرحمٰن صاحب (تلمیذ میاں سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی) سے پڑھی، شاعری میں شمس لکھنوی، اور حضرت ثاقب قزلباش سے تلمذ تھا، اردو، عربی میں تصنیفات کا ایک ذخیرہ چھوڑا، جو تقریباً تمام کا تمام غیر مطبوعہ ہے۔

شروع ہوتی ہیں، تقسیم نے جگر صاحب کے قلب وجگر پر بڑا گہرا اثر ڈالا تھا، ملک میں جو انقلاب رونما ہوا تھا، اور آئندہ جو خطرے نظر آرہے تھے، انھوں نے ان کی شاعری پر بھی گہرے نقوش چھوڑے تھے، وہ بڑے حساس اور دردمند دل اور بڑی غیور طبیعت کے آدمی تھے، تقسیم کے بعد حکومت کے انتظام وسرپرستی میں یا حکومت کے اشارے وتحریک سے جو مشاعرے قیصر باغ کی سفید بارہ دری میں یا جشن آزادی کے موقع پر ہوتے تھے، ان کی غزلوں میں اس کی طرف صاف اشارے اور ان کی روح کا کرب بالکل عیاں تھا، یہ ان کی شاعری کا اقبال یا ان کے زور کلام کا جادو تھا کہ چمن میں ان کی یہ تلخ نوائی اور آشفتہ بیانی گوارا کر لی جاتی تھی، ورنہ دوسرے کا یہ کام نہ تھا کہ حکومت کے بڑے ذمہ داروں اور اعلیٰ افسروں کے سامنے موجودہ نظام پر ایسی کھلی ہوئی تنقید، اس سے بے اطمینانی ومایوسی کا صاف اظہار، اور آزادی کے چشمۂ رواں کے سراب ہونے کا اعلان نہ صرف سن لیا جائے بلکہ اس کی ایسی داد دی جائے کہ کان پڑی آواز نہ سنی جائے، یہاں پر صرف تین شعر لکھے جاتے ہیں، جن کے اندر ایک پوری کتاب کا مضمون اور ایک دور کی بولتی ہوئی تصویر ہے۔

چمن چمن ہی نہیں جس کے گوشہ گوشہ میں
کہیں بہار نہ آئے کہیں بہار آئے

یہ میکدہ کی، یہ ساقی گری کی ہے توہین
کوئی ہو جام بکف کوئی شرمسار آئے

خلوص وہمت اہل چمن پہ ہے موقوف
کہ شاخ خشک میں بھی پھر سے برگ وبار آئے

میرے خیال میں ان کے یہ دو شعر بھی اس صورت حال کی عکاسی کرتے ہیں، اور اس

تضاد کی طرف انگلی اٹھا کر اشارہ کر رہے ہیں، جو اعلانات و واقعات اور حقائق و تخیلات کے درمیان پایا جاتا ہے۔

با ہمہ ذوق آگہی ہائے رے پستیٔ بشر
سارے جہاں کا جائزہ اپنے جہاں سے بےخبر
شورش درد الاماں گردش دہر الحذر
بہکے ہوئے سے قافلے سہمی ہوئی سی رہگذر

ایک شاعر اگر ان حدود سے تجاوز کرے اور اشارے و کنایے کا پردہ اٹھا کر صاف صاف کہنے لگے تو پھر وہ شاعر نہیں بلکہ واعظ و محتسب اور سیاسی رہنما بن جاتا ہے، اس لئے اس سے زیادہ صراحت اور بلند آہنگی، ایک شاعر کو زیب نہیں دیتی اور جگر صاحب ادب و شاعری کے ان حدود و آداب سے خوب واقف تھے۔

غرض یہ کہ تقسیم اور اس کے اثرات نے جگر صاحب کے اندر دینی احساس اور اسلامی حمیت کو بہت زیادہ ابھار دیا تھا، اور ان کے داغ کہن تازہ ہو گئے تھے، اس تبدیلی نے اور ان کی اس محتاط زندگی نے جس پر اب کئی سال گزر چکے تھے، ان کو دینی طبقے اور علماء سے قریب کر دیا تھا، لیکن مطلق دینی طبقے اور عام علماء سے نہیں کہ جگر صاحب بہرحال ایک بلند پایہ شاعر تھے، اور شاعر اس طبقہ سے جس کی "احتساب" طبیعت ثانیہ بن گیا ہے، اور وہ ہر حال میں اپنے کو مامور من اللہ سمجھنے کے عادی ہوتے ہیں، ہمیشہ متوحش رہے ہیں، واعظ و محتسب کا لفظ فارسی اردو شاعری میں جو معنی رکھتا ہے، اور شعراء نے جس طرح اس سے اپنی وحشت و خوف کا اظہار کیا ہے، وہ ادب کے کسی طالب علم سے بھی مخفی نہیں ہے، جگر صاحب کے یہاں اس انس و قرب کے لئے شرط یہ تھی کہ اسلام کا سچا درد اور ملت کی حقیقی فکر ہو،

علم دین اور خدمت ملت کو پیشہ نہ بنایا گیا ہو، اور کسی درجہ میں شعر و ادب کا ذوق اور سخن فہمی کی استعداد ہو۔

بہرحال تقسیم کے بعد ہی جگر صاحب سے نیاز حاصل ہوا، اس کا سہرا حقیقت میں سید مسعود علی صاحب آزاد[1] فتح پوری کے سر ہے، جن پر جگر صاحب کی بڑی شفقت اور لطف خاص تھا، جگر صاحب ان کی شاعری اور کلام سے زیادہ ان کی شرافت اور ان کی مروت و کریم النفسی کے قائل و مداح تھے، اور میں نے ان کی زبان سے ہمیشہ بڑے بلند الفاظ میں ان کا تذکرہ سنا، آزاد صاحب نے تقریب کی اور مجھے اور مولانا منظور صاحب کو

---

[1] سید مسعود علی صاحب آزاد، جن کو حلقۂ احباب میں ہمیشہ آزاد صاحب ہی کے نام سے پہچانا اور یاد کیا جاتا تھا، تحصیل فتح پور ضلع بارہ بنکی کے خاندان سادات کے چشم و چراغ تھے، ان کے والد کا نام سید محمود علی صاحب تھا جو بڑے اچھے فارسی داں اور اپنے زمانہ کے مطابق تعلیم یافتہ تھے، اردو میں طبع آزمائی بھی کرتے تھے، اور کلام صوفیانہ اور عارفانہ ہوتا تھا، آزاد صاحب نے ان کی اور ان کے جگری دوست مولوی مسعود علی صاحب محوی (علیگ) ملازم دارالترجمہ حیدرآباد، جو فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے، کی صحبتوں میں آنکھیں کھولیں، اور تعلیم و تربیت حاصل کی، اور بہت جلد اردو کے اچھے غزل گو شاعر بن گئے، طبیعت نہایت موزوں، دل دردمند، آواز پرسوز اور خوش آہنگ پائی تھی، بہت جلدی مشاعروں میں نام پیدا کر لیا، جگر صاحب سے ایسی یاد اللہ ہوئی کہ ان کو ان کے بغیر چین نہ آتا، یہاں تک کہ اپنے سفر حج ۱۹۵۳ء میں اپنے ساتھ لے گئے، جوانی آزادی اور خوش عیشی، و یار باشی میں گذاری ۱۹۴۶ء کے آغاز میں تبلیغی جماعت سے تعلق ہوا، اور زندگی میں انقلاب آیا، پھر اپریل ۱۹۴۶ء میں مرشد زمانہ مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری سے بیعت ہوئے، اور ان کا دامن اس طرح تھاما کہ پھر اور کسی کام کے نہ رہے حضرت نے ان کو اپنی نمازوں کا امام اس طرح بنایا کہ آخری نماز جنازہ بھی انھیں نے پڑھائی، ان کی زندگی میں ہمیشہ رائے پور ہی رہے، ۱۹۶۰ء کے قریب پاکستان منتقل ہو گئے، بالآخر ۲۵ مئی ۱۹۷۴ء میں وہیں لاہور میں جان جانِ آفریں کے سپرد کی، غفر اللہ لہٗ۔

جگرؔ صاحب سے ملایا، غالباً اس پہلی ہی مجلس میں جگرؔ صاحب نے اپنا کچھ کلام بھی سنایا، وہ ہم لوگوں سے بڑے احترام اور تواضع سے ملے غالباً اس میں اس بات کو بھی دخل تھا کہ ہم لوگ بھی اسی سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے، جس سے وہ وابستہ تھے، یعنی میاں جی نور محمد جھنجھانوی کا سلسلہ چشتیہ اور حضرت سید احمد شہیدؒ کا سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ۔

اس کے بعد سے جگرؔ صاحب کی آمد و رفت شروع ہوئی، مجلسیں ہوئیں اور وہ اپنے کلام سے محظوظ اور سرفراز بھی فرماتے، اپنی بعض غزلیں بھی انھوں نے اشاعت کے لئے الفرقان کو دیں۔

۲۶؍ اگست ۱۹۴۸ء کو میری دعوت پر دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مختلف دینی مرکزوں اور مکتبِ خیال کے نمایندے اہل فکر و اہل علم موجودہ حالات اور اس ملک میں مسلمانوں کے مستقبل پر غور کرنے اور اس کے لئے کوئی راہ عمل تجویز کرنے کے لئے جمع ہوئے، جگرؔ صاحب بھی تشریف لائے وہاں میں نے اپنا وہ مضمون پڑھا[1] جس میں حالات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا گیا، اور خطرات کی نشاندہی کی گئی، جگرؔ صاحب نے اس مضمون کو اتنا پسند کیا کہ دوسری نشست میں دوبارہ پڑھنے کی فرمائش کی، یہ فرمائش مشاعروں کی "دوبارہ ارشاد" اور "پھر پڑھئے" کی نقل اور تقلید نہ تھی، ان کے دل دردمند کی صدا تھی، وہیں اشاعت اسلام اور اشاعت اسلامیات کے لئے ایک انجمن کی بنیاد پڑی اور لوگوں سے چندے کی اپیل کی گئی، جگرؔ صاحب نے پیش قدمی کر کے ایک وقیع رقم[2] لکھوائی جو فوراً آ گئی، اس سے معلوم ہوا کہ یہ شاعر صرف نذرانہ و مشاعرے کی فیس وصول کرنے والا نہیں راہ خدا میں اولوالعزمی کے ساتھ خرچ کرنے والا بھی ہے۔

اب جگرؔ صاحب کے روابط بڑھنے لگے وہ لکھنؤ جب تشریف لاتے تو کوشش کرتے کہ خود آ کر ملیں

---

[1] یہ مضمون "نشانِ راہ" کے عنوان سے کئی بار شائع ہوا اور مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ سے مل سکتا ہے۔

[2] رفیق محترم مولانا منظور صاحب کا بیان ہے کہ وہ ایک ہزار کی رقم تھی۔

اکثر تبلیغی مرکز واقع کچہری روڈ لکھنؤ یا ندوہ کے مہمان خانہ میں تشریف لاتے، مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ جگر صاحب کچھ سنانے کی فرمائش سے آشفتہ مزاج ہو جاتے ہیں، اور بڑے بڑے سرکاری افسروں اور مقتدر لوگوں کو یہ تلخ تجربہ ہو چکا ہے، میں سادگی سے ان سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کرتا اور وہ پیشانی پر ایک شکن لائے بغیر بڑی خوش دلی کے ساتھ اپنی کوئی غزل سناتے، میرا شوق ہل من مزید کہتا اور وہ لبیک، بعد میں تو یہ معمول ہو گیا کہ میں اپنی پسندیدہ غزلوں کی فرمائش کرتا اور وہ تعمیل کرتے، یہ بات ان کو ایسی یاد ہو گئی تھی کہ اگر میں خود تعیین نہ کرتا تو وہ خود فرماتے کہ میں آپ کی پسندیدہ غزلیں سناتا ہوں ان کا سارا کلام چیدہ و پسندیدہ تھا، مگر چار غزلوں کی ضرور فرمائش کرتا، ایک غیور و خوددار شاعر کے لئے جو اپنے کلام کا مرتبہ شناس ہے، بعض مرتبہ یہ چیز اشتعال انگیز بن جاتی ہے، اور وہ اس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے کہتا ہے کہ کیا میرے سارے کلام میں یہی چند غزلیں لائق التفات اور مستحق انتخاب ہیں؟ شاعر کو اپنا سارا کلام ایسا عزیز ہوتا ہے، جیسے باپ کو اپنی اولاد جس میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا تعلق اور جذبہ فطری کی توہین ہے، لیکن خدا جگر صاحب کے درجے بلند کرے انھوں نے کبھی اس کی شکایت نہیں کی گویا انھوں نے واقعی اس سے بہتر غزلیں نہیں لکھی تھیں، جگر صاحب کے مرتبہ کے ایک شاعر کے لئے جس کے یہاں واردات اور مضامین نو کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے، یہ بڑے ایثار اور بے نفسی کا معاملہ تھا۔

میں نے اقبال کے سلسلہ میں یہ بات پہلے بھی لکھی ہے کہ کسی شاعر یا کسی کلام کی پسندیدگی کا راز یہ ہے کہ اس میں اپنے خیالات کی ترجمانی اور اپنی ذات کا عکس نظر آتا ہے، انسان درحقیقت اپنے اوپر عاشق ہوتا ہے، اور جہاں جہاں اپنی پرچھائیں دیکھتا ہے، اس کے پیچھے دیوانوں کی طرح پھرتا ہے، جگر صاحب کو پسند کرنے کا بالعموم (اور ان غزلوں کو خصوصیت کے ساتھ پسند کرنے کا) راز یہ تھا کہ اس میں اپنے بہت سے ان خیالات کی ترجمانی ملتی تھی، جن کو ادا کرنے کے لئے نہ زبان تھی، نہ موزونیت

نہ لیاقت، جب یہ غزلیں سنیں تو معلوم ہوا کہ دل یہی کہنا چاہتا تھا لیکن گونگا تھا، یا جوہر شاعری سے محروم، شاعر نے ان خیالات کو اس خوبی سے ادا کر دیا جہاں اپنا طائرِ خیال بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔

جگرؔ صاحب کے یہاں وہ جنس ملی جو عام شعراء کے یہاں اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے، وہ صرف اقبالؔ کے یہاں ملی تھی، یعنی خیالات کی جدت، فکر کی بلندی، طبیعت کی خودداری اور عزتِ نفس، رسم و آئینِ کہن سے انحراف، خواہ وہ معاشرہ کا ہو خواہ شعروادب کا جس کو بے آزار بغاوت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں، بے لوثی اور بے غرضی، گہری شرافت اور انسانی بلندی، ناآسودہ تمنا اور لامحدود طلب، اب وہ غزل سنتے چلیے جو فرمائش پر جگرؔ صاحب نے بار بار سنائی اور اس وقت بھی ان کا نغمہ و آہنگ جو انھیں نے شروع کیا تھا، اور انھیں کے ساتھ چلا گیا، اور جو ان کے کلام کی گہرائی اور روح کی بے چینی کے ساتھ بہت ہم آہنگ تھا، کانوں میں گونج رہا ہے، اس غزل میں ان کے اخلاق کی سچی تصویر اور ان کی طبیعت کی خودداری اور ارجمندی بھی شراب کی طرح کھنچ کر آگئی ہے۔

جب تک کہ غمِ انساں سے جگرؔ انسان کا دل معمور نہیں
جنت ہی سہی دنیا لیکن جنت سے جہنم دور نہیں
جز ذوقِ طلب جز شوقِ سفر کچھ اور ہمیں منظور نہیں
اے عشق بتا اب کیا ہوگا کہتے ہیں کہ منزل دور نہیں
واعظ کا ہر اک ارشاد بجا تقریر بہت دلچسپ مگر
آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں چہرہ پہ یقیں کا نور نہیں
میں زخم بھی کھاتا جاتا ہوں قاتل سے بھی کہتا جاتا ہوں
توہین ہے دست و بازو کی وہ وار کہ جو بھرپور نہیں

اس نفع وضرر کی دنیا سے میں نے یہ لیا ہے درسِ جنوں
خود اپنا زیاں تسلیم مگر اوروں کا زیاں منظور نہیں

اربابِ ستم کی خدمت میں اتنی سی گذارش ہے میری
دنیا سے قیامت دور سہی دنیا کی قیامت دور نہیں

اسی طرح ان کی یہ غزل بار بار فرمائش کر کے سنی جس کا مطلع ہے۔

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام سہی عرفانِ محبت عام نہیں

پوری غزل تو "آتش گل" میں پڑھ لیجئے گا، لیکن یہ دو شعر یہیں سنتے چلئے، حافظ اور مولانا روم کی کیسی ہمنوائی کی ہے، لیکن اردو کی نزاکت اور جگر کا طریق ادا انھیں سے مخصوص ہے۔

آنا ہے جو بزمِ جاناں میں پندارِ خودی کو توڑ کے آ
اے ہوش و خرد کے دیوانے یاں ہوش و خرد کا کام نہیں

ایک شعر اور سنئے۔

پینے کو تو سب پیتے ہیں جگر میخانۂ فطرت میں لیکن
محرومِ نگاہِ ساقی ہے وہ رند جو دُرد آشام نہیں

میری تیسری پسندیدہ غزل جو چھوٹی بحر میں ہے، لیکن اس میں غضب کی شوخی اور روانی ہے، ان کی وہ غزل جس کا مطلع ہے، اور کیسا روشن مطلع ہے۔

کوئی یہ کہدے گلشن گلشن
لاکھ بلائیں ایک نشیمن

اس کے یہ دو شعر بے سنائے رہا نہیں جاتا۔

کامل رہبر قاتل رہزن
دل سا دوست نہ دل سا دشمن

عشق ہے پیارے کھیل نہیں ہے　　　عشق ہے کارِ شیشۂ و آہن

معلوم نہیں میں نے پہلا شعر کہاں کہاں اور کیسے کیسے علمی و سنجیدہ موقعوں پر پڑھا اور اس سے کام لیا۔
ان کی چوتھی غزل جو ایسی حقیقتوں اور مضامین سے لبریز ہے، جو شاعری کے دائرہ سے نکل کر تاریخ و فلسفۂ حیات کی سرحدوں کو چھوتے اور ان سے چشمک کرتے ہیں، اور جن کے متن کی شرح ایک ایک کتاب کی طالب ہے، یہ ان کی وہ غزل تھی جس کا مطلع ہے۔ ع

وہ سبزہ ننگ چمن ہے جو لہلہا نہ سکے
وہ گل ہے زخم بہاراں جو مسکرا نہ سکے

اسی غزل کا ایک شعر ہے، جس میں انھوں نے انسان کے اس تضاد کی صلاحیت کو بیان کیا ہے کہ اگر وہ پستی میں گرتا ہے، اور اپنے سے ناآشنا ہوتا ہے تو اس سے زیادہ پست کوئی چیز نہیں اور اگر وہ مقام انسانیت اور اپنی ترقی و بلندی کے امکانات و مضمرات سے واقف ہوتا ہے تو اس سے بلند کوئی مخلوق نہیں، وہ فرماتے ہیں۔

گھٹے اگر تو بس اک مشت خاک ہے ورنہ
بڑھے تو وسعت کونین میں سما نہ سکے

انھوں نے مجھے یہ شعر ایک خاص موقع پر سنایا تھا، میں ایک تبلیغی جماعت کے ساتھ گونڈہ گیا تھا وہاں جلسۂ عام میں جس میں اچھی تعداد میں تعلیم یافتہ حضرات اور شاید کچھ غیر مسلم اصحاب بھی تھے، میری تقریر کا موضوع "مرتبہ انسانیت اور انسان کا شرف و بلندی" تھا، جگر صاحب نے جو ایسے جلسوں میں بڑے اہتمام سے شریک ہوتے تھے، جلسہ کے اختتام پر فرمایا کہ آپ نے آج تقریر میں جو کچھ فرمایا میں نے اسی کو اپنے ایک شعر میں بیان کیا ہے، پھر اپنا یہ شعر سنایا۔
جگر صاحب کا تعلق روز بروز بڑھتا جاتا تھا، وہ جس طرح معاملہ فرماتے تھے، اس سے ہمیشہ

شرمندگی ہوتی تھی، اور سوائے اس نسبت کے احترام کے جس کا اوپر ذکر ہوا اس کی اور کوئی توجیہہ سمجھ میں نہیں آتی تھی، ایک مرتبہ غالباً جنوری ۱۹۶۰ء میں بستی کے سفر سے واپسی پر رات کو گونڈہ میں ان کے یہاں ٹھہرا وہ بہت خوش ہوئے اور میری راحت کا بڑا اہتمام کیا، رات کو جب میں اٹھا اور کمرہ سے باہر نکلا، وہ میرے پاؤں کی چاپ سن کر باہر آگئے میں نے دیکھا کہ وہ سامنے کھڑے ہیں، اور بہت جھکے ہوئے، ہاتھ جوڑ کر مجھے کچھ پیش کر رہے ہیں، ان کی ہیئت اور کیفیت ایسی تھی کہ میں سمجھتا تھا کہ اگر میں نے کچھ پس و پیش کی تو ان کی دل شکنی ہوگی، اور شاید وہ رو دیں، میں نے ہاتھ بڑھا کر لے لیا، دیکھا تو روپیوں کی ایک گڈی تھی، سو روپئے سے کم پچاس سے کوئی زیادہ ایک رقم تھی، اس کو قبول کرنے سے وہ ایسے ممنون ہوئے کہ گویا ان پر بڑا احسان ہوا، ایک آدھ بار اور بھی اس آزمائش سے گزرنا پڑا، ندوۃ العلماء کو وقتاً فوقتاً بڑی بڑی رقموں کی پیش کش کرتے رہتے تھے، ایک مرتبہ مولانا منظور صاحب کو ایک ہزار کا نوٹ ندوہ کے لئے دیا، معلوم ہوا کہ اللہ تعالےٰ نے انھیں بہت بڑا دل دیا اور حوصلہ مند طبیعت عطا فرمائی ہے، اور ان کو لینے سے زیادہ دینے میں مسرت حاصل ہوتی ہے، مجھے اس کی آرزو ہی رہی کہ مجھے بھی یہ شرف حاصل ہوتا لیکن کبھی اس کی نوبت نہیں آئی، ایک مرتبہ ان کی کریم النفسی اور اخلاقی بلندی نے مجھے اور شرمندہ کیا بلکہ سبق دیا اور مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ وہ اخلاقی حیثیت سے بہت سے ان لوگوں سے بلند ہیں، جو دوسروں کو اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں، اور ان کی اخلاقی حس بڑی لطیف ہے، قصہ یہ پیش آیا کہ جگر صاحب ۱۹۵۳ء میں گونڈہ سے حج کے لئے روانہ ہوئے ان کی اہلیہ محترمہ بھی ساتھ تھیں، مجھے بھی بمبئی تک ایک دوست کو پہونچانے جانا تھا، لکھنؤ سے میرا ان کا ساتھ ہوگیا، ہم اور وہ سکنڈ کلاس میں تھے، ہمارے وہ عزیز جو میرے شاگرد بھی ہیں، کسی کے حج بدل میں جا رہے تھے، اور چونکہ ان کا سفر انکے مصارف پر ہو رہا تھا، اس لئے تھرڈ کلاس میں تھے، مجھے اس کا کوئی احساس نہیں ہوا، وہ

دو ایک بار کچھ ضرورت معلوم کرنے کے لئے ہمارے درجہ میں آئے جب وہ چلے گئے تو جگر صاحب نے مجھ سے کہا کہ یہ صاحب آپ کے ساتھ ہیں، اور ان کا آپ سے تعلق معلوم ہوتا ہے، مجھے یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ تھرڈ میں سفر کریں، میں ان کا ٹکٹ سکنڈ کلاس میں تبدیل کرادیتا ہوں آپ کو راحت ہوگی، اور میرا یہ احساس بھی جاتا رہے گا، یہ سن کر مجھے بڑی غیرت آئی کہ یہ تو میرے کرنے کا کام تھا، لیکن جگر صاحب نے اس کا بالکل موقع نہیں دیا اور بمبئی تک ٹکٹ کا جو فرق تھا، انھوں نے اس کو ادا کردیا۔

جگر صاحب کو حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری سے جو میرے اور مولانا منظور صاحب اور آزاد صاحب کے شیخ و مرشد تھے بھی بڑی عقیدت ہوگئی تھی، غالباً وہ آزاد صاحب کی دعوت و تحریک پر ایک مرتبہ رائے پور بھی گئے اور کوہ مری پاکستان پر بھی ایک مرتبہ وہ میری موجودگی میں آئے اور اپنا کلام بھی سنایا، حضرت کی لکھنؤ میں آمد سن کر وہ مرکز میں بھی ملنے کے لئے آتے ہم میں سے کوئی سنانے کی فرمائش کرتا اور وہ بے تکلف سنانا شروع کردیتے، حضرت بھی جو گہرا چشتی مذاق رکھتے تھے، اور اشعار سے بڑا لطف اور اثر لیتے تھے، محظوظ و مکیّف ہوتے، حضرت کو ان کا یہ شعر خاص طور پر پسند آیا، اور اس کی داد دی۔

واعظ کا ہر اک ارشاد بجا تقریر بہت دلچسپ مگر
آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں چہرہ پہ یقیں کا نور نہیں

جگر صاحب کا یہ تعلق اتنا بڑھا کہ بعض اوقات میرے لئے وجہ امتحان بن جاتا تھا، ایک مرتبہ میں کسی سفر سے آتے ہوئے گونڈہ اترا معلوم ہوا کہ جگر صاحب بیمار ہیں، حاضر ہوا تو بہت خوش ہوئے، گھر میں کہلا بھیجا کہ علی میاں آئے ہیں، جو کچھ خاطر ہوسکے کی جائے، پھر فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنی کتابوں کا آپ کو ٹرسٹی بنا جاؤں اور یہ سب آپ کے سپرد کر جاؤں، میں اس کے لئے ایک وصیت نامہ

بھی لکھ دینا چاہتا ہوں یہ کہہ کر انھوں نے اپنے ان دوست کو بلوایا جو پولیس سے ریٹائرڈ ہو گئے تھے، اور ان دنوں وہیں مقیم تھے، میں سمجھتا تھا کہ اس خدمت کے لئے سب سے زیادہ اہل ہمارے کرم فرما اور جگر صاحب کے بھی قدرداں سید صدیق حسن صاحب آئی سی۔ ایس ہیں، میں نے عذر کیا اور بڑی مشکل سے پیچھا چھڑایا اور ان سے رخصت ہوا، بالآخر وہ ساعت آگئی جو نبی و ولی، شاعر و ادیب، فلسفی و مفکر اور رند و زاہد سب کو پیش آتی ہے، بیماری کا سلسلہ عرصہ سے چل رہا تھا، وہ آخری بار لکھنؤ آئے اور میر احمد حسین صاحب کی کوٹھی پر اکبری دروازہ پر ٹھہرے، جہاں اب وہ عرصہ سے قیام کر رہے تھے، اس دوران میں لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن نے ان سے اپنا کلام سنانے کی پیش کش کی، انھوں نے گلوگیر اور درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں یہ غزل پڑھی جس کا یہ شعر آنے والے وقت کی پیشین گوئی کرتا تھا، اور اس کا مقام بھی متعین کرتا تھا، وہ شعر یہ ہے۔

جان کر منجملۂ خاصان میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

بالآخر وہ وقت آگیا اور یہ شاعر عارف جس نے نصف صدی تک دلوں کو گرم اور میخانۂ عشق کو آباد و پر رونق رکھا تھا، دنیا سے رخصت ہوا، ان تعلقات کی جو محض ادب و شاعری اور تفریح طبع کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں، بے ثباتی اور بے اعتباری بھی دیکھی کہ جب ان کے انتقال کی خبر لکھنؤ آئی تو اس لکھنؤ سے جو ان کے نغموں سے ابھی تک گونج رہا تھا، اور جہاں "جگر کے مریض" اور "شعلۂ طور اور آتش گل کے پروانے" ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے صرف چار آدمی ان کی نماز جنازہ میں شرکت کے لئے گونڈہ روانہ ہوئے ان میں سے ایک یہ راقم سطور، دوسرے مولانا مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی، تیسرے خاندان فرنگی محل کے ایک دوسرے فرد مولوی فرحت اللہ انصاری جو اس وقت غالباً حکومت یو۔ پی کے اردو پرچہ کے ایڈیٹر تھے، چوتھے عزیز گرامی مولوی عتیق الرحمن سنبھلی، گونڈہ والے

سمجھتے تھے کہ آج لکھنؤ ٹوٹ پڑے گا اور جگر صاحب کے قدرداں سیکڑوں کی تعداد میں ٹرین اور کاروں سے ان کا آخری دیدار کرنے اور ان کو الوداع کہنے کے لئے آئیں گے، انھوں نے اسی لئے نماز میں غیر معمولی تاخیر کی، وہ جمعہ کا دن تھا، اور جمعہ کی نماز کے بعد عام طور پر نماز جنازہ ادا کرنے کو ترجیح دی جاتی ہے کہ نمازی بکثرت شریک جنازہ ہو جاتے ہیں، لیکن لکھنؤ کی ٹرین جس سے لوگوں کے آنے کی امید ہو سکتی تھی لکھنؤ سے عین نماز جمعہ کے بعد چلتی اور عصر کے وقت گونڈہ پہونچتی تھی، ان کو ہم چار آدمیوں کو دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی، مغرب کے وقت غالباً نماز جنازہ ہوئی، مولوی محمد رضا انصاری صاحب نے نماز پڑھائی، جنازہ میں زیادہ تر عام مسلمانوں اور دینی ذوق رکھنے والے افراد کی کثرت تھی، خال خال تعلیم یافتہ اور ادب نواز حضرات نظر آتے تھے۔

آخر میں جگر صاحب کا ایک خط تبرک کے طور پر شامل کیا جاتا ہے، جو راقم سطور کے نام ایک خط کے جواب میں ہے، اور بعض حیثیتوں سے بڑا تاریخی اور قیمتی خط ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس پر تاریخ درج نہیں ہے، لیکن یہ غالباً تعارف و ملاقات کے بعد کا خط ہے۔

"گونڈہ ۷۸۶

حضرت المحترم زاد اللہ اکرامکم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

مجھ جیسے واقعۃً ننگ اسلام و ننگ خلائق پر آپ جیسے بزرگان ملت کی توجہات بے پایاں میرے لئے باعث فخر و ناز بھی ہیں، اور باعث اذیت روحانی بھی، لیکن اس طرح کی اذیت روحانی جس پر بہت سی سچی مسرتیں بھی نثار کی جا سکتی ہیں، آپ نے اپنے مکتوب گرامی میں جس صداقت و رابطۂ خاص کی جانب اشارہ فرمایا ہے، بحمد اللہ میں اس سے بے خبر نہیں مولانائے محترم! میں آپ حضرات کا جس حد تک عقیدت مند ہوں، ہر شخص اس کا

اندازہ بھی نہیں کرسکتا ہے۔

خود اپنے متعلق جو کچھ جانتا ہوں معلوم نہیں وہ کس حد تک صحیح ہے، کس حد تک غلط تاہم بزرگوں کے فیضان توجہ کی بدولت اختساب نفس سے غافل نہیں رہتا لیکن محض اختساب نفس بھی ایک طرح کی بیماری ہے، تمام عمر بے عملی و بدعملی میں بسر ہوئی اب ان سے ایک ربط خاص پیدا ہوچکا ہے اور قوائے عمل مضمحل و مفلوج، روح و دل روتے رہتے ہیں "دین" کی طرف جانا چاہتا ہوں، لیکن بے دینی کی جانب قدم مڑ جاتے ہیں، اکثر و بیشتر ایسا محسوس کرتا ہوں، جیسے میری تمام تر زندگی "دلدل" میں پھنس گئی ہے اور اب اس سے رہائی کی بظاہر کوئی توقع نہیں، اس عالم مایوسی میں خدا جانے کیوں دل گواہی دیتا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر مجھے تباہ و برباد نہ ہونے دے گا، معلوم نہیں یہ حدیث نفس ہے یا حقیقۃً پیام غیب۔

مختصراً یہ کہ ایک شدید روحانی کشمکش و اذیت میں زندگی بسر ہو رہی ہے، خدائے قدوس رحم و کرم فرمائے، میں بہت سے معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں، آپ کے علم میں ہے کہ آستانۂ منگلور شریف سے وابستہ ہوں، میری آنکھوں نے جو انوار و تجلیات دیکھے ہیں انھیں بھول نہیں سکتا، اکرام بے پایاں کی بارشیں میخانہ و مسجد سب میں یکساں ہوتی رہیں، آج بھی جو ایک درد مستقل محسوس کرتا ہوں، یہ بھی انھیں برکات کی یادگار ہے۔

مولانائے محترم! میری تمنا ہے کہ مجھے اس طرح کے مواقع دیئے جائیں کہ میں آزادانہ اپنے خیالات پیش کرسکوں، میں آپ کی تحریک کا دل سے معترف ہوں، اپنے تمام دوستوں کو اس طرف متوجہ کرتا رہتا ہوں، میرا یقین ہے کہ فلاح کا واحد ذریعہ

یہی تحریک ہے، اور اسی کے ذریعہ کائنات وماورائے کائنات سنور سکتی ہے، وقت بہت کم رہ گیا ہے، سفر درپیش ہے، شاہ جہانپور سے واپسی پر شاید دو دن کے لئے لکھنؤ ٹھہر سکوں ورنہ پھر پندرہ بیس دن بعد میں ایک اچھے مقصد کو سامنے رکھ کر دور دراز کا سفر کرنے والا ہوں دعا فرمایئے کہ اس مقصد میں کامیاب ہو سکوں۔

خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہو اور تا دیر آپ خدمت اسلامی میں سرگرمی کے ساتھ خدمت انجام دیتے رہیں۔"

خادم
جگر

# ڈاکٹر سید محمود

حافظہ پر زور ڈالنے کے باوجود یہ یاد نہیں آتا کہ میں نے ڈاکٹر صاحب کو پہلی بار کب اور کہاں دیکھا تھا؟ ممکن ہے، میں نے ان کو سب سے پہلے مولانا مسعود علی صاحب ندوی کے پاس دیکھا ہو جو دار العلوم ندوۃ العلماء کی مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں مہینوں ندوہ میں مقیم رہے، ان کے پاس اس زمانہ میں مشہور اور سربرآوردہ حضرات کثرت سے آتے تھے، اور مجلس گرم رہتی تھی، ڈاکٹر صاحب کے مولانا سے پرانے تعلقات و روابط تھے، دونوں نے خلافت تحریک میں دوش بدوش کام کیا تھا، دار المصنفین کا بھی رشتہ تھا، اور مولانا شبلی کی نیازمندی کا بھی، ممکن ہے اس سے پہلے ان کو قیصر باغ کی سفید بارہ دری میں ۱۹۲۸ء کی آل پارٹیز کانفرنس میں دیکھا ہو جو ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں نہرو رپورٹ پر غور کرنے کے لئے منعقد ہوئی تھی، لیکن یہ دیکھنا بھی ایسا دیکھنا تھا کہ حافظہ میں اس کا کوئی نقش نہیں اور اس کی کوئی یاد محفوظ نہیں، البتہ ان کا ذکر خیر تحریک خلافت کے ایک پرانے رہنما، مجاہد، ایک راسخ العقیدہ قوم پرور مسلمان و کانگریسی، گاندھی جی کے ایک معتمد ترین رفیق و نیازمند کی حیثیت سے اس وقت کی مجلسوں میں برابر رہتا تھا، میرے

محبوب و محترم رفیق مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کا تعلق صوبہ بہار سے تھا، جو ڈاکٹر صاحب کا وطن ثانی اور ان کی سیاسی و انتخابی سرگرمیوں کا میدان تھا، یہ تو بہت بعد میں حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی سے معلوم ہوا کہ وہ یوپی کے ضلع غازیپور کے ایک قصبہ سید پور بھتری کے رہنے والے تھے، ورنہ ہم تو ان کو اول و آخر بہار ہی کا سمجھتے تھے، مولانا مسعود عالم صاحب انکے حالات سے زیادہ واقف تھے، اور ان کو ان کی ذات سے دلچسپی بھی زیادہ تھی، اس لئے بار بار ان کا تذکرہ آنا قدرتی امر تھا، وہ جب بانکی پور کے کتب خانہ خدا بخش خاں کے مرتب فہرست (کیٹلاگر) ہو کر پٹنہ چلے گئے تو ڈاکٹر صاحب بہار کے وزیر تعلیم تھے اور یہ کتب خانہ انہی کی وزارت سے متعلق تھا، ان کا ان سے واسطہ پڑنا ناگزیر تھا، اس لئے ان کے خطوط میں بار بار ان کا ذکر آیا ہے۔

اپریل ۱۹۴۸ء میں جمعیۃ العلماء ہند کا سالانہ جلسہ لکھنؤ میں ہوا، مندوبین و مہمانوں کا قیام دار العلوم ندوۃ العلماء کے احاطہ میں تھا، مجھے خیال ہوا کہ اگر اس موقع پر معزز و ذی علم مہمانوں کی ضیافت طبع کے لئے طلبہ کی انجمن "الاصلاح" کی طرف سے ایک علمی و تاریخی نمائش کا انتظام کیا جائے تو ہر طرح موزوں و برمحل ہوگا، اس وقت عزیزی مولوی طیب عثمانی "الاصلاح" کے ناظم تھے، میں نے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کی عربی تصنیفات "نزہۃ الخواطر" کی آٹھ [illegible] اور "معارف العوارف فی انواع العلوم والمعارف"[1] کی مدد سے ایسے تاریخی [illegible] [illegible] تیار کیے جن کو دیکھنے سے ایک نظر میں معلوم ہو جاتا تھا کہ ہندوستان کے ہزار سالہ اسلامی عہد میں ہر علم و فن میں کون کون سی اہم شخصیتیں پیدا ہوئیں، علمائے ہند کی وہ تصنیفات

---

[1] یہ کتاب دمشق کی مشہور علمی اکیڈمی کی طرف سے "الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند" کے نام سے شائع ہوئی حال میں اس کا ترجمہ "اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں" کے نام سے دار المصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوا ہے جو مولوی ابو العرفان خانصاحب ندوی سابق مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء کا کیا ہوا ہے۔

کون سی ہیں، جو بین الاقوامی شہرت رکھتی ہیں، اور اسلام کے پورے علمی ذخیرہ میں ان کی امتیازی شان ہے، ہندوستان میں کس کس دور میں کون کون سے علمی و روحانی مرکز تھے، اور کہاں کہاں بڑے مدارس قائم ہوئے؟ نظام و نصاب تعلیم میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں؟ مختلف زمانوں میں کیا کیا معیارِ فضیلت رہے؟ غرض چند نقشوں میں ہندوستان کی علمی و دینی تاریخ کا ابھرا ہوا خاکہ اور ہزاروں صفحات کا عطر کھینچ کر آ گیا تھا، سیکڑوں آدمیوں نے اس علمی نمائش کی سیر کی لیکن اس سے سب سے زیادہ دلچسپی دو صاحبوں نے لی، ایک صدر جلسہ مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ نے دوسرے ڈاکٹر سید محمود صاحب نے، ڈاکٹر صاحب اس وقت بہار کے وزیر تعلیم تھے، انھوں نے ازراہ قدردانی پٹنہ جا کر اپنے محکمہ کی طرف سے "انجمن الاصلاح" کو دو سو روپے بھجوائے۔

عرصہ تک ڈاکٹر صاحب کو براہ راست قریب سے دیکھنے سننے کا موقع نہ ملا، میری اور ان کی عمر میں اتنا تفاوت تھا، اور ان کا اور میرا راستہ اتنا الگ الگ تھا کہ دونوں کا کراس ہونا محض ایک اتفاقی واقعہ تھا، میں ایک گمنام طالب علم، ایک دینی مدرسہ میں متوسط درجہ کا استاد، وہ میدان سیاست کے شہسوار، ایک دیرینہ سال و پختہ کار سیاسی رہنما، اس عرصہ میں وہ مرکزی حکومت میں امور خارجہ کے محکمہ میں وزیر مقرر ہوئے، میرے برادر بزرگ ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب نے جو ندوہ کے ناظم تھے، ندوہ کے ایک کام سے مجھے اور رفیق محترم مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی مہتمم دار العلوم کو ان کے پاس دہلی بھیجا، مولانا حبیب الرحمن صاحب لودھیانوی مرحوم نے مولوی سید محمد مجتبیٰ صاحب وکیل بہار کو جو ڈاکٹر صاحب کے معتمد خصوصی اور مددگار رہ چکے تھے، ہمارے ساتھ کیا، اور ہم ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی واقع نئی دہلی پہنچے، ندوہ سے قدیمی اور عزیزانہ تعلق کی بنا پر ڈاکٹر صاحب بزرگانہ شفقت اور بے تکلفی کے ساتھ ملے، اس مسئلہ کے علاوہ جس کے سلسلہ میں ہم لوگ گئے تھے، اور ڈاکٹر صاحب نے

اس میں مدد کرنے کا وعدہ کیا، ڈاکٹر صاحب دوسری علمی و دینی گفتگو کرتے رہے، اور بعض خاص مسائل پر لکھنے کی ضرورت اور قرآن و اسلام کے بعض گوشوں کو جدید طریقہ پر روشن اور اجاگر کرنے کی اہمیت کا اظہار کرتے رہے، یہ ہماری پہلی "شعوری" ملاقات تھی جس میں ڈاکٹر صاحب کو قریب سے دیکھنے اور ان کے جذبات و خیالات سے کسی حد تک واقف ہونے کا موقع ملا۔

۱۹۵۶ء میں وزیر برائے امور خارجہ کی حیثیت سے انھوں نے پہلی بار ممالک عربیہ کا سفر کیا، اس دورہ میں وہ دمشق بھی گئے، حسن اتفاق کہ اس وقت میں دمشق یونیورسٹی کی دعوت پر دمشق گیا ہوا تھا، اور وہیں مقیم تھا، ایک رات دمشق کے ہندوستانی سفارت خانہ نے ان کے اعزاز میں دعوت کی جس میں وزرائے حکومت، معززین شہر، صحافیوں اور ملک کے دانشوروں کو مدعو کیا، میں بھی اپنے بعض ہندوستانی رفقاء کے ساتھ مدعو تھا، ڈاکٹر صاحب میرے والد اور بھائی سے تو واقف ہی تھے، اور مجھے بھی نیاز حاصل ہو چکا تھا، دعوت میں خصوصی التفات سے محظوظ فرمایا، دیر تک گفتگو کرتے رہے، اور بعض خصوصی مہمانوں سے بھی تعارف کرایا، مجھ پر ڈاکٹر صاحب کے اخلاق و شرافت کا خاصہ اثر ہوا کہ وہ اپنے اس بلند منصب و مقام کے ساتھ اپنے خورد عزیزوں اور نیازمندوں کو فراموش نہیں کرتے اور ایک ایسی ممتاز تقریب میں بھی وہ خصوصیت کے ساتھ ان سے گفتگو کا وقت نکال لیتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب "دارالمصنفین" اعظم گڑھ کی مجلس انتظامی کے نہ صرف رکن رکین بلکہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، کے انتقال کے بعد اس کے مستقل صدر بھی تھے، وہ بڑی پابندی کے ساتھ اس کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے، وزارت میں ہونے یا نہ ہونے سے اس معمول میں کوئی فرق نہیں آیا، وہ ابھی وزارت ہی میں تھے کہ میں بھی دارالمصنفین کی مجلس انتظامی کا رکن منتخب ہو گیا، اور اس طرح ہم دونوں اس کے جلسوں میں جو سال میں

ایک بار ضرور ہوتے تھے، جمع ہونے لگے، وہ اپنے زمانۂ وزارت میں ایک یا دو بار میری موجودگی میں "دارالمصنفین" آئے، ان کے لئے مقامی حکام کی طرف سے وہ سب انتظامات اور اعزاز ہوتے تھے، جو مرکز کے وزراء کے دوروں کے موقع پر ہوتے ہیں، دہلی سے شاہ گنج تک وہ اپنے سیلون میں آتے، وہاں سے موٹر کا انتظام ہوتا، کلکٹر، سپرنٹنڈنٹ پولیس سلامی کے لئے حاضر ہوتے عموماً دوپہر کے کھانے میں وہ شرکت کرتے اور واپسی پر ان کو رخصت کرتے، ڈاکٹر صاحب رفقاء دارالمصنفین اور ارکان مجلس سے اسی طرح بے تکلفی اور محبت کے ساتھ ملتے جیسے ان کی اصل برادری اور انس و دلبستگی کا حلقہ یہی ہے، وہ مختلف علمی و دینی مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے، اپنے ذاتی خیالات و تحقیقات پیش کرتے، اور دوسروں کی سنتے، اس زمانہ میں ان کا محبوب موضوع اور دلچسپی کا مضمون یہ تھا کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی حیثیت فقہی و دینی نقطۂ نظر سے کیا ہے؟ اور کیا وہ اہل کتاب میں شامل ہیں یا نہیں؟ نیز مسلمان سلاطین کی رواداری و فراخدلی کے واقعات تھے، وہ ان مسائل میں اپنی خاص رائے رکھتے تھے جس سے متعدد شرکائے مجلس کو اتفاق نہیں تھا، مگر سب ان کے خلوص کا اعتراف اور ان کی ذات کا احترام کرتے تھے۔

پھر ایک وقت آیا کہ وہ وزیر نہیں رہے، اب وہ محض "ڈاکٹر سید محمود" کی حیثیت سے دارالمصنفین آئے زمانہ کی نیرنگی کا تماشا دیکھا کہ اب نہ وہ حفاظتی انتظامات تھے، نہ حکام شہر کی حاضر باشی و نیازمندی، لیکن ڈاکٹر صاحب کی ذات و صفات کا احترام اب بھی باقی تھا، اب وہ برائے نام رسمیات کا حجاب بھی باقی نہیں رہا تھا، جو سایہ کی طرح ان کے ساتھ رہتا تھا، اور جس کو دیکھ کر ان کے بعض نیازمند کہتے تھے "باسایہ ترا نمی پسندم" دارالمصنفین آکر ان کا پرانا علمی ذوق ابھر آتا تھا، وہ تاریخ کے طالب علم رہ چکے تھے، اور اسی میں انھوں نے ڈاکٹریٹ

کیا تھا، اسلامیات سے ان کو گہرا شغف تھا، وہ اپنی موروثی وفطری اسلامیت اور اپنے ذوقی و علمی نیشنلزم اور حب الوطنی میں ہمیشہ مطابقت پیدا کرنے کے خواہشمند رہے، اور اس کے لئے تاریخی و علمی دلائل فراہم کرنے کے لئے کوشاں، ان کے اس جذبہ کی تسکین کا سب سے بڑا سامان یہ تھا کہ قرآن وحدیث سے بھی جن پر ان کا ہمیشہ پختہ عقیدہ رہا کوئی تائید مل جائے، ظاہر ہے کہ ان کے خیال میں دارالمصنفین سے بہتر اس کے لئے کوئی جگہ نہ تھی، چنانچہ وہ اس موضوع کو بار بار چھیڑتے اور رات گئے تک اس موضوع پر کھل کر گفتگو کرتے، اسی زمانہ میں وہ مجھ پر بہت شفقت فرمانے لگے تھے، ان کی خواہش وکوشش رہتی تھی کہ میں دیر رات تک ان کی مجلس میں شریک رہوں اور اس موضوع پر کھل کر گفتگو کروں، میں ہمیشہ سے دیر رات تک جاگنے کے معاملہ میں بہت کمزور رہا ہوں، پھر کوئی ایسی بات بھی نہیں کہنا چاہتا تھا جس سے ان کو تکلیف ہو، بارہا ایسا ہوا کہ انھوں نے مجھ کو تلاش کرایا، اور میں کوئی بہانہ کر کے وہاں سے ٹل گیا، مولانا مسعود علی صاحب مرحوم خاص طور پر ان مجلسوں سے گریز کرتے اور واجبی حد تک ڈاکٹر صاحب کا ساتھ دیتے۔

ڈاکٹر صاحب سے جب بار بار ملنا ہوا اور تفصیل سے ان کی باتیں سننے کا موقع ملا تو معلوم ہوا کہ ان کو حضرت سید احمد شہیدؒ سے والہانہ عقیدت اور محبت ہے، اس میں سید صاحب کی تحریک جہاد کے علاوہ جس سے ڈاکٹر صاحب کو فطری مناسبت تھی، اور وہ ان کو ہندوستان کی آزادی کی جد وجہد کا اولین داعی اور قائد سمجھتے تھے، ان کے خاندانی تعلقات وروایات کا بڑا دخل تھا، اور ان کو ان کی ذات سے صرف ذہنی وفکری لگاؤ نہیں بلکہ ذاتی اور جذباتی تعلق بھی تھا، ان کے رشتہ کے دادا قاضی فرزند علی[1] صاحب سید صاحب سے ارادت وبیعت کا خصوصی

---

[1] قاضی فرزند علی صاحب شیخ صدیقی تھے، ان کی شرافت اور علوئے خاندانی ضلع میں مشہور ومسلم تھی، ڈاکٹر صاحب کا بھی اسی خاندان سے تعلق تھا، ان کا نام غالباً آنریبل ڈاکٹر سید محمود فرزند سر سید احمد خاں کے نام پر (باقی ص ۳۸۴ پر)

تعلق رکھتے تھے، اور سید صاحب کو بھی ان سے بڑی محبت و خصوصیت تھی، سید صاحب کے سفر حج کی واپسی کے واقعات میں ان کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے، کہ "جب آپ محمود آباد (ضلع غازیپور) پہنچے تو وہاں سے آپ ایک طرف کو روانہ ہوئے، لوگوں نے پوچھا کہاں تشریف لے جاتے ہیں؟ فرمایا کہ محمود آباد کے پاس ایک دیہات ہے، یہاں سے ایک دوست کی بو آتی ہے، ان سے ملاقات کے لئے جاتا ہوں، آپ جب یوسف پور پہنچے شیخ فرزند علی اس موضع میں بیمار تھے، وہ ناطاقتی کی وجہ سے خود تشریف نہ لا سکے، انھوں نے اپنے لڑکوں کو استقبال کے لئے بھیجا تھا، آپ ان کے ساتھ شیخ صاحب کے پاس تشریف لے گئے، شیخ صاحب نے بڑی تعظیم و تکریم اور بڑی خدمتگزاری اور مہمانداری کی اور اپنے تمام اہل و عیال کو بیعت کرا دیا، آپ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ "تم نے ہمارے دوست کو دیکھا"؟ دوسرے روز کشتیاں غازیپور پہنچیں، شیخ صاحب اپنے بچوں کے ساتھ ہمراہ تھے، آپ نے شیخ صاحب کے مکان پر چھ روز قیام فرمایا۔"[1] سید صاحب جب ہندوستان سے ہجرت فرما کر صوبہ سرحد تشریف لے جانے لگے، جہاں سے ان کو اپنے محبوب عمل جہاد کا آغاز کرنا تھا، تو شیخ فرزند علی صاحب نے بڑی اولوالعزمی اور جوش عقیدت کے ساتھ اسلحہ اور سامان کی پیشکش کی اور سب سے نرالا نذرانہ اپنے ایک جوان محبوب بیٹے کی شکل میں راہ خدا میں شہادت کے لئے پیش کیا، سید صاحب کے مشہور سوانح نگار، مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری نے سوانح احمدی میں لکھا ہے۔

---

(باقی صفحہ ۳۸۲ کا) رکھا گیا تھا جنھوں نے اس زمانہ میں بڑا نام پیدا کیا تھا، اور اپنے بہت سے کمالات کی وجہ سے اس دور کے ایک مثالی شخصیت بن گئے تھے، سید ڈاکٹر صاحب کے نام میں شامل تھا، اور وہ ان کے نام سے کبھی جدا نہیں ہوتا تھا۔

[1] سیرت سید احمد شہیدؒ حصہ اول، طبع چہارم، مطبوعہ لاہور صفحہ ۳۴۰-۳۳۹

"انھیں دنوں میں شیخ فرزند علی صاحب غازیپوری زمنیا سے دو نہایت عمدہ گھوڑے اور بہت سے وردی کے کپڑے اور چالیس جلد قرآن مجید تحفہ لے کر آئے اور سب سے عجیب تحفہ جو شیخ صاحب موصوف لے کر آئے وہ امجد نام ان کا ایک نوجوان بیٹا تھا جس کو انھوں نے مثل حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے راہ خدا میں نذر کر کے سید صاحب کے حوالہ کر دیا اور عرض کیا کہ اس کو اپنے ساتھ جہاد میں لے جائیے اور تیغ کفار سے اس کی قربانی کرا لیجئے۔"[1]

ڈاکٹر صاحب مزے لے لے کر ان واقعات کو سناتے جب وہ اس کی روایت کرتے تو ان کی آنکھوں میں محبت و خوشی کی ایک چمک، چہرہ پر حمیت اسلامی اور جوش ایمانی کا ایک نور، اور آواز میں گرفتگی پیدا ہو جاتی تھی، مجھے ان حالات کے سننے کے بعد احساس ہوا کہ ان کو میرے حال پر جو شفقت و خصوصیت تھی، اور جس سے میں نے بڑے آڑے وقتوں میں بڑا فائدہ اٹھایا اس کا اصل سبب یہ تھا کہ مجھے سید صاحب سے خاندانی نسبت تھی۔

ڈاکٹر صاحب کو جونپور کی خانقاہ رشیدیہ سے بھی بڑا گہرا روحانی تعلق تھا، یہ تو یقینی طور پر معلوم نہیں کہ وہ اس سلسلہ میں بیعت بھی تھے، لیکن ان کو اسی سلسلہ کے مشہور شیخ مولانا عبدالعلیم آسی غازیپوری سے ایسی عقیدت و وابستگی تھی کہ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ اپنی نوجوانی میں ان سے بیعت ہو گئے تھے، اپنی زندگی کے آخری دور میں وہ ان کا کلام بڑے شغف اور جوش عقیدت کے ساتھ

---

[1] سوانح احمدی ص ۸۹، سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب نے بھی اپنی اس کتاب میں جو ڈاکٹر صاحب پر لکھی ہے، اس تعلق کا اور ان واقعات کا ذکر کیا ہے، جو انھوں نے ڈاکٹر صاحب ہی سے سنے ہوں گے، اور اتنا اور اضافہ کیا ہے کہ ایک موقع پر شیخ فرزند علی صاحب نے سید صاحب کی خدمت میں ایک لاکھ کی رقم پیش کی۔

(ڈاکٹر سید محمود ص ۶)

پڑھتے تھے، اور اکثر ان کا تذکرہ فرماتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کے خطوط سے جو راقم سطور کے نام ہیں، دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مجلس مشاورت کے قیام (اگست ۱۹۶۴ء) سے کئی سال پہلے سے وہ اس راقم پر عنایت فرمانے لگے تھے، ملک میں ہندو احیائیت کی تحریک، مسلمانوں کی تہذیب اور کلچر سے نفرت اور مسلم حکومتوں کے مظالم اور ہندو کشی کی داستانوں کو مبالغہ اور رنگ آمیزی کے ساتھ پھیلانے اور اس سے فرقہ وارانہ منافرت پیدا کرنے کی جو مہم شروع ہو گئی تھی، اسی طرح مسلمان جس طرح جذباتی طور پر ہندوؤں کی ہر چیز کو نفرت وحقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، اس سے ڈاکٹر صاحب بجا طور پر خائف تھے، غالباً ان کو اس راقم کے خیالات میں بھی اس مسئلہ پر کسی قدر اتحاد و یکسانی نظر آئی اور ان کو اندازہ ہوا کہ علمی طور پر اس سے مدد مل سکتی ہے، اس وقت ان پر (جیسا کہ ان کا مزاج تھا) یہ مسئلہ شدت سے طاری تھا، کہ ملک کے ان دونوں عظیم ترین فرقوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ اتحاد و اعتماد کی فضا پیدا ہو، اور اس سلسلہ میں اختلاف سے زیادہ اتفاق کے نقطوں کو نمایاں کیا جائے، وہ اس کی طرف ہر اس شخص کو متوجہ کرنا چاہتے تھے، جس سے ان کو ذرا بھی مدد ملنے کی توقع تھی، اپنے ایک گرامی نامہ میں جو غالباً اوائل دسمبر ۱۹۶۱ء کا لکھا ہوا ہے، تحریر فرماتے ہیں۔

> "آپ سے لکھنؤ میں جو مختصر باتیں ہوئی تھیں، ان میں سے ایک امر پر میں نے یوپی کے مشرقی اضلاع میں کامیابی کے ساتھ کام کیا، اور ان اضلاع کے عربی اور انگریزی مسلم مدارس نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ۱۴ر نومبر جو پنڈت جواہر لال کا جنم دن ہے، وہ اپنے اپنے اداروں میں جذباتی یک جہتی اور قومی اتحاد کو اپنے اپنے نصابوں میں داخل کر لیں گے، اور اس مضمون پر ہفتہ وار یا روزانہ لکچر دیں گے، جب تک کہ کتاب مرتب ہو کر چھپ نہ جائے، چنانچہ ان اضلاع میں کام شروع کر دیا ہے،

ممکن ہے کہ آپ کی نظروں سے کبھی گزرا ہو، آپ سے اس بارے میں باتیں ہوئی ہیں،
کہ آپ اپنی کمیٹی میں اپنے ندوہ کے لئے بھی غور کریں اور اس کو نصاب میں داخل کریں،
معلوم نہیں اس پر آپ کو موقعہ ملا یا نہیں، امید ہے کہ آپ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے
جلسے میں ۲-۳ دن ضرور شرکت کریں گے، تاکہ اس قسم کی باتوں پر تفصیلی گفتگو ہو کر
ایک راہ عمل اختیار کی جائے، چونکہ ہم دونوں کے خیالات کافی ملتے جلتے ہیں، اس لئے
میں نے مناسب سمجھا کہ پہلے آپ سے مفصل گفتگو کر کے تب مولانا حفظ الرحمن صاحب
سے باتیں کروں۔"

ڈاکٹر صاحب کو ندوۃ العلماء کے مقاصد سے ہمیشہ گہری دلچسپی اور ذہنی مناسبت رہی ہے، وہ مولانا شبلیؒ کی مجلسوں اور تحریروں سے بہت متاثر تھے، اور ایسے فضلاء کو ملت کے درد کی دوا سمجھتے تھے، جو علوم قدیمہ اور جدیدہ کے جامع اور مشرق و مغرب کے نبض شناس ہوں، چنانچہ جب یہ آواز کہیں سے اٹھتی تھی، تو ان کے دل کو چھیڑ دیتی تھی، وہ ندوۃ العلماء کے ایک جلسہ کی روداد میں میرا ایک مضمون پڑھ کر مجھے ایک خط میں جو یکم ستمبر ۶۳ء کو لکھا گیا ہے تحریر فرماتے ہیں۔

"جب میں نے آپ کی رپورٹ پڑھنا شروع کیا تو اس قدر دلچسپی ہوئی کہ اس کو
ختم کر کے یہ خط لکھنے بیٹھ گیا، آمدنی کی قلت اور اخراجات ضروری کی کثرت سے
تکلیف و مایوسی دونوں ہوئی، لیکن آپ کی رپورٹ کا صفحہ ۸ پڑھ کر طبیعت
باغ باغ ہو گئی" ندوۃ العلماء ایک تحریک کی حیثیت سے شروع ہوا مگر اب صرف
دارالعلوم ہو کر رہ گیا، اس کا مقصد تو ایسے علماء کا پیدا کرنا تھا جو قدیم و جدید
اور علم و عمل کے جامع ہوں اور جو اسلام کی ابدی شریعت کے اصول و مسائل اور

بدلتے ہوئے زمانہ کے نئے نئے تقاضوں کے درمیان تطبیق پیدا کر سکیں اور جو دین اور زندگی کی دوری کو دور کر سکیں، زندگی کے نئے نئے مسائل کا دینی حل تلاش کریں اور اسلام کی دعوت اور اس کے ابدی حقائق کو نئے ذہنوں کے لئے عام فہم و مانوس بنا سکیں، اس وقت جو ہو رہا ہے اس کو اس عظیم مقصد سے کوئی مناسبت نہیں، ایسی صورت میں ہمیں اور آپ کو اس عظیم و عزیز مقصد کے حصول کا اس ادارہ کو مرکز بنانے کی کوشش کرنی چاہیے" آپ کے ان مہتم بالشان الفاظ نے مجھ پر بڑا گہرا اثر کیا اور چونکہ میں بھی ایسے ہی مقصد کی تلاش میں دنیائے اسلام کے اور خود ہندوستان کے مختلف اداروں کو بغور تلاش کرتا رہا مگر اس مقصد عظیم کا ہر جگہ فقدان پایا بلکہ شاید اس کا احساس بھی نہیں، اس کام کے لئے تو شاید ہندوستان ہی بہتر جگہ ہو اور ندوہ ہی آپ کی سرکردگی میں اس کا مرکز بن سکے، پہلے تو چند ایسے ذہین حضرات تلاش کئے جائیں جن کو ان کی ضروریات سے مستغنی کر کے آپ کی زیر نگرانی اس مقصد عظیم کے ابتدائی مبلغ ہونے کے لئے تیار کئے جائیں، نئے تعلیم یافتوں میں ممکن ہے ایسے لوگ تلاش سے مل جائیں، پہلے ہندوستان اور پھر ممالک اسلامی میں ان مقاصد عظیم کو واضح طور پر مسلسل پیش کیا جائے، اور ایک کروڑ روپئے فراہمی کی ضرورت بتلائی جائے اور بہت سے طریقے سوچے جا سکتے ہیں، جن سے کامیابی کی امید کی جا سکے، خدا آپ کی عمر میں برکت دے، میں تو سمجھتا ہوں کہ پانچ چھ برس کے اندر آپ کو اچھی خاصی کامیابی کی صورت نظر آنے لگے گی"

ڈاکٹر صاحب کو اپنے مسلسل دوروں اور وسیع تجربوں کی بنا پر مسلمانوں کی کمزوریوں کا

پورا اندازہ تھا، وہ تحریک خلافت سے لے کر مسلم کنونشن دہلی تک برابر کام کرتے رہے تھے، اس بنا پر وہ مسلمانوں کے بارے میں کچھ زیادہ رجائی (OPTIMIST) نہیں واقع ہوئے تھے، وہ ۲۰/اپریل ۶۲ء کے اپنے ایک خط میں اس کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ہماری قوم تخریبی کاموں کو بہت پسند کرتی ہے، تعمیری کاموں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں، اگر کسی کی مخالفت کرنی ہے تو یہ سب سے آگے ہیں، اگر کسی کی موافقت کرنی ہے تو سب سے پیچھے! ہندوستان میں ہم کو اقدامی قدم بڑھانا ہوگا نہ کہ دفاعی، قرآن کے اندر رہ کر جس قدر بھی قدم اٹھا سکتے ہیں، وہ اٹھانا ہے۔"

جون ۶۱ء میں دہلی میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی سعی و اہتمام سے ڈاکٹر صاحب کی صدارت میں وہ مسلم کنونشن منعقد ہوا جس نے ایک مرتبہ سارے ملک کی نگاہوں کو مسلمانوں کے مسئلہ اور ان کے موجودہ موقف کی طرف متوجہ کر دیا۔ اور موافق و مخالف سیاسی حلقے اس کے تذکرہ سے گونج گئے، ڈاکٹر صاحب کا جرأت مندانہ خطبۂ صدارت جو انھوں نے اس موقع پر پڑھا تھا، عرصہ تک فراموش نہ کیا جا سکے گا، یہ پہلا موقع تھا کہ ہندوستان کے ایک قدیم ترین و مخلص ترین قوم پرور مسلمان رہنما نے جو ایک طویل عرصہ تک کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر اور آل انڈیا کانگریس کا سکریٹری رہا تھا، اس ملک میں مسلمانوں کے دوسرے نمبر کے شہری ہونے کی برملا شکایت کی، پنڈت جواہر لال نہرو تک اس چوٹ کو چھپا نہ سکے جو اس سادہ سے جملے نے ان کے غیرت مند و محب وطن دل پر لگائی تھی، اس کی اہمیت اور سنگینی اس لئے اور زیادہ تھی کہ یہ اس شخص کی زبان سے نکلا تھا جس کی حب الوطنی اور قوم پروری ہر شبہہ سے بالاتر تھی، اور جس کا حصہ جنگ۔ آزادی کی قربانیوں میں کسی بڑے سے بڑے کانگریسی رہنما سے کم نہ تھا، انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے اس خطبہ کی ایسی شکایت کی جس میں حیرت، تاسف، تعلق اور جھنجھلاہٹ

سبھی جذبات کی آمیزش تھی، اس خطبہ نے ڈاکٹر صاحب کا مرتبہ مسلمانوں کی نگاہوں میں اچانک بلند کر دیا اور ملک میں ہر طرف ان کا نام لیا جانے لگا، افسوس ہے کہ میں اور رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی ارادے اور وعدے کے باوجود اس کنونشن میں شریک نہیں ہوئے جس کی اطلاع مولانا حفظ الرحمن صاحب کو جلسہ سے پہلے کر دی گئی تھی، مولانا حفظ الرحمن صاحب مرحوم کو بھی بہت افسوس رہا، وجہ یہ تھی کہ اس کنونشن کے متعلق اعلان کیا گیا تھا کہ وہ مسلمانوں کی تمام جماعتوں کی طرف سے ہوگا، اور اس میں بلا تفریق تمام مسلمان زعما اور مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والے شریک ہوں گے، لیکن عین وقت پر مولانا کے سامنے یہ سوال آکر کھڑا ہو گیا کہ یا تو وہ کنونشن کو ملتوی کریں یا جماعت اسلامی کے امیر مولانا ابواللیث صاحب ندوی اور ان کے رفقاء کو اور مسلم لیگ کے رہنماؤں کو مدعوئین کی فہرست سے خارج کریں، کنونشن کی شہرت اور اس کے انتظامات اس حد تک پہنچ گئے تھے کہ اب اس کا التوا مشکل تھا، انھوں نے عین وقت پر دوسرا فیصلہ کیا، ہم لوگوں نے اسی بنا پر کہ اب کنونشن پورے طور پر آزاد اور تمام مسلمانوں کا نمائندہ نہیں ہے، شرکت سے معذرت کر دی اور اس مضمون کا ایک اعلان "ندائے ملت" میں شائع کر دیا۔

لیکن کیا معلوم تھا کہ کچھ ہی عرصہ کے بعد ایک اور مسلم کنونشن ڈاکٹر صاحب ہی کی صدارت میں منعقد ہوگا، اور ہم لوگ نہ صرف یہ کہ شرکت کریں گے بلکہ اس کے داعیوں کی صف اول میں ہوں گے، اور اس کی پوری ذمہ داری قبول کریں گے، یہ وہ تاریخی بلکہ تاریخ ساز کنونشن تھا، جو ۸، ۹ اگست ۱۹۶۴ء کو کل ہند مسلم مشاورتی اجتماع کے نام سے دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں منعقد ہوا، اور جس میں مسلم مجلس مشاورت کی بنیاد پڑی اور جس سے میری زندگی کا ایک ایسا دور شروع ہوا، جو مجھے اپنے گوشۂ عزلت سے نکال کر اجتماعی و ملی خدمت کے

میدان میں لے آیا، اور جس نے مجھے مسلمانوں کے مسائل سے بہت قریب اور ڈاکٹر صاحب کا ایک حقیر رفیق سفر بنا دیا، یہ مسلمانوں کی ملی زندگی کی تاریخ میں ایک نیا ورق تھا جس کو اگرچہ بادِ صرصر کے جھونکوں نے جلد الٹ دیا، لیکن اس کو ملت اسلامیہ ہند کا کوئی مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا، اگر وہ اجتماعیت قائم رہتی، جو ڈاکٹر صاحب کی قیادت میں مجلس مشاورت کے پلیٹ فارم پر وجود میں آئی تھی، اور اس کو اپنا سفر جاری رکھنے کا موقع ملتا تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کچھ اور ہوتی، اور وہ یقیناً انتشار، لاوارثی کی کیفیت نفسا نفسی کے عالم، احساس کہتری، اور مایوسی کی اس تاریخ سے بہت مختلف ہوتی، جو اس وقت لکھی جا رہی ہے، اس کنونشن کے محرکات اور اسباب کیا تھے؟ وہ کس فضا میں منعقد ہوا؟ اس نے اپنا سفر کہاں سے شروع کیا، اور کہاں ختم کیا؟ اس نے مسلمانوں اور ہندوستان پر کیا اثر ڈالا؟ مسلمانوں نے کس طرح اس کا استقبال کیا اور اس سے کیا توقعات قائم کیں؟ پھر وہ کس طرح مسلمانوں کے تمام اجتماعی کاموں کی طرح انتشار و اختلاف کا شکار ہوا، اور بالآخر ایک تاریخی داستان بن کر رہ گیا؟ یہ وہ سوالات ہیں، جن کا جواب دل کو تھامے اور آنسوؤں کو روکے بغیر دینا مشکل ہے، اب جب کہ ڈاکٹر صاحب اس دنیا میں نہیں ہیں، جن کو اس تحریک سے پدرانہ لگاؤ تھا، اور جو ان کے خوابوں کی بہترین تعبیر اور ان کی تمناؤں کی بہترین تکمیل تھی، اور جو اس کے مقاصد اور مزاج کی ترجمانی کا سب سے زیادہ حق رکھتے تھے، یہ فریضہ اور بھی دشوار اور نازک ہو جاتا ہے، لیکن اس فریضہ کو بہر حال ضروری احتیاط اور مورخانہ ذمہ داری کے ساتھ ہر اس شخص کو ادا کرنا پڑے گا، جو ڈاکٹر صاحب یا اس اہم تاریخی واقعہ پر لکھنے کے لئے قلم اٹھائے۔

دسمبر ۱۹۶۳ء اور جنوری ۱۹۶۴ء میں کلکتہ میں بڑے پیمانہ پر فرقہ وارانہ فساد ہوا، پھر مارچ

اور اپریل ۱۹۶۴ء میں مشرقی ہندوستان کی اس صنعتی پٹی میں جس میں رانچی، جمشید پور اور راوڑکیلہ واقع ہیں ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے ماتحت نہایت بھیانک فرقہ وارانہ فساد کی ایک لہر چلی جس میں مسلمان اقلیت وحشیانہ مظالم کا شکار ہوئی، کارخانوں میں کام کرنے والے مسلمان مزدور، امن پسند شہری آبادی، معصوم بچے اور کمزور اور بے دست وپا عورتیں ایسی بربریت کا نشانہ بنیں جس کی مثال اس سے پہلے کے فسادات میں دیکھنے میں نہیں آئی تھی، یہ فرقہ وارانہ نفرت واشتعال کی ایک ایسی ہسٹریائی کیفیت تھی جس میں طالب علموں نے طالب علموں کو، استادوں نے استادوں کو، پیشہ ور لوگوں نے اپنے ہم پیشہ ساتھیوں اور کمیونسٹوں نے اپنے کمیونسٹ ساتھیوں کو مارا جو محض نسلی طور پر مسلمان تھے، اس نے ایک بار پھر مسلمانوں کو اس ملک میں اپنے مستقبل پر غور کرنے پر مجبور کر دیا، اور قیادت کے خلا کے احساس کو شدت کے ساتھ ابھار دیا، دوسری طرف انسان دوست و شریف النفس ہندوؤں کی بھی ایک تعداد میدان میں آگئی جس نے ثابت کیا کہ اس ملک کا ضمیر ابھی زندہ اور امید کی روشنی ابھی باقی ہے۔

میں نے اور رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر "الفرقان" نے یہ سوچتے ہوئے کہ ان حالات میں نہ کسی تعمیری کام کی گنجائش ہے نہ کسی تعلیمی اور تصنیفی مشغلہ کا جواز، وقت کا سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ انسانیت دشمنی کی اس لہر کو روکا جائے، جو انسانیت اور ملک کی ہر چیز کو چیلنج کر رہی ہے، اس کے لئے اکثریت ہی کے فرقہ کے ان رہنماؤں اور دردمندوں کو میدان میں لایا جائے، جو اس رجحان کی ہلاکت خیزی اور انسانیت سوزی پر عقیدہ رکھتے ہوں اور کم سے کم گاندھی جی کے اصول وتعلیمات پر ان کا یقین ہو، اسی سلسلہ میں ہم لوگ ونوبا بھاوے جی اور جے پرکاش نرائن کے پاس گئے، اور ان کو اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ اس مسئلہ پر اپنی اولین توجہ مرکوز کریں، اور اس کو ایک مہم کی طرح چلائیں، ۲۸ مارچ ۱۹۶۴ء کو ہم نے ناگپور سے چھ میل دور ایک دیہات میں

اچاریہ جی سے ملاقات کی اور انھیں اس مقصد کے لئے ایک واضح اور موثر میمورنڈم[1] پیش کیا لیکن ان ملاقاتوں اور ان حضرات کی گفتگو نے ہم لوگوں کی زیادہ ہمت افزائی نہیں کی، اور ہم کو اندازہ ہوا کہ جہاں تک ان حالات سے پنجہ آزمائی کرنے کا تعلق ہے اور اس کے لئے تمام کاموں کو ملتوی کرکے اسی ایک کام پر ہر خطرے اور ہر نتیجہ سے بے نیاز ہو کر جان کی بازی لگا دینے کا معاملہ ہے تو۔ ع

وہ کوہ کن کی بات گئی کوہ کن کے ساتھ

اس احساس کے بعد ہم لوگوں کے سامنے ایک ہی راستہ تھا، وہ یہ کہ ایک طرف مسلمانوں میں حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت اور عزم، اور "خدا اعتمادی اور خود اعتمادی" کی شان پیدا کی جائے اور قیادت کے اس خلاء کو پر کرنے کی کوشش کی جائے جس کو ان ناشدنی حالات کے پیدا کرنے میں بہت بڑا دخل ہے، دوسری طرف ملک میں ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جائے جس سے یہ اعصابی تناؤ کم ہو ملک کے شہری انسانوں اور ہم وطنوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارنے پر آمادہ ہوں اور انسانیت کا احترام پیدا ہو اور دلوں سے منافرت کا وہ زہر امکانی حد تک دور ہو جو فرقہ وارانہ سیاست، اشتعال انگیز تقریروں اور غیر ذمہ دار پریس نے پیدا کر دیا ہے۔

ڈاکٹر سید محمود صاحب اس صورت حال سے سب سے زیادہ فکرمند اور مغموم رہتے تھے، ان کا خیال تھا کہ سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کے ذہن ضرور بڑی حد تک مسموم ہو گئے ہیں، لیکن ہندوستان کے عوام ابھی سیاسی زہر سے محفوظ ہیں، ان کا ضمیر مردہ نہیں ہوا ہے اور ان سے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں، ضرورت براہ راست ان تک پہنچنے اور ان کے دلوں کے دروازوں پر

---

[1] یہ میمورنڈم ۲۰ راپریل ۱۹۶۴ء کے "ندائے ملت" میں شائع ہو چکا ہے۔

دستک دینے کی ہے، اس عرصہ میں ڈاکٹر صاحب برابر لکھنؤ آتے جاتے رہے اور ہم لوگ دہلی کا سفر
کرتے رہے، گفتگو کا ایک ہی موضوع تھا کہ اس غیر فطری صورت حال کو جلد سے جلد دور کرنے
کی کوشش کی جائے مسلمانوں کے انتشار کو دور کیا جائے، اور ان کی منتشر قوتوں کو ایک شیرازہ
میں مجتمع کر کے ملت کے وجود اور ملک کے استحکام اور سالمیت کو اس قریبی خطرہ اور تباہی سے
بچایا جائے، جو تلوار کی طرح دونوں کے سروں پر لٹک رہا ہے، اس عرصہ میں ان تعلیم یافتہ مسلمانوں
اور عوام کی طرف سے جن کو صرف ملت کے مفاد سے دلچسپی تھی، بارہا مطالبہ ہوا تھا کہ مسلم جماعتیں
اپنے باہمی اختلافات کو ختم کر کے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں، اور ملت کے درد کی دوا اور
اس زخم کا مرہم تلاش کریں ورنہ ہم ان تمام جماعتوں سے بغاوت کر دیں گے اور ان کے
قائدین کے احترام کا لحاظ کئے بغیر جو ہماری سمجھ میں آئے گا وہ کریں گے، ڈاکٹر صاحب پر جو
خیال سب سے زیادہ طاری تھا، وہ یہ کہ اس ملک میں اخلاقی قیادت کا ایک خلا ہے، جو صرف
مسلمان ہی (قرآنی تعلیمات اور اسوۂ رسول کی مدد سے) پُر کر سکتے ہیں، مسلمانوں کو اس قیادت
کی ذمہ داری قبول کرنی چاہیئے، وہ کہتے تھے کہ افسوس ہے کہ اکثریت اس قیادت سے
دست کش ہو گئی ہے، اور اس نے اپنی اخلاقی ناکامی کا ثبوت دے دیا ہے، گاندھی جی
کے بعد ہندو مسلم اتحاد کا کوئی داعی ملک میں نہیں رہا، ان کا اس پر پورا عقیدہ تھا کہ یہ ملک کی
اولین ضرورت ہے، اس کے بغیر اس ملک میں جو کام کیا جائے گا، وہ سراب اور نقش بر آب ہے،
ان پر شدت سے یہ بات طاری تھی کہ اگر اکثریت کے افراد یہ کام نہیں کر سکتے، اور ان کو
اس کی فرصت نہیں ہے، یا اب وہ اس کی ضرورت نہیں سمجھتے تو مسلمانوں کو آگے بڑھ کر یہ
جھنڈا اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہیئے جس کا اٹھانے والا کوئی نہیں، ڈاکٹر صاحب اس زمانہ میں
سراپا تاثر و جذبات بن گئے تھے، اور ان میں عجیب طرح کی سیمابی کیفیت آگئی تھی، ان کو کسی پہلو

آرام نہیں تھا، دوڑ دوڑ کر لکھنؤ آتے، اور ہم کو دہلی بلاتے، دہلی میں ان کا مفتی صاحب، مولانا
ابو اللیث صاحب اور مسلم صاحب سے برابر رابطہ قائم تھا، آخر میں گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ جلد
سے جلد ایک مسلم مشاورتی اجتماع بلایا جائے جس میں راہ عمل متعین کی جائے، اور کام شروع
کردیا جائے، بعض مجبوریوں اور مصلحتوں کی بنا پر یہ مناسب معلوم ہوا کہ یہ اجتماع بجائے
دہلی کے لکھنؤ میں رکھا جائے، میں نے اور مولانا محمد منظور صاحب نے اس کی ذمہ داری قبول
کی اور طے پایا کہ اگست کے دوسرے ہفتہ میں یہ اجتماع دار العلوم ندوۃ العلماء میں منعقد ہو
اسی عرصہ میں وسط جولائی میں مجھے اپنی آنکھ کے آپریشن کے لئے بمبئی جانا پڑا، اس
دوران میں میں تفصیلات سے بے خبر اور عملی کاموں سے بے تعلق رہا، اگست کے پہلے ہفتہ
میں میری واپسی ہوئی، سرجن نے مکمل احتیاط اور آرام کی ہدایت کی تھی، اور چھ ہفتہ تک مطلق
تقریر اور زور سے بات کرنے سے بھی منع کیا تھا، میں اپنے وطن رائے بریلی میں تھا کہ اچانک
مولانا محمد منظور صاحب کا پیغام پہونچا کہ ۸ راگست کو ہونے والے کل ہند مسلم مشاورتی اجتماع
کے خیر مقدم کے لئے مجھ کو کچھ لکھوا دینا چاہئے، اس فرمائش میں ملا جان صاحب کا ایما بھی
شامل تھا، جن سے ابھی میری ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی، خطبۂ استقبالیہ کی اصطلاح سے
جو اپنے ساتھ خاص آداب و روایات رکھتی ہے، قصداً احتراز کیا گیا تھا، لیکن میرا فریضہ
تھا کہ میں اجمالی طور پر اس اجتماع کے محرکات و دواعی کا تذکرہ کروں اور اس کے لئے سنجیدگی،
احساس ذمہ داری اور مسلمانوں کے مسائل کو دینی ذہن اور اخلاص و بے غرضی کے اس جذبہ
کے ساتھ سمجھنے اور ان کا حل تلاش کرنے کی فضا پیدا کی جائے، جو عام طور پر ایسے اجتماعات
میں پیدا نہیں ہوتی، جہاں سیاسی نوعیت کے مسائل زیر بحث ہوتے ہیں، اور جماعتوں کے
مفادات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں، یہ کام یوں بھی دشوار تھا، لیکن میری صحت کی

اس وقت کی کیفیت کی بناء پر نہ صرف دشوار تر بلکہ خطرناک تھا، لیکن جس فضا میں یہ اجتماع ہونے جا رہا تھا، اس نے کسی اور چیز کو سوچنے اور اہمیت دینے کا موقع ہی نہیں دیا، میں نے ایک مضمون لکھوا دیا، جس کو اس اجتماع کے پہلے اجلاس میں عزیز گرامی مولوی ابوالعرفان صاحب ندوی نے پڑھ کر سنایا، اور جو اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوا۔

اجلاس امید و بیم کی حالت میں اور جذبات سے بھری ہوئی اور تاثرات سے گرم فضا میں شروع ہوا، یہ اجلاس شہر کے ایک دور افتادہ حصہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سلیمانیہ ہال میں دروازہ بند کر کے ہو رہا تھا، شرکاء کی تعداد شاید سو سے زیادہ نہ رہی ہوگی، لیکن اس محدود و مختصر اجتماع میں ہندوستانی مسلمانوں کی اگر قسمت کا فیصلہ ہوتے نہیں جا رہا تھا، تو ان کی صلاحیت و شعور کا امتحان ضرور درپیش تھا، اس اجتماع کو زیادہ شہرت نہیں دی گئی تھی، اور اس سے بچنے کی کوشش کی گئی تھی کہ وہ سیاسی بازیگروں کا اکھاڑا بن جائے، لیکن اس پر ملک کے تمام دردمند مسلمانوں کی نگاہیں لگی ہوئی تھیں، اور وہ اس کی تجاویز اور نتائج کے لئے گوش برآواز تھے، ہندوستان کی چار موقر جماعتوں، جمعیۃ العلماء، جماعت اسلامی، مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کے سربراہ اور صدر و سکریٹری موجود تھے، بعض دوسری مسلم تنظیموں، تعمیر ملت حیدرآباد، امارت شرعیہ بہار کے ذمہ دار بھی تھے، ہم جیسے کچھ ایسے لوگ بھی تھے، جن کا کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہ تھا، ان میں بمبئی کے محمد یٰسین نوری صاحب بیرسٹر، حیدرآباد کے محمد یونس سلیم صاحب (جو بعد میں مرکزی حکومت میں نائب وزیر قانون ہوئے) مدراس کے این۔ ایم۔ انور صاحب ممبر پارلیمنٹ اور بہار کے سابق ایم۔ پی سید مظہر امام صاحب، لکھنؤ کے ڈاکٹر محمد عبدالجلیل فریدی اور مولوی سید کلب عباس صاحب صدر شیعہ کانفرنس خاص طور پر قابل ذکر ہیں، بعض سیاسی مشاہدین اور اخباروں کے نمایندے بھی شریک یا گوش بدیوار تھے، جن میں سے بعض امریکہ کے کثیر الاشاعت اخبارات سے بھی تعلق رکھتے تھے،

اجتماع تاثیر و جذبات سے ڈوبی ہوئی، فضا میں شروع ہوا، گویا ہندوستانی مسلمانوں کی کشتی بھنور میں پھنسی ہے، اور طوفان میں ہچکولے کھا رہی ہے، اور کشتی کے ناخدا۔۔۔ اس کو بچانے کی فکر میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، قرآن شریف پڑھا گیا، پھر خلافت کے دیرینہ خادم و کارکن ملا جان کی فرمائش پر اقبال کی نظم۔ ع

"یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے"

پڑھی گئی، جب خوش الحان کمسن طالب علم اس شعر پر پہونچا

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل

اس شہر کے خوگر کو پھر وسعت صحرا دے

تو کئی آنکھیں پر آب ہو گئیں، اور بہت سے دل امنڈ آئے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنا پر مغز خطبہ پڑھا، ان کی چوڑی پیشانی کی لکیروں میں نصف صدی کی تاریخ کے آثار چڑھاؤ اور مسلمانوں کی زندگی کے مد و جزر نظر آ رہے تھے جس سپاہی کا سفر تحریک خلافت کے ہنگامہ خیز اور پر از اعتماد دور سے شروع ہوا تھا، جب ہندوستان کے مسلمان اپنے کو اس قابل سمجھتے تھے کہ ہزاروں میل دور اور سات سمندر پار کے ایک ایسے مسئلہ پر اپنی رائے اور جذبات کا اظہار کریں، جو دنیا کی بڑی طاقتوں کی زور آزمائی کا میدان بنا ہوا تھا، وہ سپاہی اب اس منزل پر اپنے کو کھڑا پاتا ہے، کہ خود ان مسلمانوں کو اپنے اس ہزار سالہ وطن میں اپنے جینے اور رہنے کا استحقاق ثابت کرنا اور اپنی وفاداری کا ثبوت دینا ہے، ہندوستان کے مسلمانوں نے ڈاکٹر صاحب کو بالواسطہ اور بلا واسطہ اپنا نمائندہ منتخب کیا تھا، اور آج وہ اس اجتماعی قیادت کے مقام سے ان کے ضمیر اور ان کے دلوں و دماغوں کو خطاب کر رہے تھے، بہت کچھ کھونے کے بعد یہ یافت ڈاکٹر صاحب کے لئے بڑی کامیابی اور بڑا اعزاز تھا۔

اجمال سے جب یہ اجتماع تفصیلات کی طرف اور ابہام سے تعینات کی طرف آیا تو دلوں کے اندر کی چیز زبانوں کے اوپر آنے لگی اور سیاسی میدان کے کھلاڑیوں کی برسوں کی عادت ایک ایک لفظ پر بحث کرنے، بال کی کھال نکالنے اور اپنے جماعتی مفادات کے تحفظ کرنے کی ابھر آئی، بحث و مباحثہ میں اختلاف نے گرم گفتاری اور شعلہ نوائی کی بہت جلد شکل اختیار کر لی، اس وقت کئی بار یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ یہ اجتماع کچھ طے کئے اور کسی نتیجہ پر پہونچے بغیر ختم ہو جائے گا، اس موقع پر کئی بار راقم نے اپنی صحت کے تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے جذباتی انداز میں خطاب کیا اور ان کو اس اہم جلسہ کے مقصد و آداب اور اسلامی تعلیمات کو مدنظر رکھنے کی اپیل کی جو الحمدللہ بے اثر نہیں رہی اور تھوڑی دیر کے لئے سکون پیدا ہو گیا، لیکن جذبات کی اس ہانڈی میں بار بار اُبال آتا تھا، ایک موقع تو ایسا آیا کہ قریب تھا، کہ ڈاکٹر صاحب اجتماع کے ختم اور اس کوشش کے ناکام ہونے کا اعلان کر دیں، بحث غالباً جماعتوں کی نمایندگی پر تھی کہ اس کا کوٹہ کیا ہو، اور خاص طور پر یہ کہ کیا مسلم لیگ کی بھی اس جماعت میں نمایندگی ہو، جو اجتماع کے نتیجہ میں مستقل طور پر وجود میں آئے گی، اس وقت یہ مناسب معلوم ہوا کہ اس مسئلہ پر اس کھلے اجلاس میں بحث کرنے کے بجائے جماعتوں کے نمایندے الگ بیٹھ کر مشورہ کر لیں، مجھے یاد ہے کہ جب ہم لوگ دارالعلوم کے مہمان خانہ میں گفتگو کرنے کے لئے جا رہے تھے، تو شرکا کی صفوں میں سے گزرتے ہوئے بعض حضرات نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا کہ اگر یہ اجتماع کسی نتیجہ پر پہونچے بغیر ختم ہوا تو ہم کیا منہ لے کر اپنے شہر واپس جائیں گے، اور اپنے ساتھیوں کو کیا جواب دیں گے؟ انھوں نے اللہ و رسول کا واسطہ دے کر کہا کہ خدا کے لئے ہم کو اور پوری ملت کو اس رسوائی و ذلت سے بچائیے، فیصلہ کا انحصار بہت کچھ ڈاکٹر صاحب پر تھا، وہ بعض جماعتوں کے بارے میں بہت سخت تھے، ہم مہمان خانہ میں پہونچے یہاں صرف جماعتوں کے سربراہ تھے، میں نے محسوس کیا کہ یہ وقت

دلائل کا نہیں ہے ملت کے بقا اور ہر قیمت پر مسلمانوں کے اتحاد کا جذبہ ہی اس موقع پر رہنمائی اور مشکل کشائی کر سکتا ہے، اس موقع پر میں نے اپنے اسی تعلق کو استعمال کیا جو ڈاکٹر صاحب مجھ سے رکھتے تھے، اور ان کے اس جذبہ کو ابھارنے کی کوشش کی جوان کے ہر جذبہ پر غالب تھا میں نے ان کا پاؤں پکڑ کر کہا کہ اس وقت ہر قیمت پر آپ اس اجتماع کو ناکام ہونے سے بچائیے ڈاکٹر صاحب نے میری بات مان لی، اور تمام شرکا راضی ہو گئے اور ہم لوگ خوش خوش اجتماع گاہ میں آئے اور اعلان کیا کہ مسلمانوں کی پیدا ہونے والی اجتماعیت کے لئے جو خطرہ (CRISIS) پیدا ہوا تھا وہ گزر گیا، حاضرین نے جوش و مسرت کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور اجتماع تین روز کی کارروائی اور بحث و مباحثہ کے بعد جس میں کئی بار انتشار و بدمزگی اور ناکامی کا خطرہ پیدا ہوا، بخیر و خوبی ختم ہو گیا اور ملا جان کے الفاظ میں جو وہ اپنے دوروں کی ہر تقریر کے آغاز میں کہا کرتے تھے اشرکائے جلسہ نے اعلان کیا۔ ع

ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

ملک میں عام طور پر مسلمانوں کی اس وفاقی تنظیم اور نئی قیادت کے وجود میں آنے کا خیر مقدم کیا گیا، اور اس کو مسلمانوں کے لئے فال نیک سمجھا گیا، یہ "مسلم مجلس مشاورت" کے وجود میں آنے کی مختصر کہانی ہے، جو درحقیقت ایک مفصل تاریخ کی طالب ہے، لیکن بظاہر اس کی کوئی امید نہیں معلوم ہوتی کہ وہ کبھی تفصیل کے ساتھ لکھی جائے گی، اس لئے کسی قدر وضاحت اور دراز نفسی کے ساتھ یہ کہانی سنا دی گئی کہ۔ ع

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

مجلس کے ذمہ داروں نے یہ دانشمندانہ فیصلہ کیا کہ مجلس کو سب سے پہلے یہ کام کرنا چاہیے کہ اس کا ایک وفد فساد زدہ علاقوں کا دورہ کرے، اور اس وفد میں تمام جماعتوں کے سربراہ شریک ہوں

مجلس نے ستمبر ۶۴ء میں بہار اور پٹنہ کے دورہ کا پروگرام بنایا، وفد ۷ ار ستمبر ۶۴ء کو رانچی پہونچا، مجلس کے ہمدردوں مولوی احمد علی صاحب قاسمی، مولوی انیس الرحمٰن صاحب قاسمی اور مولانا محمد مصطفٰے صاحب[۱] (خطیب جامع مسجد راعین محلہ) نے رانچی میں وفد کے دورے کے لئے بڑی اچھی فضا تیار کر لی تھی، اور اس کے استقبال کے لئے بڑی وسیع تیاریاں کی تھیں، ہم لوگ جب پٹنہ رانچی اکسپرس کے ذریعہ صبح ساڑھے ۸ بجے رانچی پہنچے تو ایسا معلوم ہوا کہ گویا آدھا شہر اپنے مہمانوں کے استقبال کے لئے امنڈ آیا ہے، ڈاکٹر صاحب اور چند حضرات ایک کھلی ہوئی کار پر آگے آگے تھے، مولوی محمد اسمٰعیل صاحب صدر مسلم لیگ، ابراہیم سلیمان سیٹھ، مولانا ابواللیث صاحب، ملا جان صاحب اور یہ راقم سطور دوسری کھلی ہوئی گاڑی پر تھے، راستہ میں ہر تھوڑے فاصلہ پر پھاٹک نصب تھے، جن پر خیر مقدمی عبارتیں کاغذ پر لکھی ہوئی آویزاں تھیں، مہمانوں کا استقبال ہندو مسلم اتحاد کے نعروں سے اور گل پوشی اور گلاب پاشی سے ہوتا تھا، اس وقت ڈاکٹر صاحب اور معمر مہمانوں کے سامنے تحریک خلافت کے دور کا پورا سماں پھر گیا، جب ہندو مسلمان ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں ملک کے رہنماؤں کا استقبال کرتے تھے، اور ان کے اندر اتحاد و اعتماد کا جذبہ موجزن تھا، مسلمان تاجروں نے بہت فراخدلی سے انتظامات کئے تھے، جلوس تقریباً ڈیڑھ میل (۱½ میل) کی مسافت طے کر کے عبدالرؤف صاحب کے دولتکدہ پر ختم ہوا، جہاں مہمانوں کے قیام کا انتظام تھا، انھوں نے اور میزبان محترم مختار احمد صاحب نے میزبانی میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا، رات کو ویلفیر سنٹر کے وسیع میدان میں جلسہ ہوا، جس میں ہندو مسلمان مساوی طریقہ پر شریک ہوئے، مقامی حضرات کا اندازہ اسّی ہزار سے بھی زائد ہے، لیکن مقامی انگریزی و ہندی اخبارات نے شرکا کی تعداد سوا لاکھ ڈیڑھ لاکھ بتائی، ڈائس پر بعض عیسائی مشنری بھی تھے،

---

[۱] یہاں پر منتظمین اور رانچی کے سرگرم کارکنوں کی پوری فہرست دینی مشکل ہے، جن کی تعداد ایک درجن کے قریب تھی، اللہ تعالےٰ سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

جو سنتھال پرگنہ میں آدی باسیوں میں (جن کو فساد میں خاص طور پر آلہ کار بنایا گیا تھا) کام کرتے تھے، جماعتوں کے تقریباً تمام سربراہوں نے تقریریں کیں، جن کا غالب و مشترک حصہ ہم وطنوں کی جان کی حفاظت کی ضرورت اور انسانیت کے احترام کا درس تھا، عیسائی پادریوں کی خواہش و فرمائش پر ڈاکٹر صاحب نے کچھ دیر انگریزی میں بھی تقریر کی اور جلسہ بڑی اچھی فضا میں ختم ہوا۔

رانچی سے ہم لوگ چکردھرپور اور چائی باسہ (ضلع سنگھ بھوم) اور ان مقامات پر ٹھہرتے ہوئے جو فساد کی لپیٹ میں بری طرح آئے تھے، جلسے اور تقریریں کرتے ہوئے جمشید پور کو روانہ ہوئے، جمشید پور کے حدود میں داخل ہوتے ہی ایک مجمع عظیم ملا جو بہت دیر سے مہمانوں کا منتظر تھا، اس مجمع کے جلو میں یہ قافلہ اس شہر میں داخل ہوا، جو تھوڑے دن پہلے خون کے دریا میں نہا کر نکلا تھا، اور جہاں انسانیت کی سخت تذلیل ہوئی تھی، ہم لوگ شہر کے گسٹ ہاؤس میں ٹھہرائے گئے، ڈاکٹر صاحب نے استقبال کرنے والوں کے اس ہجوم کو جو یہاں تک ساتھ آیا تھا خطاب کیا، اور ان کی محبت کا شکریہ ادا کیا، انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہم لوگ گاندھی جی کا مشن پورا کر رہے ہیں، اور اس سے ان کی روح کو سکون حاصل ہوگا، مجھے یاد ہے کہ بہت سے ان مسلمانوں کو ان کے یہ الفاظ پسند نہیں آئے جو خالص خدا اور رسول کی بات اور اسلامی تعلیمات کا حوالہ ان سے سننا چاہتے تھے، ارکان وفد میں بھی تھوڑی دیر چہ میگوئی رہی لیکن ڈاکٹر صاحب نے یہ بات دل کی گہرائی سے کہی تھی، اور وہ اس پر شرمسار نہیں تھے، ان کو گاندھی جی کی ذات سے بڑا گہرا تعلق تھا، اور وہ اس موقع پر ان کے تذکرہ کو اسلامی شرافت اور احسان مندی کا تقاضا سمجھتے تھے، شام کو ایک پریس کانفرنس ہوئی جس میں پٹنہ اور کلکتہ سے نکلنے والے کئی انگریزی و ہندی اخبارات کے نامہ نگار اور ہندوستانی نیوز ایجنسیوں کے نمائندے شریک ہوئے، ان لوگوں نے ڈاکٹر صاحب سے بہت سے سوالات کئے اور ڈاکٹر صاحب نے جوابات دیئے، بعض ارکان وفد نے بھی اس میں حصہ لیا، لیکن ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب

ان اخبارات نے جن کے نمایندے پریس کانفرنس میں شریک تھے اور جو حقائق معلوم کرنے کے لئے بہت مضطرب نظر آتے تھے اس پریس کانفرنس کا کوئی نوٹس نہیں لیا، اور ان اخباروں کی کسی اشاعت میں اس کا مطلق تذکرہ نہیں آیا۔

رات کو جمشید پور کے ایک کھلے میدان میں جلسہ عام ہوا، مقامی کارکنوں نے ٹاٹا کمپنی کے جنرل منیجر کو جو ایک پنجابی ہندو تھے، اور اردو سے خوب واقف، جلسہ کی صدارت کے لئے آمادہ کر لیا، انھوں نے کہا میں آخر تک نہیں بیٹھ سکوں گا، اس لئے کہ مجھے ایک کمیٹی میں شرکت کرنی ہے، لیکن میں یہ خدمت ضرور انجام دوں گا، جہاں تک نظر کام کرتی تھی، میدان آدمیوں سے بھرا ہوا تھا، یہ انقلاب زمانہ کا عجیب نمونہ اور خلوص کا عجب کارنامہ تھا کہ جس شہر میں چند ہفتے پہلے خون کی ہولی کھیلی گئی تھی، اور جہاں انسانیت کی ساری قدریں پامال کر کے رکھ دی گئی تھیں، وہاں ہندو مسلمان، عیسائی، امن و آشتی کا پیام لانے والے مسلمان رہنماؤں کی صورتیں دیکھنے کے لئے مشتاق اور ان کی تقریریں سننے کے لئے بے تاب تھے، موقع و محل کے مطابق تقریریں کی گئیں، اس کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ بعض تقریریں سیاسی رنگ اور تلخی سے خالی نہیں تھیں، اور ان میں اپنی جماعت کی نمایندگی کا رنگ صاف جھلکتا تھا، جو ڈاکٹر صاحب کو اور صدر جلسہ کو بہت محسوس ہوا، میں نے اپنی تقریر میں جمشید پور کی صنعتی مرکزیت کو جس میں لوہا خاص کردار ادا کرتا ہے، موضوع بنا کر انسانوں کی پستی اور انسانیت کی ناکامی کا ذکر کیا اور کہا کہ "اگر اس آہن خام کے زبان ہوتی جو ان کارخانوں میں آکر تھوڑی سی انسانی حکمت و صنعت کی بدولت ارتقار کی منزلیں طے کرتا ہے، اور انسانی تمدن و تہذیب کے کام میں اپنی افادیت ثابت کرتا ہے، تو وہ انسان پر اپنی برتری ثابت کرتا اور اس کی بے عنوانیوں اور لوہے کے مصنوعات کے غلط استعمال کو یاد دلا کر اس کو شرماتا اور کہتا کہ ہم کو ہمارے خالق نے اس لئے نہیں پیدا کیا تھا، اور ہم پر ان کارخانوں میں اس لئے محنتیں صرف،

نہیں ہوئیں کہ ہم سے انسان کا جو اشرف المخلوقات ہے، گلا کاٹا جائے، اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں، ان پڑھے لکھے انسانوں کا قصور ہے، جو ہم سے حفاظت کے بجائے ہلاکت کا، تعمیر کے بجائے تخریب کا اور تہذیب کے بجائے غارتگری کا کام لیتے ہیں، مجھے یاد ہے کہ صدر جلسہ جب مقررہ وقت ختم ہونے پر ڈائس سے اٹھ کر جانے لگے تو قصداً راہ بدل کر میرے پاس آئے اور کان کے پاس منہ لاکر یہ کہا کہ آپ کی تقریر بڑی برموقع تھی، اور مجھے بہت پسند آئی، ڈاکٹر صاحب نے بھی بعد میں اس تقریر پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا، اور اس کے چند جملوں کو دہرایا، یہ ڈاکٹر صاحب کے ذوق اور عقیدے کے عین مطابق تھی، اور ان کے خیالات کی صحیح ترجمانی۔

جمشید پور سے وفد راوڑکیلا گیا لیکن مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اپنی علالت کی بنا پر اور میں اس وجہ سے کہ مجھے قریبی تاریخوں میں یورپ کا سفر کرنا تھا جمشید پور رہ گئے، اور وہیں سے واپس ہوئے، معلوم ہوا کہ راوڑکیلا میں بھی وفد کا بڑی گرمجوشی سے استقبال ہوا، اور لوگوں نے موسلا دھار بارش میں بیٹھ کر اپنے محبوب رہنماؤں کی تقریریں بڑے ذوق و شوق سے سنیں۔

اس دورہ میں ڈاکٹر صاحب کی مستعدی اور متعدد معذوریوں اور بڑھاپے کے ساتھ ان کی غیر معمولی جفاکشی اور قوت برداشت ہم لوگوں کے لئے نہ صرف حیرت کا سامان تھی، بلکہ ایک تازیانۂ عبرت، ان کی عمر اس وقت اسّی سے متجاوز تھی، وہ بہت اونچا سنتے تھے، اور ان کی نگاہ برائے نام رہ گئی تھی، فیل پا کے بھی مریض تھے، جس کی وجہ سے پیدل چلنے میں زحمت پیش آتی تھی، لیکن وہ ہر موقع پر جوانوں سے آگے آگے نظر آتے تھے، وہ کئی کئی گھنٹے جم کر ڈائس پر بیٹھتے اور جلسہ ختم ہوئے بغیر وہاں سے نہ ہٹتے، رانچی سے جمشید پور تک بذریعہ کار سفر تھا، راستہ کوہستانی، دشوار گزار، ہم لوگ جب پہلی منزل چکر دھر پور پہنچے تو تھک کر چور ہو گئے تھے، میں نے تو اپنی آنکھوں کا عذر کرکے چھٹی لے لی، لیکن ڈاکٹر صاحب جلسہ گاہ گئے، اور دیر تک ڈائس پر

بیٹھے رہے۔

اس دورے سے مجلس مشاورت کے ارکان میں جو اس کے بانی بھی تھے، نئی امنگ اور حوصلہ پیدا ہو گیا، ان کو محسوس ہوا کہ کام کا وسیع میدان ہے، اور زمین پیاسی ہے، خلوص اور بے غرضی کے ساتھ کوئی بات سلیقہ سے کہی جائے تو دل اس کو قبول کرنے کے لئے اب بھی تیار ہیں، اس ملک کے باشندوں کے ضمیر اور روحیں ابھی ایسی مردہ نہیں ہوئی ہیں کہ ان کو حقیقت پسندی، سچی حب الوطنی اور انسان دوستی کا پیام نہ دیا جا سکے، اس دورے نے کامیابی کے امکانات اور روشن کر دیئے، نئے دوروں کا عزم و ارادہ بیدار کر دیا، اس دورہ میں مرکزی جمعیۃ العلماء کے صدر و سکریٹری اور ناظم عمومی کے علاوہ تمام رکن جماعتوں کے سربراہ اور ذمہ دار شریک تھے۔

نومبر ۶۴ء میں مجلس کے وفد نے مہاراشٹر کا دورہ کیا، اور اس کا بھی اسی گرم جوشی سے استقبال ہوا، جیسا بہار و اڑیسہ میں ہوا تھا، بمبئی مالیگاؤں اورنگ آباد اور شولاپور میں زبردست استقبال ہوا، اور عظیم الشان جلسے منعقد ہوئے، میں اوائل نومبر میں یورپ کے سفر سے بمبئی واپس ہوا، تو وفد کا پروگرام مالیگاؤں میں تھا، جو بمبئی سے زیادہ دور نہیں، لیکن میں آنکھوں کی تکلیف اپنے ساتھ لایا تھا، مالیگاؤں نہ جا سکا، اور براہ راست لکھنؤ آ گیا۔

اب مجلس کی شاخیں ہندوستان کی متعدد ریاستوں میں قائم ہو چکی تھیں، اور ان ریاستوں کے مسلمان مجلس کے وفد کے دورے کے لئے جس میں مسلم جماعتوں کے قائدین شریک تھے، اور جو مسلمانوں کی امیدوں کا مرکز بن گئی تھی، چشم براہ تھے، گجرات سے وفد کو دورہ کی دعوت دی گئی، اور ڈاکٹر صاحب نے اس کو منظور کر لیا، ۶ر دسمبر ۶۴ء کو وفد دہلی سے روانہ ہوا، تمام جماعتوں کی بہتر سے بہتر نمایندگی تھی، اور تقریباً سب کے صدر اور رہنما موجود تھے، میں اور مولانا محمد منظور صاحب مجلس کے ایک رکن اور اپنی ذاتی حیثیت سے شریک تھے، اس دورہ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی

کہ اس میں پہلی مرتبہ ڈاکٹر صاحب کی دیرینہ خواہش اور دعوت پر پنڈت سندر لال بھی شریک تھے، اس سفر کی پہلی منزل پالن پور تھی، رات کو جلسۂ عام ہوا، اگلے دن ہم لوگ بذریعہ کار احمد آباد روانہ ہوئے، احمد آباد میں وفد کا زبردست استقبال ہوا، شرکاء وفد کے قیام کے لئے شہر کا ایک معزز ہوٹل تجویز کیا گیا، شام کو وفد کے اعزاز میں ایک عصرانہ تھا جس میں ہندو مسلم معززین شریک تھے، وہاں ڈاکٹر صاحب نے اردو میں اور این۔ ایم انور صاحب سکریٹری جنرل مجلس مشاورت نے انگریزی میں تقریر کی، وہیں، این، ایم انور صاحب کی انگریزی پر قدرت اور ان کی خطابت کا پہلی مرتبہ تجربہ ہوا، میں نے ان سے اصرار کیا کہ وہ ہمیشہ اردو کے بجائے انگریزی ہی میں تقریر کریں، اور بعد میں اسی پر عمل ہوا، رات کو جلسہ عام ہوا، ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر میں بڑی جرأت و صفائی کے ساتھ جماعت اسلامی اور مسلم لیگ کی طرف سے مدافعت کی اور کہا کہ مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ یہ دونوں جماعتیں فرقہ پرست ہرگز نہیں ہیں دوسرے دن بھی احمد آباد قیام رہا، اس وقت نواب مہدی نواز جنگ گجرات کے گورنر تھے، وہ ایک خاندانی اور تعلیم یافتہ شخص ہیں، انھوں نے ڈاکٹر صاحب اور پنڈت سندر لال کو گورنمنٹ ہاؤس میں مدعو کیا، اور ان کی پذیرائی کی، پنڈت سندر لال کئی روز ان کے مہمان رہے۔

احمد آباد کے قومی کارکنوں اور ملی کام کرنے والوں نے ریاست گجرات کے دورہ کا بڑا اچھا پروگرام بنایا تھا، اور بڑی دانشمندی اور خوش سلیقگی کے ساتھ وفد کے دورہ سے فائدہ اٹھانے کا انتظام کیا تھا، اس پروگرام میں مولوی حبیب الرحمٰن صاحب غزنوی مرحوم ایڈیٹر "آب حیات" کی ذہانت اور سلیقہ کو بہت دخل تھا، جو گجرات کے تمام ملی کاموں میں پیش پیش رہتے تھے، اور مسلمان عوام سے بھی ان کا بہت اچھا رابطہ تھا، اور ان کے دست راست احمد آباد کے مقبول و ہر دلعزیز معالج و ماہر فن ڈاکٹر رحمت اللہ حکیم تھے، مولانا عبدالرحمٰن صاحب

پالن پوری نے بھی اس دورہ میں بڑی دلچسپی لی تھی، اور معزز مہمانوں کا تعارف عموماً وہی کراتے تھے، وفد نے احمد آباد کے مضافات اور نواحی قصبات کا بھی دورہ کیا، جو بڑے آباد اور متمول قصبے بلکہ اچھے خاصے شہر تھے، اور مسلمان وہاں تجارت میں نمایاں، ہر جگہ مہمانوں کے ٹھہرنے کے نہایت شائستہ انتظامات تھے،. . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . .

. . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . اور ہر جگہ ان کا جوش و خروش سے استقبال ہوا، اور بڑے بڑے جلسے، نڈیاڈ میں جو آنجہانی ولبھ بھائی پٹیل کا وطن ہے، بھی بڑا استقبال ہوا، وہاں ہمارے شہر رائے بریلی کے ایک تاجر مرزا قاسم بیگ صاحب پورے وفد کے میزبان تھے، یہاں سے وفد گودھرا گیا، یہاں چند سال پہلے ایک سخت ہندو مسلم فساد ہوا تھا جس میں مسلمانوں کی دوکانیں اور املاک کو نذر آتش کر دیا گیا تھا، اب یہاں ہندوؤں و مسلمانوں نے مل کر وفد کا استقبال کیا اور رات کو کامیاب جلسہ ہوا، نڈیاڈ یا گودھرے میں بڑودہ کا ایک وفد پہونچا جو وہاں کے مسلمانوں کا ایک پیام لے کر آیا تھا کہ وفد کے پہونچنے سے پہلے ڈاکٹر صاحب بڑودہ تشریف لے آئیں اور جمعہ وہیں پڑھیں اور مسلمانوں کو خطاب کریں، ڈاکٹر صاحب کی طبیعت کچھ کسل مند تھی یا کسی وجہ سے وہ اس کو مناسب نہیں سمجھتے تھے، انھوں نے جانے سے معذرت کر دی، بہت کچھ عرض کیا گیا لیکن ڈاکٹر صاحب انکار کرتے رہے، آخر میں ارکان وفد نے مجھ سے کہا کہ تم کسی طرح ڈاکٹر صاحب کو راضی کر لو وہ تمہاری بات نہیں ٹالیں گے، میں گیا اور بڑودہ جانے کی افادیت اور ضرورت بیان کی، اور جانے کے لئے ایک حد تک ضد کی، ڈاکٹر صاحب نے حسب عادت اس کو منظور فرما لیا، اور کہا کہ میرے مزاج میں مروت ہے، اور میں کمزور آدمی ہوں اپنے عزیزوں اور دوستوں کے اصرار سے اپنا ارادہ بدل دیتا ہوں، لیکن اگر مولانا آزاد ہوتے تو میں دیکھتا کہ

تم لوگ کس طرح ان کی مرضی کے خلاف ان کو آمادہ کر سکتے ہو۔

بڑودہ تک وفد کا دورہ بذریعہ کار تھا، بڑودہ میں زبردست استقبال ہوا، ارکان وفد ہاروں سے لاد دیئے گئے، رات کو جلسۂ عام ہوا جس میں اکثر ارکان وفد نے تقریریں کیں، اگلے دن ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس سے ارکان وفد نے نیک فال لی اور مسلمانانِ شہر نے اس کو مجلس کے خلوص اور اس کے مقاصد کی صحت کا ثبوت سمجھا، ہم لوگ فجر کی نماز کے بعد اپنی قیام گاہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک چند لوگ مکان میں داخل ہوئے، وہ سخت سراسیمہ اور بدحواس تھے، انھوں نے کہا کہ پاس کا ایک مکان زمین میں دھنس رہا ہے، خواب میں متواتر بتایا گیا تھا، کہ بعض گناہوں اور بداعمالیوں کی وجہ سے یہ مکان زمین میں دھنسا دیا جائے گا، چنانچہ اس کے آثار شروع ہو گئے ہیں اور مکیں و اہل محلہ سخت خائف ہیں، آپ حضرات چل کر وہاں دعا کر دیں، ہم لوگ ایاز قدر خود را بشناس کے اصول پر اپنی حیثیت سے واقف تھے، لیکن جہاں تک دعا کا تعلق ہے ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے تھے، ڈرتے ڈرتے اور شرماتے ہوئے، ہم لوگ وہاں جا کر کھڑے ہوئے اور دعا کی، اللہ کی شان کہ مکان کا دھنسنا فوراً بند ہو گیا، اور وہ اس وقت سے (جہاں تک ہم کو معلوم ہے) ابھی تک قائم ہے، میں تو اس واقعہ کو بھول گیا تھا، لیکن مفتی صاحب نے کئی بار یاد دلایا، مسلمان جماعتوں کے نمائندے اس وفد میں موجود تھے، ان سب نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے، اور جس سے جو بن آیا اس نے دعا کی، اللہ تعالےٰ نے بھی ملت کی اس اجتماعیت کی شرم رکھ لی، کس وجہ سے یہ آئی ہوئی آفت ٹل گئی، وہ اللہ کو معلوم ہے، لیکن یہ واقعہ مجلس کی طرف منسوب ہو گیا، اور شہر میں اس کا خاصہ چرچا ہوا۔

بڑودہ سے وفد بھڑوچ گیا وہاں بھی حسب معمول استقبال اور جلسے ہوئے اب دورہ کا اختتام سورت پر ہونا تھا، جو کبھی باب مکہ تھا، اور جہاں مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کا ایک دور گزر چکا ہے

یہاں کے پروگرام میں ہمارے مخدوم ومکرم سید عظیم الدین صاحب منادی[1] ایڈیٹر مسلم گجرات کا دماغ کام کر رہا تھا، مجلس استقبالیہ کے صدر یہاں کے مسلمان تاجر میاں محمد سیٹھ تھے، جن کو عام طور میاں سیٹھ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، رات کو بہت بڑا جلسہ ہوا، جس کی صدارت سورت کے میئر نے کی اور ارکان وفد میں سے اکثر حضرات کی تقریریں ہوئیں، میں یہ لکھنا بھول گیا کہ پنڈت سندر لال جی کی تقریر کا غالب ومشترک یہ حصہ ہوا کرتا تھا، کہ پاکستان کی ذمہ داری جناح صاحب پر نہیں، ہندوؤں کی تنگ نظری اور کوتاہ بینی پر ہے، وہ اس کو چشم دید واقعات اور دلائل وحوالوں سے ثابت کرتے تھے، صدر صاحب کو ان کی تقریر کے اس حصہ سے ناگواری ہوئی، اور انھوں نے کئی بار گھنٹی بجائی پنڈت جی نے اپنی تقریر ناگواری کے ساتھ ختم کی اور بیٹھ گئے، صدر صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں اس کی شکایت بھی کی اور تردید بھی، سورت پر گجرات کا دورہ ختم ہوا، اور ارکان وفد رات کی گاڑی سے برائے دہلی واپس ہوئے۔

بہار، اڑیسہ، مہاراشٹرا اور گجرات کے دوروں نے ارکان مجلس کا حوصلہ بلند کر دیا اور ان کو کام کا ایک وسیع میدان نظر آنے لگا، جہاں تک ڈاکٹر صاحب کا تعلق ہے، ان میں ایک نئی توانائی و

---

[1] سید عظیم الدین صاحب منادی بڑی محبوب ومحترم شخصیت کے مالک تھے، وہ گجراتی زبان وادب میں ایک طرز خاص کے بانی تھے، جو زبان وبیان کی خوبیوں کے ساتھ اسلامیت اور دینی تعبیرات واصطلاحات سے آراستہ تھے، انھوں نے علامہ شبلی، اور مولانا سید سلیمان ندوی کی کئی کتابوں کا گجراتی میں ترجمہ کیا جو بہت مقبول ہوا، ان کا پرچہ "مسلم" گجرات، ہندو بیرون ہند کے گجراتی مسلمانوں میں بڑا مقبول تھا، اور ہندی وانگریزی پریس بھی اس کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، افسوس ہے کہ پیرانہ سالی اور مالی مشکلات کی بنا پر منادی صاحب کو اسے فروخت کر دینا پڑا، وہ عرصہ تک خلیج کی بعض ریاستوں میں رہنے کی وجہ سے عربی سمجھتے اور بولتے تھے، کثیر المطالعہ، باخبر، اور بڑے باحمیت اور غیور مسلمان تھے، ۸ ربیع الاول ۱۳۹۲ھ ۲۳ اپریل ۱۹۷۲ء میں انتقال کیا۔ غفر اللہ لہ۔

رعنائی پیدا ہو گئی، انھوں نے کئی مرتبہ کہا کہ "ان نظاروں نے مجھے بڑھاپے میں جوان کر دیا" لیکن اس کے ساتھ قوم پرست حلقوں اور خاص طور پر انگریزی اخبارات میں مسلم مجلس مشاورت اور اس کے عزائم و مقاصد کے متعلق شبہات کا اظہار کیا جانے لگا، اور اس کی مسلمانوں میں اس مقبولیت اور مسلمانوں کی اس کے ساتھ غیر معمولی دلچسپی کو ایک "نئے فتنے" کا پیش خیمہ بتایا جانے لگا، بعض وزرائے حکومت اور کانگریس کے ذمہ داروں نے بھی اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا، ڈاکٹر صاحب کا جن کی پوری زندگی ہندو مسلم اتحاد کی تلقین اور ملک و قوم کی بے لوث خدمت میں گزری تھی، اور جو ہر دور میں پختہ نیشلسٹ رہے تھے، اس سے ملول و دل شکستہ ہونا قدرتی تھا، ان کو اپنی زندگی اور روشن تاریخ پر فرقہ پرستی کے الزام کا داغ لگنا کسی طرح گوارا نہ تھا، اب وہ اپنی عمر کے ۸۰ دور اور قویٰ کے ضعف کی اس منزل میں تھے کہ وہ اس کا طاقت کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور ان کے لئے اس کا نظر انداز کرنا بھی مشکل تھا، انھوں نے پریس کی تنقید اور اپنے رفقاء کے اس گلے و شکوے کے جواب میں اکثر معذرت آمیز طرز اور صفائی پیش کرنے کا انداز اختیار کیا، وہ بعض مرتبہ انگریزی اخباروں کے ایڈیٹروں سے بھی ملے، اور انھوں نے مجلس مشاورت کی اور اپنی پوزیشن صاف کرنے کی کوشش کی مجلس کے ان ارکان کو جو ابھی عمر کی اس منزل میں نہیں پہنچے تھے، اور اپنے ساتھ ایثار و قربانی اور قوم پرستی کی ایسی تاریخ نہیں رکھتے تھے، جو ان کو عزیز ہو اور جس پر داغ آنا ان کو گوارا نہ ہو، اس طرز عمل اور اس لب و لہجہ کو ملت اسلامی کے ایک متفقہ قائد کے مقام کے شایان شان نہیں سمجھا، انھوں نے اس پر اپنی دلگیری کا اظہار بھی کیا، میں نے ۱۸ فروری ۶۵ء کو ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں ایک مفصل خط لکھا، جس میں مودبانہ طریقہ پر اپنے اس تاثر کا اظہار کیا، یہاں پر اس کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے، اس سے کسی قدر اس ذہنی کشمکش کا اندازہ ہوگا، جو اس وقت متعدد ارکان کے دماغوں میں پائی جاتی تھی۔

"اس عظیم انقلاب انگیز، عہد آفریں اور نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ اس ملک کی تاریخ بدل دینے والے کام کے سلسلہ میں حکومت کے بعض ذمہ داروں کا کسی غلط فہمی یا بدگمانی میں مبتلا ہونا، ان کا اس ادارہ یا اس کی بعض شریک جماعتوں کی طرف سے مشکوک ہونا، بعض ذمہ داروں کی طرف سے خیالی خطرات کا اظہار کرنا، بعض بداندیش اور تنگ مزاج لوگوں کا اس پر الزام لگانا، متشدد فرقہ پرست جماعتوں کا اس کے خلاف اعلان جنگ، غیر مسلم پریس کا اس کا مقاطعہ کرنا، یا الزام تراشی اور بہتان طرازی، یہ ایک بالکل قدرتی امر ہے جس پر کسی آزمودہ کار شخص کو قطعاً متعجب نہ ہونا چاہئے، بلکہ اگر یہ چیزیں نہ پیش آئیں تو اس پر تعجب ہونا چاہیے اور اپنے خلوص نیت اور کام کی اہمیت کے بارے میں شک پیدا ہو جانا چاہیے، لیکن قدرتی ہونے کے ساتھ یہ چیزیں اتنی ناقابل اعتنا، اتنی حقیر اور اس طرح خس و خاشاک کی حیثیت رکھتی ہیں کہ آپ کی ذات تو بہت بلند ہے، آپ تو ہمیشہ دار و رسن کو دعوت دیتے رہے اور آپ نے سب سے بڑی باجبروت سلطنت (برطانیہ) کی پروا نہیں کی مجھ جیسا گوشہ گیر انسان بھی جس کی ساری عمر علمی مشاغل میں گزری، اور جو ہمیشہ سیاسی میدانوں سے الگ رہا، اس مقصد عالی کے سرور و کیفیت میں جو ہندوستانی مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ اور ملک کی حفاظت و بقا کی اس کوشش میں کبھی کبھی طاری ہو جاتا ہے ہزار زبان سے یہ شعر پڑھنے لگتا ہے۔

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں "

ڈاکٹر صاحب کے چونکہ زیادہ تر تعلقات غیر مسلم قوم پرستوں سے رہے تھے، اور ان کا عقیدہ

تھا، کہ جب تک اکثریت کے لوگ ہندو مسلم اتحاد کے اس کام کو لے کر نہیں اٹھیں گے یہ تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی، اس لئے اگر جلسہ میں کوئی ایک غیر مسلم بھی آجاتا تو ڈاکٹر صاحب کے چہرہ پر مسرت و شادمانی کی لہر دوڑ جاتی اور یہ خیال ان کی پوری تقریر پر حاوی ہو جاتا لیکن حالت یہ تھی کہ غیر مسلم پریس نے تو مجلس کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا تھا، اگر کبھی اس کا ذکر بھی آتا تو محض حقارت اور تنقید کے ساتھ، گویا مومن خاں کا یہ شعر بالکل صادق تھا۔

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی

تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

غیر مسلم اصحاب کی بھی جلسوں میں شرکت نہ ہونے کے برابر ہوتی لیکن ڈاکٹر صاحب پر جو سننے اور دیکھنے سے بھی بہت کچھ معذور تھے، یہ خیال برابر غالب رہتا اور ان کی تقریروں میں اسی کا رنگ جھلکتا مسلمان عوام جو بڑے ذوق و شوق اور عقیدت کے ساتھ ان جلسوں اور جلوسوں میں شریک ہوتے بعض اوقات ان تقریروں سے مایوس ہوتے، ہم لوگوں نے زبانی بھی ڈاکٹر صاحب کو اس کی طرف متوجہ کیا اور اوپر جس خط کا تذکرہ ہوا ہے، اس میں بھی بہت وضاحت کے ساتھ اس کو عرض کیا گیا ہے، ڈاکٹر صاحب یہ خط پڑھ کر کچھ خوش نہیں ہوئے، انھوں نے اس میں بے اعتمادی کی جھلک پائی، انھوں نے اس خط کا جواب معذوری کے باوجود اپنے قلم سے دیا، تاکہ یہ بات میرے اور ان کے درمیان رہے۔

مجلس کا کام جاری رہا، نشیب و فراز آتے رہے، ۱۹۶۵ء کی ہندوستان و پاکستان جنگ بھی جو ایک نازک ترین مرحلہ تھا، مجلس کے کام میں تعطل نہیں پیدا کر سکی اور مجلس ڈاکٹر صاحب کی رہنمائی میں اس امتحان سے بھی کامیابی کے ساتھ گزر گئی، اور اس نے کوئی ایسا موقف اختیار نہیں کیا، جو اس کے مقام کے شایان شان نہ ہوتا، مجلس کا ملک میں بڑا چرچا تھا، اس کے سب دورے کامیاب ہوتے تھے، ملک کے ہر گوشہ سے مجلس کے صدر دفتر میں تحسین و تائید کے خطوط آتے تھے، مگر حیرت کی بات ہے کہ

مسلمانوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ مجلس کو فنڈ کی بھی ضرورت ہے، اور انھوں نے یہ بھی خیال نہیں کیا کہ اتنے بڑے دوروں کے مصارف کہاں سے ادا ہوتے ہیں، واقعہ یہ تھا کہ ارکان وفد ہی اپنے سفروں کا انتظام کرتے ہیں جب ڈاکٹر صاحب سے مجلس کی مقبولیت کا ذکر کرتا تو وہ فرماتے کہ میں کیسے اس بات کو تسلیم کروں، آج تک کسی ایک نے بھی مجلس کی مالی اعانت کی ضرورت نہیں سمجھی، اور یہ نہیں سوچا کہ آپ لوگ کس طرح کام چلاتے ہیں، ڈاکٹر صاحب مجلس کو کس نظر سے دیکھتے تھے، اور اس سے کیا کام لینا چاہتے تھے، اس کا اندازہ ان کے ایک طویل خط سے ہوگا، جو ۱۹ر جون ۶۶ء کا لکھا ہوا ہے اس میں میری جس تقریر کا ذکر ہے، وہ غالباً لکھنؤ کے گنگا پرشاد میموریل ہال کی تقریر ہے، جو مجلس مشاورت کی ضرورت اور مقاصد پر کی گئی تھی۔

"محترمی! السلام علیکم، میں آج اعظم گڑھ سے لکھنؤ (دہلی جاتے وقت) اس امید میں ٹھہرا کہ آپ سے ملاقات ہوسکے گی، مگر نیاز نہ حاصل ہونے کا افسوس رہا، بہرحال آپ کی تقریر ندائے ملت میں پڑھی ٹیپ رکارڈ مشین سے سنی، سبحان اللہ ماشاء اللہ، آپ اس پر نظر ثانی کرلیں تو وہ چھپوا دی جائے، وہ چھپوا دینے کی ہے، مگر مور جب اپنا پیر دیکھتا ہے تو شرما جاتا ہے، مجلس مشاورت کا ایک طرف تو اتنا شور ہے، اور دوسری طرف کام کرنے کے لئے اس کے پاس کوئی فنڈ نہیں۔

آپ نے جن باتوں پر مشاورت کے نظریہ کو صاف کیا ہے، وہ بہت خوب ہے اور ان ہی دو باتوں کو لے کر ہم مشاورت کے آئندہ جلسہ میں سب حضرات اور جماعت کا نظریہ صاف کرلینا چاہتے ہیں، اس کے بعد میرے خیال میں کام آسان ہو جائے گا۔

نظریہ کو صاف کرنے کے بعد اور وہ اچھے اچھے فقرے جو آپ نے اپنی تقریر میں کہے ہیں، ان کو اس نظریہ کے صاف کرنے میں استعمال کر کے ہم یہ کہیں کہ ہم یہ مطالبہ

کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو مسلمانوں کا نمائندہ سمجھ کر پارلیمنٹ و اسمبلیوں میں نہ لیا جائے، ایسے مسلمانوں سے مسلمان بہت ناامید ہیں اور وہ اچھے ہندو ہی کو اپنا بہتر نمائندہ سمجھیں گے، اور انہی کے ذریعہ اپنا کام نکالنے کی کوشش کریں گے، (اس مطلب کو اچھے الفاظ میں ادا کیا جائے آپ کے اچھے الفاظ میں) پھر ہم اپنے مطالبات کو بیان کریں۔

مطالبات مثلاً اردو دینی تعلیم کے علاوہ ان میں ایسی چیزیں بھی ہونا چاہئیں جن کا تعلق صرف مسلمانوں سے نہ ہو، مثلاً دوسری اقلیتوں کے معاملات یا مطالبات (جو ہمارے مقاصد میں بھی شامل ہے) اور ملک کے ایسے معاملات جو ہر قوم سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً ہمارا یہ مطالبہ ہونا چاہیے کہ اسکولوں میں دینی تعلیم جاری کی جائے، ملک میں جو بے راہ روی ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اخلاقی تعلیم کو پس پشت ڈال رکھا ہے، یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ دینی تعلیم کا کیا مفہوم ہے، مسلمانوں میں بیسیوں فرقے ہیں، تو ہندوؤں میں سو، ہر فرقہ کو تعلیم نہیں دی جا سکتی، اس کو صاف کرنا ہوگا، اس کا مطلب یہ نہ ہوگا کہ شیعہ سنی یا کسی اور فرقہ کی تعلیم بلکہ اعلیٰ اخلاقی تعلیم، جسے اچھے اچھے الفاظ میں صاف کریں، اسی طرح بہت سے ایسے مسائل ہیں، جن کا تعلق سب قوموں سے ہے، اور جن کا پورا ہونا ضروری ہے۔

نصاب تعلیم کا مسئلہ کہ جس سے خاص کر ہمارے ملک کے چھوٹے بچوں کی ذہنیت بنے اور صحیح معنوں میں [illegible] فردوں سے ربط و محبت پیدا ہو، ان کے دماغ ملک کی خدمت کے لئے میل و محبت اور اعلیٰ پیمانہ پر بن سکیں۔

آج عام طور پر ہندو سوسائٹی کا یہ مطالبہ ہے کہ باوجود قانون پاس ہونے کے

شادی بیاہوں میں ملک کا زور شور ہے، اور ہندو لڑکیوں کی شادی کے لئے بڑی بڑی رقمیں دینی پڑتی ہیں، گورنمنٹ نے قانون پاس کیا لیکن نفاذ میں ناکامی ہے، غریب ہندو خاندان کی لڑکیاں اپنی زندگی نہایت پریشانی و ہیجان میں گزارتی ہیں۔

ہریجنوں کے متعلق گورنمنٹ نے ضروری قانون پاس کیا ہے، اور یہ صحیح ہے کہ گورنمنٹ نے ان کو اونچا کرنے میں مدد دی ہے، لیکن پھر بھی ذات پات کا قصہ خاص کر دیہاتوں سے نہیں اٹھا، اس کے لئے ایک بڑے پیمانہ پر گورنمنٹ کی طرف سے اور سب لوگوں کی طرف سے طرح طرح سے یہ پروپیگنڈا ہونا چاہئے، اسی طرح سکھوں کا معاملہ ہے تو اس کو بھی اپنانا چاہئے، ایسے ملکی معاملات بہت سے ملیں گے جن میں ہم بھی شامل ہیں، اور ہمارے فائدے کے ہیں، جیسے اوروں کے، ان کو بھی ہم کو اپنے معاملات کے ساتھ اٹھانا چاہئے۔

پرسنل لا مسلمانوں کے خاص مسئلہ میں آتا ہے، اس کو اچھے الفاظ میں صاف کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ کوئی کمیونل مطالبہ نہیں ہے، ہمارے ملک کی حیثیت اور یہاں کے بسنے والوں کی حیثیت ایک گلدستہ کی ہے جس میں طرح طرح کے رنگ و بو کے پھول ہیں، ان کو صرف کنول کے پھول کا کھیت بنانا مناسب نہ ہوگا، جو لوگ یہاں بستے ہیں، ان سب کی اپنی اپنی ضروریات اپنے اپنے طریقے ہیں، ان پر عمل کے یہ معنی نہیں کہ ہم دو نیشن ہیں، اپنے اپنے طریقوں اور اپنے اپنے مذہب پر عمل کرتے ہوئے پھر بھی ایک قوم ہیں، اور رہ سکتے ہیں۔

آنحضرتؐ نے عرب کے غیر مسلمین کو اپنی قوم سے تعبیر کیا اور ان کے لئے دعا کی کہ خدا ان کو راہ راست پر لا، ہم سیکولرزم کے حامی ہیں، اور اس ملک میں سیکولرزم کا

ہونا ضروری سمجھتے ہیں، مگر سیکولرزم کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہر ہر آدمی لامذہب ہو یا اپنے سب طریقوں کو چھوڑ کر ایک ہی طریقہ اختیار کرے سیکولرزم کے جو معنی بتائے گئے ہیں، وہ یہ کہ گورنمنٹ کا کوئی مذہب نہیں، ان کے علاوہ اور بھی مشترک مطالبات ہو سکتے ہیں جو سب کے لئے مفید ہیں، جن میں ہم بھی شامل ہیں، آپ کے قلم جیسے زیادہ بہتر ان خیالات کو کون ظاہر کر سکتا ہے۔

ہاں ایک امر اور بھی ہے کہ مشاورت کے نام میں مسلم بھی رکھا ہے، ہم نے لکھنؤ میں ۱۹۶۴ء میں اس کام کو اپنے ذمہ لیا تھا اور جان کی بازی لگا دینے کی کوشش کی تھی کہ ہم ہندوؤں کی غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کریں گے، اور مسلمانوں کو ملک کے کام کے لئے زیادہ سے زیادہ مخاطب کرنے کی کوشش کریں گے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اچھی طرح سمجھنے لگے کہ بغیر ہندوؤں، مسلمانوں کی مفاہمت کے نہ ملک کی خیر ہے، اور نہ مسلمانوں کی، اس کا عملی نتیجہ لڑائی کے موقع پر مسلمانوں نے ثابت کر دیا کہ وہ پاکستانی ذہنیت کے نہیں ہیں، اگر وہ فوج میں کافی شامل ہوتے تو ثابت کر دیتے کہ وہ ملک کے کس حد تک وفادار ہیں۔

ہم میں سے کچھ لوگ ہمیشہ ہندو مسلم میل و محبت کی جد و جہد کرتے رہے ہیں مگر وہ کانگریس کے نام سے مسلمانوں کو بلاتے رہے ہیں، اب بھی ہم سب لوگ وہی کام کر رہے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ اب مسلمانوں کو ملکی کاموں کی طرف اور ہندو مسلم مفاہمت کی طرف مسلمانوں کے نام پر بلاتے ہیں، ہم نے یہ دیکھا کہ اس کا اثر مسلمانوں پر کہیں زیادہ ہے، ہمارا دستور موجود ہے، جس میں کہیں بھی فرقہ پرستی نام کو نہیں، مسلم نام رکھنے سے مسلمانوں کو فخر ہوتا ہے کہ ملک کے اس بڑے کام کو ہم نے اپنے ذمہ

اٹھایا اور ہم کوشش کر رہے ہیں۔"

گجرات کے دورہ کے بعد مجلس کے غالباً تین دورے اور ہوئے، ایک حیدرآباد کا، دوسرا غالباً مالوہ کا، تیسرا ریاست میسور کا، اول الذکر دو[۲] دوروں میں میری شرکت نہیں ہو سکی، اس لئے اس کے مشاہدات اور تاثرات لکھے نہیں جا سکتے، اس وقت ڈاکٹر صاحب کا ایک خط پیش نظر ہے جس میں انھوں نے حیدرآباد کے دورہ کی کامیابی پر مسرت اور میری عدم شرکت پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔

ریاست میسور کے دورہ کے متعلق میں بہت تفصیل سے ندائے ملت (دسمبر ۶۶ء) کے پانچ شماروں میں لکھ چکا ہوں[۱]، یہ مجلس کی تاریخ کا سب سے طویل وعریض، اور سب سے کامیاب دورہ تھا، اس میں بارہ روز صرف ہوئے، مضمون کی تمہید میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ یہاں نقل کیا جاتا ہے کہ اس میں اس دورہ کی اجمالی تصویر آگئی ہے۔

"قارئین کو معلوم ہو چکا ہے کہ ۱۱ر نومبر سے ۲۲ر نومبر ۶۶ء تک مرکزی مجلس مشاورت کے ایک وفد نے جس میں تقریباً تمام ارکان مجلس اور شریک جماعتوں کے ذمہ دار نمائندے شریک تھے، ریاست میسور کا دورہ کیا، یہ ایک نہایت طویل، وسیع اور موثر دورہ تھا، جو ہندوستان کی کسی منظم جماعت نے ماضی میں کیا ہوگا، مجموعی طور پر اس وفد نے جو مسافت طے کی وہ تقریباً ساڑھے چھ ہزار میل کی ہے، اس میں تقریباً ڈیڑھ ہزار میل کی مسافت بس سے طے کی گئی، قافلہ نے اپنا سفر بذریعہ بس مدراس سے شروع کیا اور گلبرگہ پر ختم کیا، قافلہ میں نو[۹] مرکزی مجلس کے ارکان شریک تھے، اور

---

[۱] یہ سلسلہ مضامین علیحدہ رسالہ کی شکل میں "بارہ دن ریاست میسور میں" کے نام سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ان طلبہ نے شائع کر دیا ہے، جن کا تعلق ریاست میسور سے ہے، ان میں عزیزی قاضی محمد فاروق بھٹکلی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پندرہ ریاستی مجلس کے ارکان، داعی و منتظمین اور اخباروں کے ایڈیٹر و رپورٹر، وفد ۳۶ مقامات سے گزرا جن میں سے پندرہ وہ بڑے شہر اور اہم مقامات تھے، جہاں عظیم الشان جلسے منعقد ہوئے اور ارکان وفد نے پر اثر اور ولولہ انگیز تقریریں کیں، اکیس[۲۱] راستہ کے وہ چھوٹے مقامات تھے جہاں ارکان وفد کا بڑے بڑے مجمعوں نے استقبال کیا، شرکائے وفد کی گل پوشی کی ان کے اعزاز میں اہل قصبہ یا میونسپلٹی کے چیرمینوں نے جن میں بڑی تعداد غیر مسلم حضرات کی تھی، استقبالیہ دیئے ایڈریس یا خیر مقدمی قصائد پڑھے گئے، اور صدر محترم ڈاکٹر سید محمود صاحب یا ارکان وفد نے ان کا جواب دیا، اور مجلس کا پیغام پہونچایا، اس پورے طویل راستہ میں جو ڈیڑھ ہزار میل پر پھیلا ہوا تھا، اور گیارہ[۱۱] بارہ[۱۲] دنوں میں طے ہوا استقبال کرنے والوں کا خلوص، ان کی مسرت اور ان کا جوش و خروش دیکھنے کے قابل تھا، ہندو مسلمانوں کے اتحاد کا ایسا نظارہ بھی تحریک خلافت کے بعد دیکھنے میں نہ آیا ہوگا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جنوبی ہند کا یہ خطہ ملک کی پوری آبادی کو محبت و اتحاد اور ملت اسلامیہ کو جرأت و اعتماد کا پیام دینے والوں کے استقبال کے لئے امنڈ آیا ہے، اس دورہ سے اندازہ ہوا کہ اہل ملک کے ضمیر میں محبت کی کیسی چنگاری، قبول حق کی کتنی صلاحیت اور سلامت روی کا کتنا مادہ ہے، اور اگر بے لوث و بے غرض خود آگاہ و خدا ترس خادم ملک و ملت، سیاسی اغراض و ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر اس ملک کے سیدھے سادے باشندوں، خاموش مگر گرم جوش عوام سے براہ راست رابطہ پیدا کریں، اور ان کے دماغ سے زیادہ ان کے دل اور ضمیر کو خطاب کریں تو وہ کس طرح پروانوں کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں، یہ پورا خطہ جو صرف جنوبی ہند نہیں بلکہ پورے ہندوستان کی نمایندگی کرتا تھا، زبان حال سے

پکار پکار کر کہہ رہا تھا، اور دشت وجبل سے یہی صدا آرہی تھی :-

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ بر کف
بہ امید آنکہ روزے بہ شکار خواہی آمد"

اس دورہ میں اس راقم کی ایک دیرینہ آرزو بھی پوری ہوگئی یعنی سرنگا پٹن کی زیارت جہاں ہندوستان کا وہ شیر سو رہا ہے جس نے گیدڑ کی زندگی کے سو سال پر شیر کی زندگی کی ایک ساعت کو ترجیح دی تھی، اور جس نے اپنے لئے بجائے تسبیح خاموش کے بجائے تکبیر پرخروش کا انتخاب کیا تھا۔

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل | یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردان خود آگاہ و خدا مست | یہ مذہب ملا و جمادات و نباتات

اور جو اقبال کے الفاظ میں۔ ؎ "نہ کشتے مارا خدنگ آخریں" کا مصداق تھا۔

اس مضمون میں میرے قلم سے یہ لفظ نکلے ہیں "سلطان شہید کی عقیدت و محبت جسم و جان میں پیوست ہوگئی، اور وہ زندگی کی ایک عزیز و لذیذ متاع بن گئی، جہاں تک راقم کا تعلق ہے، اس کے روحانی روابط اس سے زیادہ وسیع و عمیق تھے جتنے اکثر رفقاء کے تھے، ہماری خاندانی روایات اور بعض تاریخی دستاویزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان شہید کے خاندان کو سید شہید کے خاندان سے روحانی ارتباط رہا ہے"۔

میسور کا دورہ مجلس مشاورت کی شہرت و مقبولیت کا نقطۂ عروج تھا، ندائے ملت میں اس کے بارے میں جو سلسلۂ مضامین شروع کیا گیا تھا، اس کا آغاز مصحفی کے اس شعر سے کیا گیا تھا، جس نے درحقیقت پورے مضمون میں جان ڈال دی تھی۔ ؎

چلی بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا

مجلس مشاورت سے اس وقت مسلمانوں کی جو توقعات وابستہ تھیں، مستقبل جتنا مبہم اور غیر واضح نظر آرہا تھا اس حسین خواب کی تعبیر میں جو قیاس آرائیاں کی جارہی تھیں، امکانات و مشکلات، حوصلہ افزائیوں اور ہمت شکنیوں کے جو بادل امنڈ رہے تھے، مجلس کے ارکان کے درمیان خیالات کا جو انتشار اور مقاصد کا جو اختلاف کارفرما تھا، پھر بھی مسلمانوں کی اس اجتماعی قیادت کے وجود میں آنے اور اس کے غیر معمولی استقبال نے امیدوں کی جو شمعیں روشن کردی تھیں، اس ملی جلی کیفیت کو ادا کرنے کے لئے مصحفی کے اس شعر سے بہتر کوئی آغاز نہیں تھا، اور یہ امید بظاہر حالات خلاف عقل اور بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتی تھی کہ۔ ع

کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا

لیکن یہ قافلۂ نوبہار مسلمانوں کی بدقسمتی سے کس منزل پر ٹھہرا یہ کم سے کم ہندوستان کے مسلمانوں کی جدید تاریخ میں المناک داستان اور ایک حزنیہ ہے۔

قارئین کو اندازہ ہوچکا ہوگا کہ مجلس مشاورت کے عناصر ترکیبی ہی سے ایک اہم عنصر (مرکزی جمعیۃ علماء ہند) تھوڑے ہی عرصہ کے بعد بے تعلق ہوگیا تھا، صرف مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اپنی ذات سے اپنے چند رفقاء کے ساتھ شریک تھے، حکومت نے مسلمانوں میں مشاورت کے اثرات کو کم کرنے کے لئے اپنے طریقے اور اثرات استعمال کئے، پھر بھی اس کا شیرازہ ابھی مجتمع تھا، اور اس کی صفوں میں کوئی انتشار پیدا نہیں ہوا تھا، یہ صورت حال بھی زیادہ دن قائم نہ رہ سکی، اس اجمال کی قدرے تفصیل آئندہ سطور میں آتی ہے۔

۱۹۶۷ء کے عمومی انتخابات بلاواسطہ مجلس کے لئے اور بالواسطہ مسلمانان ہند کے لئے بڑے نامبارک ثابت ہوئے، مجلس کی زندگی میں ابھی تک حسب ابہام و اجمال سے کام چل رہا تھا، انتخابات کی بے رحم اور سنگین منطق نے جو ریاضی کی طرح نظریات پر نہیں بلکہ عملی فیصلہ پر اور ابہام پر

نہیں بلکہ تعیین پر عقیدہ رکھتی ہے مجلس کے شیرازہ کو درہم برہم کر دیا، میں اپنے اس انٹرویو میں جو "ندائے ملت" کے ۲۱ر فروری ۷۱ئہ کے شمارہ میں شائع ہوا ہے، اور جو بہت دنوں تک اخبارات و رسائل کا موضوع بحث بنا رہا اس کو تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔

درحقیقت مجلس میں دو بنیادی خیالات کام کر رہے تھے، ایک یہ کہ مسلم مجلس مشاورت اس اخلاقی قیادت کے خلار کو پر کرنے کے لئے وجود میں آئی ہے، جو عرصہ سے ہندوستان کی سیاست اور ہندو مسلم تعلقات کے میدان میں پایا جاتا تھا، اس کو خیر امت اور خادم انسانیت بن کر میدان میں آنا چاہیئے اور ملک کو سچی حب الوطنی انسان دوستی، خلوص، دیانت اور محبت کا پیغام دینا چاہیئے یہی ڈاکٹر صاحب کے دل کی آرزو تھی، اور اسی سے ان کی حقیقی دلچسپی تھی۔

دوسرا خیال یہ کہ مسلمانوں میں قیادت کا ایک خلار پایا جاتا ہے، ایسی قیادت جو ان کے مسائل کو جرأت اور قابلیت کے ساتھ پیش کر سکے، اور جو ان کے مقدمے کی قوت و اعتماد کے ساتھ وکالت کرے، مسلمانوں کا انتشار اس سے دور ہو، اور اکثریت سے دانستہ یا نادانستہ پہونچنے والے نقصانات کا مقابلہ کیا جا سکے، یہ مجلس کے اکثر ارکان کا فکر تھا، اور مجھے اس کے اعتراف میں کوئی تامل نہیں کہ مجلس مشاورت کے کامیاب دوروں نے مجھے اس خیال سے بہت متاثر کیا اور مجھے ایسا نظر آنے لگا کہ کوئی ایک فرد تو اس خلار کو پُر نہیں کر سکے گا، اجتماعی قیادت (COLLECTIVE LEADERSHIP) اس کو بڑی حد تک پُر کر سکتی ہے، یہ دونوں طریقۂ فکر اپنے مزاج، اپنے نتائج اور اپنے تقاضوں میں بڑا بعد رکھتے تھے، پہلا انتخابات کے اغراض و مقاصد، اس کے طریقۂ کار، ٹکنک سے جوڑ نہیں کھاتا، دوسرا انتخابات میں حصہ لینے کی اور مسلمانوں کو اس ملک میں مؤثر طاقت ثابت کرنے کی حقیقت و ضرورت کو نظر انداز نہیں کر سکتا، اور وہ مسلمانوں کے اس سو فیصد مطالبہ سے صرف نظر نہیں کر سکتا کہ وہ انتخابات میں حصہ لے کر اپنے وزن کا ثبوت دیں اور

اپنے مسائل و مستقبل کے تحفظ کے لئے بہتر فضا پیدا کریں، اس وقت حکمراں سیاسی پارٹی (کانگریس)
کے اکثر ذمہ داروں کا یہ تاثر و تصور تھا کہ مسلمان اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہیں، اور ان کے لئے موجودہ
حالات میں کوئی دوسرا راستہ نہیں، اس تصور و تیقن نے مسلمانوں کے مسائل کی طرف سے وہ
بے اعتنائی پیدا کر دی تھی، جو قدرتاً ہر اس جماعت میں پیدا ہونی چاہیئے، جس کے یہاں فیصلوں کی
میزان، اصول، اخلاق، خدا ترسی، محاسبۂ نفس اور خوف آخرت کے بجائے مصالح اور فوائد اور
واقعات اور سود و زیاں کی منطق ہوتی ہے، یقیناً کانگریس ایسی متقی و متورع جماعت نہیں تھی، اور
اس سے یہ توقع محض ایک خام خیالی اور سادگی تھی کہ وہ مسلمانوں کے غیر موثر اور ہمیشہ مفید اور کبھی مضر
ہونے کی شکل میں بھی ان کو مطمئن کرنے اور ان کے مسائل کے حل کرنے کی ویسے ہی کوشش کرے گی
جیسے وہ جماعتیں کرتی ہیں، جن کی تربیت خالصتہً اخلاق اور اصول پر ہوتی ہے، میں نے اپنے ایک
مضمون میں مسلمانوں کی اس کمزوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال کا یہ شعر لکھا تھا۔ ؏

تمیز خار و گل سے ہے آشکارا — نسیم صبح کی روشن ضمیری
حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے — اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری

غرض یہ دو طریقۂ فکر تھے، اور یہ کھل کر اس وقت سامنے آگئے، جب ۶۷ء کے انتخابات کا
معرکہ سر پر آگیا، ایک فریق جس میں ہمارے دوست ڈاکٹر فریدی پیش پیش تھے، میں اور مولانا منظور صاحب
اور مجلس کے اکثر ارکان اس کے مؤید تھے، یہ مطالبہ کر رہا تھا کہ مجلس انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت
دے اور خود ڈاکٹر صاحب کے الفاظ میں "ایک بار ثابت کر دے کہ مسلمانوں نے کانگریس کے لئے
خط غلامی نہیں لکھ دیا ہے"، بڑی کشمکش کے بعد یہ تجویز منظور ہوئی، لیکن تجویز کا متن بڑے سلیقہ اور
قابلیت کے ساتھ تیار کیا گیا، جس میں ہمارے دوست مولوی محمد مسلم صاحب ایڈیٹر دعوت کی صحافتی
لیاقت اور توازن دماغی کو بہت دخل تھا، اور جس کا رنگ اور اپیل سیاسی سے زیادہ اخلاقی و

اصولی تھی، ڈاکٹر صاحب نے حسب معمول ہم لوگوں کی مروت میں بادل ناخواستہ اس کو منظور کیا، اس کے نتیجہ میں متعدد ریاستوں اور بالخصوص یوپی میں مجلس کی شاخوں نے انتخابات میں حصہ لیا، اور پھر وہ سب کچھ ہوا جس سے انتخابات کے ہنگامہ میں بچا نہیں جا سکتا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مجلس کے وقار اور اس کے دفاعی ڈھانچہ کو محفوظ رکھنے کے لئے اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے جو اس کی تشکیل میں شریک غالب تھا، اور جس کے لئے اس وقت بھی کوئی جماعت میدان میں نہیں ہے ڈاکٹر صاحب کا طریقۂ فکر زیادہ مناسب تھا، لیکن اس وقت جب کہ ساری فضا انتخابات کے برقی کرنٹ سے گرم ہو رہی تھی، اور اس مقصد کو ہاتھ سے دینا بڑا غیر دانشمندانہ اقدام نظر آتا تھا، یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا، خیالات کے اختلافات اور فیصلوں پر جب اس ماحول سے الگ کر کے جن میں وہ پیدا ہوئے تھے، تصنیف کے صفحات اور تاریخ کے گوشۂ عافیت میں غور کیا جائے گا، تو کسی نہ کسی فریق کے ساتھ ناانصافی ضرور ہوگی۔

مجلس کی تجویز میں مسلمانوں کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ امیدواروں کی تائید و مخالفت میں ان سیاسی پارٹیوں کے بجائے، (جن کے وہ نمایندے ہیں) ان کی ذاتی صفات، اخلاقی بلندی اور اصول پسندی اور سچی حب الوطنی کو معیار اور فیصلہ کن قرار دیں اور ہر اس اچھے امیدوار کی حمایت کریں جو مسلمانوں کے مسائل سے ہمدردی رکھتا ہو، اور ملک کی بے لوث خدمت کرنا چاہتا ہو، خواہ اس کا تعلق کسی پارٹی سے ہو لیکن ظاہر ہے کہ انتخابات کی گرماگرمی میں اس اصول پر قائم رہنا عملاً بہت دشوار تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ بعض ریاستوں میں مسلمانوں نے اس اصول کو نظر انداز کر کے کانگریس کے امیدواروں کی مخالفت کی اور بعض جگہ ان کی حمایت کی خود ڈاکٹر صاحب نے ہماری موجودہ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کی تائید میں بیان شائع کیا اور بہار کے بعض ان کانگریسی امیدواروں کی حمایت کی جن سے مسلمانوں کو شکایات تھیں، اور وہ ان سے کوئی اچھی امیدیں نہیں رکھتے تھے

کانگریس کی سب سے بڑی مخالفت یوپی میں ہوئی اور اس سے کانگریس کے امیدواروں کو بعض حلقوں میں خاصہ نقصان پہونچا، اس مختلف طرز عمل نے مجلس کی صفوں میں بڑا انتشار پیدا کر دیا، اور مجلس کا شیرازہ بکھرتا نظر آیا۔

نتائج کے اعلان کے بعد مجلس کا جلسہ ۲، ۳ اپریل ۶۷ء کو دہلی میں منعقد ہونا طے پایا، مجلس اس وقت موت وحیات کی کشمکش سے گزر رہی تھی، دل شکایتوں سے لبریز تھے، ڈاکٹر صاحب خاص طور پر نہایت دل شکستہ اور بد دل تھے، مجلس کا خاتمہ بہت نزدیک نظر آرہا تھا، لیکن اس کی قسمت میں روز اول سے یہ مقدر تھا کہ موت کے منہ سے نکل کر زندگی کے دامن میں آرہے اور اس کا چراغ گل ہوتے ہوتے بھڑک اٹھے، اس موقع پر بھی یہی ہوا، مجلس کے وجود کی ضرورت کا احساس، اس کے شاندار آغاز، اور اس کے پر کیف دوروں کی یاد، مسلمانوں کی توقعات، اتنی بڑی اجتماعیت کے نصیب ہونے کے بعد اس کو خود ختم کرنے کی خدا کے یہاں پرسش کا سوال بار بار دامن گیر ہوتا، بالآخر امڈتے ہوئے جذبات میں سکون پیدا ہوا، ڈاکٹر صاحب کو مستعفی ہونے سے باز رکھا گیا، آئندہ اس انتشار اور بحران کو روکنے کے لئے بڑے غور و فکر کے بعد یہ تجویز کیا گیا کہ ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی صاحب اور ان کے رفقاء کو اجازت دی جائے کہ وہ یوپی میں ایک سیاسی اور انتظامی تنظیم قائم کریں، اور آئندہ اسی کے نام سے انتخابات میں حصہ لیں، یہ مجلس اس وفاق کی اسی طرح رکن رہے گی، جیسے بعض دوسری سیاسی جماعتیں (مسلم لیگ وغیرہ) ہیں، انتخاب میں حصہ لینے پر سب سے زیادہ اعتراض مولانا ابو اللیث صاحب امیر جماعت اسلامی ہند اور انکے رفقاء کو تھا، اس تجویز سے وہ بھی مطمئن ہو گئے، یہ کام میرے سپرد کیا گیا کہ میں ڈاکٹر فریدی صاحب کو اس پر آمادہ کر لوں کہ وہ ایک الگ سیاسی تنظیم قائم کریں، یوپی مجلس مشاورت کی شاخ بدستور رہے، اور اس کو الکشن سے کوئی سروکار نہ ہو، چنانچہ اس پر عمل ہوا، اور ۲ جون ۶۷ء کے جلسہ میں مسلم مجلس یوپی کے قیام کا فیصلہ کیا گیا،

اور وہ مجلس ڈاکٹر فریدی کی صدارت میں ایک الگ سیاسی تنظیم کے طور پر قائم ہوگئی، ڈاکٹر صاحب مجلس مشاورت کے بدستور مرکزی ممبر رہے، اور ڈاکٹر سید محمود صاحب نے اپنی فراخدلی اور بزرگانہ شفقت سے پچھلے واقعات کو نظر انداز کر دیا، اور دونوں گلے مل گئے۔

لیکن ڈاکٹر سید محمود صاحب کی بد دلی مجلس مشاورت سے بڑھتی گئی اب ان میں پہلی سی امنگ اور ولولہ باقی نہیں رہا، اس میں ان کی صحت کے روز افزوں انحطاط اور اضمحلال طبع کو بھی دخل تھا، بالآخر انھوں نے ایک جلسہ میں ہم لوگوں کے عرض و معروض کے باوجود صدارت سے استعفا دیدیا، اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب صدر منتخب ہوئے، ڈاکٹر صاحب بدستور رکن رہے، لیکن نہایت افسردہ اور دل شکستہ۔

ڈاکٹر صاحب کے علاوہ مجلس مشاورت کے بعض بنیادی ارکان جو اس کے بانیوں میں بھی امتیاز کے مالک تھے، کنارہ کش اور مستعفی ہو گئے، اس میں رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جو کسی طرح مجلس کی رکنیت کو بھی برقرار رکھنے پر آمادہ نہیں ہوسکے۔

مؤرخانہ احساس ذمہ داری کا تقاضہ ہے کہ اس تلخ حقیقت کا بھی اظہار کر دیا جائے کہ مجلس مشاورت کی بعض رکن جماعتوں نے مجلس سے فائدہ زیادہ اٹھایا، اس کو فائدہ کم پہونچایا، مثلاً بعض جماعتوں نے اس کی رکنیت اور اس کے وفود اور دوروں سے اس خلیج کو پاٹنے یا اس کا عرض اور عمق کم کرنے کی کوشش کی (اور اس مقصد میں بہت حد تک کامیاب ہوئیں) جو ان کے اور مسلم عوام کے درمیان بعض خاص اسباب اور واقعات کی بناء پر پڑ گئی تھی، بعض جماعتوں نے اس کے ذریعہ سے ان ریاستوں میں اثر و رسوخ پیدا کیا، جہاں پہلے سے ان کا وجود بھی نہ تھا، پھر بعض جماعتوں کے طرز عمل اور طرز فکر نے یہ ثابت کیا کہ اہمیت کے لحاظ سے پہلے "جماعت" ہے پھر ملت، بہرحال مجلس مشاورت کی ترکیب و ترتیب سے قیادت کی وہ معجون تیار نہیں ہوسکی، جس میں مختلف اجزاء باہم گھل مل کر اور ایک دوسرے

میں حل ہو کر اپنا انفرادی مزاج ترک کر کے، ایک نیا اجتماعی مزاج اختیار کر لیتے ہیں، جو اس معجون کا خاص مزاج کہلاتا ہے، اس طرح اس کمزور و مریض ملت کے لئے اجتماعی قیادت کا جو معجون مرکب تیار کیا گیا تھا، وہ ملت کے درد کے لئے دوا نہ بن سکا، اور بالآخر مجلس تعطل کا شکار ہو کر ایک تاریخی داستان بن کر رہ گئی اس کے شرکا، اور قائدین میں سے کوئی بھی تنہا ایسا نہ تھا، جو اس کے ڈھانچہ میں نئی روح پھونکتا، اور اس کو از سرِ نو سرگرم و فعال بنا دیتا، جن لوگوں نے اس کے دوروں میں شرکت کی تھی، اور مسلمانوں کی اس گرمجوشی، اور مسرت و اعتماد کو دیکھا تھا، جس کا انھوں نے اس کے قائدین کے استقبال، اور ان کے جلسوں میں شرکت میں اظہار کیا تھا، ان کے دل پر اس کو یاد کر کے ایک چوٹ سی لگتی ہے، اور خدا و خلق کے سامنے جوابدہی کا اندیشہ ان کو مضطرب و بے چین بنا دیتا ہے۔

اس عرصہ میں میرے نیاز مندانہ تعلقات ڈاکٹر صاحب سے قائم رہے کہ ان کی بنیاد زیادہ گہری اور قدیم تھی، میں کسی ایسی بات کہنے اور کرنے سے احتیاط کرتا تھا جس سے ان کو تکلیف پہونچے لیکن ان کو اس بات کا رنج تھا کہ میں نے ڈاکٹر فریدی کے موقف کی حمایت کی تھی، اور یو، پی میں جو کچھ پیش آیا، اس میں میری اخلاقی تائید شامل تھی، اور میرا نام استعمال کیا گیا، وہ سید صاحبؒ کے تعلق سے مجھے اور نظر سے دیکھتے تھے، اور ان کو بجا طور پر توقع تھی کہ میں ان کا کلی طور پر ساتھ دوں گا، بلکہ ان کے مشن کی تکمیل کروں گا، ان کی اس شکایت میں کچھ غلط فہمی کو بھی دخل تھا، اور کچھ درمیانی لوگوں کی سرگوشیوں کا بھی، میرے پاس متعدد ایسے خطوط آئے جن میں مجلس مشاورت کے بارے میں میرا موقف دریافت کیا گیا، اور یہ پوچھا گیا کہ یہ کہاں تک صحیح ہے کہ مسلم مجلس کے قیام کی ذمہ داری میرے اوپر عائد ہوتی ہے، اور اس کا سہرا میرے سر ہے میں نے ضرورت سمجھی کہ میں ایک مفصل انٹرویو "ندائے ملت" کو دوں جس میں مجلس مشاورت کے قیام کا پس منظر، اس کی مفصل تاریخ، اس کے ساتھ اپنے تعلق اور دلچسپی کی وجہ اور مسلم مجلس کے قیام

کی حقیقت واضح کروں جس نے بہت سی غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں، یہ انٹرویو ۲۱ فروری ۱۹۷۰ء کے "ندائے ملت" کے شمارہ میں شائع ہوا، میں نے اس میں اپنی طرف سے پوری احتیاط ملحوظ رکھی، اور کہیں اعتدال اور توازن کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا، ڈاکٹر صاحب کی مجبوریوں اور مشکلات کے متعلق بھی جو کچھ اظہار خیال کیا گیا، اس میں بھی میرے نزدیک پوری بزرگداشت اور انکی بڑائی اور خلوص کا اعتراف موجود تھا، البتہ اس کا اظہار تھا کہ ہم لوگوں نے ان پر قیادت کا جو بوجھ ڈالا اور ان سے جو توقعات قائم کیں وہ ان کی عمر رسیدگی، ضعف و انحطاط، گوناگوں معذوریوں اور کام کی نزاکت و عظمت کے لحاظ سے زیادہ تھیں، یہ انٹرویو معلوم نہیں کس نے کس انداز میں ان کو پڑھ کر سنایا کہ ان کو یہ محسوس ہوا کہ اس میں ان کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے، اور ان کی اس میں کچھ تنقیص ہے، وہ اس سے سخت آشفتہ خاطر ہوئے، اور انھوں نے اس کے جواب میں ایک طویل مضمون لکھوا دیا، جو پہلے لکھنؤ کے ہفتہ وار "عزائم" ۲۸ مئی ۱۹۷۰ء کے شمارہ میں "روداد چمن" کے عنوان سے شائع ہوا، اس مضمون میں انھوں نے مختلف خیالات و افکار کا اظہار فرمایا، جو ان کے بہت سے نیازمندوں کے لئے بھی نئے تھے، اور ان میں بحث و اختلاف کی بڑی گنجائش تھی، نیز میرے انٹرویو پر بھی اپنی دلی تکلیف اور شکایت کا اظہار کیا، میں نے قصداً اس مضمون کو پڑھنے سے احتیاط برتی، تاکہ میرے دل میں ڈاکٹر صاحب کی طرف سے تکدر نہ آنے پائے، مضمون کے متعلق بھی متضاد روائتیں سنیں، ایک قول یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے خود ہی مضمون ڈکٹیٹ کرایا، اور اس میں انھیں کے افکار ان کے الفاظ میں ادا ہوئے ہیں، دوسری روایت یہ سننے میں آئی کہ انھوں نے کچھ نوٹس لکھوا دیئے، اور کسی نے ان کو پھیلا کر رنگ آمیزی کے ساتھ لکھ دیا، لیکن اس روایت کی تصدیق نہ ہو سکی اور پہلی روایت راجح ہے، اس مضمون کی اشاعت کے تھوڑے ہی دن کے بعد ان کو گر جانے کا وہ حادثہ پیش آیا،

جس میں ان کے کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی، اور وہ ایسے صاحب فراش ہوئے کہ پھر نہ اٹھ سکے، میں اس زمانہ میں جنوبی ہند کے ایک سفر پر تھا، وطن واپس ہوا تو سیلاب کے حادثہ سے دوچار ہوا، میں اس وقت رائے بریلی میں اپنے خاندان کے ساتھ ایک جگہ پناہ گزیں تھا کہ مولوی محمد مسلم صاحب (جن کو ہمیشہ بچھڑوں کو ملانے کا شوق رہتا ہے) کا خط آیا کہ "ڈاکٹر صاحب اسپتال میں بیمار پڑے ہیں، ان کو اپنے "عزائم" والے مضمون کا بڑا قلق ہے، وہ بار بار کہتے ہیں کہ میں نے بڑا گناہ کیا، ہم لوگوں نے ایک دن مشورہ کیا کہ ان کی اس بے چینی اور احساس کو کم کرنے کے لئے آپ کا سلام پہونچائیں، اور آپ کی طرف سے مزاج پرسی کریں، چنانچہ جب ہم نے آپ کا سلام پہونچایا اور آپ کی طرف سے معذرت کرتے ہوئے مزاج پرسی کی تو ڈاکٹر صاحب بہت خوش ہوئے اور ان کو بڑی تسکین ہوئی اب میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ آپ جلد موقع نکال کر دہلی آئیں اور ڈاکٹر صاحب کی خود عیادت کریں" میں اس وقت سفر کرنے سے مجبور تھا کہ سارا خاندان بے سروسامانی کی حالت میں ایک اجنبی جگہ پر مقیم تھا، میں نے ان کو لکھ دیا کہ میں انشاء اللہ موقع ملتے ہی حاضر ہوں گا، آپ مناسب الفاظ میں ڈاکٹر صاحب سے معذرت کر دیں۔

اس عرصہ میں رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب اور عزیز گرامی مولوی عتیق الرحمن صاحب سنبھلی ڈاکٹر صاحب کو دیکھنے گئے، ڈاکٹر صاحب نے ان کی موجودگی میں کئی بار فرمایا کہ مجھ سے بڑا گناہ ہوا، وہ صحت یاب ہونے کے بعد رائے بریلی تشریف لے جانے کی تمنا کا بھی بار بار اظہار فرماتے تھے، ان کی دیرینہ آرزو تھی کہ وہ چند دن حضرت سید صاحب کے وطن میں گزاریں، ایک بار وہ چند گھنٹوں کے لئے وہاں موٹر پر تشریف لائے تھے، اور مسجد میں نماز پڑھی تھی، اور پھر اطمینان سے آنے کے لئے وعدہ فرما گئے تھے، اس بیماری میں وہ بار بار اس خواہش کا اظہار کرتے تھے۔

مجھے بڑی بے چینی تھی کہ کہیں میرے حاضر ہونے سے پہلے وقت موعود آنہ پہونچے اور پھر ساری عمر اس کا قلق رہے کہ میں ڈاکٹر صاحب سے اپنا کہا سنا معاف نہیں کرا سکا، اور وہ بھی مجھ سے اپنا دل صاف نہ کر سکے، لیکن مسلسل سننے میں آتا تھا، کہ ڈاکٹر صاحب کا زیادہ تر وقت بے ہوشی میں گزرتا ہے، اور کسی کسی وقت میں ہوش میں آتے ہیں، مجھے اندیشہ تھا کہ میں جاؤں اور وہ ہوش میں نہ ہوں تو میرا جانا بھی بیکار ہوگا، برادر محترم مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی اور برادر مکرم سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کے ساتھ یہی بات پیش آئی کہ انھوں نے دہلی کا سفر محض ڈاکٹر صاحب کو دیکھنے اور ملنے کے لئے کیا، لیکن جب بھی وہ اسپتال گئے انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو بے ہوش پایا اور باوجود اس کے کہ ان کو دارالمصنفین سے بڑا گہرا تعلق تھا، اگر ان کو ان کی آمد کا ذرا بھی احساس ہوتا تو وہ بہت خوش ہوتے اور دل کھول کر باتیں کرتے لیکن مقدرات سے چارا نہیں۔

بالآخر یہ آرزو پوری ہوئی میں ۱۶ اگست ۱۹۷۷ء کو ان کی خدمت میں پہونچنے میں کامیاب ہوگیا، اس کو روحانی تعلق کی برکت کہئے یا ڈاکٹر صاحب کے درد و خلوص کا کرشمہ کہ جیسے ہی ان کو میری آمد کی اطلاع دی گئی انھوں نے آنکھیں کھولدیں اور مجھے اچھی طرح پہچان لیا، وہ گھڑی بھی عجب گھڑی تھی، اور اس کی یاد عمر بھر پہلو میں چٹکیاں لیتی رہے گی، جب انھوں نے میرا ہاتھ لے کر اپنے سر پر رکھا، آنکھوں سے ملا، پھر دیر تک اپنے دل پر رکھے رہے، وہ دل جو اسلام کی محبت سے ہمیشہ معمور اور مسلمانوں کے مصائب سے ہمیشہ زخمی اور رنجور رہا، وہ بار بار کہتے تھے، میں نے بڑا گناہ کیا، میں ضرور رائے بریلی آؤں گا، میں ان کو تسلی دیتا تھا، اور اپنے تعلق کا اظہار کرتا تھا، اس سلسلہ میں ایک منٹ کے لئے بھی ان کو غفلت نہیں ہوئی، شاید سلسلہ بہت دیر تک جاری رہتا، اور وہ میرا ہاتھ نہ چھوڑتے، لیکن مجھے ان کی تکلیف سے تکلیف تھی، یہ بھی خیال لگا تھا کہ شاید دوا، غذا کا وقت ہو، بالآخر میں نے ہی پیش قدمی کی اور رخصت کی اجازت چاہی اور اس چہرہ پر آخری نگاہ ڈالتا ہوا جو مسلمانوں کی خوشی سے ہشاش بشاش

اوران کی مصیبت سے اداس ہوتا تھا، اور جس پر شرافت خاندان اور شرافت نفس کا نور تھا، رخصت ہوا۔

بالآخر جس وقت کا اندیشہ تھا، وہ ۲۸ ستمبر ۱۷ئہ کی صبح کو پیش آ گیا، اور ڈاکٹر صاحب اس جہان فانی سے اس عالم جاودانی کو رخصت ہوئے جہاں اخلاص و درد کی متاع بڑی قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے، اور جہاں کریم نکتہ نواز، رب غفور و شکور سے واسطہ ہے، نہ کہ زود رنج اور زود فراموش ملت اور ظاہر بیں اور کوتاہ نظر مورخوں سے، ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ایک دور کا خاتمہ اور تاریخ کے ایک باب کی تکمیل ہوگئی، جس کے بغیر ہندوستانی مسلمانوں کی اس صدی کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را
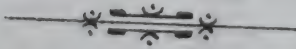
# ڈاکٹر محمد عبد الجلیل فریدی[1]

غالباً ۲۱ یا ۲۲ مئی ۱۹۷۴ء کی تاریخ تھی کہ مدینہ طیبہ میں جہاں اس زمانہ میں میرا قیام تھا، مکہ معظمہ سے عزیز گرامی ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کا ٹیلیفون پر پیغام پہنچا کہ "لکھنؤ سے ڈاکٹر اشتیاق صاحب قریشی نے تار کے ذریعہ اطلاع دی ہے کہ ڈاکٹر فریدی صاحب کا انتقال ہو گیا" ڈاکٹر صاحب کو لکھنؤ میں اس حالت میں چھوڑ کر آیا تھا کہ کسی وقت بھی یہ حادثہ غیر متوقع نہ تھا، لیکن فرط تعلق سے ایسا معلوم ہوا کہ بالکل خلاف توقع پیش آیا، تھوڑی دیر کے لئے دل پکڑ کر رہ گیا۔ ایسا محسوس ہوا کہ کسی عزیز ترین فرد خاندان کا حادثہ پیش آیا۔

فروری ۱۹۷۴ء کے یوپی اسمبلی کے انتخابات میں ڈاکٹر صاحب نے جس جانفشانی سے کام لیا تھا، بلکہ حقیقت میں وہ اپنی جان پر کھیل کر اس میدان میں اترے تھے، اس سے ان کی صحت پر ایسا اثر پڑا تھا کہ ان کے دوستوں کو ہر وقت اس کا دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کسی وقت بھی یہ واقعہ پیش آسکتا ہے،

---

[1] یہ مضمون ہفت روزہ "ندائے ملت" لکھنؤ کے "قائد ملت ڈاکٹر فریدی نمبر" (۱۴ جولائی ۱۹۷۴ء) کے لئے لکھا گیا، خفیف ترمیم و اضافہ کے ساتھ اس مجموعہ میں شامل کیا جاتا ہے۔

ان انتخابات سے کئی سال پہلے سے ان کی حالت یہ تھی کہ دو قدم چلنے میں ان کی سانس پھول جاتی تھی، تیز چلنا یا زینہ پر چڑھنا تو ان کے لئے ممکن ہی نہ تھا، موٹر سے اتر کر چند قدم بھی ان کو چلنا پڑتا تھا تو کچھ دیر دم لے کر وہ بات کرنے کے قابل ہوتے تھے، سالہا سال سے ان کے پھیپھڑوں میں سکڑنے اور پھیلنے کی صلاحیت ختم ہو گئی تھی، اگر کچھ گرد و غبار سانس لینے میں اندر چلا جاتا تھا تو جب تک وہ کچھ دیر ایرکنڈیشنڈ کمرہ میں نہ رہیں، اس کو نکال یا جذب نہیں کر سکتے تھے، اس کے باوجود وہ جن مقاصد کو عزیز سمجھتے تھے، ان کے لئے وہ نتائج سے آنکھیں بند کر کے بے تکلف طویل طویل دورے کرتے تھے، جیپ کا سفر ان کے لئے اس حیثیت سے زیادہ مضر تھا، مگر وہ اس کی پروا نہیں کرتے تھے، اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے ان مقاصد کی راہ میں جان دیدی تو کچھ بے جا نہ ہوگا، اس لئے کہ وہ اپنے مرض کے نتائج اور اس کی ضروری احتیاطوں سے ناواقف نہ تھے، وہ ہندوستان میں امراض صدر کے ماہر ترین ڈاکٹروں میں تھے، اور مشہور ہے کہ ڈاکٹر کی نظر مرض کے بعید ترین اور بدترین نتائج پر ہوتی ہے، اس لئے اگر کہا جائے کہ انھوں نے حضرت آزردہ کے اس شعر پر عمل کیا، اور اس کو حرز جان بنا لیا تھا تو بے جا نہ ہوگا ؎

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں

اک جان کا زیاں ہے، سو ایسا زیاں نہیں

گمان غالب بلکہ یقین ہے کہ یہ شعر انھوں نے کبھی سنا بھی نہ ہوگا، ایسا بہت ہوا ہے کہ بہت سے عمل کرنے والوں کو شعراء کی حکمتوں اور مذہبی پیشواؤں کی ہدایتوں کا علم بھی نہیں ہوتا، اور وہ ان پر بہت سے ان لوگوں سے بھی زیادہ عمل کرتے ہیں، جن کو وہ نوک زبان ہوتی ہیں، اور ہر وقت ان کو ان حکمتوں اور نصیحتوں کو دہراتے اور دوسروں کو تلقین کرتے سنا جاتا ہے، قیس و فرہاد اور معلوم نہیں کتنے عشاق اور نہ جانے کتنی جان کی بازی لگانے والوں کا یہی معاملہ ہے۔

حجاز روانہ ہونے سے پہلے جب آخری بار ان کے مکان پر ملنے اور ان سے رخصت ہونے گیا
تو اندازہ ہوا کہ وہ "قمارِ عشق" کے اس انجام سے بے خبر نہیں، بلکہ اس کے لئے تیار بیٹھے ہیں، اور ایک
مسلمان کی طرح اس سے کچھ زیادہ خائف نہیں، فرمانے لگے کہ مولانا حسرت موہانی کا انتقال
ہونے لگا تو ان کے متعلقین رونے لگے، مولانا حسرت نے آنکھیں کھولیں اور ان کو مخاطب کر کے
بڑے تعجب سے پوچھا کہ "یہ کیا نئی بات ہو رہی ہے جس پر تم لوگ رو رہے ہو، یہ کیا کوئی نیا واقعہ
ہے؟" مولانا حسرت کا انتقال حضرت مولانا عبد الباری فرنگی محلیؒ کے محل سرا واقع فرنگی محل لکھنؤ
میں ہوا تھا، عجب نہیں کہ ڈاکٹر صاحب معالج کی حیثیت سے اس وقت موجود ہوں انھوں نے
اس کو بیان اسی طرح کیا گویا ان کی آنکھوں کے سامنے کا واقعہ ہے، لیکن ہم لوگ سمجھ گئے کہ یہ "حدیث
دیگراں" میں "سرّ دلبراں" ہے، اور ڈاکٹر صاحب ہم لوگوں کو اس خبر کے سننے کے لئے تیار کر رہے ہیں،
ایک عامی آدمی کے لئے جان کی اس طرح بازی لگا دینا اور اپنی صحت سے بے پروا ہو جانا شاید اتنی
بڑی قربانی نہ ہو، لیکن ایک حاذق ڈاکٹر اور تجربہ کار معالج کے لئے ایک مقصد عزیز کے لئے جان دیدینا
اور موت کو دعوت دینا، اگر منہ مانگی شہادت قرار دی جائے تو شاید کچھ خلاف واقعہ بات نہ ہوگی۔

وہ سب لوگ جو ڈاکٹر صاحب سے کسی طرح قریب رہے ہیں اور جن کی آنکھوں پر جماعتی
عصبیت یا سیاسی رقابت کا پردہ پڑا ہوا نہیں ہے، وہ اس کی شہادت دیں گے، کہ ڈاکٹر صاحب
کے سوچنے اور عمل کرنے کے طریقے، ان کی سیاسی سوجھ بوجھ اور ان کی حکمت عملی سے کتنے ہی اختلاف
کی گنجائش ہو اور ان سے کتنی ہی شدید غلطیاں ہوئی ہوں ان کے اندازے کتنے ہی غلط نکلے ہوں اس سے
انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے دل میں مسلمانوں کا سچا درد تھا، اس ملک میں مسلمانوں کے مستقبل کی فکر
ان کی ہر فکر پر غالب آگئی تھی، اس نے ان کے ذاتی مسائل، پیشہ کے لوازم و آداب اپنے کنبے اور خاندان
کے معاشی مستقبل، نیک نامی اور بدنامی، عوام کی پسندیدگی و ناپسندیدگی ہر جذبہ و احساس کو

دبا دیا تھا، میرے محدود علم میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کے بعد (جن سے بقول مخدومی پروفیسر رشید احمد صدیقی ان کو بڑی مماثلت تھی) کسی مسلمان لیڈر نے اپنے پیشہ کی اتنی بڑی قربانی، ملت و ملک کے اجتماعی مسائل کے لئے نہیں دی اور نہ اس طرح بے دریغ اپنا وقت اور اپنا پیسہ اس راہ میں استعمال کیا، جس طرح ڈاکٹر صاحب نے کیا، ورنہ ان گنہگار آنکھوں نے بارہا دیکھا ہے کہ بہت سے سیاسی رہنماؤں کا عمل فارسی کے اس پرانے شعر پر رہا ہے ؎

گر جان طلبی مضائقہ نیست

گر زر طلبی، سخن درین است

اس قربانی کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے، جب آدمی اپنے پیشہ میں کامیاب بھی ہو، اس کو اپنے فن اور مشغلہ سے طبعی ذوق اور دلچسپی بھی ہو، وہ اس کا واحد وسیلۂ معاش اور "قوت مالا یموت" کا ذریعہ بھی ہو، سب جانتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کم سے کم مسلمانوں میں ہندوستان کے گنے چنے ڈاکٹروں میں تھے، امراض صدر کے علاج میں ان کی دھوم مچی ہوئی تھی، ان کو اس فن سے خداداد مناسبت تھی، اللہ نے دست شفا بھی بخشا تھا، وہ اپنے علم و تجربہ میں برابر اضافہ کرتے رہتے تھے، نئے نئے نظریات و تجربات سے واقف ہونے کی برابر کوشش کرتے تھے، اور اس سلسلہ کے جدید لٹریچر کے مطالعہ کے علاوہ وہ وقتاً فوقتاً یورپ، امریکہ کا سفر بھی کرتے تھے، اس کے باوجود وہ ملک و ملت کی خدمت کے لئے کبھی کبھی اس پیشہ سے اس طرح آنکھیں بند کر لیتے تھے، جیسے ان کا اس سے کوئی تعلق ہی نہیں، الیکشن کے زمانہ کے علاوہ جو ایک بحرانی دور ہوتا ہے، وہ مسلم مجلس کے لئے کئی کئی دن کا دورہ کرتے، مسلم مجلس مشاورت کے جلسوں میں شرکت کے لئے دور دور کا سفر کرتے اور کئی کئی دن کا حرج کرتے تھے، اور اکثر اوقات اپنی صحت کو خطرہ میں ڈال لیتے تھے، عرصہ تک انھوں نے مسلم مجلس کا مالی بار اٹھایا اور اس کے کارکنوں کا مالی تکفل کیا، ان کے نزدیک ملت اور اپنی ذات کے درمیان وہ موٹی لکیر

یا گہری خلیج نہ تھی، جو اچھے اچھے ملّی رہنماؤں اور سیاسی لیڈروں کی زندگی میں دیکھنے میں آئی ہے کہ ملت یا ملک کے مصارف اور ضروریات کی ذمہ داری ملت کے ذمہ ہے، اور ان کے مصارف اور ضروریات کی ذمہ داری ان کے سر، ان کی زندگی میں ملت اور ذات اس طرح شیر و شکر ہو گئے تھے کہ دونوں میں تفریق اور دائرہ کی تحدید مشکل تھی، اور یہ اسی وقت ہوتا ہے، جب کوئی تحریک فیشن یا اعزاز کے لئے نہ اختیار کی جائے، بلکہ وہ ذوق اور غذا بن جائے اور ڈاکٹر صاحب کا یہی معاملہ تھا، بلکہ آخر میں ہم لوگ کہنے لگے تھے کہ اب ان کی زندگی اسی ذوق اور غذا کے سہارے قائم ہے، گویا اس ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو اسی ذوق اور مشغلہ سے تیل اور بتی ملتی ہے، اور اس کی روح کو اس سے وہ طاقت حاصل ہوتی ہے، جو ان کے اس زار و نزار جسم کی پشت پناہی کرتی ہے، اور اس کو متحرک رکھتی ہے، اس بات کی وہی لوگ تصدیق کریں گے، جن کو عشق کی مسیحائیوں اور کرشمہ سازیوں کا کچھ علم، یا انسان کی قوت ارادی اور مقصد کے لگن کی بوالعجبیوں کی تاریخ پر کچھ نظر ہے، اور ایسے لوگوں کے وجود سے (خواہ وہ کسی میدان سے تعلق رکھتے ہوں) کوئی زمانہ خالی نہیں ؎

رہروان راخستگی راہ نیست

عشق ہم راہ است ہم خود منزل است

ڈاکٹر صاحب بہت سے کمالات و اوصاف کے حامل تھے، ان کے احباب و رفقائے کار ان کا تذکرہ اور ان خصوصیات کو نمایاں کریں گے، لیکن میں اس مضمون میں جو بہت عجلت اور علالت کی حالت میں لکھوایا جا رہا ہے، اور جس سے اپنے شکستہ اور مغموم و حزین قلب کی تسکین منظور ہے، ان کی وہ نمایاں خصوصیتوں کا ذکر کروں گا، جن میں ڈاکٹر فریدی اگر "فرد فرید" نہیں تو ایک ممتاز و نمایاں مقام پر ضرور فائز تھے۔

۱۔ ڈاکٹر صاحب چونکہ فن طب و معالجات کے میدان کے آدمی تھے، جس کی بنیاد سراسر

واقعیت، تجربہ اور حقیقت پسندی پر ہوتی ہے اس لئے حقیقت پسندی ان کا مزاج بن گئی تھی، وہ اودھ کے ایک شریف خاندان کے فرد تھے ان کی پوری زندگی لکھنؤ کے احول میں گزری جس کی فضا شعر و نغمہ سے ہمیشہ گونجتی رہی ان کے پاس اٹھنے بیٹھنے والے بہت سے ادب و شاعری کا ذوق بھی رکھتے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب مبالغہ اور خیال آرائی و تخیل پسندی سے بہت دور رہے، علوم ریاضی کیمیا اور میڈیسن کا بڑا فائدہ صحیح تحلیل و تجزیہ اور صحیح نتائج تک پہنچنے کی دیانتدارانہ کوشش ہے، ہندوستان اور مسلمانوں کی سیاسیات میں ڈاکٹر صاحب کی یہی بہت بڑی جیت تھی کہ وہ حالات و واقعات کا صحیح تجزیہ کرتے تھے، تخیلات و مفروضات سے حتی الامکان دور رہتے تھے، آنے والے خطرات کو ایک عملی اور حقیقت پسند انسان کی طرح دیکھتے تھے اور ان کے دور کرنے کے لئے فکرمند رہتے تھے۔

میری طرح اکثر ان کے مسلم اور غیر مسلم دوست شہادت دیں گے کہ وہ سچے محب وطن تھے اور جو کچھ کر رہے تھے اس کا فائدہ صرف مسلمانوں کو نہیں، پورے ملک کو پہنچنے والا تھا ہندوستان میں اقلیتوں اور فرقوں، اور بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ دانستہ اور نادانستہ جو ناانصافیاں اور زیادتیاں ہو رہی ہیں، اور یہاں کے اہل اقتدار اور سیاسی رہنما جس کوتاہ نظری، جذباتیت، سطحیت کے شکار ہیں، اس کا نقصان نہ صرف ملت اسلامیہ کو بلکہ ہندوستان کو پہونچ رہا ہے، انھوں نے اس صورت حال کی اصلاح حقائق کو سمجھنے اور طریق انتخاب کو بدلنے، سیاسی مسائل سے نپٹنے اور خاص طور پر مسلمانوں کی شکایات کو دور کرنے، صحیح جمہوریت، سماجی انصاف اور سیاسی شعور پیدا کرنے کے لئے مختلف زمانوں میں جو تجاویز اور خاکے پیش کئے، وہ ان کی اس مزاجی خصوصیت اور خداداد صلاحیت کی دلیل ہیں، جن کی طرف ہم نے اوپر کی سطروں میں اشارہ کیا، یعنی تحلیل و تجزیہ کی صلاحیت، واقعات کے عملی پہلو دیکھنے کی اہمیت، اور حقیقت پسندی۔

مسلمانوں کے مسائل میں، اور خالص مسلمانوں کو خطاب کرنے کے موقع پر بھی ان کی حقیقت پسندی
اور ان کا "ڈاکٹری مزاج" ان پر حاوی رہتا تھا، وہ اپنی تقریروں میں مسلمانوں کو اتنا ہی "ڈوز"
دیتے تھے، جتنی ان کو ایک مریض کی طرح اس وقت ضرورت ہوتی تھی، الفاظ کے بڑے سے بڑے
ذخیرہ کو خرچ کر دینے اور مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنے کے وہ اس طرح قائل نہ تھے، جس طرح
مسلمانوں کی بعض سیاسی جماعتوں کے آتش نوا اور شعلہ بیان مقرر قائل اور عادی ہیں، اس کا تاوان
ان کو اس صورت میں برداشت کرنا پڑا کہ وہ کبھی عوام اور جذباتی لوگوں کے محبوب لیڈر نہ بن سکے،
لیکن ان کو اس کی پروا نہ تھی، ان کا فن ان کا مزاج بن گیا تھا، مسلمانوں کی اس بیماری سے وہ
واقف تھے کہ وہ وقتی جوش اور ہنگامہ کو مسلسل اور مستقل کوشش اور سرگرمی پر ترجیح دیتے ہیں، لیکن
حقیقتاً وہ اپنے فن کا وفادار اور مریض کا ہمدرد ڈاکٹر نہیں، جو مریض کو تسکین دینے اور اس کے
تیمارداروں سے داد حاصل کرنے کے لئے "عطائی" کی سطح پر آنے کے لئے تیار ہو جائے، اور ہر مرض
میں مارفیا کا انجکشن دے کر مریض کو سلا دے، یا وقتی طور پر مطمئن کر دے۔

ان اسباب اور بعض دوسرے اسباب کی بنا پر (جن کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں) ان کی
ذات و کمالات پر بہت سے پردے پڑے رہے، اور عمر کے اس آخری دور میں جب سے انھوں نے
"مسلم مجلس" کی بنیاد ڈالی، ان پر فرقہ پرستی کا گمان بھی کیا گیا (جس کی جھلک شکر ہے کہ ان مضامین میں
بالکل نہیں پائی جاتی جو ان کے انتقال کے بعد مسلم اور غیر مسلم قوم پرور یا فرقہ پرور اخبارات و
رسائل میں شائع ہوئے ہیں) وہ دنیا کے مختلف ممالک کے سیاسی دستوروں اور نظاموں کا ہمیشہ
مطالعہ کرتے رہتے تھے، روس اور امریکہ کے انھوں نے متعدد سفر کئے تھے، ہندوستان کے چوٹی
کے سیاسی رہنماؤں سے ان کے ذاتی تعلقات اور واقفیت تھی، انھوں نے اپنے دماغ کے
دروازوں کو کبھی بند نہیں کیا، مختلف وقتوں میں وہ گوشہ نشین ہو کر یکسوئی کے ساتھ مختلف ممالک کے

سیاسی تجربوں، تحریکات، فلسفوں اور واقعات کے اتار چڑھاؤ کا مطالعہ کرتے تھے، وہ جس طرح دل کے
صاف تھے (اور اس کا ان کے تمام موافق اور مخالف لوگوں کو اعتراف ہے) اسی طرح ان کا دماغ
بھی بہت صاف تھا، ان کا دماغ پیچ وخم اور شاعرانہ وفلسفیانہ باتوں سے بہت کم مناسبت رکھتا
تھا، افسوس ہے کہ کچھ مسلمان ہونے کے قصور میں اور کچھ مسلمانوں کی حمایت کے جرم میں ہندوستان کے
انگریزی وہندی پریس نے ان کے ان سیاسی مشوروں کی اشاعت وتبلیغ میں ہمیشہ بخل سے کام لیا،
اور ان کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی جو وہ مختلف وقتوں میں پیش کرتے رہے، اور جس ملت کا
خود اپنا پریس نہ ہو، وہ اس سزا کی مستحق بھی ہے، اگرچہ ملک کے بہی خواہوں اور سچے محب وطن اخبارات
اور سیاسی جماعتوں کے لئے یہ کسی طرح سزاوار اور جائز نہیں اور اس سے ان کی ذمہ داری ہلکی نہیں ہوتی۔

عرصہ تک اس کا قلق رہے گا، کہ ان کی صلاحیتوں سے ملک کی سیاسیات اور اس کو صحیح رخ
پر لگانے میں فائدہ نہیں اٹھایا جاسکا، عرصہ کی بات ہے، کہ مجھ سے انھوں نے تذکرہ کیا کہ جواہر لال
ان کو مرکز میں لینا چاہتے ہیں، اور ان کے پاس اس طرح کے پیغامات پہنچے ہیں، لیکن ڈاکٹر صاحب
اس کو اپنے مخصوص خیالات اور سیاسی سرگرمیوں کی قیمت سمجھتے تھے، اور وہ اس سودے کے لئے
تیار نہ تھے، وہ جانتے تھے کہ وہ حکومت سے باہر رہ کر ملک کی زیادہ خدمت کرسکتے ہیں، اس لئے
انھوں نے اپنے لئے اسی کا فیصلہ کیا، کم سے کم ان کے صوبہ میں جہاں ان کے اثرات کا اعتراف ان کے
موافقین ومخالفین سب کو ہے، وہ بڑے سے بڑا منصب حاصل کرسکتے تھے، لیکن یہ بات ان کے
مقام سے اتنی فروتر ہے کہ اس کے امکانات کی تردید بھی ان کی عظمت کو کم کرتی ہے، وہ نہ صرف
مسلمانوں بلکہ ملک کے ان معدودے چند رہنماؤں اور خدمت گزاروں میں تھے، جن کے ضمیر کا کوئی
سودا بڑی سے بڑی قیمت ادا کرکے بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، اور اس بارے میں ان پر پورا اعتماد
کیا جاسکتا تھا، کہ وہ سَو بار غلطی کرسکتے ہیں، لیکن ایک بار بھی بک نہیں سکتے، اور اس زمانہ میں جب

بڑے سے بڑے بلند قامت انسان آسانی کے ساتھ اپنے ذاتی مفادات کے لئے پارٹیوں کی تبدیلی اور وفاداریوں کا سودا کر سکتے ہیں، یہ بات کچھ کم اہم نہیں۔

خود مسلمانوں کی سیاسی جماعتوں کے ساتھ بھی ان کا یہی معاملہ تھا کہ وہ ان میں شامل ہو کر قیادت کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام تک پہنچ سکتے تھے، لیکن جن سیاسی جماعتوں کے بعض بنیادی اصولوں یا طریق کار سے ان کو اختلاف تھا، ان میں وہ محض قیادت کا منصب حاصل کرنے کے لئے جانا ہرگز گوارہ نہیں کرتے تھے، اور اس اصول پسندی اور ضمیر سے وفاداری کی ان کو وہ قیمت ادا کرنی پڑی جو ایسے سب اصول پسندوں اور ضمیر کے وفاداروں کو ادا کرنی پڑتی ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ وہ ان مختلف سیاسی جماعتوں کے اتحاد و تعاون کے لئے ہمیشہ کوشاں اور سرگرداں رہے، اور اس کے لئے انھوں نے بعض اوقات بڑی سے بڑی قربانی (اصول و ضمیر کی قربانی کے ماسوا) پیش کرنے سے دریغ نہ کیا، انھوں نے ہمیشہ مصالحت کا ہاتھ بڑھایا، لیکن اس کا کبھی گرم جوشی سے استقبال نہیں کیا گیا، اس سلسلہ میں ان کی سرگرانیوں، فکرمندیوں اور کوششوں کا علم مجھے ذاتی طور پر ہے، اور میں جانتا ہوں کہ وہ اس سلسلہ میں کتنی دور تک جانے کے لئے تیار تھے، افسوس ہے کہ ان کے اس جذبہ کی قدر نہ کی گئی، اور ۱۹۶۷ء کے ریاستی انتخابات میں وہ صورت حال پیش آئی جو نہ مسلمانوں کے لئے مفید تھی، نہ ملک کے لئے، گمان غالب ہے کہ وہ یہ داغ اپنی چھاتی پر لے کر گئے اور اس نے ان کی بیماری کی شدت میں یقیناً اضافہ کیا۔

شاید بہت کم لوگ اس سے واقف ہوں گے کہ وہ اپنی سچی حب الوطنی، روشن خیالی اعلیٰ انگریزی تعلیم اور اس ماحول کے باوجود جو ان کے پیشہ کے لوازم میں سے ہے، نہ صرف صحیح العقیدہ باعمل بلکہ باحمیت مسلمان تھے، میرے سامنے ان کی دینی حمیت اور اسلامی غیرت کے کئی واقعات اور تجربات ہیں، بعض موقعوں پر مجھے خود حیرت ہوئی، کہ انھوں نے بعض اسلامی شعائر کے استخفاف

اور اسلام و مسلمانوں کی توہین کے واقعہ کو سن کر ایسی اسلامی حمیت اور جوش کا اظہار کیا جس کی ان سے بالکل توقع نہ تھی، اور دینداروں اور طبقۂ علماء میں بھی سب لوگ ایسے موقع پر ایسے جذبہ کا اظہار نہیں کرتے۔

یہی اسلامی حمیت ان کو اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے دوسرے کاموں اور مسلمانوں کے ملی اثاثہ کو بچانے کی کوشش کی تحریکوں میں لے گئی، اور وہ ان کے ایک جانباز سپاہی اور پرزور وکیل بن گئے، اسی بناء پر ان کو دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کی تحریک سے دلچسپی تھی، اور وہ اس کے جلسوں میں بڑے اہتمام سے شریک ہوتے تھے، مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز کی کانفرنس اور پھر آخر میں مسلم یونیورسٹی کنونشن دہلی میں بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوئے اور اس کی رہنمائی کی، مسلم یونیورسٹی ایکشن کمیٹی کا ساتھ دیا، مسلم مجلس کے تحت مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں گزشتہ سال ایجی ٹیشن چلایا اور اپنی صحت، بلکہ جان کی پروا کئے بغیر جیل بھی گئے، اور سزا کی مدت پوری کی، اردو زبان کی حفاظت اور اس کو اس کا صحیح مقام دلانے کی کوشش میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہے، اور یہ ان کے بنیادی مطالبوں کا ایک اہم جزء تھا، مسلم پرسنل لا کی حفاظت کی تحریک سے بھی ان کو گہری دلچسپی تھی، دار المصنفین اعظم گڑھ کے بھی وہ بڑے قدردانوں اور خادموں میں تھے، اور اس بناء پر اس کی مجلس انتظامی کے رکن بھی بنا لئے گئے تھے، ندوۃ العلماء کی خدمت میں بھی وہ دامے درمے قدمے شریک اور شہر میں پیش پیش رہتے تھے، یہ سب ان کی دینی حمیت اور اسلامی غیرت کا نتیجہ تھا۔

ان کی جرأت ان کے حلقۂ احباب ہی میں نہیں ان سب لوگوں میں بھی معروف و مسلّم ہے، جو ان سے کچھ بھی واقف تھے، مختلف موقعوں پر ان کی اس جرأت، صاف گوئی و بیباکی کا اظہار ہوا، جس سے معلوم ہوا کہ ان کو اس "آئین جواں مرداں" سے حصۂ وافر ملا ہے، جو بقول اقبال "روباہی و زمانہ سازی" سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔

۱- ان کی دوسری صفت جو ان کے صفات و کمالات کے مرقع میں سب سے زیادہ آب و رنگ رکھتی ہے، اور جو گویا ان کی پوری زندگی پر کار فرما رہی، وہ ان کی جبلی و فطری شرافت ہے، وہ بڑے بامروت، نرم خو و نرم گفتار، دوست پرور، دشمن نواز اور وضعدار انسان تھے، وہ حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکر کی نسل و خاندان میں تھے، اور انھوں نے اپنی پہلی کوٹھی کا جو نظر باغ میں ہے، "گنج شکر" نام رکھا تھا، وہ کوٹھی تو اینٹ پتھر کی بنی ہوئی ہے، مکان کا اعتبار مکین سے ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب سراپا گنج شکر تھے، اقبال نے مرد مومن کی تعریف کی ہے، اور حقیقتاً وہ بہت بڑی تعریف ہے ؎

نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو

ڈاکٹر صاحب پر یہ تعریف بالکل صادق آتی ہے، ان کے پہلے ہی جملہ سے دل شکستہ اور مایوس مریض کو تسکین ہوتی تھی، اور اس کا آدھا مرض ان کی شیریں گفتاری اور تسلی آمیز کلمات سے دور ہو جاتا تھا۔

ان کا یہ انداز مریضوں تک محدود نہ تھا، موافقوں، مخالفوں تک وسیع تھا، ان کی گفتگو میں قند کی حلاوت اور خلوص کی حرارت تھی ان کا دل آئینہ کی طرح صاف تھا، نہ وہ ذاتی کینہ پروری کے مفہوم سے آشنا تھے، نہ سیاسی کینہ پروری سے جو کہیں زیادہ خطرناک ہوتی ہے؛ ان سے ملنے والا محسوس کرتا تھا کہ وہ دل کھول کر ملتے ہیں، اور کم سے کم اس وقت تمام اختلافات اور پچھلے واقعات کو بھول جاتے ہیں، اس طرح ان کے اندر ایک موہنی تھی، جو دلوں کو موہ لیتی تھی، اس نے جہاں ان کے پیشہ کو کامیابی کا ایک اہم عنصر عطا کیا، ان کے اندر محبوب قائد بننے کی صلاحیت بھی پیدا کر دی، لیکن افسوس ہے کہ یہ بو غنچہ کے اندر رہی، اور زیادہ وسیع دائرہ میں پھیلنے نہ پائی، اور اس زمانہ میں ان کے متعلق (باوجود اس کے کہ وہ عمر طبعی کو پہنچے) یہ مصرعہ پڑھنا

بے جانہ ہوگا کہ ؎

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

میں نے ان کو سب سے پہلے ۱۹۴۹ء میں قریب سے دیکھا جب ان کی کوٹھی "گنج شکر" میں میری دعوت پر شہر کا ایک بڑا تبلیغی اجتماع منعقد ہوا جس میں عمائد شہر اور عام مسلمانوں نے شرکت کی، یہ میرا ان کا پہلا سابقہ تھا، اس کے بعد میرا تعلق ان سے صرف ایک مریض (اور اکثر کسی مریض کے رفیق و رہبر) اور ایک نامور معالج اور حاذق طبیب کا رہا، اور ہمیشہ ان کو شفیق اور غمگسار، بے طمع اور مخلص پایا، اصلی تعلق اور قرب اس وقت سے حاصل ہوا جب جولائی ۱۹۶۴ء میں مسلم مجلس مشاورت کی لکھنؤ میں بنیاد پڑی وہ دن اور ان سے رخصت ہونے کا آخری دن اس تعلق، اعتماد و خلوص میں کبھی فرق واقع نہ ہوا، بلکہ وہ یوماً فیوماً بڑھتا رہا، اور آخر میں تو نوبت یہاں تک آگئی تھی کہ میں ان کے اظہار اعتماد و تعلق سے جو نجی مجلسوں سے لے کر بھرے جلسوں تک عام تھا، محجوب و شرمندہ ہو جاتا تھا، وہ بار بار فرماتے تھے، اور یہ بات مطلقاً خلاف واقعہ بھی نہیں کہ وہ میرے کہنے پر ملّی خدمت کے اس میدان میں آئے وہ ہمیشہ سے ملّی خدمت کے میدان میں تھے، اور ان کا دل ملک و ملّت کے لئے درد مند اور ان کا ذہن مسلمانوں اور ہم وطنوں کے لئے فکر مند تھا، لیکن "مسلم مجلس مشاورت" کے آخری دور اور "مسلم مجلس" کے ابتدائی دور میں میں نے یہ سمجھ کر ہمیشہ ان کی ہمت افزائی اور تقویت کی کوشش کی کہ ان کی خصوصیات و صفات کا دوسرا آدمی، بالخصوص اس جرأت و بے غرضی کا دوسرا رہنما مسلمانوں کی اس نسل میں اور خاص طور پر ان چند برسوں میں جب ہندوستان تحریک خلافت کے پروردہ تمام آزمودہ کار سپاہیوں اور رہنماؤں سے خالی ہو گیا ہے نہیں نظر آتا، بارہا انھوں نے اپنی تنہائی، ساتھ دینے والوں کی کمی، پرانے ساتھیوں کے بیٹھ جاتے، اور نئے رفیقوں کے نہ ملنے کا شکوہ کرتے ہوئے کہا کہ اب اجازت دیجئے کہ میں بھی سیاست کا میدان چھوڑ کر اپنے مطب اور

پیشہ میں مصروف ہو جاؤں، ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب خود اس پر عمل کرنے پر قادر نہ تھے، ان کا اور سیاست کا قصہ، بیراک اور ریچھ کا روایتی قصہ تھا، جو کمبل سمجھ کر دریا میں کودا تھا، اور جب اس سے کہا گیا کہ کمبل چھوڑ کر باہر آجاؤ، اس نے کہا کہ اب کمبل مجھے نہیں چھوڑتا، ان کا درد ان کو چین سے بیٹھنے نہ دیتا، جن خطرات اور حقائق کو وہ بچشم سر دیکھ رہے تھے، ان سے وہ اپنی آنکھیں نہیں بند کر سکتے تھے، ان سیکڑوں مریضوں سے زیادہ جو ان کے مطب میں آتے تھے، ان کے نزدیک ملک و ملت مریض تھے، اور ان کا حال یہ تھا کہ ؎

اگر بینم کہ نابینا و چاہ است
اگر خاموش بنشینم گناہ است

اس لئے یہ ان کی اجازت طلبی ان کے دل و دماغ کی آواز نہیں، درد کی ایک کراہ تھی، اور ظاہر ہے کہ میرا یہ منصب کبھی بھی نہیں تھا کہ میں ان کو حکم دوں اور نہ یہ واقعہ تھا کہ ان کی آخری سیاسی سرگرمیاں اور ملّی خدمات میری کسی سیاسی بصیرت یا میرے حکم و اشارہ کا نتیجہ تھی، حاشا و کلّا، وہ خود ایک صاحب فکر، صاحب عزم انسان تھے، لیکن ان کی یہ شرافت نفس، خاکساری، اور سیرت کی بلندی تھی کہ وہ مجھ سے یہ کہتے تھے، اور میری بہت سی معروضات کو شرف قبول بخشتے تھے۔

ابھی تک جو کچھ لکھا گیا، وہ مسلمانوں کے ایک مخلص اور دردمند رہنما ڈاکٹر محمد عبد الجلیل فریدی کے متعلق تھا، ان سے اپنے تعلقات، اور ان کی خصوصی عنایات کا ذکر اس انداز میں ہوا، جیسا کہ سیاسی رہنما اپنے ان نیاز مندوں، یا رفقاء کے ساتھ کیا کرتے ہیں، جن سے خیال و عمل میں اشتراک، یا کسی مقصد کے سلسلہ میں رفاقت ہوتی ہے، لیکن میرے ان کے تعلقات اس سے وسیع تر اور عمیق تر تھے، وہ مجلس مشاورت، یا مسلم مجلس کے دائرے تک محدود نہ تھے، کہتے ہیں کہ محبت کا آئین نرالا ہے، ہم دونوں کی محبت ایک دوسرے کی "افادیت" سے بے نیاز ہو کر ذات سے وابستہ ہو گئی تھی،

عارفین کا قول و تجربہ ہے کہ جو محبت صفات و منافع سے وابستہ ہوتی ہے اس کا کچھ زیادہ اعتبار نہیں کہ صفات و منافع میں زوال و تغیر واقع ہوتا رہتا ہے، اور محبت اس کے مطابق گھٹتی بڑھتی اور قائم و زائل ہوتی رہتی ہے، لیکن جو محبت ذات سے قائم ہوتی ہے اس کو زیادہ خطرہ نہیں، ڈاکٹر صاحب کا معاملہ کچھ ایسا ہی تھا کہ ان کو میری حقیر ذات سے ایک ذاتی لگاؤ، اور خلوص و اعتماد پیدا ہو گیا تھا، کوئی چھوٹا بڑا مسئلہ ہو، میں لکھنؤ میں ہوں، یا اپنے وطن رائے بریلی میں، وہ سیدھے وہیں پہونچ جاتے تھے، اس پر تبادلۂ خیال کرتے، اپنی الجھنیں پیش کرتے، اپنی تنہائی کا شکوہ کرتے، ملت کی بے توجہی، اور بے اعتنائی کی فریاد کرتے، مستقبل کے خطروں، اور وقت کی نزاکت پر اپنے اضطراب و پریشانی کا اظہار کرتے، اور یہ سب کہہ سن کر دل ہلکا کر لیتے، مثل مشہور ہے کہ "ملا کی دوڑ مسجد تک" لیکن ڈاکٹر صاحب کے متعلق یہ کہنا صحیح ہو گا کہ "لیڈر کی دوڑ ملا تک" کیسا ہی موسم سخت ہوتا، رائے بریلی میں میں ایسی جگہ رہتا ہوں جو شہر سے دور جنگل میں ندی کنارے ایک بستی ہے، راستہ خام اور ناہموار، ڈاکٹر صاحب ضیق النفس کے مریض لیکن لکھنؤ سے منہ اندھیرے چلتے اور دن نکلتے ہمارے گاؤں میں پہونچ جاتے، اس وقت کوئی کار آتی نظر آتی تو سب سمجھ جاتے کہ ڈاکٹر فریدی ہیں۔

ان کو میری صحت کی بھی بڑی فکر رہتی تھی، میری زندگی بڑی غیر منظم ہے، اور اس میں سفر بار بار پیش آتے ہیں، ڈاکٹر صاحب ہمیشہ اوقات آرام، کام اور غذا کی باقاعدگی کی ہدایات دیتے، ان کے لئے اصرار کرتے اور بعض اوقات محبانہ اور دوستانہ احتجاج بھی فرماتے، سیتاپور میں جب آنکھوں کے بار بار آپریشن ہو رہے تھے، اور میرا ہفتوں اور مہینوں قیام رہتا تھا، وہ اپنا حرج کر کے بار بار تشریف لاتے، معالج ڈاکٹروں اور سرجنوں سے ملتے، مرض اور علاج کے متعلق معلومات حاصل کرتے، ان کی بار بار آمد اور تعلق خاطر کی وجہ سے قدرتاً مریض کی اہمیت، اور اس کی طرف توجہ میں اضافہ ہوتا، ۱۹۶۹ء کے موسم گرما میں وہ اپنے علاج کے سلسلہ میں ماہرین فن سے مشورہ کرنے کے لئے لندن گئے،

میں اس زمانہ میں حجاز میں تھا، آنکھ کی تکلیف برابر رہتی تھی اور ہندوستان کے علاج سے کلی طور پر فائدہ نہیں ہوا تھا، عرب احباب بالخصوص مخدومی مفتی سید امین الحسینی صاحب مرحوم کے اصرار و تقاضہ سے میں نے انگلستان جاکر وہاں کے سرجنوں کو دکھانا طے کیا، مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب لندن سے روانہ ہونے والے ہیں، جون ۱۹۶۹ء کا وسط تھا کہ میں نے ان کو تار دیا کہ میں آرہا ہوں، آپ میرا انتظار کیجئے، ڈاکٹر صاحب نے سفر ملتوی کردیا، لندن پہونچکر انھوں نے اپنے ایک دوست ڈاکٹر منظر علی خاں بھوپالی کے ذریعہ آنکھوں کے مشہور سرجن اور ماہر امراض چشم (MR. JOHN L... TANELY) سے وقت مقرر کیا، وہ میری قیام گاہ پر تشریف لائے اور وہاں انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے بات کرنے کے لئے یادداشت، اور میرے مرض کی ضروری تفصیلات نوٹ کیں، پھر وہ میرے ساتھ گئے، اور اس کی روشنی میں گفتگو کی، اور آخر تک ساتھ رہے۔

اس زمانہ میں راجہ محمد امیر احمد خاں آف محمود آباد اسلامک سنٹر، بیکر اسٹریٹ لندن کے ناظم اور ڈائرکٹر تھے، وہ ڈاکٹر صاحب کے قدیم دوست تھے، مجھ سے کم، لیکن برادر معظم ڈاکٹر عبدالعلی صاحب مرحوم سے اچھی طرح واقف تھے، راجہ صاحب نے ہم لوگوں کو اسلامک سنٹر میں مدعو کیا، وہ بڑے باذوق تعلیم یافتہ اور شگفتہ مزاج انسان تھے، قسمت سے مولانا جمال میاں صاحب فرزند حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف لائے ہوئے تھے، پھر کیا تھا، شعراء کے منتخب کلام کے دفتر کھل گئے، اور لطائف، ادبی نکات اور بذلہ سنجیوں کا چمن کھل گیا، ڈاکٹر صاحب تو ایک زیر لب تبسم سے اس کی داد یا رسید دیتے، راجہ صاحب اس میں ادیبانہ اور سخن گسترانہ حصہ لیتے، اس وقت لندن کا یہ گوشہ لکھنؤ کا کوئی قدیم محلہ، یا اودھ کے شرفاء کی کوئی بزم ادب معلوم ہوتی۔

عرصہ سے معمول تھا کہ جب میں کسی بیرونی سفر سے واپس آتا، یا کچھ طویل عرصہ کے بعد لکھنؤ

حاضری ہوتی، تو وہ جلد سے جلد ملنے کی کوشش کرتے، اور اپنے کاموں کا حرج کرکے مکان پر، یا مرکز یا دار العلوم میں تشریف لاتے، دیر تک بیٹھتے، اپنی کہتے، میری سنتے، اب اس مرتبہ جون ۱۹۷۴ء میں جب حجاز سے واپسی ہوئی، تو ڈاکٹر صاحب لکھنؤ ہی نہیں، بلکہ اس عالم کے بیت الحزن اور دار المحن کو چھوڑ کر جہاں ناآشنایان صورت شناس سے واسطہ تھا، لکھنؤ کے اس حصہ میں منتقل ہو چکے تھے، جس کا قدیم سے لکھنؤ کے خوش مذاق باشندوں نے "عیش باغ"[۱] نام رکھا ہے، جہاں نہ وفا کا جواب جفا سے ملتا ہے، نہ خدمت کا صلہ حقارت و ذلت، اور بدگمانی و الزام تراشی سے، جہاں رب غفور و شکور سے واسطہ ہے، جو بار بار "إِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ" اور "لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم" اور "مَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ" کا اعلان کرتا ہے، جہاں ان کے ساتھ ہزاروں مریضوں اور ان کے عزیزوں کی دعائیں، اور ٹوٹے ہوئے دلوں (جن کی انھوں نے ہمیشہ ہمدردی اور چارہ سازی کی) کا تشکر و اعتراف نیز ان غریبوں، اپاہجوں، بیواؤں اور مستور الحال شرفا کی جن کی وہ چھپ چھپ کر مدد کرتے تھے، ان کی مغفرت کے لئے خدا کے حضور میں سفارشیں اور دعائیں، ساتھ گئیں، جن کا شمار، بلکہ جن کا علم بھی خدائے علیم و خبیر کے سوا کسی کو نہیں، میں درد نقرس میں مبتلا تھا، دو قدم بھی چلنا مشکل تھا، لیکن ان کی قبر پر حاضری، ان کی محبت و تعلق کا ادنیٰ حق تھا، کسی طرح سے ان دوستوں کی محبت میں جو ان کو بہت عزیز تھے، اور جنھوں نے آخر دم تک ان کا ساتھ دیا[۲]، ان کی قبر پر پہونچا، فاتحہ پڑھی، اور قلب حزین کے ساتھ واپس آیا۔

یہ دو دن چار دن کی کہانی نہیں ڈاکٹر صاحب عمر بھر یاد آتے رہیں گے، محض اپنی اور

---

۱؎ لکھنؤ کا عمومی قبرستان۔

۲؎ محترمی حاجی شفیق الرحمن صاحب ایڈوکیٹ، محبی ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی اور مکرمی ظفر احمد صاحب صدیقی مراد ہیں

اپنے عزیزوں اور دوستوں کی بیماریوں کے موقعوں پر نہیں جن میں اپنے بڑے بھائی صاحب ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب مرحوم کے بعد ان سے زیادہ مخلص، بے غرض اور خیر خواہ معالج ملنا مشکل ہے، بلکہ ملک وملت کی بہت سی بیماریوں اور پریشانیوں کے موقعہ پر جن کا سلسلہ لا متناہی معلوم ہوتا ہے، وہ ہمیشہ یاد آتے رہیں گے، ان کی صفات وکمالات کی یاد ہمیشہ تڑپاتی رہے گی، ان کی وفات سے حلقۂ احباب میں اہل خلوص وکمال کی صف میں، شریف انسانوں کی بزم میں اور ملک وملت کی قیادت کے میدان میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے، اس کا پُر ہونا بظاہر اسباب، اور جس طرح کی تعلیم و تربیت نئی نسل کو مل رہی ہے، اور ملک جس رخ پر جا رہا ہے، پُر ہونا نظر نہیں آتا، اللہ تعالےٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے، اور کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے کہ اچھی زندگی گزاری، اچھی موت پائی، اور اچھا نام چھوڑا ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما
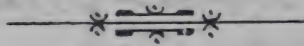
# مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم

میری کتاب "پرانے چراغ" پریس میں تھی، خیال تھا کہ اس کے پریس سے باہر آنے تک ان پرانے چراغوں میں، کسی نئے چراغ کا اضافہ نہ ہوگا جس سے ہماری بزم میں روشنی تھی، اور جن کے گل ہونے پر آنسو بہانے پڑیں گے، لیکن خدا کی ذات بے نیاز ہے، ان چراغوں میں ایک ایسے چراغ کا اضافہ ہوگیا جس کو گھر کا چراغ، بلکہ "گوہر شب چراغ" کہنا بجا ہوگا، اور جو کم سے کم فضلائے ندوہ کی بزم چراغاں میں (مشکل سے ایک دو ہستیوں کو مستثنیٰ کرکے جو عرصہ سے چراغ سحری ہو رہے ہیں) سب سے قدیم تھا، علم و فضل، ادب و انشاء، واقفیت و باخبری، مطالعہ و علمی خدمت اور سب سے بڑھ کر متانت و شرافت، قدیم وضعداری و تہذیب، اور وقار و خودداری کے اس چراغ کے گل ہونے پر اور بزم شبلی و سلیمان کے اس صدر نشین کے اٹھ جانے پر نالہ زن اور فغاں سنج ہونا ہر طرح برمحل ہے، اور جتنا بھی حسرت و افسوس ہو وہ بجا ہے۔

جہاں تک ان سطور کے لکھنے والے کا تعلق ہے، اس کا تعلق تو جانے والے سے چھوٹے بڑے بھائی کا تھا، احباب و واقفین سب جانتے ہیں کہ وہ مجھ پر بڑے بھائی کی سی شفقت

فرماتے تھے، اور میں بھی ان کا اسی طرح ادب کرتا، ان کے حکم کی تعمیل اور ان کے منشا کی تکمیل میں روحانی مسرت محسوس کرتا، اور اس کو اپنے لئے باعث سعادت سمجھتا، جیسے ایک چھوٹا بھائی سمجھتا ہے جب ان سے مراسلت کا شرف حاصل ہوا، ہمیشہ ان کو برادر محترم کے الفاظ سے خطاب کرتا، اور وہ مجھے "عزیز گرامی" لکھتے، گوناگوں روحانی و دبستانی تعلقات، مذاق و خیالات کے اتحاد، ان کی پرکشش ذات، علوئے نسبی، فطری شرافت اور ایک طرح کی معصومانہ طبیعت کی وجہ سے ان سے ایسی محبت اور انس محسوس ہوتا، جو بہت کم معاصرین، رفقاء اور اعزہ سے محسوس ہوتا تھا، ان کے آنے سے خوشی ہوتی، ان کے جانے سے رنج، ان کی مجلس سے اٹھنے کو جی نہ چاہتا، ان کے رہنے سے ایک عجیب طرح کی رونق، اور دلبستگی محسوس ہوتی، دارالمصنفین کے جلسوں میں شرکت، اور اعظم گڑھ کی حاضری میں اصل کشش ان کی ذات اور شوق ملاقات ہی سے پیدا ہوتی، "دل را بدل رہلیست" غالباً ان کا بھی یہی حال تھا، ان کو جو موانست، و دلبستگی مجھ بے ہنر سے تھی، وہ کم ہی لوگوں سے رہی ہوگی، اور آخر میں تو یہ تعلق بہت بڑھ گیا تھا، اس لئے ۱۳ دسمبر ۱۹۷۳ء کو جب اچانک ان کی وفات کی خبر ملی تو بالکل یہ محسوس ہوا کہ ایک بڑے بھائی کا سایہ ایک چھوٹے بھائی کے سر سے اٹھ گیا، اور زندگی میں ایک ایسا خلا محسوس ہونے لگا، جس کا پر ہونا بظاہر ممکن نہیں ہوتا، اس کو کچھ وہی لوگ سمجھیں گے جنھوں نے قلم کو صرف فریضہ یا وظیفہ کی ادائگی ہی کے لئے حرکت نہیں دی، بلکہ اس سے اپنا اور اپنے دوستوں اور بزرگوں کا دل خوش کرنا بھی پیش نظر رہا ہے، کہ مضمون لکھنے یا تصنیف کرنے کے دوران میں بے اختیار ان دوستوں اور بزرگوں کا تصور سامنے آجاتا ہے، اور وہ سامنے کھڑے نظر آجاتے ہیں، جو مضمون نگار کی خوشی سے خوش ہونے والے، اس کی سچی قدر کرنے والے، اور مضمون کے صحیح نقاد اور جوہری ہوتے ہیں، یہاں مضمون نگاری کی سرحدیں شاعری سے مل جاتی ہیں، اور یہ مضمون نگاری کا کوئی عیب اور

مضمون نگار کا کوئی گناہ نہیں، جس سے وہ اپنی برارت ظاہر کرے، فطرت انسانی ہے، اور فطرت انسانی پر کوئی پہرہ نہیں بٹھایا جاسکتا، غالب کو غزل لکھتے وقت، نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے تصور، اور ان کی رائے اور تاثر کے اشتیاق و انتظار سے روکا نہیں جاسکتا تھا، غالب کو ان کی داد و تحسین سے جو تقویت و اطمینان حاصل ہوتا تھا، اور ان کو اس پر جتنا ناز تھا، اس کا اندازہ ان کے اس شعر سے ہوتا ہے ؎

غالب بہ فن گفتگو نازد بایں زور ش کہ او
ننوشت در دیواں، غزل تا مصطفےٰ خاں خوش نہ کرد

شاہ صاحب اگرچہ ہندوستان کے مستند و معتمد مصنفین میں تھے، ان کی تحریر و تصنیف کی عمر میری موجودہ عمر سے کچھ ہی کم رہی ہوگی، ہندوستان کی سب سے موقر علمی مجلس (دار المصنفین) کے وہ صدر نشین، اور موجودہ اسلامی ہند کے سب سے بڑے مصنف (مولانا سید سلیمان ندویؒ) کے جانشین تھے، وہ زبان و ادب، الفاظ و محاورات کے استعمال اور زبان کی صحت و سقم کے بارے میں سند کا درجہ رکھتے تھے، اور اب تھوڑے ہی لوگ زبان کی نوک پلک اور اس کے مزاج سے اتنے واقف ہوں گے، جتنے وہ تھے، انھوں نے اودھ کی معیاری مجلسوں، لکھنؤ کی علمی ادبی صحبتوں اور اساتذۂ فن اور اساطین علم کی آغوش میں آنکھیں کھولی تھیں، اور تربیت پائی تھی، ہندوستان کی نہایت باوقار سرکاری اور غیر سرکاری مجلسوں، کمیٹیوں اور اکیڈمیوں کے ممبر تھے، "معارف" جیسے رسالہ کے مدیر اور کئی مقبول کتابوں کے مصنف تھے، اس سب کے نتیجہ میں اگر ان میں علم کا پندار اور احساس برتری پیدا ہوجاتا، تو محل تعجب نہ ہوتا، اس کا تقاضا تھا کہ وہ ضروری موقعوں پر بھی اپنے تاثرات کو چھپاتے، اور چھوٹوں کی تو داد و تحسین میں بہت زیادہ محتاط رہتے، لیکن ان کی طبعی شرافت، محبت کے فطری عنصر، اور تواضع و سادگی جو ان کی جبلت بن گئی تھی، ان کو اس سے

بازرکھتی، اور وہ اپنے خوردسال ونیاز مند معاصرین اور اہل قلم کو دل کھول کر داد دیتے، ان کی یہ تحریریں ان کی شرافت نفس کا آئینہ ہیں، اور اس کے بغیر ان کی سیرت اور اصل جوہر کا سمجھنا مشکل ہے، یہاں پر بہت ڈرتے ڈرتے ان کے خطوط کے دو اقتباسات پیش کرنے کی جرأت کی جاتی ہے، افسوس ہے کہ اس وقت وہی خطوط سامنے ہیں، جو انھوں نے اپنے اس نیاز مند کو لکھے ہیں، میرے نزدیک (اگر نفس فریب نہ دے رہا ہو) تو یہ مکتوب الیہ کی اہمیت سے زیادہ، مکتوب نگار کی عظمت کی دلیل ہے، اس سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ضمیر وخمیر میں محبت وشرافت کا کیسا جوہر اور اس خاکستر میں کیسی آگ دبی ہوئی تھی، میری کتاب "تذکرہ فضل رحمٰن" جب شائع ہوئی تو میں نے ان کو بھی بھیجی، کتاب پڑھ کر جو انھوں نے خط لکھا، اس کا ایک اقتباس پیش ہے:-

"مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ پڑھا، اس میں کچھ ایسی لذت ملی کہ ایک ہی نشست میں پوری کتاب ختم کردی، اور ابھی مستقل مطالعہ جاری ہے، تصنیفی حیثیت سے آپ کی دوسری کتابیں کہیں اس سے بہتر ہیں، لیکن خدا جانے ان سادہ واقعات اور سادہ تحریر میں کیا تاثیر ہے کہ دل کو جو کیف وسرور اس میں حاصل ہوا، وہ بڑی بڑی کتابوں میں نہیں ملتا، بعض بعض مقامات پر خصوصاً مولانا کی زبان فیض ترجمان کے برمحل اشعار پڑھ کر تو وجد کی کیفیت پیدا ہوگئی، اور آنکھیں پرنم ہوگئیں، یہ صاحب تذکرہ کی روحانیت اور آپ کے قلم دونوں کا فیض ہے، جس نے اس کو شراب دوآتشہ بنا دیا، مدتوں کے بعد دل کو ایسی لذت وحلاوت ملی، اور آپ کے لئے دل سے دعا نکلی ؎

کرم کردی الٰہی زندہ باش

میں لاکھ بے عمل سہی لیکن الحمدللہ بے عقیدہ نہیں، دل میں ایمان کی چنگاری موجود ہے،

جب کوئی شعاع پڑتی ہے تو اس میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے، میری طبیعت کو فطرتاً
جمال و عشق و محبت سے زیادہ مناسبت ہے، اس لئے خشک کتابوں کا زیادہ اثر
نہیں ہوتا، مگر جب عشق و محبت اور کیف و مستی کا کوئی نغمہ کانوں میں پڑتا ہے، تو
دل کی کیفیت بدل جاتی ہے، اللہ تعالےٰ اس کو مستقل فرما دے، سعدیؒ کو تو
چالیس ہی سال کی عمر میں طفلی کا شکوہ تھا، اور یہاں پچپن سال کی عمر ہو گئی، اور
اب تک وہی حال ہے، اور محض اللہ کا رحم و کرم اور اس کی رحمت و مغفرت پر
بھروسہ ہے، آخر رحمت و مغفرت کی بشارتیں ہم ہی جیسے گنہگاروں کے لئے
ہیں، "کہ مستحق کرامت گنہگاراں اند" آپ میرے اصلاح حال کی دعا فرمایا کیجئے"۔

معین الدین

۱۰ر نومبر ۱۹۵۸ء

راقم سطور نے دینی تعلیمی کونسل کے ایک جلسہ میں جس میں گورکھپور کے خواص، اعیان شہر
اور معززین موجود تھے، ایک تقریر کی تھی، جس میں مسلمانوں کے سربرآوردہ حضرات، اہل ثروت اور
صاحبان وجاہت کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلائی گئی تھیں، اور بتایا گیا تھا کہ "خواص" کا صحیح
اسلامی اور قرآنی مفہوم کیا ہے؟ ان سے دین و ملت کی کیا توقعات وابستہ ہیں، انھوں نے
تاریخ کے مختلف دوروں میں اپنی اس حیثیت اور اثرات کا استعمال کس طرح کیا، اور ملت کو
کیسے خطروں سے بچالیا، مجھے نہ اس تقریر کے کرنے کے وقت اس کا احساس تھا اور نہ اس کے
تحریری شکل میں شائع ہونے کے بعد کہ شاہ صاحب جیسے اہل نظر، اہل ذوق اس کو غیر معمولی
اہمیت دیں گے، لیکن ۶ر جنوری ۱۹۷۳ء کو انھوں نے راقم کو خط لکھ کر اس کی ایسی داد دی جس سے
اس تقریر کی قدر و قیمت خود مقرر کی نظر میں پیدا ہوئی، یہاں اس خط کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے

جس سے نہ صرف ان کی شرافت و بے نفسی کا اندازہ ہوتا ہے، بلکہ ان کی اسلامی حمیت اور درد کا بھی پتہ چلتا ہے، جو ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا:۔

"مجھے نہ صرف آپ سے ملاقات بلکہ ان لبوں اور ہاتھوں کے استلام کا اشتیاق ہے، جن سے خواص کو خطاب کیا گیا ہے، یہ تقریر تو دیوبندؒ کی تقریر سے بھی بڑھ گئی اور تاریخ میں زندہ رہنے کے قابل ہے کس خوبصورتی سے کیسے کیسے حقائق ظاہر کئے گئے، اس کو پڑھنے کے بعد ہی سے آپ کو خط لکھنے کا تقاضا تھا، جو پورا نہ ہو سکا، اگر آپ ہندوستان میں ہوتے تو اسی وقت لکھتا۔"

شاہ صاحب کا تذکرہ شروع کرتے ہی بے اختیار اس خلا کا ذکر زبان قلم پر آ گیا، جو ان کی وفات نے کم سے کم راقم سطور کی علمی و ادبی زندگی میں پیدا کر دیا ہے، یہ حادثہ یا المیہ ہمیشہ سے ان لوگوں کو پیش آیا ہے، جن کے نقوش قلم کو دلچسپی و محبت سے پڑھنے والے اور اگر وہ عمر میں چھوٹے اور علم و فضل میں کم رتبہ ہیں، یا علم و تصنیف کی بساط کے تازہ واردوں میں ہیں، تو ان کو شاباش دینے والے، اور ان کا دل بڑھانے والے دنیا سے اٹھتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ان لکھنے والوں کو اپنی تقریر و تحریر بے سامع کی غزل، یا کسی ایسی زبان میں حرف مطلب ادا کرنے کے مرادف معلوم ہونے لگتی ہے، جس کا کوئی سمجھنے والا نہ ہو، اور عرفی کی زبان میں کہنا پڑتا ہے کہ؎

مدار صحبت ما بر حدیث زیر لبی است
کہ اہل بزم عوام اند و گفتگو عربی است

شاہ صاحب ردولی ضلع بارہ بنکی کے اس نامور و بلند مرتبہ فاروقی خاندان کے

---

لے ایک تقریر جو کچھ عرصہ پہلے دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کے سامنے کی گئی تھی، اور جو "عصر جدید کا چیلنج اور اس کا جواب" کے عنوان سے "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنو" سے شائع ہو گئی۔

چشم و چراغ تھے، جنہوں نے دورِ آخر میں حضرت مخدوم شیخ احمد عبد الحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت سے عزت و شہرت حاصل کی، مخدوم صاحب نویں صدی ہجری کے اکابر اولیاء اللہ اور شیوخ طریقت میں سے تھے، مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ "بعض اہل نظر کا خیال ہے کہ وہ اس صدی کے مجدد تھے۔" اور اس میں تو شبہ نہیں کہ سلسلۂ چشتیہ صابریہ کو ان کی ذات سے نئی زندگی، اور فروغ ملا، اس شاخ پر ثمر میں ان سے بلند پایہ شیخ اور عارف و محقق نظر نہیں آتا، افسوس ہے کہ بیشتر اولیائے متقدمین، اور شیوخ طریقت کی طرح ان کے حالات و ملفوظات کو قلمبند کرنے کا اہتمام نہیں کیا گیا، اور جب اس کا ارادہ کیا گیا تھا اتنا زمانہ گزر چکا تھا کہ سوائے مشہور کرامات اور چند خاندانی روایات کے کوئی مواد نہیں مل سکا، انھیں کے سلسلہ کے مشہور شیخ طریقت حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ نے جن کو دو واسطوں سے مخدوم صاحب سے اجازت و خلافت حاصل ہے، ان کے حالات و ملفوظات جمع کرنے کی کوشش کی (جس کے اردو ترجمہ کی سعادت شاہ صاحب کے حصہ میں آئی) لیکن اس میں بھی وہ تفصیلات و جزئیات نہیں ملتیں، جن سے ان کی شخصیت و مقام کا پورا اندازہ کیا جا سکے، لیکن بعض بزرگوں کا کوئی واقعہ اور ان کی زبان سے نکلا ہوا، کوئی جملہ کتابوں میں ایسا نقل ہو گیا ہے، جو ان کی شخصیت و مرتبہ پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہے، میرے نزدیک حضرت مخدوم صاحب کا فرمایا ہوا یہ جملہ ان کے فضائل و مناقب کے پورے دفتر کی قائم مقامی کرتا ہے، اور حقیقتاً دریا کو کوزہ میں بند کر دیا گیا ہے، انھوں نے فرمایا کہ "منصور بچہ تھا جو اس کی زبان سے "انا الحق" نکل گیا، یہاں اللہ کے ایسے بندے ہیں، جو سمندر کے سمندر پی چکے ہیں اور ڈکار نہیں لیتے" یہ جملہ تنہا ان کی زندگی کے اصل جوہر اور ان کے مقام کی بلندی کو واضح کرتا ہے، یعنی عالی ظرفی،

تحمل واستقامت اور دریا سے گزر جانا اور دامن کو تر نہ ہونے دینا۔

شاہ صاحب نے اپنے اس خط میں "جو تذکرہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ پڑھ کر لکھا گیا تھا، جمال و عشق و محبت سے اپنی فطری مناسبت کا جو تذکرہ کیا اور لکھا کہ 'عشق و محبت اور کیف و مستی کا کوئی نغمہ کانوں میں پڑتا ہے تو دل کی کیفیت بدل جاتی ہے' یہ اسی نسب و نسبت کا فیض اور اسی آتشکدۂ عشق کی چنگاری تھی، جس کو باد مخالف، اور علم و عقل کے چھینٹے بھی بجھا نہ سکے، اس خاندان میں شاہ صاحب کے بچپن اور جوانی تک اس دبی ہوئی چنگاری کو ابھارنے اور فروزاں کرنے کا سامان موجود تھا، دیے سے دیا جلتا چلا آرہا تھا سماع کی محفلیں گرم ہوتی تھیں، اگرچہ شاہ صاحب اپنی تعلیم و مطالعہ کے نتیجہ میں، بعد میں ان سے وہ دلچسپی نہیں لے سکتے تھے، جو خانقاہوں اور سماع خانوں کا شعار ہے، لیکن ان محفلوں کا اثر ان کی طبیعت میں آخر آخر تک رہا، انھوں نے کئی بار فرمایا کہ اچھے اشعار سے لطف لینے کی صلاحیت، منتخب اور اثر انگیز اشعار کا یاد رہ جانا اور فارسی و اردو کلام کا پاکیزہ ذوق سماع کی انھیں محفلوں کا فیض ہے، خود مجھے بھی جب ردولی میں ایک دو بار ایسی محفل میں شرکت کا اتفاق ہوا، جس میں مخدومی شاہ آفاق احمد صاحب سجادہ نشین خانقاہ حضرت مخدوم صاحب تشریف رکھتے تھے، اور ان دونوں حضرات سے اساتذہ فارسی و اردو کے منتخب ترین اشعار اور تیر و نشتر سننے میں آئے تو اس کا اندازہ ہوا کہ یہ بات ذوق آفرینی اور ادب آموزی کی حد تک بالکل صحیح ہے، ندوہ کی تعلیم، دارالمصنفین کے قیام اور حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نیز بزرگان دیوبند کی تصنیفات و تحقیقات کے مطالعہ نے ان کی طبیعت میں اعتدال اور اصلاحی ذوق پیدا کر دیا تھا، اور اسی کے نتیجہ میں انھوں نے اپنے خاندانی تعلقات اور اعتماد سے کام لے کر بعض ایسے رسم و رواج کی اصلاح کی خدمت بھی انجام دی تھی، جو صدیوں سے

چلے آرہے تھے، اس میں جہاں ان کا جذبۂ اصلاح قابل تعریف ہے، مخدومی شاہ آفاق احمد صاحب بھی قابل صد تحسین و آفریں ہیں، کہ انھوں نے اپنے دور سجادگی میں بعض ایسے معمولات و رسوم کی اصلاح فرمائی، جن کی طرف اس سے پہلے کسی کا خیال نہیں گیا تھا۔

شاہ صاحب کے نانا شاہ شرف الدین، شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے، شاہ صاحب نے، مکہ معظمہ میں ان کی بیعت کا واقعہ اور حضرت حاجی صاحب کا ان کے ساتھ خصوصی معاملہ کئی مرتبہ مزہ لے لے کر سنایا، شاہ صاحب کی تعلیم و تربیت میں ان کا بڑا حصہ تھا، فرنگی محل کے خاندان کے حضرت مخدوم صاحب کے خاندان سے تقریباً ساڑھے تین سو (۳۵۰) سال کے تعلقات تھے، بانی درس نظامی استاذ الہند ملا نظام الدین فرنگی محلی، حضرت سید عبدالرزاق بانسوی رحمۃ اللہ علیہ سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت تھے، اور ان کے تعلق سے ان کے تینوں بھائی بھی، سید صاحب کے دست گرفتہ اور وابستۂ دامن تھے، لیکن ملا نظام الدین کے والد، ملا قطب الدین شہید سہالوی مخدوم صاحب کے سلسلہ میں قاضی گھاسی بن داؤد الہ آبادی سے بیعت تھے، اس وقت سے فرنگی محل کے علماء مخدوم صاحب سے نسب و نسبت کا تعلق رکھنے والوں کے ساتھ پیرزادوں، اور صاحبزادوں کا سا معاملہ کرتے ہیں، شاہ صاحب نے کئی مرتبہ سنایا کہ فرنگی محل کے علماء و مشائخ نے ان کو نذر پیش کی، ایک مرتبہ قطب میاں (مولانا قطب الدین عبدالوالی) نے جو حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے برادرزادہ اور جانشین تھے، ملاقات پر نذر پیش کی، شاہ صاحب نے عذر کیا کہ ان کا یہ معمول نہیں، اور وہ اپنے کو اس کا مستحق نہیں سمجھتے، قطب میاں نے فرمایا کہ یہ تو ہمارا حق ہے، اور آپ کو لینا پڑے گا۔

اسی روحانی و علمی تعلق کی بنا پر شاہ صاحب کی تعلیم فرنگی محل میں شروع ہوئی، یہ حضرت

مولانا عبدالباری فرنگی محلی کا زمانہ تھا، یہ مجھے معلوم نہیں کہ انھوں نے کتنے سال فرنگی محل میں تعلیم پائی، غالباً متوسطات تک انھوں نے پڑھا ہوگا کہ خاندان کے بزرگوں نے ان کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل کر دیا، اور وہیں انھوں نے تعلیم کی تکمیل کی تعلیم کے دوران ہی ان کی تحریری و علمی صلاحیت نمایاں ہوگئی تھی، اسی بنا پر مولانا سید سلیمان ندویؒ کی نظر انتخاب ان پر پڑی، اور فراغت کے بعد ہی وہ دارالمصنفین منتقل ہوگئے، اور کہنا چاہیئے کہ ایسے گئے کہ وہاں سے مر کر ہی نکلے "آستانۂ شیخ" پر ان کے خاندان کے شیوخ، اور ان کے خاندان کے مسترشدین کا بیٹھنا، تاریخ میں بار بار نقل کیا جاتا ہے، لیکن مشیخت و مخدومیت کی مسند چھوڑ کر آستانۂ علم و تصنیف پر بیٹھنا ان کے حصہ میں آیا، اور انھوں نے اس "جانشینی" اور علمی و تصنیفی عزلت گزینی کا وہ حق ادا کیا، جس نے مشائخ پیشیں کے ترک و تجرید، زہد و تبتل اور انقطاع و یکسوئی کی یاد تازہ کر دی، دارالمصنفین سے تعلق پیدا ہونے کے بعد انھوں نے کسی اور "آستانہ" کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا، ان کی رفیقۂ حیات کا انتقال ان کے عالم شباب ہی میں ہو چکا تھا، (جن کی صرف دو یادگاریں میاں ودود احمد سلمہٗ اور اہلیہ چودھری محمد اویس صاحب ردولوی ہیں) اس کے بعد سے انھوں نے مسلسل چھبیس سال کے قریب تجرد کی زندگی بسر کی، کسی بڑی سے بڑی ملازمت اور عہدہ و منصب کی طرف انھوں نے کبھی نظر نہ اٹھائی، وہ متعدد کمیٹیوں کے ممبر تھے، اور اکسپرٹ کی حیثیت سے مسلم یونیورسٹی میں انتخاب کے موقع پر بلائے جاتے تھے، ان کے لئے کسی بڑی سے بڑی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو، یا شعبۂ اسلامیات میں اونچی سے اونچی جگہ حاصل کرنا نہ صرف آسان، بلکہ اس دانشگاہ کے لئے سرمایۂ افتخار تھا، لیکن انھوں نے ان چیزوں کو کبھی درخور اعتنا نہ سمجھا، ان کو جو علمی اعزاز (AWARD) صدر جمہوریہ کی طرف سے ملا، وہ بھی بے طلب اور بے منت تھا، اور انھوں نے

کبھی اس کو اہمیت نہیں دی، اس طرح وہ دارالمصنفین کشتیاں جلا کر آئے اور اپنی پوری زندگی اور صلاحیتیں اس کے نذر کر دیں، کسی اور منصب وجاہ کا سوچنا تو درکنار، انھوں نے کبھی اپنے مشاہرہ میں اضافہ کی خواہش و کوشش نہ کی بلکہ اکثر ارکان کمیٹی کی سفارش کے باوجود اس کے لینے سے معذرت کی، اور کہا کہ جو کچھ ملتا ہے، وہ میرے لئے کافی ہے، وہ آخری دن تک شبلی منزل کے اسی کمرہ میں رہے، جو ان کو بحیثیت رفیق کے ملا تھا، وہ رفیق سے دارالمصنفین کے ناظم اعلیٰ اور مختار کل ہوئے، لیکن انھوں نے اپنا وہ طالب علمانہ کمرہ نہ چھوڑا، اور اس مکان میں بھی منتقل نہ ہوئے، جو مولانا مسعود علی صاحب کی وفات کے بعد خالی ہو گیا تھا، اور برسوں خالی رہا، میاں وددواحمد سلمہ، سالہا سال سے ان سے جدا اور پاکستان میں مقیم تھے، لیکن بہت کم لوگوں نے ان کو ان کی یاد میں بے قرار اور ملاقات کے لئے کوشاں پایا، انھوں نے کوئی جائداد بنائی نہ سرمایہ جمع کیا، نہ آبائی مکان کی بود و باش میں تھا، فکر کی، وہ وہاں بھی مہمان کی طرح جاتے اور چلے آتے، ان کا اصل نشیمن اور ان کے ذوق و روح کا مسکن دارالمصنفین ہی تھا، اس طرح ان میں فقر و استغنا کی وہ شان تھی، جو ان کے آبائے کرام کا شیوہ تھا، خانقاہوں کے ماحول میں تو اس ادا کا قائم رکھنا اتنا مشکل نہیں، لیکن علمی و ادبی ماحول میں، اور اس پر آشوب مادیت زدہ دور میں خودداری کی اس آن اور فقر و درویشی کی اس شان کو قائم رکھنا بڑے جگر گردے والوں کا کام ہے۔

سب سے زیادہ صبر آزما، حوصلہ شکن اور کٹھن گھڑی وہ تھی، جب سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دارالمصنفین کو خیرباد کہا، اور پاکستان منتقل ہو گئے، ہندوستان کے سر پر سے تقسیم ملک کی جو ہوئے خون گزر گئی تھی، تصنیفی و تحقیقی اداروں کے لئے جن کی بنیاد اسلام کے خزانۂ عامرہ کی حفاظت و اشاعت پر تھی، اور جن کا خمیر سیرت نبوی اور تاریخ اسلام سے

اٹھایا گیا تھا، زندگی کا میدان تنگ، اور مستقبل تاریک سے تاریک تر نظر آ رہا تھا، سیاسی اور اقتصادی انقلاب نے علمی ذوق، اسلامی کتابوں کی اشاعت اور تحقیقی کام کو "بے وقت کی شہنائی" قرار دیدیا تھا، مسلمانوں کا جذبۂ اعانت و ایثار مفلوج سا ہوگیا تھا، علمی و دینی اور خصوصیت کے ساتھ بلند پایہ تحقیقی کتابوں کی خریداری، اور ایسے اداروں کی سرپرستی کا جذبہ سرد، بلکہ مردہ ہوتا جا رہا تھا، دارالمصنفین کی کتابوں کے دو بڑے مارکٹ اور اس کے قدردانوں کے دو اہم و فعّال حلقے تھے، پنجاب اور حیدرآباد، ایک اس ملک سے کٹ چکا تھا، دوسرا انقلاب و حوادث کا شکار تھا، ایسی حالت میں انھوں نے دارالمصنفین کی بظاہر ڈوبتی ہوئی کشتی سے اپنی قسمت اور اپنی سب صلاحیتیں وابستہ کر دیں، اور ایک قلندر صفت درویش اور ایک سرپھرے ملاح کی طرح بے رحم دریا کے بہاؤ کے خلاف اس کو چلانے اور ساحلِ مراد تک پہنچانے کا عزم کر لیا، مولانا مسعود علی صاحب ندویؒ جن کو دارالمصنفین کا حقیقی معمار کہنا چاہیئے، اور جن کی ہمتِ مردانہ اور خداداد انتظامی صلاحیتوں نے اس ادارہ کو مستحکم بنایا تھا، اب جسمانی انحطاط اور دماغی اضمحلال کے دور سے گزر رہے تھے، یہاں تک کہ وہ وقت آگیا کہ اب ان کی حیثیت ایک تبرک اور یادگار کی سی رہ گئی، شاہ صاحب کے رفیق کار اور دست راست سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ایم، اے، اگرچہ اپنے تحقیقی مقالوں اور بعض مقبول تصنیفات کی بنا پر ملک میں روشناس، اور عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، اور خدا نے ان کو ایسی انتظامی صلاحیت اور جد و جہد کی قوت عطا فرمائی تھی جس سے وہ شاہ صاحب کے خلوص، علم اور کمالات کی تکمیل کرتے تھے، اور دارالمصنفین کے انتظامی و مالی صیغے کو سنبھالے ہوئے تھے، لیکن جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے کہ دارالمصنفین کا خمیر سیرت و تاریخ اسلام

اور جدید علم کلام سے اٹھایا گیا تھا، اس بنا پر اس ادارہ کا اعتبار و آبرو شاہ صاحب ہی کی ذات سے قائم تھی،
انھوں نے نہ صرف اسلاف کی یہ شمع روشن رکھی، اور ادارہ اور اس کے ترجمان "معارف" کا معیار گرنے
نہ دیا، بلکہ ادارہ کی توسیع و ترقی کے کئی نئے کام کئے، انھیں کے عہد نظامت (جنوری ۱۹۶۵ء) میں دار المصنفین
کی وہ پنجاہ سالہ جبلی منائی گئی، جس کی صدارت کے لئے نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اعظم گڑھ
آئے، اور انھوں نے وہ مقالہ پڑھا جو ان کی ادبی و فکری صلاحیتوں کا بہترین آئینہ دار ہے، اور جس میں
انھوں نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ دار المصنفین کے بانیوں اور رفقاء کی خدمات کو سراہا، اس کے
مقاصد کی بلندی اور اس کے موجودہ کارکنوں کی قربانی، بے لوثی اور عالی ہمتی کی داد دی، دار المصنفین
کا یہ جشن سیمیں جس میں ہر طبقہ کے چیدہ اور برگزیدہ فضلاء اور زعماء شامل تھے، دار المصنفین کی تاریخ میں ایک
سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، شاہ صاحب کا خطبۂ استقبالیہ یا خیر مقدمی مقالہ اپنی سلاست و حلاوت
کے ساتھ جو شاہ صاحب کے قلم کا جوہر ہے، خودداری، وقار اور بلندی کی ایک خاص شان لئے ہوئے تھا۔

دار المصنفین کے جشن سیمیں کے علاوہ بمبئی کا سفر اور وہاں دار المصنفین کے تعارف کا کام،
علمی مجالس کا انعقاد، جس میں شاہ صاحب عین وقت پر اپنی بیماری کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکے تھے،
نیز اس ادارہ کی توسیع و ترقی کے لئے، دوسری کوششیں، ملک کے بعض اعیان و معززین کی آمد، صوبہ و
مرکز کی حکومت کی نگاہ میں اس ادارہ کی اہمیت و وقعت کا پیدا ہونا، اور اس سب میں بھی اس ادارہ
کے معیار و وقار اور روایات کو قائم رکھنا شاہ صاحب ہی کے عہد نظامت کے کارنامے ہیں، جن میں اگرچہ
سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب کی قوت عمل اور سعی پیہم کا بڑا ہاتھ ہے، لیکن اس کی کامیابی اس شہرت و
عزت اور اس وقار و اعتبار کی بہت کچھ رہین منت ہے، جس کو شاہ صاحب نے کامیابی کے ساتھ قائم رکھا تھا۔

شاہ صاحب جس طرح اپنے نامور استاذ و مربی کے علمی و تصنیفی میدان میں جانشین تھے، اسی طرح
اس "روح بیتاب" اور "قلب بیدار" کی وراثت بھی ان کو ملی، جو اپنے عہد کے سب سے بڑے مسلمان مصنف،

نامور عالم اور میخانہ علم کے مے نوش نہیں بلکہ ساقی کو خانقاہ تھانہ بھون لے گیا تھا شاہ صاحب ہندوستان کے ایک نامی گرامی خانوادہ روحانی کے فرد تھے، ان کے اندر جیسا کہ اوپر لکھا گیا محبت و انابت کی چنگاریاں دبی ہوئی تھیں، بالآخر انھوں نے اپنا کام کیا، ان کو اپنے اس خاندانی وراثت سے بھی حصہ حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا، اور ان خوش قسمت مصنفین اور اہل قلم کی طرح جنھوں نے ہر دور میں روحانی پیاس محسوس کی، اور اس کو بجھانے کی مخلصانہ کوشش کی، ان کو بھی ایک روحانی مربی، اور خضر طریق کی تلاش ہوئی، قدرتاً ان کا ذہن اپنے ہی سلسلہ کے شیوخ کی طرف گیا، جو عملاً بھی اس زمانہ کا سب سے زیادہ زندہ اور فعال سلسلہ ہے، اس سلسلہ میں ان کی نظر انتخاب حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوری پر پڑی، جن کی ذات جامع شریعت و طریقت بھی ہے، اور جن کا علمی مقام بھی مسلم ہے، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لئے مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ میں جو کشش کے اسباب تھے، قریب قریب وہی اسباب شیخ کی ذات میں شاہ صاحب کے لئے تھے، شاہ صاحب نے اس ناچیز کو جس کو شیخ کی خدمت میں عرصۂ دراز سے نیاز حاصل تھا، واسطہ بنایا اور ایک مرتبہ اس کی معیت میں سہارنپور تشریف لے گئے اور داخل سلسلہ ہوئے، شیخ نے بھی اس نسبت گرامی کی بنا پر جو شاہ صاحب کو حاصل تھی، ان کے ساتھ خصوصی معاملہ فرمایا، مجھے یاد ہے جب ان کو دوازدہ تسبیحات کی تلقین فرمائی تو غالباً ان کے استفسار پر ارشاد فرمایا کہ اتنی ہی تسبیحات ہمیں آپ کے گھر سے ملی ہیں، یہ اشارہ تھا حضرت مخدوم محمد عبدالحق قدس اللہ سرہٗ کی طرف جن سے اس سلسلہ کے تمام شیوخ و مسترشدین کو تعلیم و فیض حاصل ہوا۔

شاہ صاحب کا تعلق اپنے شیخ و مرشد سے روز بروز بڑھتا گیا، وہ ایک دوبار رمضان المبارک میں بھی سہارنپور گئے، اس میں بھی مجھے شرف ہمرکابی حاصل تھا، گذشتہ سال جب وہ حکومت سعودیہ کے وزارت واطلاعات کی دعوت پر مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی کی معیت میں دوبارہ حج بیت اللہ کو گئے تو مدینہ طیبہ میں شیخ کی محبت و التفات سے محظوظ ہوئے، برابر ان کی مجالس میں حاضر ہوتے رہے، یہ بھی عجیب اتفاق ہے، اور ان کے تعلق قلبی کی دلیل کہ اپنے انتقال سے چند ہی روز پہلے وہ سہارنپور جاکر شیخ سے ملے یہ ان کی آخری ملاقات تھی، شیخ سفر حجاز کو

روانہ ہوئے اور شاہ صاحب سفر آخرت پر، درمیان میں چند ہی دنوں کا فصل تھا۔

ان کو اس سلسلہ کے اکابر شیوخ مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا تھانویؒ اور مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ سب ہی سے عقیدت و محبت کا تعلق تھا، اور سبھی کا نام بڑے احترام سے لیتے تھے، میرے شیخ حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کی وفات پر انھوں نے مجھے جو تعزیت نامہ لکھا ہے، اس سے ان کے اصلی خیالات اور اندرونی جذبات کا اندازہ ہوتا ہے، یہاں وہ خط پورا نقل کیا جاتا ہے کہ ان کے طرز تحریر اور احساسات و تاثرات کا ایک موثر نمونہ ہے:۔

"عزیز گرامی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

حضرت مولانا رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کے سانحہ رحلت کی خبر اخبارات سے ملی تھی، آپ کو خط لکھنا چاہتا تھا، مگر آپ پاکستان میں تھے، اور وہاں کا پتہ معلوم نہ تھا، یقین ہے کہ اب واپس آگئے ہوں گے، اس لئے لکھنؤ لکھ رہا ہوں۔

یہ حادثہ کوئی غیر متوقع نہیں تھا، ایک تو عمر شریف، پھر پیرانہ سالی کے عوارض، مگر آفتاب جب بھی غروب ہو تاریکی پھیلنا لازمی ہے، اب ایسے نفوس قدسیہ کتنے رہ گئے ہیں، جن کے دم سے اسلام کی روحانی شمع روشن تھی۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مدارج و مراتب کا اصلی اندازہ تو وہی لوگ کر سکتے ہیں، جن کو ان کی صحبت اور ان سے استفادہ کی سعادت حاصل ہوئی ہے، لیکن ان کی عظمت و جلالت کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اجل خلفاء میں تھے، اور ان کے دامن تربیت سے آپ جیسی شخصیت پیدا ہوئی، اب غالباً اس سلسلۃ الذہب میں اس درجہ کی کوئی شخصیت باقی نہیں رہی، اس حادثہ کا جو اثر آپ پر ہوگا وہ ظاہر ہے، یہ تنہا آپ کا نہیں بلکہ دنیائے سلوک و تصوف کا بہت بڑا حادثہ ہے، مگر یہ مقام شکر ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایسے خلفاء و متوسلین چھوڑ گئے ہیں کہ ان کے بعد بھی ان کا روحانی فیض جاری رہے گا۔

یا الٰہی تا ابد قائم یہ میخانہ رہے

اس موقع پر خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ کے کچھ اشعار جو انھوں نے غالباً اپنے مرشد کی وفات پر کہے تھے، بے اختیار زبان قلم پر آگئے، ان کا نقل کر دینا شاید مناسب حال ہوگا۔

| | |
|---|---|
| ہجر کی شب عجب ہے شب حال یہ کیا ہے العجب | تارے ہیں روشنی نہیں، چاند ہے چاندنی نہیں |
| شیشہ ہے جام ہے نہ خم اصل تو وہ نقیں ہیں گم | لاکھ سجا لیے ہو تم بزم ابھی سجی نہیں |
| جائیں بہ چشم نم کہاں اس کی وہ بزم ہم کہاں | پہلے سے اب کرم کہاں زلف یہ اف ہی نہیں |
| بیٹھا ہوں میں جھکائے سر نیچی کیے ہوئے نظر | بزم میں سب سہی مگر وہ جو نہیں تو کچھ نہیں |
| اے مرے باغ آرزو کیسا ہے باغ ہائے تو | کلیاں تو گو ہیں چار سو کوئی کلی کھلی نہیں |
| دل میں لگائے اس کی لو کر دے جہاں میں نشر ضو | شمعیں تو جل رہی ہیں سو بزم میں روشنی نہیں ،، |

شاہ صاحب کی سب سے بڑی نمایاں صفت ان کی فطری شرافت، کریم النفسی، اور عالی ظرفی تھی، اس میں انکی خاندانی روایات، علوئے نسب، اور اودھ کی قدیم تہذیب کا بھی دخل تھا، اس شرافت کا تجربہ کم و بیش ان سب لوگوں کو ہوگا، جن کا ان سے واسطہ پڑا، یا کچھ دن ساتھ رہنے کا موقع ملا، اس کی ایک مثال یہ ہے کہ مولانا مسعود علی صاحب ندوی کے معذور ہو جانے کے بعد انھوں نے ان کی خدمت و احترام میں کوئی کوتاہی نہیں کی، جب کہ ان کے پرانے پرانے دوست اور اہل بزم، جن کو انکی ہم نشینی اور مخاطبت پر فخر کرتے سنا گیا ہے، ان کے سامنے آنے سے احتیاط کرنے لگے تھے، اور انکی نظر سے بچ کر نکل جانے کی کوشش کرتے تھے، شاہ صاحب نے اس معذوری کے زمانہ میں مولانا کو بڑا بنا کر رکھا، اور ادارہ کی طرف سے انکی وہی خدمت ہوتی رہی جسکے وہ ہر طرح سے مستحق تھے، مولانا بھی ان کی اس شرافت کے بڑے معترف اور شکر گزار تھے، اور کئی بار انھوں نے اس کا اعتراف کیا، شاہ صاحب اودھ کے ایک اونچے اور کھاتے پیتے خاندان کے فرد تھے، جس سے جوار کے ہندو مسلمانوں کا تعلق معتقدانہ اور نیازمندانہ رہا تھا، وہ نسباً فاروقی تھے، اور اس پر ان کو شکر اور فخر بھی تھا، ان سب نسبتوں اور

روایتوں کی بنا پر ان میں خودداری اور عزت نفس تھی، لیکن دین و شریعت کے کسی تقاضے کی بنا پر وہ اپنی خودداری کو بالائے طاق رکھ دیتے اور دین و شریعت کے احترام میں اودھ کی خاندانی روایات کا پاس کئے بغیر اپنی بات نیچی کر لیتے، اور اپنے کسی نیازمند اور عزیز کی فرمائش پوری کر دیتے، چند سال کا واقعہ ہے کہ ایک نامور معاصر اور بزرگ نے ان کو ایک سخت خط لکھا، اور اپنی خفگی کا اظہار کیا، جہاں تک مجھے معلوم ہے اس میں شاہ صاحب کا بالکل قصور نہ تھا، شاہ صاحب نے بھی کسی قدر ان کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے صاف جواب دیا، اس سے بات آگے بڑھی، شاہ صاحب کے ایک نیازمند نے جو دارالمصنفین کے مخلص تھے، مجھے اس کی طرف توجہ دلائی میں نے شاہ صاحب سے عرض کیا کہ وہ ایثار سے کام لیں اور صورتحال کی اصلاح میں پیش قدمی کریں، معاملہ اہم تھا اور ان کے جذبات و احساسات بری طرح مجروح ہوتے تھے، لیکن انھوں نے اپنی فطری شرافت اور نیک نفسی کی بنا پر اس مشورہ کو قبول کیا، اور تعلقات پھر درست و استوار ہو گئے۔

شاہ صاحب کے قلم میں جو شگفتگی اور پختگی تھی، وہ ان کے اعلیٰ ادبی ذوق، اودھ کے شرفاء کی مجلسوں، اہل زبان کے ماحول میں نشو و نما، دبستان شبلی کا اثر، اور سید صاحب کی صحبت کا فیض تھا، لیکن یہ سب چیزیں اپنی قدر و قیمت کے باوجود اکثر بے نتیجہ اور بے ثمر رہتی ہیں، اگر فطری استعداد اور موہبت خداوندی نہ ہو، شاہ صاحب کی تحریر میں تکلف اور تصنع نہیں ہوتا تھا، الفاظ کا بقدر ضرورت استعمال کرتے تھے، عبارت کو مرصع اور رنگین بنانے کی عمداً کوئی کوشش نہیں کرتے تھے، ان کے یہاں رجز یہ شان اور خطابت کی آن بان بھی نہ تھی، وہ غالباً قلم برداشتہ لکھتے تھے، اور بہت کم کاٹتے تھے، شاعری کے مجموعوں اور ادبی کتابوں پر ان کے تبصرے خاص طور پر بڑے دلآویز اور جچے تلے ہوتے تھے، جس سے ان کے اعلیٰ ادبی ذوق، سخن فہمی اور نکتہ رسی کا اظہار ہوتا تھا، مسلمانوں کے قومی مسائل اور ملی حوادث پر بھی ان کی تحریریں اور شذرات بڑے سنجیدہ، متین، وزنی اور باوقار ہوتے تھے، اور ان میں ان کی حقیقت پسندی، ذہنی توازن، ملی درد اور اخلاقی جرأت کا پورے طور پر اظہار ہوتا تھا، یہ شذرات اور تحریریں اس قابل ہیں کہ ان کے الگ الگ مجموعے شائع کئے جائیں، اور

ادب و انشاء کے طالب علم اور صحافت و سیاست کے نو وارد، ان سے حسن بیان، متانت تحریر اور اصابت رائے کا سبق لیں۔

آخر میں سید صاحب اور دارالمصنفین سے تعلق رکھنے والے تمام احباب اور بزرگوں کا تقاضا تھا کہ دارالمصنفین سے سید صاحب کی کوئی ایسی سوانح حیات یا تذکرہ شائع ہو جس میں ان کی علمی، ادبی اور دینی زندگی کا تنوع، اور ان کے کمالات کی رنگارنگی، اور فتوحات سلیمانی کی وسعت و کثرت پورے طور پر عیاں ہو، یہ نازک اور دشوار کام وہی شخص انجام دے سکتا تھا، جس کو نہ صرف سید صاحب کی زندگی کے ان مختلف اور بعض اوقات متضاد شعبوں سے قریبی واقفیت ہو، بلکہ وہ ان کا قدرداں اور مرتبہ شناس بھی ہو، جس کو فطری طور پر توازن و اعتدال کا جوہر ملا ہو، اور اس نے سید صاحب کو صرف ایک ہی رنگ میں نہ دیکھا ہو، جو ہزار حسین و دلکش سہی ان کے مرقع کمالات کا ایک گوشہ ہے، ہم سب کی نظر اس سلسلہ میں شاہ صاحب ہی پر پڑتی تھی کہ ؎

داستان فصل گل خوش می سراید عندلیب

اس کام میں بہت دیر لگ رہی تھی، اور کتابت و طباعت کی مشکلات کی بناء پر اس کا کبھی کبھی اندیشہ پیدا ہو جاتا تھا، کہ کہیں یہ کام بھی بہت سے مصنفین کے بعض اہم کاموں کی طرح حوادث روزگار کا شکار نہ ہو جائے، بڑے مسرت و شکر کا مقام ہے کہ شاہ صاحب نے اپنی زندگی میں اس کی تکمیل کر دی، اور "حیات سلیمانی" ان کے قلم سے مکمل ہو کر منظر عام پر آگئی، ہر انسانی کام کی طرح کوئی تصنیف بھی تنقید سے بالاتر اور کمی کسر سے محفوظ نہیں، لیکن یہ ایک قیمتی، علمی اور تاریخی دستاویز تھی، جس کے وجود میں آجانے سے بڑی حد تک مسلمانوں کی ملی، علمی، ادبی و سیاسی تاریخ کا وہ سلسلہ مکمل ہو گیا، جس کی اہم کڑیاں "حیات جاوید" "وقار حیات" اور "حیات شبلی" ہیں۔

جب جانشین سلیمان نے اپنی زندگی کا یہ اہم ترین کام انجام دے دیا تو خود اس کی کتاب زندگی کا آخری ورق الٹ گیا، اور وہ اپنے آبائے کرام کے پاس پہنچ گیا، جہاں تصنیفات کے اوراق کی تعداد نہیں، صحت اعتقاد، حسن عمل، حسن اخلاق اور رضائے الٰہی کے طلب و کوشش کی قدر ہے، اور

جہاں تک ہم کوتاہ نظروں کا تعلق ہے، اس جنس سے ان کا دامن خالی اور اس زادِ راہ سے وہ محروم نہ تھے،
ان کا دل محبت آشنا، ان کی آنکھیں پُرنم، ان کی زبان شیریں، ان کی طبیعت بے آزار، اور ان کا قلب کینہ و
عداوت سے بہت دور تھا، جہاں تک ان کے ساتھ رہنے والوں، اٹھنے بیٹھنے والوں کی معلومات اور
تجربہ کا تعلق ہے بہت کم لوگ شاید اس کی شکایت کر سکیں گے کہ انھوں نے ان کا دل دکھایا اور ان کو
نقصان پہنچایا، ان کی طبیعت میں معصوم بچوں کی سی سادگی اور معصومیت تھی، انھوں نے زندگی جس آزادی
اور وارستہ مزاجی کے ساتھ گزاری، وہ کسی پر بوجھ نہیں بنے، ساری عمر سبک بار و بے ہمہ رہے اسی شان سے
انھوں نے دنیا سے سفر بھی کیا، ۱۳ر دسمبر ۱۹۷۴ء کو جمعہ کا دن تھا جمعہ کی نماز دار المصنفین میں پڑھی، نماز کے بعد
اپنے کمرہ میں آکر سو گئے، عصر کی نماز کے وقت اٹھے، وضو کے لئے پانی طلب کیا، پانی آیا تو وضو کرنے کے لئے
کرسی سے اٹھے، گرے اور جاں بحق ہو گئے، اس طرح انھوں نے نہ طویل بیماری اٹھائی، نہ کسی سے خدمت لی،
نہ کسی پر بار ہوئے، انتقال کی خبر جس نے سنا وہ سناٹے میں آگیا، نعش آبائی وطن ردولی لائی گئی، ہفتہ کے
روز ۱۴ر دسمبر ۱۹۷۴ء کو یہ گنجینۂ خوبی سپردِ خاک ہوا، یہ سب کچھ اس طرح آناً فاناً ہو گیا کہ بہت سے عزیزوں،
دوستوں اور عقیدت مندوں کو نمازِ جنازہ میں شرکت کی بھی سعادت حاصل نہ ہوئی کہ ؎

سبک بار مردم سبک تر روند

اللہ کی کریم ذات سے امید ہے کہ وہ ان کے ساتھ لطف و کرم کا معاملہ فرمائے گا، ان کی
لغزشوں سے جس سے کوئی فردِ بشر خالی نہیں درگذر فرمائے گا، اور ان کو اپنے مقامِ رحمت و رضا
میں جگہ دے گا۔